

تشریحاً ترمذی

تشریحاً ترمذی
ترمذی

تالیف

حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
خادم الاحادیث النبویہ
جامعہ اسلامیہ مخزن العلوم

جلد ششم

قلیسی کن خانہ
مقابل آرام باغ کراچی



تَشْرِیحات تَرْمذی

تألیف
حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
استاد الحدیث جامعہ اسلامیہ کلکتہ کراچی

جلد ششم

قدیمی گنج خانہ
مقابلہ آثار باغ بکراچی

کل
۱۶/۷

جملہ حقوق بحق قدیمی کتب خانہ محفوظ ہیں۔

تَشْرِیحاتِ تَرْغِیباتِ

حضرت مولانا کمال الدین المسترشد

مولانا شمس الحق 0300-2426745

نام کتاب:

تالیف:

کمپوزنگ:

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابلہ آلام باغ کراچی

021-32627608

021-32623782

فون:

فہرست ابواب تشریحات ترمذی

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	فہرست ابواب تشریحات ترمذی	۳	۲۰	باب ماجاء فی کراہیۃ اکل الثوم والبصل	۴۵
۲	ابواب الاطعمۃ		۲۱	باب ماجاء فی الرزقۃ فی اکل	
	عن رسول اللہ ﷺ	۱۲		الثوم مطبوخا	۴۸
۳	باب ماجاء علی ما کان یأکل النبی ﷺ	۱۳	۲۲	باب ماجاء فی تخمیر الالبان واطفاء	
۴	کرسی اور میز پر کھانا	۱۶		السراج والنار عند المنام	۴۹
۵	فائدہ نمبر ۱	۱۷	۲۳	باب ماجاء فی کراہیۃ القران بین اتمرین	۵۲
۶	فائدہ نمبر ۲	۱۷	۲۴	باب ماجاء فی استحباب التمر	۵۳
۷	باب ماجاء فی اکل الارنب	۱۸	۲۵	باب ماجاء فی الحمد علی الطعام	
۸	باب ماجاء فی اکل الفص	۲۰		اذا فرغ منه	۵۵
۹	گوہ کھانے کا حکم	۲۰	۲۶	باب ماجاء فی الاکل مع الجذوم	۵۷
۱۰	باب ماجاء فی اکل الضج	۲۳	۲۷	جذام کیا ہے؟	۵۷
۱۱	باب ماجاء فی اکل لحوم الخیل	۲۷	۲۸	باب ماجاء ان المؤمن یأکل فی معی واحد	۶۰
۱۲	باب ماجاء فی لحوم الحمر الاہلیۃ	۳۰	۲۹	باب ماجاء فی طعام الواحد یکلمی الاثنین	۶۲
۱۳	باب ماجاء فی الاکل فی آئیۃ الکفار	۳۲	۳۰	باب ماجاء فی اکل الجراد	۶۳
۱۴	باب ماجاء فی الفلۃ تموت فی السم	۳۳	۳۱	باب ماجاء فی اکل لحوم الجلالۃ والبانہا	۶۵
۱۵	باب ماجاء فی النہی عن الاکل		۳۲	باب ماجاء فی اکل الدجاج	۶۸
	والشرب بالشمال	۳۶	۳۳	قاری مرغیوں کا حکم	۶۹
۱۶	آداب	۳۸	۳۴	باب ماجاء فی اکل الخبازی	۷۰
۱۷	باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الاکل	۳۹	۳۵	باب ماجاء فی اکل الشواء	۷۱
۱۸	باب ماجاء فی الملقمۃ تسقط	۴۱	۳۶	باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل متکئا	۷۳
۱۹	باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل من		۳۷	باب ماجاء فی حب النبی ﷺ	
	وسط الطعام	۴۴		الحلو اءوالعسل	۷۶

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار	صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۱۰۴	مسئلہ	۵۸	۷۸	باب ماجاء فی اکثر الرقعة	۳۸
۱۰۵	ابواب الاشربة	۵۹	۸۰	باب ماجاء فی فضل الشریہ	۳۹
۱۰۵	باب ماجاء فی شارب الخمر	۶۰	۸۱	افضل کون؟	۴۰
۱۰۶	ائمہ ثلاثہ کے دلائل	۶۱	۸۲	باب ماجاء انھشوا اللحم نھشاً	۴۱
۱۰۷	خفیی کی دلیل	۶۲		باب ماجاء عن النبی ﷺ فی الرخصة	۴۲
۱۰۷	جوابات	۶۳	۸۳	فی قطع اللحم بالسکین	
۱۰۸	دوسری بحث	۶۴		باب ماجاء ای اللحم احب الی	۴۳
	ادویات اور پرفوم میں شامل کیا	۶۵	۸۴	رسول اللہ ﷺ؟	
۱۱۰	جانے والا "الکحول"		۸۶	باب ماجاء فی الخن	۴۴
۱۱۰	تیسری بات	۶۶	۸۷	باب ماجاء فی اکل الطبخ بالرطب	۴۵
۱۱۳	باب ماجاء بکل مسکر حرام	۶۷	۸۹	باب ماجاء فی اکل القثاء بالرطب	۴۶
۱۱۳	باب ماجاء ما اسکر کثیرہ فتقلیہ حرام	۶۸	۸۹	باب ماجاء فی شرب ابوال الابل	۴۷
۱۱۵	باب ماجاء فی نبیذ الخمر	۶۹	۸۹	باب الوضوء قبل الطعام وبعده	۴۸
	باب ماجاء فی کراہیۃ ان یتبذ فی	۷۰	۹۱	باب ماجاء فی ترک الوضوء قبل الطعام	۴۹
۱۱۷	الذہب والنقر و الخس		۹۳	باب ماجاء فی اکل الذہب	۵۰
	باب ماجاء فی الرخصة ان یتبذ	۷۱	۹۵	باب ماجاء فی اکل الزیت	۵۱
۱۱۹	فی الظروف		۹۶	باب ماجاء فی الاکل مع المملوک	۵۲
۱۲۰	باب ماجاء فی الانتباذ فی السقاء	۷۲	۹۷	باب ماجاء فی فضل طعام الطعام	۵۳
	باب ماجاء فی الحبوب التي تتخذ	۷۳	۹۸	آداب سلام	۵۴
۱۲۲	منہا الخمر		۹۹	باب ماجاء فی فضل العشاء	۵۵
۱۲۳	باب ماجاء فی خلیط البس و التمر	۷۴	۱۰۰	باب ماجاء فی التسمیۃ علی الطعام	۵۶
	باب ماجاء فی کراہیۃ الشرب فی	۷۵		باب ماجاء فی کراہیۃ البیوتہ	۵۷
۱۲۴	آمیۃ الذہب والفضۃ		۱۰۳	وفی یدہ ریح غمر	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷۶	سونے چاندی کا استعمال	۱۲۵	۹۷	باب ماجاء فی بر الخالة	۱۵۶
۷۷	مطلق تخبہ مذموم نہیں	۱۲۷	۹۸	باب ماجاء فی دعاء الوالدین	۱۵۹
۷۸	باب ماجاء فی النہی عن الشرب قائماً	۱۲۹	۹۹	باب ماجاء فی حق الوالدین	۱۶۱
۷۹	باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً	۱۳۰	۱۰۰	باب ماجاء فی قطعية الرحم	۱۶۲
۸۰	باب ماجاء فی التنفس فی الاءاء	۱۳۳	۱۰۱	باب ماجاء فی صلة الرحم	۱۶۳
۸۱	باب ما ذکر فی الشرب بفسین	۱۳۴	۱۰۲	صلہ رحمی کرنے کا طریقہ	۱۶۵
۸۲	باب ماجاء فی کراہیۃ الخ فی الشرب	۱۳۵	۱۰۳	باب ماجاء فی حب الولد	۱۶۶
۸۳	باب ماجاء فی کراہیۃ التنفس فی الاءاء	۱۳۶	۱۰۴	باب ماجاء فی رحمة الولد	۱۶۸
۸۴	باب ماجاء فی النہی عن امتثاۃ الاسقیۃ	۱۳۷	۱۰۵	باب ماجاء فی النفقة علی البنات	۱۶۹
۸۵	باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک	۱۳۸	۱۰۶	باب ماجاء فی رحمة الیتیم وکفالتہ	۱۷۳
۸۶	باب ماجاء ان الایمنین احق بالشرب	۱۳۹	۱۰۷	باب ماجاء فی رحمة الصبیان	۱۷۵
۸۷	باب ماجاء ان ساقی القوم آخرہم شرباً	۱۴۲	۱۰۸	باب ماجاء فی رحمة الناس	۱۷۷
۸۸	باب ماجاء ای الشرب کان احب		۱۰۹	باب ماجاء فی النصیۃ	۱۷۹
	الی رسول اللہ ﷺ	۱۴۳	۱۱۰	باب ماجاء فی شفقتہ المسلم علی المسلم	۱۸۱
۸۹	ابواب البر والصلۃ		۱۱۱	باب ماجاء فی الستر علی المسلمین	۱۸۴
	عن رسول اللہ ﷺ	۱۴۴	۱۱۲	باب ماجاء فی الذب عن المسلم	۱۸۶
۹۰	باب ماجاء فی بر الوالدین	۱۴۴	۱۱۳	باب ماجاء فی کراہیۃ الحجر للمسلم	۱۸۷
۹۱	ماں باپ کے مختلف حقوق	۱۴۶	۱۱۴	باب ماجاء فی مواساة الاخ	۱۸۹
۹۲	باب منہ	۱۴۷	۱۱۵	باب ماجاء فی الغیۃ	۱۹۱
۹۳	باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین	۱۴۹	۱۱۶	باب ماجاء فی الحسد	۱۹۳
۹۴	مسئلہ	۱۵۱	۱۱۷	باب ماجاء فی التباغض	۱۹۶
۹۵	باب ماجاء فی عقود الوالدین	۱۵۲	۱۱۸	باب ماجاء فی اصلاح ذات البین	۱۹۸
۹۶	باب ماجاء فی اکرام صدیق الوالد	۱۵۵	۱۱۹	باب ماجاء فی الحیاء والغش	۲۰۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۱۲۰	باب ماجاء فی حق الجوار	۲۰۴	۱۴۰	مہمان کی ذمہ داری	۲۳۹
۱۲۱	بمسائگی کے چند اہم حقوق	۲۰۶	۱۴۱	باب ماجاء فی السعی علی الارملۃ والیتیم	۲۴۰
۱۲۲	باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم	۲۰۷	۱۴۲	باب ماجاء فی طلاقۃ الوجہ وحسن البشر	۲۴۱
۱۲۳	باب النہی عن ضرب الفقہ ام و شتمہم	۲۱۰	۱۴۳	باب ماجاء فی الصدق والکذب	۲۴۲
۱۲۴	باب ماجاء فی ادب الخادم	۲۱۱	۱۴۴	باب ماجاء فی الفحش	۲۴۳
۱۲۵	باب ماجاء فی العقوبۃ الخادم	۲۱۲	۱۴۵	باب ماجاء فی اللعۃ	۲۴۶
۱۲۶	باب ماجاء فی ادب الولد	۲۱۳	۱۴۶	باب ماجاء فی تقیۃ النسب	۲۴۹
۱۲۷	باب ماجاء فی قبول المہدیۃ		۱۴۷	باب ماجاء فی دعوة الاخ للاحیہ	
	والمکافۃ علیہا	۲۱۵		بظہر الغیب	۲۵۱
۱۲۸	باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک	۲۱۷	۱۴۸	باب ماجاء فی الشتم	۲۵۱
۱۲۹	باب ماجاء فی صنائع المعروف	۲۱۸	۱۴۹	باب ماجاء فی قول المعروف	۲۵۳
۱۳۰	باب ماجاء فی المنیۃ	۲۱۹	۱۵۰	باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح	۲۵۵
۱۳۱	باب ماجاء فی الماطۃ الاذی عن الطریق	۲۲۰	۱۵۱	باب ماجاء فی معاشرۃ الناس	۲۵۷
۱۳۲	باب ماجاء ان الجالس بالامانۃ	۲۲۱	۱۵۲	باب ماجاء فی ظن السوء	۲۵۸
۱۳۳	باب ماجاء فی السخاء	۲۲۲	۱۵۳	باب ماجاء فی المزاح	۲۶۰
۱۳۴	باب ماجاء فی التملک	۲۲۶	۱۵۴	باب ماجاء فی الخمر	۲۶۱
۱۳۵	باب ماجاء فی النفقۃ علی الاہل	۲۳۲	۱۵۵	باب ماجاء فی المداۃ	۲۷۰
۱۳۶	باب ماجاء فی الضیافۃ وغایۃ الضیافۃ		۱۵۶	کفار سے تعلقات کی نوعیت	۲۷۲
	کم ہو؟	۲۳۳	۱۵۷	باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والیغض	۲۷۴
۱۳۷	محمد عربی پر ایمان عقیدہ کا لازمی		۱۵۸	باب ماجاء فی الکبر	۲۷۵
	جزء ہے	۲۳۵	۱۵۹	کبر و تکبر اور اسباب	۲۷۶
۱۳۸	اکرام ضیف	۲۳۷	۱۶۰	حدیث باب کا مطلب	۲۷۷
۱۳۹	ضیافت کا حکم	۲۳۷	۱۶۱	باب ماجاء فی حسن الخلق	۲۸۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۶۲	باب ماجاء فی الاحسان والعفو	۲۸۲	۱۸۵	باب ماجاء فی تعظیم المؤمن	۳۲۳
۱۶۳	باب ماجاء فی زیارة الاخوان	۲۸۵	۱۸۶	باب ماجاء فی التجارب	۳۲۵
۱۶۴	باب ماجاء فی الحیاء	۲۸۶	۱۸۷	باب ماجاء فی التشیخ بما لم یعط	۳۲۷
۱۶۵	باب ماجاء فی التانیۃ العجلۃ	۲۸۷	۱۸۸	باب ماجاء فی الشاء بالمعروف	۳۲۹
۱۶۶	باب ماجاء فی الرقی	۲۹۱	۱۸۹	ابواب الطب	
۱۶۷	باب ماجاء فی دعوة المظلوم	۲۹۲		عن رسول اللہ ﷺ	۳۳۱
۱۶۸	باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ	۲۹۳	۱۹۰	طب کاثبوت	۳۳۱
۱۶۹	باب ماجاء فی حسن العبد	۲۹۷	۱۹۱	باب ماجاء فی الحمیۃ	۳۳۲
۱۷۰	باب ماجاء فی معالی الاخلاق	۲۹۸	۱۹۲	مرض لاحق ہونے سے قبل پرہیز	
۱۷۱	باب ماجاء فی اللعن واللعن	۳۰۱		اور دوا کا حکم	۳۳۳
۱۷۲	باب ماجاء فی کثرة الغضب	۳۰۱	۱۹۳	باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ	۳۳۶
۱۷۳	باب ماجاء فی نظم الغیظ	۳۰۳	۱۹۴	باب ماجاء ما یطعم المریض	۳۳۸
۱۷۴	باب ماجاء فی اجلال الکبیر	۳۰۵	۱۹۵	باب ماجاء لا کرہوا مرضا کم	
۱۷۵	باب ماجاء فی المتباجین	۳۰۶		على الطعام والشراب	۳۴۰
۱۷۶	باب ماجاء فی الصبر	۳۰۸	۱۹۶	باب ماجاء فی الحبة السوداء	۳۴۲
۱۷۷	باب ماجاء فی ذی الوجھین	۳۱۱	۱۹۷	باب ماجاء فی شرب ابوال الابل	۳۴۳
۱۷۸	باب ماجاء فی التمام	۳۱۲	۱۹۸	باب ماجاء من قتل نفسه بسم او غیرہ	۳۴۴
۱۷۹	مخبری اور جاسوسی	۳۱۳	۱۹۹	تنبیہ	۳۴۶
۱۸۰	باب ماجاء فی البی	۳۱۶	۲۰۰	خودکشی حرام ہے	۳۴۶
۱۸۱	باب ماجاء ان من البیان محرأ	۳۱۸	۲۰۱	باب ماجاء فی کراهیۃ الدواۃ بالمسکر	۳۴۸
۱۸۲	باب ماجاء فی التواضع	۳۱۹	۲۰۲	باب ماجاء فی السعوط وغیرہ	۳۵۰
۱۸۳	باب ماجاء فی الظلم	۳۲۱	۲۰۳	باب ماجاء فی کراهیۃ الکلی	۳۵۳
۱۸۴	باب ماجاء فی ترک العیب للنعمة	۳۲۲	۲۰۴	باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک	۳۵۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳۹۴	باب ماجاء فی العسل	۲۲۷	۳۵۷	باب ماجاء فی الحجامة	۲۰۵
۳۹۶	باب	۲۲۸	۳۶۰	باب ماجاء فی التدوی بالحناء	۲۰۶
۳۹۶	باب	۲۲۹	۳۶۱	باب ماجاء فی کرہیۃ الرقۃ	۲۰۷
۳۹۸	باب التدوی بالرماد	۲۳۰	۳۶۱	باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک	۲۰۸
۳۹۹	جدید تحقیق	۲۳۱	۳۶۱	دونوں بابوں کی تشریح	۲۰۹
۴۰۰	باب	۲۳۲	۳۶۳	باب ماجاء فی الرقۃ بالمعوذتین	۲۱۰
	ابواب الفرائض	۲۳۳	۳۶۴	باب ماجاء فی الرقۃ من العین	۲۱۱
۴۰۱	عن رسول اللہ ﷺ		۳۶۶	باب ماجاء ان العین حق والغسل لها	۲۱۲
۴۰۱	باب ماجاء فی من ترک مالاً فلو رشہ	۲۳۴	۳۶۹	باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ	۲۱۳
۴۰۳	باب ماجاء فی تعلیم الفرائض	۲۳۵	۳۷۲	باب ماجاء فی الرقی والادویۃ	۲۱۴
۴۰۴	باب ماجاء فی میراث البنات	۲۳۶	۳۷۴	باب ماجاء فی الکماة والعجوة	۲۱۵
	باب ماجاء فی میراث بنت الابن	۲۳۷	۳۷۶	فائدہ	۲۱۶
۴۰۶	مع بنت الصلب		۳۷۸	باب ماجاء فی اجراکما هن	۲۱۷
	باب ماجاء فی میراث الاخوة	۲۳۸	۳۸۰	تنبیہ نمبر ۱	۲۱۸
۴۰۸	من الاب والام		۳۸۱	تنبیہ نمبر ۲	۲۱۹
۴۱۰	باب میراث البنین مع البنات	۲۳۹	۳۸۲	باب ماجاء فی کرہیۃ التعليق	۲۲۰
۴۱۱	باب ماجاء فی میراث الاخوات	۲۴۰	۳۸۵	باب ماجاء فی تمریدہ لأمی بالماء	۲۲۱
۴۱۲	باب ماجاء فی میراث العصۃ	۲۴۱		بخار کے لئے غسل، جدید تحقیق	۲۲۲
۴۱۴	باب ماجاء فی میراث الجدة	۲۴۲		کی دوشنی میں	
۴۱۶	باب ماجاء فی میراث الجدة	۲۴۳	۳۸۶		
۴۱۸	باب ماجاء فی میراث الجدة مع ابنها	۲۴۴	۳۸۸	باب ماجاء فی الغیلة	۲۲۳
۴۱۹	باب ماجاء فی میراث الخال	۲۴۵	۳۹۰	باب ماجاء فی دواء ذات الحجب	۲۲۴
	باب ماجاء فی الذی یموت ولیس	۲۴۶	۳۹۲	باب	۲۲۵
۴۲۰	لدارث		۳۹۳	باب ماجاء فی السنۃ	۲۲۶

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار	صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۴۴۸	باب	۲۶۴	۴۴۲	باب فی میراث السولی الأسفل	۲۴۷
	ابواب الولاء والہبۃ	۲۶۵		باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر	۲۴۸
۴۵۰	عن رسول اللہ ﷺ		۴۴۲		
۴۵۰	باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق	۲۶۶		آج کے اہل بدعت کی وراثت	۲۴۹
۴۵۲	باب انہی عن بیع الولاء وحبۃ	۲۶۷	۴۴۵	ومناعت کا حکم	
	باب ماجاء فی من تولى غیر موالیہ	۲۶۸	۴۴۷	تنبیہ	۲۵۰
۴۵۳	اداولی الی غیرابیہ		۴۴۸	باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل	۲۵۱
۴۵۷	باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده	۲۶۹		باب ماجاء فی میراث المرأة من	۲۵۲
۴۵۹	باب ماجاء فی القافۃ	۲۷۰	۴۴۹	دیۃ زوجھا	
	باب ماجاء فی حب النبی ﷺ	۲۷۱		باب ماجاء ان المیراث للورثۃ	۲۵۳
۴۶۲	علی الہدیۃ		۴۳۰	والعقل للعصۃ (علی العصۃ)	
۴۶۳	باب ماجاء فی کرمیۃ الرجوع فی الہبۃ	۲۷۲	۴۳۲	باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل	۲۵۴
	ابواب القدر	۲۷۳	۴۳۳	باب من یرث الولاء	۲۵۵
۴۶۴	عن رسول اللہ ﷺ			ابواب الوصایا	۲۵۶
	باب ماجاء من التشدید فی الخوض	۲۷۴	۴۳۶	عن رسول اللہ ﷺ	
۴۶۶	فی القدر		۴۳۶	باب ماجاء فی الوصیۃ بالثلث	۲۵۷
۴۶۷	باب	۲۷۵		باب ماجاء فی الضرر فی الوصیۃ	۲۵۸
۴۷۱	باب ماجاء فی الشقاء والسعادۃ	۲۷۶	۴۴۰		
۴۷۳	باب ماجاء ان الاعمال بالخواتیم	۲۷۷	۴۴۱	باب ماجاء فی المحبۃ علی الوصیۃ	۲۵۹
۴۷۸	باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرۃ	۲۷۸	۴۴۲	باب ماجاء ان النبی ﷺ لم یوص	۲۶۰
۴۸۲	باب ماجاء لا یرث القدر الا دعاء	۲۷۹	۴۴۳	باب لا وصیۃ لوارث	۲۶۱
۴۸۳	باب ماجاء ان القلوب بین اصحبی الرحمن	۲۸۰	۴۴۶	باب ماجاء بعد ابدالین قبل الوصیۃ	۲۶۲
	باب ماجاء ان اللہ کتب کتابا	۲۸۱		باب ماجاء فی الرجل یمصدق	۲۶۳
۴۸۴	لاہل الحیۃ والنار		۴۴۷	او یلقن عند الموت	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۸۲	باب ماجاء لاندوی ولاہامۃ والاصفر	۲۸۷	۲۹۹	باب النھی عن تعاطی السیف مسلولا	۵۱۳
۲۸۳	باب ماجاء فی الایمان بالقدر		۳۰۰	باب من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللہ	
	خیر وشرہ	۲۸۹		عز وجل	۵۱۴
۲۸۴	باب ماجاء ان النفس تموت حیث		۳۰۱	باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ	۵۱۵
	ماکتب لها	۲۹۰	۳۰۲	جماعت سے مراد کون ہیں؟	۵۱۸
۲۸۵	باب ماجاء لا ترؤا الرقی والدواء		۳۰۳	باب ماجاء فی نزول العذاب اذا	
	من قدر اللہ شیئا	۲۹۱		لم یغیر الممکر	۵۲۲
۲۸۶	باب ماجاء فی القدریۃ	۲۹۲	۳۰۴	باب ماجاء فی الامر بالمعروف	
	بیان مذاہب	۲۹۳		والنھی عن المنکر	۵۲۳
۲۸۸	دلائل	۲۹۴	۳۰۵	باب ماجاء فی تغیر المنکر بالمید	
۲۸۹	باب	۲۹۷		او باللسان وبالقلب	۵۲۸
۲۹۰	باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء	۲۹۸	۳۰۶	دل سے برا سمجھنے کا مطلب	۵۳۰
۲۹۱	باب	۵۰۰	۳۰۷	باب منہ	۵۳۱
۲۹۲	ملفوظ	۵۰۳	۳۰۸	باب افضل الجناۃ کما یرید	
۲۹۳	متعدد روایات میں تطبیق	۵۰۴		عند سلطان جائز	۵۳۳
۲۹۴	ابواب الفتن		۳۰۹	باب سوال النبی ﷺ خلافتی امتہ	۵۳۳
	عن رسول اللہ ﷺ	۵۰۶	۳۱۰	باب ماجاء فی الرجل یموت فی الفتنۃ	۵۳۷
۲۹۵	باب ماجاء لا یحل دم امرئ مسلم		۳۱۱	رجبائیت اور عزالت نشینی میں فرق	۵۳۸
	الا باحدی ثلاث	۵۰۶	۳۱۲	باب ماجاء فی رفع الامانۃ	۵۴۱
۲۹۶	باب ماجاء فی تحريم الدماء والاموال	۵۰۹	۳۱۳	باب لترکین سُنن من کان قبلكم	۵۴۶
۲۹۷	باب ماجاء لا یحل لمسلم ان یرد مسلما	۵۱۱	۳۱۴	اشکال	۵۴۸
۲۹۸	باب ماجاء فی اشارۃ الرجل		۳۱۵	حل	۵۴۸
	علی اخیہ بالسلاح	۵۱۲	۳۱۶	باب ماجاء فی کلام السباع	۵۴۸

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار	صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۵۷۷	باب ماجاء فی احل الشام	۳۲۸	۵۵۰	باب ماجاء فی اشتقاق القمر	۳۱۷
	باب لا تترجوا بعدی کفاراً یضرب	۳۲۹	۵۵۲	باب ماجاء فی الخسف	۳۱۸
۵۷۸	بعضکم رقاب بعض		۵۵۸	باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها	۳۱۹
	باب ماجاء انه تكون فتنة القاعد فیها	۳۳۰		و اصولی اعتراضات اور ان کے	۳۲۰
۵۷۹	خیر من القائم		۵۵۹	اصولی جوابات	
	باب ماجاء سکون فتنة کقطع	۳۳۱	۵۵۹	زمین گول ہے	۳۲۱
۵۸۱	اللیل المظلم		۵۶۰	نیون کا اصول	۳۲۲
۵۸۵	باب ماجاء فی الهرج	۳۳۲	۵۶۱	علم طبیعیات کے قوانین کا جائزہ	۳۲۳
۵۸۸	باب ماجاء فی اتخاذ السیف من الخشب	۳۳۳	۵۶۲	باب ماجاء فی خروج یا جوج و ما جوج	۳۲۴
	تمت فہرس المجلد السادس		۵۶۹	باب ماجاء فی صفة المارقة	۳۲۵
	ویلیہ المجلد السابع اولہ		۵۷۱	باب ماجاء فی الاثرۃ	۳۲۶
	”باب ماجاء فی اشرط الساعة“			باب ما خبر النبی ﷺ اصحابہ بما هو	۳۲۷
	(ان شاء اللہ)		۵۷۳	کائن الی یوم القیامۃ	



”المجلد الثانی“ من الجامع للحافظ الامام ابی عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلياً و مسلماً

ابواب الاطعمہ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اطعمہ، طعام کی جمع ہے جس کے معنی کھانے اور خوراک کے ہیں یعنی ہر وہ چیز جو کھائی جائے اور جسم کی بقاء کا اس پر مدار ہو، تاہم اہل حجاز اور اہل عراق عام طور پر اس کا اطلاق گیہوں پر کرتے ہیں۔

اس مادہ ط، ع، م، میں چکھنے، قوت حاصل کرنے اور لذت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں جس سے وجہ تسمیہ واضح ہو جاتی ہے۔

چونکہ طعام کے معنی میں کافی توسع ہے لفظ بھی اور اصطلاح بھی، اس لئے مشروبات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ آیت نمبر: ۲۳۹ میں ہے ”فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي“، ومن لم يطعمه فانه مني“ الآیۃ۔

(حضرت طاووت نے فرمایا تو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے)

چنانچہ خطیب المفسرین ابوسعودؒ ”ومن لم يطعمه“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ”ومن لم يطعمه“ ای لم يذقه، من طعام الشيء اذا ذاقه ما كولا كان او مشروباً او غيرهما، یعنی طعام اشیٰ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کو چکھا جائے خواہ وہ چیز کھانے کی ہو یا پینے کی، پھر اس کی تائید میں ایک شعر بھی ذکر کیا ہے، گو کہ یہاں چکھنے سے مراد نگنا ہے کیونکہ زبان پر رکھنے کو چکھنا کہتے ہیں مگر اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (تدبر)

علیٰ ہذا قرآن کی اس آیت پر پادری کا اعتراض غلط ہے کہ بجائے ”لم يطعمه“ کے ”لم يشربه“ کہنا چاہئے تھا، اور وجہ غلطی ظاہر ہے کہ اس نے طعام کو صرف کھانے کی اشیاء تک محدود سمجھ کر اعتراض کیا ہے۔

ویسے تو بہت سی اشیاء ہیں جنہیں کھایا جاتا ہے اور کھایا جاسکتا ہے، مگر شرعی اعتبار سے صرف وہ اشیاء

قابل تغذی اور قابل تناول ہیں جو انسانی مقصد میں معاون ثابت ہوتی ہیں یا کم از کم مضر نہیں، چونکہ ہر انسان کا نصب العین اللہ عز وجل کی خوشنودی کا حصول ہونا چاہئے اور یہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اعمال اور اخلاق حسنہ سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے اور یہی انسان کی خلقت کا بھی مقصد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت میں بھی یہ شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ“۔ (سورۃ الاعراف: ۱۵۷) (اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں)

لہذا جو اشیاء قوتِ علمیہ اور قوتِ عملیہ کے بڑھانے کا ذریعہ ہیں وہ تو جائز ہیں اور جو ان دونوں قوتوں کو ضرر پہنچائے وہ ناجائز ہوگی، چنانچہ مسکرات و منشیات قوتِ علمیہ کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے اور درندے وغیرہ قوتِ عملیہ کو ضرر رساں ہونے کی بناء پر حرام و ممنوع قرار دے دیئے گئے۔

کسی چیز کی تحریم سے غرض تنگی پیدا کرنا ہرگز نہیں بلکہ انسان کو گندے اعمال و اخلاق سے بچانا ہے لہذا اگر کوئی چیز کلی طور پر خراب ہے تو شریعت نے اسے بالکلیہ حرام قرار دیا ہے جیسا کہ خنزیر اور باقی درندے، اور جو چیز عمومی و مجموعی طور پر پاک ہے مگر اس میں فاسد اور گندہ مادہ ہے تو اس کا فقط وہی گندہ حصہ ممنوع قرار دیا ہے جیسے دم مسفوح لہذا حلال جانور کا وہ خون جو رگوں میں ہوتا ہے اور چلتا رہتا ہے اسے خارج کرنے کا حکم دیا کہ اس میں ایسی باطنی سمیت و جراثیم پائے جاتے ہیں کہ ان سے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں تاہم بعض اشیاء میں خوبیاں و خامیاں دونوں شریک ہوتی ہیں ایسی چیزوں کو ناپسندیدہ اور مکروہ قرار دے دیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی برکات کا مشاہدہ آج کی دنیا میں کوئی مشکل نہیں۔ آج جتنی نئی نئی گندی بیماریاں جنم لیتی ہیں تو ان کا نقطہ آغاز وہ ممالک ہوتے ہیں جہاں اسلامی طریقہ سے کھانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا گوکہ مسلمانوں کی لاپرواہی یا اختلاط کی وجہ سے وہ امراض اسلامی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں مگر شروعات بہر حال غیر اسلامی ممالک سے ہوتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توپوری زندگی مشعلِ راہ اور ہلاکتوں سے بچنے کا محفوظ ترین راستہ ہے جس پر چلنا دین و دنیا دونوں کی حفاظت کی ضمانت ہے، تاہم ابواب الاطعمہ اور ابواب الاشریہ اور ان کے مابعد کے ابواب حیاتِ طیبہ اپنانے کے زرین ابواب ہیں ان کی ایک ایک کیت اور ایک ایک کیفیت تمام دنیا کے طبیبوں اور ڈاکٹروں کے تجربات و ہدایات سے زیادہ قابلِ توجہ اور قابلِ عمل ہے۔

باب ماجاء علی ما کان يأکل النبی ﷺ ؟

عن انس رضی اللہ عنہ قال: ما أكل النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی حیوان ولا سُکرَجَة

ولا خُبْزَ له مرقق الحديث۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینی پر نہیں کھایا اور نہ چھوٹی طشتری میں کھایا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چپاتی پکائی گئی۔ میں (یونس راوی) نے قنادہ سے کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس چیز پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے؟ انہوں نے فرمایا چڑے کے دسترخوان پر۔

لغات:- قولہ ”حیوان“ بکسر الخاء بروزن علاج اور یہی لغت مشہور ہے تاہم خاء کا ضمہ پڑھنا بھی جائز ہے یعنی بروزن غراب، یہ معرب ہے اگرچہ قدیم لغت عربی میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے، یہ عموماً دھات کی بنی ہوئی بلکہ پیتل کی بنی ہوئی میز نما چوکی ہوتی تھی یا یوں کہنا چاہئے کہ چھوٹا سا تخت ہوتا تھا جس پر کھانا رکھنے سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، چونکہ اسکے اصل مادہ میں خیانت کے معنی پائے جاتے ہیں جس کے معنی نقصان اور کم کرنے کے ہیں اسلئے اسکو خوان سے مستمی کیا گیا کہ اس پر کھانے کی جو چیز رکھی جاتی ہے وہ کم اور ناقص ہو جاتی ہے بلکہ کبھی ختم بھی ہو جاتی ہے۔

قولہ ”سُکرَجَة“ بضم السین والکاف والراء المشددة یعنی پے درپے تین ضمتوں اور راء کی تشدید اور جیم کے فتح کے ساتھ، چھوٹی رکابی اور تھالی کو کہتے ہیں جس میں اکثر چٹنی، راستہ اور کھٹی چیزیں رکھی جاتی ہیں، جن سے کھانے کی خواہش بڑھ جاتی ہے، یہ بھی فارسی کا لفظ ہے۔

قولہ ”ولا خُبْزَ له“ صیغہ مجہول ہے۔ قولہ ”له“ ای للنبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

قولہ ”مرقق“ باب تفعیل ترقیق سے اسم مفعول کا صیغہ ہے رقت کے معنی نرم اور نازک کے ہیں چونکہ چپاتی بھی نرم و نازک ہوتی ہے اسلئے اس کو مرقق سے تعبیر کیا۔ قولہ ”فعلی ما“ ای فعلی ای شیء۔ اس نئے پر تو کوئی اشکال نہیں لیکن بعض روایات میں ”فعلام“ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرف جر جب ”ما“ استفہامیہ پر داخل ہو جائے تو کثرت استعمال کی وجہ سے الف گر جاتا ہے گو کہ الف پڑھنا اور باقی رکھنا بھی جائز ہے۔

قولہ ”السُفر“ بضم السین وفتح الفاء ”سفرة“ کی جمع ہے جو دراصل مسافر کیلئے گول دسترخوان میں لپیٹے ہوئے کھانے کو کہتے ہیں مگر پھر اس کا طلاق چڑے کے دسترخوان پر اور پھر مزید توسع سے مطلق دسترخوان

پر ہونے لگا خواہ وہ کپڑے وغیرہ کا کیوں نہ ہو۔

تشریح:- چونکہ اسلام ایک معتدل دین کا نام ہے اسلئے اس کا ہر فعل و عمل افراط و تفریط کے درمیان ہوتا ہے، کھانے کے اصول سے بھی اس کی نمایاں خصوصیت عیاں ہے کہ زمین پر کھانا رکھنے سے ایک طرف ضیاع کا امکان رہتا ہے اور دوسری جانب جانوروں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے جبکہ کسی اونچی چیز پر رکھ کر کھائے سے متکبرین کی مشابہت لازم آتی ہے کیونکہ یہ لوگ راحت و سہولت اور زیادہ کھانے کی غرض سے زمین سے اونچا کرنے کی خاطر میز نمنا تخت پر کھانا رکھ کر کھاتے تاکہ سینہ اور منہ کے قریب ہو۔ اس سے بچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو دونوں برائیوں کے درمیان ہے چونکہ ہر فضیلت دو رذیتوں کے درمیان ہوتی ہے لہذا کہا جائے گا کہ دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا میا نہ و عادلانہ طریقہ ہے۔ اس سے ایک طرف تواضع حاصل کی جاسکتی ہے اور دوسری جانب جانوروں اور متکبرین کی مشابہت سے بچا جاسکتا ہے۔ نیز کھانے اور فائدے کی چیز کی توہین بھی نہیں کرنی چاہئے لہذا کھانا زمین پر بلا دسترخوان رکھ کر نہیں کھانا چاہئے اسی طرح اگر لقمہ یا کوئی ٹکڑا گرے گا تو بجائے مٹی کے دسترخوان پر گرے گا جسے اٹھا کر کھانا عین ممکن ہوگا۔ البتہ اگر کوئی مائع خوراک ہو جیسے آئسکریم یا چائے وغیرہ تو چونکہ وہ برتن اور پیالہ وغیرہ میں ہوا کرتی ہے اسلئے دسترخوان بچھانے کی ضرورت نہیں الا یہ کہ نیچے قالین وغیرہ ہو اور اس پر گرنے کا امکان ہو، بخلاف روٹی وغیرہ کے کہ اسے نیچے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں اگر روٹی کسی پلیٹ وغیرہ میں رکھے اور سالن کسی دوسری پلیٹ میں یاثرید ہو تو پھر بھی اگر احتیاط سے کھائے اور زمین پر گرانے سے بچے تو دسترخوان کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک چھوٹی پلیٹوں اور پیالوں میں کھانے کا تعلق ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان میں نہ کھانے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ عربوں میں عموماً مل کر کھانے کا معمول تھا اور عموماً اس کیلئے بڑے پیالوں اور تھالوں کا استعمال ہوتا تھا، علیٰ ہذا یہ طریقہ پھر سنن زوائد میں شامل ہوگا۔ مگر دوسری وجہ جو سیاق حدیث سے معلوم ہوتی ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تواضع پسند تھی اور متکبرین کے طور و طریقوں سے اجتناب فرماتے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ کھانے کا نہ صرف یہ کہ شوق نہ تھا بلکہ خود بھی کم تناول فرماتے اور قلیل پر اکتفاء کرنے کی تلقین بھی فرماتے تھے، جیسا کہ ان شاء اللہ ابواب الزہد سے معلوم ہو جائیگا۔ چونکہ طشتری کا استعمال یا اس وقت ہوتا ہے جب بہت ساری چیزیں دسترخوان پر موجود ہوں اور تھوڑا تھوڑا کر کے سب کو چکھنا مقصود ہو جیسے آج کل کی دعوتوں میں ہوتا ہے یا پھر سلاخ چٹنی وغیرہ

کے زور سے زیادہ کھانا مراد ہو تو یہ چیز بلاشبہ شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

چنانچہ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

”الاتساع فی الشهوات من المکروہات وقد نعی اللہ علی قوم ذالک فی کتابہ العزیز فقال: اذہبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بہا^۱ وكذلك التبسط فی الهیئات والتبعیر فی الماکل والموائد التجمع بالالوان والفواکہ والتقلیل هو المحمود والتواضع هو المحبوب۔“

غرض کھانے کا مقصد عبادت پر قدرت حاصل کرنا اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا استعمال و شکریہ ہونا چاہئے اس سے مراد بوجھل ہونا اور متلذذ و موٹا ہونا نہ چاہئے ”فان عباد اللہ لیسوا بمتنعمین“^۲ اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چپاتی یا میدے کی نرم روٹی کا انتظام نہیں ہوتا تھا اہتمام تو بڑی چیز ہے بلکہ اکثر جو کے آٹے میں پھونک کر بھوسا اڑا دیا جاتا اور باقی پکایا جاتا ایسے میں مرقق اور نرم روٹی کہاں تیار ہو سکتی تھی بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بھی چھلنیوں سے خالی تھے، وہ واقعی اللہ والے تھے۔

کرسی اور میز پر کھانا:

چونکہ آج کل اکثر مواضع میں کرسی اور میز کا استعمال عام ہو گیا ہے اس لئے میز پر کھانا اگرچہ علت تشبہ کی بناء پر تو ممنوع یا مکروہ نہیں ہے کیونکہ جو مشابہت ناجائز ہے وہ مقید ہے اسکے ساتھ جو غیر قوم کی خصوصیت ہو اور تشبہ کے قصد و ارادہ سے اختیار کیا جائے جیسا کہ درمختار ”باب ما یفسد الصلوۃ وما یکرہ فیہا“ میں ہے:

”فان التشبہ بہم (ای باہل الكتاب) لا یکرہ فی کل شیء بل فی المذموم و فیما یقصد بہ التشبہ کما فی البحر۔“

اس پر علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

”فقد اشار الی ان صورة المتشابهة فیما تتعلق به صلاح العباد لا یضر۔“

(شامی صفحہ ۱۶۲۳ بیچ ایم سعید)

باب ماجاء علی ما کان یا کل النبی ﷺ

۱۔ سورة الاحقاف رقم آیت: ۲۰۔ ۲۔ رواہ احمد فی مسندہ ص: ۳۲۲ ج: ۶ رقم حدیث: ۲۱۶۰۰ ”ایاہی والتنعم، فان عباد اللہ لیسوا بالمتنعمین“ ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۱۰۲ ج: ۳ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

البتہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی حکمت تواضع اور خاکساری کو اپنانا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ زمین ہی پر بیٹھ کر اور مل کر کھایا جائے۔ اگر ہوٹلوں میں ہم اس طرز کو اپنانے سے قاصر ہیں تو اپنے گھروں اور اختیار کی جگہوں میں تو اس پر آسانی خود بھی عمل کر سکتے ہیں اور دوسروں سے بھی کر داسکتے ہیں۔

فائدہ نمبر ۱:- حکمت اور علت میں فرق یہ ہے کہ علت کے ساتھ حکم کا طرد اور عکس ہوتا ہے یعنی اگر علت دور اور ختم ہو جائے تو حکم بھی رفع ہو جاتا ہے اور اگر علت پھر لوٹ آئے تو حکم بھی لوٹ آتا ہے جیسے مسائل عرفیہ وغیرہ کا ضابطہ ہے۔

مگر حکمت چونکہ دائمی چیز ہوتی ہے اس لئے یہاں طرد و عکس والی تفصیل نہیں چلتی، علیٰ ہذا زمین پر بیٹھ کر کھانے کی حکمت تواضع کی بناء پر بہر کیف افضل و مطلوب ہے، اگر اسکے ساتھ میز پر یا کھڑے ہو کر کھانے میں تکبر یا تشبہ کی علت ہو تو پھر زمین پر بیٹھنا لازم ہو جاتا ہے کہ علت و حکمت دونوں جمع ہو گئیں۔

فائدہ نمبر ۲:- جس طرح کھانا اونچا رکھ کر منہ کے قریب کرنا مکروہ ہے اسی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ خود تو اونچی جگہ پر بیٹھ جائے اور کھانا نیچے رکھے مثلاً خود بستر پر بیٹھے اور کھانا زمین پر رکھے کیونکہ دسترخوان اتنا موٹا نہیں ہوتا کہ اسے بستر کے برابر کر دے۔ اسی طرح اگر چار پائی پر کھانا ہو تو کھانا پائنتی کی طرف نہ رکھے بلکہ خود پائنتی کی جانب بیٹھنا چاہئے کھانے کے بعد پہلے دسترخوان اٹھوایا جائے پھر خود اٹھے۔

میرے پاس بعض اوقات مہمان آتے ہیں ہم کھانا کمرے کے درمیان میں دسترخوان پر رکھ لیتے ہیں تاکہ ایک تو اٹھ کر کھانے کے پاس جانا پڑے، دوم یہ کہ کھانا ہم سے نیچے نہ ہو مگر بعض مہمان بچوں سے کہتے ہیں کہ دسترخوان یہاں نشستوں والے بستروں پر لاؤ، اس طرح وہ خود اوپر رہتے ہیں اور کھانا نسبتاً نیچے اور لطف یہ کہ جب میں کھانے کے برابر قالین پر بیٹھتا ہوں تو بعض حضرات اوپر بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہم حیا کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے مگر مہمان کو چاہئے کہ جس طرح اہل خانہ کریں اور بالخصوص جب اس میں مصلحت بھی پیش نظر ہو تو اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔

قولہ ”هذا حديث حسن غريب“ قال ابن العربي في العارضة الحديث صحيح خرجه البخاری۔^۱

باب ماجاء فی اکل الارنب

عن هشام بن زید قال سمعت انساً يقول أنفجنا أرنباً بمر الظهران فسمي أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم خلفها فادركتها فاخذتها... الخ -

حضرت هشام بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم نے مر الظهران نامی جگہ میں ایک خرگوش کو بھڑکایا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے میں نے اسکو قابو کر کے پکڑ لیا پھر اسکو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا، تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسے چقماق کے پتھر سے ذبح کر دیا پھر اسکی ران یا ران کا بالائی حصہ (یعنی کوئہا) مجھے دے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھایا۔ میں (راوی هشام) نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا؟ انھوں نے کہا کہ قبول فرمایا تھا۔

لغات:- ”انفجنا“ جمع متکلم کا صیغہ ہے جس کے معنی خرگوش کو بھڑکا کر نکالنے کے ہیں ”نفج الارنب“ اس وقت کہا جاتا ہے جب خرگوش اکسائے جانے پر بھڑک کر بھاگنے لگے جیسے ”نفجت الریح“ ہوا کے تیزی سے چلنے کو کہا جاتا ہے، غرض ہم نے اسے چھپنے کی جگہ سے نکال باہر کر دیا۔

قولہ ”بمر وہ“ چقماق کے پتھر کو کہا جاتا ہے جب اسے دوسرے پتھر پر مارا جاتا ہے تو اس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں اور جب اسے توڑا جائے تو اس میں تیز دھار بنتی ہے۔ ہم بچپن میں رات کو کبھی کبھی اندھیرے میں اس سے آگ نکال کر کھیلتے تھے اور جب پرندے مارتے اور چاقو نہ ہوتا یا مچھلی شکار کرتے تو اس پتھر سے چاقو کا کام لیتے جو بڑا آسان ہوتا ہے۔

قولہ ”او بورکھا“ بفتح واو جبکہ کسرہ بھی جائز ہے اسی طرح راء بھی مکسور اور ساکن دونوں صحیح ہے، ران کے بالائی حصے اور کوئہ کی ہڈی کو کہتے ہیں، اور اسکی جمع اور اک آتی ہے۔

تشریح:- حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ روافض کے سوا باقی سب کے نزدیک خرگوش حلال ہے۔ باب کی حدیث حلت کی دلیل ہے پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا ”فبعث معی“ اس کی تائید کیلئے ہے کہ یہ محض سنی ہوئی بات نہیں بلکہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے قبول کرتے ہوئے چشم خود دیکھا ہے، پھر تعبیر کی اس تغیر کو تعارض نہ سمجھا جائے کہ پہلے کہا ”فاکله“ اور پھر فرمایا ”قبلہ“ کیونکہ قبول کرنا ملزوم ہے اور

کھانا جائز ہونا لازم ہے، تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصرف اور تعمیر شعبہ نے کیا ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کھانے کی نسبت روایت بالمعنی ہے اور یہ کوئی کذب اور جھوٹ نہیں کیونکہ اگر خرگوش حلال نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسکو ہرگز قبول نہ فرماتے بلکہ اسکو ہاتھ بھی نہ لگاتے، بہر حال اس بارے میں مزید روایات بھی وارد ہوئی ہیں: مثلاً (نسائی ۱) میں ہے کہ ایک اعرابی نے بنا ہوا خرگوش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود تو نہیں کھایا البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کھانے کو کہا) اسکے مقابلے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو کراہیت پر دلالت کرے اور یہ جو ترمذی نے نقل کیا ہے ”انہا تدمی“ کہ اسکو خون آتا ہے تو یہ عدم جواز یا کراہیت کی علت نہیں ہو سکتا بلکہ خون بہنے سے تو ماقبی صاف ہو جاتا ہے ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طبیعت اسکو پسند نہیں کرتی وہ الگ شے ہے یعنی طبعی کراہیت ہے نہ کہ شرعی۔

علامہ عینیؒ اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ اور باقی سب علماء کے نزدیک خرگوش حلال ہے سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، عبدالرحمن بن ابی بلیل اور عکرمہؒ کے، شاید امام ترمذیؒ ”وقد کرہ بعض اهل العلم... الخ“ میں ان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، باقی شاہ صاحبؒ نے جو نسبت روافض کی طرف کی ہے ممکن ہے کہ ان کا قول بھی کراہیت کا ہو۔ واللہ اعلم

ابن العربیؒ ”عارضۃ الاحوذی“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے شکار کے تعاقب میں بھاگنے اور دوڑنے کا جواز معلوم ہوا اگرچہ اس میں گرنے کا خطرہ رہتا ہے مگر طلب رزق میں ایسا کرنا جائز ہے، بظاہر اس خرگوش میں دوسرے لوگ بھی شریک ہونے چاہئے تھے مگر ہو سکتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسے اکیلے ہی پکڑا ہو یعنی کسی کی مدد کے بغیر، حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے ربیب تھے مگر پہلے حضرت طلحہ کے پاس لانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دور ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عظیم شخصیت کی خدمت میں معمولی ہدیہ بھیجنا جائز ہے۔ کذا فی العارضہ

باب ماجاء فی اکل الارنب

۱ سنن نسائی ص ۱۹۷ ج ۲: الارنب ”كتاب الصيد والذباح“

۲ کذا فی فتح الباری ص ۸۲۶ ج ۹ ”كتاب الذبائح والصيد“

باب ماجاء فی اکل الضب

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سُئل عن اکل الضب فقال لا اكله ولا احرّمہ۔

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گوہ کے کھانے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو میں اسے کھاتا ہوں اور نہ حرام قرار دیتا ہوں۔“

لغات :- قولہ ”الضب“ مفتح الضاد وتشدید الباء ایک چالاک جنگلی جانور ہے جو زمین میں ہل بنا کر رہتا ہے، اردو میں اسے ”گوہ“ کہتے ہیں مادہ کیلئے ”ضبة“ آتا ہے، اور اسکی جمع ”ضباب“ و ”اضب“ آتی ہے فارسی میں اسے ”سوسار“ اور پشتو میں اسے ”سمسارہ“ کہتے ہیں۔

تشریح :- گوہ وضع قطع کے لحاظ سے گرگٹ کی مانند ہے البتہ گوہ کافی بڑی ہوتی ہے، ابن خالویہ کہتے ہیں کہ گوہ کی عمر سات سو برس تک ہوتی ہے، خشک علاقوں میں پائی جاتی ہے، مشہور ہے کہ یہ پانی نہیں پیتی اور چالیس دنوں میں ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے، گویا ٹھنڈی ہوا سے اس کی اندرونی خشکی و حرارت دور ہو جاتی ہے، اپنے رہنے کیلئے مختلف سمتوں سے ہل بنا کر ایک سے داخل ہو کر عموماً دوسرے سے نکل جاتی ہے، اور یہ بے ضرر جانور ہے، بعض چور لوگ اسکو چوری کی واردات کیلئے پالتے بھی ہیں کیونکہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ جب ایک دفعہ کسی چیز پر اپنے پنجے چرکا دے تو اسے پھر کوئی انسان جدا نہیں کر سکتا اس لئے یہ لوگ اس کی دُم کے ساتھ رسی باندھ کر دیوار پر چڑھاتے ہیں اور پھر جب وہ دیوار پر چڑھ جاتی ہے تو وہ رسی کھینچ لیتے ہیں اس طرح یہ چپک جاتی ہے اور وہ اسی رسی پر چڑھ کر دیوار سے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

بچپن کا واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ گاؤں کے لڑکوں نے اسے ایک ہل میں پھنسا یا تھا اندر جگہ کم تھی اس لئے اس کی دُم باہر رہ گئی، لڑکوں نے مل کر اسے کھینچا مگر وہ نہ نکال سکے پھر آگ جلادی گئی مگر وہ پھر بھی نہیں نکلی بالآخر اسکی دُم کٹ گئی جو انتہائی مضبوط ہوتی ہے مگر گوہ کسی حال میں نہ نکلی۔

گوہ کھانے کا حکم :- قولہ ”وقد اختلف اهل العلم فی اکل الضب“ الخ مجموعی اعتبار سے اس بارے میں دو قول ہیں (۱) مکروہ (۲) جائز غیر مکروہ۔ پہلا قول حنفیہ کا ہے اور دوسرا ائمہ ثلاثہ و اہل ظواہر کا۔ پھر حضرت شاہ صاحب ”عرف الشذی“ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے حنفی فقہاء نے کراہت تحریمی کو اختیار کیا ہے جبکہ

احناف کے محدثین نے تنزیہی کو۔ چنانچہ حاشیہ پر جہاں ملا علی قاریؒ نے امام محمدؒ کا قول نقل کیا ہے تو وہاں اس کو احتیاط سے مقید کیا ہے "قال محمد قد جاء في اكله اختلاف واما نحن فلانرى ان يوكل^۱ قال القاري اي احتياطاً لتعارض الأدلة" الخ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملا علی قاریؒ گراہت کو تنزیہ پر محمول کرنا چاہتے ہیں۔

جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "كلوا" بصیغہ امر جیسا کہ مسلمؒ کی روایت میں ہے گو کہ خود تناول کرنے سے انکار فرمایا کیونکہ مکہ میں گوہ کھانے کی عادت نہ تھی کہ وہاں یہ نہیں پائی جاتی ہے۔

یا پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یہ حرام ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا ولكن لم يكن بارض قومي فاجدني اعافه" جیسا کہ بخاری شریفؒ میں ہے یعنی یہ حرام تو نہیں مگر مجھے اس سے گھن آتی ہے کہ یہ ہماری قوم کی سر زمین میں نہیں پائی جاتی ہے، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس ارشاد کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے تناول فرمایا۔ حدیث الباب میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا آكله ولا أخرجه" علاوہ ازیں بھی اس مضمون کی صحیح احادیث موجود ہیں۔^۲

ان روایات سے اس کی حلت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر گوہ جائز نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم "كلوا واطعموا" نہ فرماتے اور "لا احرمه" کبھی نہ کہتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیان تحریم و تحلیل پر مامور تھے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر اسے کھایا جاتا۔ اس لئے امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے^۳ اور قاضی عیاضؒ کی نقل پر اعتراض کیا جنہوں نے بعض علماء کی طرف حرمت کی نسبت کی ہے، غرض ان روایات سابقہ کی وجہ سے بقول امام نوویؒ حرام کہنا خلاف منصوص ہے ہاں حنفیہ سے

باب ماجاء في اكل الضب

۱۔ کذا فی المؤطا الامام محمد ص: ۲۸۵ باب اكل الضب "كتاب الصيد والذبائح، ادارة الحرم لاہور۔

۲۔ صحيح مسلم ص: ۱۵۱ باب اباحة الضب "كتاب الصيد والذبائح الخ"۔

۳۔ انظر فتح الباری ص: ۸۲۷ ج: ۹ وقم حدیث: ۵۵۳۷، قدیمی کتب خانہ۔

۴۔ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۳۳ تا ۳۶ ج: ۳ "كتاب الصيد والذبائح" دار الکتب العلمیہ بیروت۔

۵۔ النووی علی مسلم ص: ۱۵۱ ج: ۲ باب اباحة الضب۔

مکراہیت کا قول ثابت ہے۔ ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

(۱) امام ترمذیؒ نے وفی الباب میں ابوسعید اور ثابت بن ودیعہ رضی اللہ عنہما کی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا تو یہ حدیثیں بالترتیب مسلم^۱، مسند احمد، ابن ماجہ اور ابوداؤد و نسائی میں ہیں۔ ان میں گوہ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو اسرائیل کی ایک قوم جانوروں کی شکل میں مسخ ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سے جانور ہیں۔ حافظؒ نے فتح الباری میں فرمایا ”وسندہ صحیح“۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امکان ظاہر کرنا کہ شاید گوہ وہی مسخ شدہ امت ہو، جو اس کی رزالت کی علامت ہے کیونکہ مسخ رذیل چیز کی شکل میں ہوتا ہے جیسے بندر اور خنزیر، باقی یہ کہنا کہ مسخ شدہ قوم باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اس کی نسل پیدا ہوتی ہے تو یہ بات اگرچہ مشہور ہے مگر ابن العربیؒ نے عارضہ میں اسے سختی سے رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں عقل سے تو معلوم نہیں کی جاسکتیں اور نقل صحیح اس بارے میں کوئی نہیں چنانچہ وہ اس بحث کے اصول نمبر پانچ میں لکھتے ہیں:

”الخامسة قولهم ان الممسوح لا تنسل دعوى، وهذا امر لا يعلم بالعقل

وانما طريق معرفته الشرع وليس فى ذالك اثريعول عليه“۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت باطنی اعتبار سے مسخ ہو چکی ہے پھر بھی ان کی نسلیں پیدا ہوتی ہیں تو ظاہری مسوخ کی نسل پیدا ہونے سے کیا چیز مانع ہے؟ پھر اس حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسوخ کی نسل در نسل بقاء میں کوئی واضح مانع نہیں ہے ”ان امة من بنى اسرائيل مسخت ذواب فى الارض وانى لا ادرى اى الدواب هى“ (ابوداؤد و نسائی و مسلم^۲) اس کا سیاق بتلا رہا ہے کہ مسوخ کی بقاء ممکن ہے ورنہ تو اس تغلیل کی پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ مسلم^۳ کی روایت اس مقصد پر زیادہ ناطق ہے ”قال اُتِى رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بضب فآبى ان يأكل منه وقال: لا ادرى لعله من القرون التى مسخت“۔

۱۔ صحیح مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ باب اباحة الضب، مسند احمد ص: ۴۷۶ ج: ۳ رقم حدیث ۱۱۲۰ سنن ابن ماجہ

ص: ۲۴۳ باب الضب ”ابواب الصيد“ عن ثابت بن ودیعہ، سنن نسائی ص: ۱۹۸ ج: ۲ ”الضب“ ”كتاب الصيد“، سنن

ابی داؤد ص: ۱۷۶ ج: ۲ باب فی اكل الضب ”كتاب الاطعمة“، بحوالہ بالا۔

۲۔ صحیح مسلم ص: ۱۵۱ ج: ۲ ”كتاب الصيد والذبائح“

(۲) مسند احمد^۹، ابوداؤد^{۱۰} اور طحاوی وغیرہ میں عبد الرحمن بن حسنہ کی روایت ہے۔

”وفیه.. انهم طبخوا منها (ای من الضباب) فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان

امة من بنی اسرائیل مسخت دواب الارض فاحشی ان تكون هذه فاکفوها“۔

حافظ ابن حجر^{۱۱} فتح الباری میں لکھتے ہیں ”وسنده علی شرط الشيخین الا الضحاک فلم

یخرجہ“۔^{۱۲}

طریق استدلال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہانڈیاں التوادینا اس کو ناپسند کرنے کی بنا پر ہی ممکن

ہے۔

مجوزین ان روایات میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو نہ کھائی مگر اس سے منع بھی نہیں فرمایا ہے جس سے حلت معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی کیونکہ اس کے بارے میں امت مسوخہ کا خدشہ ظاہر کرنا عام علت ہے، اس لئے حنفیہ کہتے ہیں کہ عدم تحریم سے متعلق جتنی بھی روایات ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توقف پر محمول ہیں یعنی اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف مسکوت عنہا اشیاء بذات خود مباح بھی ہو سکتی ہیں بلکہ بہت سے علماء کے نزدیک تو اشیاء میں اصل اباحت ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا۔ پھر جب بنی اسرائیل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخ کا پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہانڈیاں التوادیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ جب حلت و حرمت میں شک ہو جائے تو ترجیح حرمت کو ہوتی ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے۔

نیز گوہ ایک کر یہ المنظر جانور بھی ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر تھوکا، عارضۃ الاحوزی میں ہے ”روی مسلم و ابوداؤد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما قَدِمَ الیہ الضب نبز“۔^{۱۳} اور جہاں تک صاحب تحفۃ الاحوزی کا یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی

۹ مسند احمد ص: ۲۱۹ ج: ۵ حدیث: ۱۷۳۰۳، ایضاً أخرجه ابویعلی فی مسنده برقم: ۹۳۱، مجمع الزوائد

ص: ۳۳ ج: ۲، ۱۷۶ ج: ۲ باب فی اکل الضب ”كتاب الاطعمة، عن ثابت بن دیمہ وفیہ قال ان امة من

بنی اسرائیل مسخت دواب فی الارض وانی لا ادری ای الدواب هی الخ۔ فتح الباری ص: ۸۳۰ ج: ۹ ”كتاب الدبائح

والصيد“۔ ۱۲ لم اجدہ بلفظہ فی مسلم واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ الحنفی عفی عنہ، سنن ابی داؤد ص: ۱۶۸ ج: ۲ باب

ما یقول اذا شرب اللبن۔ کتاب الاشربة۔

احادیث تحلیل کی روایات پر مقدم ہیں کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھا کہ مسوخ کی نسل نہیں رہتی اور جب معلوم ہوا تو نبی کی علت ختم ہو گئی اور ابن حجر کی بات بھی کچھ اس طرح ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ مسوخ کی نسل باقی نہیں رہتی؟ اور ابن العربی کی بات نقل کی گئی ہے کہ اس دعوے پر کوئی قابل اعتماد اثر نہیں لہذا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور منع کی احادیث کو مقدم کہنا محض دعویٰ ہے۔ اور امام نووی کا دعوائے اجماع علی الحکمت بھی صحیح نہیں کہ خود حافظ نے اسے رد کیا ہے کہ ابن المذہب نے حضرت علیؓ سے اس کے خلاف قول نقل کیا ہے تو حضرت علیؓ کی مخالفت کے ہوتے ہوئے اجماع کیسے ممکن ہے؟ (کذا فی حاشیۃ الکوکب ۱۳) علاوہ ازیں ترمذی کی نقل نووی کی نقل پر بہر حال مقدم ہے۔

باب ماجاء فی أکل الضبع

”عن ابی عمار قال قلت لجابر: الضبع أصیبتھی؟ قال نعم قلت أکلها؟ قال نعم قلت أفأله رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال نعم۔“

حضرت ابن ابی عمار فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ آیا تجھ شکار ہے انہوں نے فرمایا: ہاں میں نے کہا اسے کھا سکتا ہوں فرمایا ہاں میں نے عرض کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔

لغات:- ”ضبع“ بفتح ضاد اور ضمہ باء اسے فارسی میں کفتار اور ہندی وارو میں میں ہنڈا یا بٹو کہتے ہیں۔ ایک معروف درندہ ہے جو انسانی گوشت کو بہت پسند کرتا ہے اس لئے یہ مردہ اور سوئے ہوئے انسانوں کو شکار کرتا رہتا ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ سوئے ہوئے شخص پر اس کا حملہ بڑا عجیب ہوتا ہے یہ اس کے سر کی جانب آتا ہے پہلے سر کے نیچے جگہ کھودتا ہے جب اس کا سر نیچے ہو جاتا ہے اور گلہ اچھی طرح کھل جاتا ہے تو یک دم سے اپنی داڑھوں سے آٹا ٹاٹا گلہ کاٹتا ہے۔

”وہی تفترس الآدمی ولكن خدیعة (دھوکے سے پھاڑتا ہے) ... الی... اذا نام

وصفة افتراسها انها تأتيه من قبل رأسه فتحتفر الارض حتى يعمل رأسه

ویرز حلقه فتحهم بانیا بها علیہ وتفریہ فی لحظۃ۔

قولہ ”أصیدھی“ ہمزہ استفہامیہ مصدر پر داخل ہے جوئی للمفعول ہے۔ قولہ ”أکلھا“ ہمزہ کے مد کے ساتھ کیونکہ استفہامیہ ہمزہ قطعیہ پر داخل ہے۔ قولہ ”أقالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“؟ اقالہ کی ضمیر میں ایک احتمال یہ ہے کہ ”الضبع أصیدھی“ کی طرف راجع ہو مگر یہ خلاف ظاہر ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مذکورہ قول کی طرف عائد ہو اس صورت میں یہ مطلب حنفیہ کے خلاف بنتا ہے جس کا جواب آ رہا ہے۔

تشریح:- یہ حدیث ابواب الحج ”باب ماجاء فی الضبع یصیبھا المحرم“ میں بھی گزری ہے اس کی بعض شرح (تشریحات جلد سوم ص ۵۰۴، ۵۰۵) پر دیکھی جاسکتی ہے۔ بچو کے حلال اور حرام ہونے کی حیثیت بھی ائمہ کے درمیان متنازع رہی ہے۔ شوافع وحنابلہ اور اہل نطاہر کے نزدیک بجو حلال ہے جبکہ حنفیہ و مالکیہ اور سعید بن المسیب کے ہاں حلال نہیں پھر حنفیہ کے نزدیک تو حرام ہے جبکہ امام مالک کے نزدیک مکروہ (تحریکی) ہے۔

مجوزین کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔ نیز امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بچو کا گوشت ہمیشہ صفا اور مروہ کے درمیان بکتا رہا ہے مگر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا ہے جو اس کے حلال ہونے کی دلیل ہے۔ مانعین کا استدلال ترمذی میں باب کی دوسری حدیث سے ظاہر تو ہے مگر اس پر فریق اول کی طرف یہ اعتراض ہے کہ اس میں دوراوی متکلم فیہما ہیں جیسا کہ ترمذی نے فرمایا ”وقد تکلم بعض اهل الحديث فی اسمعبل وعبدالکریم“ الخ گو کہ اس کا جواب ہو سکتا ہے مگر اس سے زیادہ قوی دلیل قرآن کی آیت اور مسلم شریف کی مشہور حدیث ہے (۱) قال اللہ تعالیٰ ”وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ“۔^۱ اور بجو کے خبیث ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جو مردوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔ (۲) ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع وعن کل ذی مخلب من الطیر“۔^۲

ابن القیمؒ اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ اس بارے میں کہ داڑھ والے جانور حرام ہیں احادیث حدوٰ اتر تک پہنچتی ہیں ”وقد تواترت الآثار عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنہی عن أکل کل ذی

باب ماجاء فی أکل الضبع

۱۔ سورة الاعراف آیت: ۱۵۷۔ ۲۔ صحیح مسلم ص: ۱۴۷ ج: ۲۰ باب تحریم أکل کل ذی ناب من السباع الخ ”کتاب الصيد والذباح“ ایضاً راجع للتفصیل اعلاء السنن ص: ۱۶۳ تا ۱۶۹ ج: ۱۷۰ باب ماجاء فی الضبع.

ناب من السباع وصحت صحة لامطعن فيها“ الخ باقی قاضی شوکاٹی کا اسے ذی ناب سے خارج کرنا صحیح نہیں کہ اس کے ذی ناب ہونے میں کسی نے شک نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابن قیمؒ کا اسے سباع سے باہر کرنا بھی بے معنی کوشش ہے کہ درندگی اس کی مشہور صفت ہے لہذا ابن قیمؒ کا یہ استدلال الٹا ہوا کہ حرمت کا دار و مدار دو وصفوں پر مبنی ہے ایک یہ کہ وہ ذی ناب ہو اور دوم یہ کہ وہ ایسے سباع میں سے ہو جو از خود حملہ آور ہو جبکہ بچوں میں صرف ذی ناب ہونے کا وصف پایا جاتا ہے۔

”فانه انما حرم ما شتمل على الوصفين ان يكون له ناب وان يكون من السباع

العادية بطبعها كالاسد... واما الضبع فانما فيها احد الوصفين وهو كونها ذات

ناب وليست من السباع العادية“ الخ۔ (تحفة عن الاعلام)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کو کسی بھی حالت میں خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ معاف نہ کرنے والا جانور درندہ اور سبع نہیں تو پھر تو کوئی چیز بھی سباع میں سے نہیں اس لئے ابن العربیؒ ایسے لوگوں کی بات پر سخت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان پر تعجب ہے جو گیدڑ اور لومڑی کو تو حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ مرغی پھاڑ کر کھانے والے درندے ہیں جبکہ بچو کو حلال قرار دیتے ہیں دریں حالیکہ وہ سوئے ہوئے انسان کو پھاڑ کر کھاتا ہے ”وعجب لمن يحرم الثعلب وهو يفترس الدجاج ويبيع الضبع وهي تفترس الآدمي اذ انما“۔ (عارضة الاحوذی)

لہذا ہم کہتے ہیں کہ اولاً تو باب کی حدیث بچو کی حلت پر صریح نہیں کیونکہ اس میں ”اقالہ“ کی ضمیر ”اصیدھی“ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور اس سے تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ثانیاً اگر اسے مقول کی طرف راجع مانیں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ یہ حضرت جابرؓ کا اپنا گمان ہے کہ انہوں نے اس کے شکار ہونے سے حلال ہونا مستحب کیا علیٰ ہذا یہ قرآن کی اس مذکورہ آیت اور مندرجہ بالا مشہور بلکہ متواتر حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ یہ حدیث ابوداؤدؒ میں بھی آئی ہے مگر اس میں کھانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ فقط یہ الفاظ ہیں ”فقال هو صيد ويجعل فيه كبش اذا صاده المحرم“ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے صید محرم کے لئے جزاء کے حکم کے طور پر قرار دیا گیا ویسے تو عام سباع بھی اصیاد ہوتے ہیں۔

واذا ركب فصیدی الابطال

صيد الملوك ارناب و تعالب

حالانکہ بھڑے اور لومڑی کے حلال ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں اس لئے ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں ”والجزاء فیہ عندنا غلب والتحریم فیہ اغلب“۔ بہر حال یہ ایک واحد حدیث ہے جو صریح بھی نہیں لہذا یہ درندوں اور خبائث کی حرمت کے بارے میں نصوص قطعہ کے لئے ناخ یا مخصص نہیں بن سکتی خاص طور پر جب مقابلہ بھی محرم سے ہو۔ واللہ اعلم

ملفوظ ”تاب“ کو اردو میں کچلی کہتے ہیں جس کے معنی نوک داردانت کے ہیں جو سامنے کے چار دانتوں کے برابر والے آمنے سامنے دو دانت ہوتے ہیں درندوں کے یہ دونوں دانت نوکیلی اور نمایاں ہوتے ہیں جن سے دوسرے جانداروں کو پھاڑتے اور کاٹتے ہیں اسے کٹنا دانت بھی کہتے ہیں۔ جبکہ خلب نوک دار اور نوکیلی چنگل، ناخن اور پنچے کو کہتے ہیں۔ جو پرندے دوسرے پرندوں کو شکار کرتے ہیں ان کے پنچے نیک دار اور بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ انہی سے چیزوں کو پکڑ کر کھاتے ہیں۔ چونکہ درندگی ایک معیوب وصف ہے اس لئے ایسے جانور انسانوں پر حرام کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کے اخلاق انسان پر اثر انداز نہ ہوں۔

قولہ ”وعبدالکریم بن مالک الحزری ثقہ“ چونکہ اس نام کے دو راوی تھے جب امام ترمذیؒ نے ایک کی تضعیف نقل فرمائی تو دفع اشتباه کے لئے دوسرے کی توثیق کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ساتھ دونوں کی نسبت بھی بتلا دی۔

باب ماجاء فی اکل لحوم الخیل

”عن جابر قال أطلعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم لحوم الخيل ونهانا عن لحوم

الحُمُر“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور گدھوں کے گوشت کھانے سے ہم کو منع فرمایا۔

تشریح:- گھوڑے کا گوشت حل وعدم حل کے حوالے سے متنازع ہے تاہم یہ اختلاف سابقہ دونوں بابوں کے اختلاف کی نسبت کم ہے، جمہور علماء یعنی شافعیہ، حنابلہ، صاحبین اور بعض صحابہ کرامؓ و تابعینؓ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت بلا کراہت جائز ہے۔ جبکہ ابن عباسؓ، حکم، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ

ہے۔ (کذا نقلہ النووی فی شرح مسلم^۱) پھر بعض مالکیہ اور بعض حنفیہ کے نزدیک کراہت تزیہی ہے جبکہ بعض حنفیہ اور محققین کے نزدیک تحریمی ہے۔ علامہ عینی نے امام صاحب کی طرف تحریم و تزیہ دونوں کی نسبت کی ہے جبکہ حضرت شاہ صاحب نے عرف الشذی میں تزیہی کو مختار کہا ہے بلکہ در مختار نے امام صاحب سے مرض وفات میں رجوع نقل کیا ہے۔ (کذا فی العرف) مجوزین کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔ اسی طرح حضرت اسماء کی حدیث جس کی طرف ”وفی الباب“ میں اشارہ ہے۔ اور صحیحین^۲ میں مروی ہے بھی ان کی قوی دلیل ہے ”قالت ذبحنا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرساً ونحن بالمدينة فأكلناه“۔
 مانعین کی دلیل سورہ نحل^۳ کی آیات ہیں۔

”والانعام خلقها لكم فيها دِفءٌ و منافع ومنهاتا كلون ۝ ولکم فیہا جمال حین
 تریحون و حین تسرحون ۝ وتحمل أثقالکم الیٰ بلدٍ لِّم تَکونوا بِلغیہِ إِلَّا بِشِقِّ
 الانفس ان ربکم لرؤفٌ رحیم ۝ والخیل والبغال والحمیر لئن کبہوا وزینہ
 ویخلق ما لاتعلمون ۝ (آیات: ۸۳۵)

طریق استدلال اس طرح ہے کہ پہلے چوپایوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے تین انعامات کا ذکر فرمایا (۱) لباس (۲) کھانے کا اور (۳) مال برداری کا انعام پھر گھوڑوں، خجروں اور گدھوں کے حوالے سے دو انعامات کا ذکر فرمادیئے ایک سواری اور بھر دوم زینت کا۔ اگر ان کا کھانا جائز ہوتا تو اسے ضرور ذکر کیا جاتا کیونکہ قرآن اللہ حکیم کا کلام ہے اور غذا ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بڑے انعام کو چھوڑ دیا جائے اور نہ بڑے کم درجے کے انعامات کا تذکرہ کر دیا جائے، خاص کر جبکہ مقام امتنان کا ہے، اگر گدھے، خچر اور گھوڑے کے حکم میں فرق ہوتا تو گھوڑے کو الگ ذکر کر دیا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ گھوڑے کا گوشت کھانے کے راوی ہیں جیسا کہ دارقطنی کی روایت میں ہے لیکن خود ان کا مذہب کراہت کا ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے نقل کیا ہے۔ اس لئے

باب ماجاء فی اکل لحوم الخیل

۱۔ النووی علی مسلم ص: ۱۵۰ ج: ۲ باب اباحۃ اکل لحم الخیل ”کتاب الصيد والذباح“۔

۲۔ صحیح بخاری ص: ۸۲۹ ج: ۲ باب لحوم الخیل ”کتاب الصيد والذباح“ ایضاً فتح الباری ص: ۷۹۸ ج: ۹ باب

النحر والدبح ”کتاب الذبائح والصيد، صحیح مسلم ص: ۱۵۰ ج: ۲ باب اباحۃ لحم الخیل۔

۳۔ سورۃ النحل آیت: ۵ تا ۸ پارہ: ۱۳۔

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس نکتہ کو سوائے امام مالکؒ کے کوئی نہ سمجھ سکا ”لعظیم فہمہ وسعة علمہ“۔
 المسترشد عرض کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان سے قبل رئیس المفسرین حضرت ابن عباسؓ بھی اس باریکی کو سمجھ چکے تھے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ حلت کے بارے میں تمام احادیث کو حالت ضرورت پر حمل کیا جائے گا کیونکہ گھوڑے کھانے کا عام معمول نہ تھا، اس طرح احادیث کا مطلب اور قرآن کا نظم ٹکرانے سے بچ جائیں گے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ آیت میں دونوں اقسام کو ایک بنانا فصاحت سے معارضہ اور نعمت پر اعتراض ہے۔ علاوہ ازیں گھوڑا ایک جہادی جانور ہے اس لئے اس کے گوشت کی اباحت سے آلہ جہاد کی تقلیل بلکہ انقطاع کا خطرہ ہے۔ گھوڑے کی وفاداری کا عالم یہ ہے کہ وہ مالک کے اشارے پر ہر خطرہ کی جگہ میں گھس جاتا ہے بلکہ کبھی تو اپنے مالک کو بچانے کے لئے جان پر کھیل کر وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ آج کل جہاد اگرچہ گھوڑوں کے ذریعہ نہیں ہوتا اور مذکورہ علت مفقود ہے تاہم چونکہ بنیادی وجہ سورہ نحل کی آیات کا نظم ہے اس لئے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا لہذا کراہت بدستور باقی رہے گی۔ واللہ اعلم

علاوہ ازیں خچر کی حرمت پر اجماع ہے جبکہ جانور اپنی ماں کے تابع ہوتے ہیں پس اگر گھوڑی حلال ہوتی تو خچر بھی حلال ہوتا۔ نیز ابوداؤدؒ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی روایت ہے۔

”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن اکل لحوم الخیل والبغال والحمیر (الحديث) وایضاً أخرجه النسائی وابن ماجہ^۵ والطحاوی۔

اس روایت میں اگرچہ صالح بن یحییٰ پر امام بخاریؒ نے اعتراض کیا ہے ”فیہ نظر“ کہہ کر مگر ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے جو کم از کم تائید کے درجہ میں قابل استدلال ہے، تاہم ابوداؤد کے بعض نسخوں میں امام ابوداؤد نے اس کو منسوخ ضرور کہا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ ممانعت منسوخ نہیں بلکہ اباحت کا منسوخ ہونا رائج ہے جیسا کہ گدھوں کے گوشت کا حکم ہے یا پھر ابن العربیؒ کے قول کے مطابق اباحت کی روایات ضرورت پر محمول ہیں اس کی تائید امام زہریؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے کافی البذل:

”انه قال ما علمنا الخیل اكلت الافی حصار (قلعه)۔ وعن الحسن انه قال كان

۴ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۵ ج: ۲ باب فی اکل لحوم الخیل ”كتاب الاطعمة“.

۵ سنن نسائی ص: ۱۹۸ ج: ۲ تحریم اکل لحوم الخیل ”كتاب الصيد والذباح“ سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۰ باب لحوم البغال قبیل ابواب الصيد.

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کلون الخیل فی مغازیہم۔^۱

(بذل ص ۳۵۵ ج ۵)

عارضۃ الاحوذی میں ہے۔

”وفی الصحیح انہم ما دخلوا خیر الاوہم جیاع^۲ فلاحجۃ بتلك الحالة علی الاطلاق وحديث اسماء قضية فی عين فتحتمل الضرورة والذي يتحققه ان ذلك كان نادراً ولم یکن معتاداً وبهذا التقدير یصح نظم القرآن وتستمر الاحادیث علی سبیل البیان۔

باب ماجاء فی لحوم الحمر الأهلية

”عن علی قال نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن متعة النساء زمّن خیر وعن لحوم الحمر الاہلیة“۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے (نکاح) متعہ سے خیر کے زمانہ میں منع فرمایا اور پالتو گدھوں کے گوشت سے بھی۔

لغات:- ”متعة النساء“ سے مراد نکاح متعہ ہے جس کی تفصیل ابواب النکاح میں گذری ہے۔
قولہ ”الحمر الاہلیة“ حمر بضم حاء کی جمع ہے جیسے کتب اور کتاب۔ قولہ ”الاہلیة“ آہل بالمد مانوس، پالتو اور گھریلو جانور کو کہتے ہیں یہی معنی حمار انسی کے بھی ہیں جو کہ اگلی روایت کے اخیر میں ہے اس قید سے وحشی سے احتراز کرنا مقصود ہے کیونکہ جنگلی گدھا حلال ہے۔

تشریح:- امام نووی^۱ شرح مسلم^۲ میں لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ کے علاوہ باقی سب علماء پالتو گدھے کی تحریم پر متفق ہیں۔ البتہ مالکیہ سے اس بارے میں تین روایات ہیں جن میں تیسری روایت کراہت کی ہے۔ تاہم

۱ رواہ ابن ابی شیبہ فی مسنده ص: ۵۳۹ ج: ۵ ”کتاب الاطعمہ“ دار الفکر بیروت۔

۲ کذا فی مصنف ابن ابی شیبہ عن البراء قال اصاب الناس یوم خیر جوع شدید الخ ص: ۵۳۱ ج: ۵ فی الحمر الاہلیة ”کتاب الاطعمہ“ ایضاً سنن کبری للبیہقی ص: ۳۱۹ ج: ۱۲ کتاب الضحایا حفیظ الرحمن الحنفی، ندوة العلم

باب ماجاء فی لحوم الحمر الاہلیة

۱ النووی علی مسلم ص: ۱۳۹ ج: ۲ باب تحریم اکل لحم الحمر الانسیة ”کتاب الصد والذبايح“

ابن العربیؒ نے عارضہ میں میں صرف دو قول نقل کئے ہیں ایک حلال ہونے کا۔ اور دوسرا حرام ہونے کا۔ اور ترجیح حرمت کو دی ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے ”ان اللہ ورسولہ ینہاکم عن لحوم الحمر الاہلیۃ فانہا رجس“^۱۔

جو حضرات جواز کے قائل ہیں دراصل ان کو خیبر والے دن اس نہی کی علت میں تردد ہے کیونکہ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ یہ نجس ہونے کی بناء پر ہو جیسا اوپر بخاری شریف کی روایت میں اس کی تصریح ذکر ہوئی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علت مال برداری کی ضرورت ہو۔ یا صحابہ کرامؓ نے نجس نکالنے سے پہلے ہی ان کو ذبح کیا ہو۔ یا وہ گدھے گندگی کھانے والے (جلالہ) ہوں۔ علاوہ ازیں اس آیت میں ”قُلْ لَا أَجْنُبُ مِمَّا حَسِيَ السَّيِّئُ مَحْرَمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مِثْنًا أَوْ دُمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمِ خَنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رَجَسٌ“^۲ آیت تین محرمات کے علاوہ کوئی چیز مذکور نہیں۔

مابین کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا بخاری شریف کی روایت میں اس پر رجس کا اطلاق کیا گیا ہے لہذا یہی علت متعین ہے اور چونکہ یہ ایسی علت ہے جو دائم اور باقی ہے لہذا یہ صرف خیبر کے گدھوں کی تخصیص کی بناء پر نہیں کہا گیا۔ اسی طرح حنفیہ نے گھوڑوں کی تحریم پر قرآن کی جس آیت سے جس انداز سے استدلال کیا ہے بعینہ وہی استدلال یہاں بھی کیا جائے گا۔

جہاں تک مجوزین کے تردد کا تعلق ہے تو بخاری شریف کی سابقہ روایت کے بعد اس تردد کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اور جو آیت انہوں نے پیش کی ہے تو اس کا مطلب اگرچہ بظاہر حصر ہے لیکن اس کا پس منظر ملحوظ رکھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان کی غرض کے مناقضہ کے طور پر نازل ہوئی ہے اس سے حصر مقصود نہیں۔ چونکہ کفار ان چیزوں کو حرام کہتے جن کو اللہ نے حلال کیا تھا جیسے حام، بحیرہ اور سائبہ وغیرہ اور یہ کام ضد و عناد کی وجہ سے کرتے تو اللہ نے مذکورہ آیت بطور مضادہ کے نازل فرمائی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی آپ سے کہدے ”لَا تَأْكُلُ الْيَوْمَ حَلَاوَةَ“ آج تم میٹھا مت کھاؤ تو آپ جواب میں کہتے ہیں ”لَا تَأْكُلُ الْيَوْمَ الْإِحْلَاوَةَ“ تو یہاں مطلب حصر نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں آج ضرور میٹھا کھاؤں گا۔ (کذا حققه السيوطي في الاتقان نقلًا عن الامام الشافعي ص: ۳۸، ۳۹)

۱۔ رواہ البخاری ص: ۸۳۰ ج: ۲ فی کتاب الذبائح والصيد باب لحوم الحمر الأنسیۃ فتح الباری ص: ۸۱۵ ج: ۹۔

۲۔ سورة الانعام آیت: ۱۴۶۔

دوسری روایت:- ”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حَرَّمَ یومَ خَیبر کل

ذی ناب من السباع والمجمعة والحمار الانسی“۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ہر کچلی والے درندے اور نشانہ کے لئے روکے گئے جانور اور پالتو گدھوں کو حرام قرار دیا ہے۔

لغات:- ”المجمعة“ بصیغۃ اسم مفعول یعنی بضم المیم وفتح الجیم وتشدید الشاء المفتوحة۔ لغوی اعتبار سے بجم کے معنی ہیں کسی جانور یا انسان کا زمین سے سینہ لگا کر چمٹنا۔ لیکن یہاں جمعہ سے مراد وہ جانور ہے جس کو نشانہ بازی کی مشق کے لئے باندھ لیا جائے جو عموماً پرندوں اور خرگوش کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسا جانور جس کو باندھ کر نشانہ بنایا جائے اور بغیر ذبح اختیاری کے مر جائے وہ حرام ہے لیکن اگر اسے مرنے سے پہلے ذبح بھی کر لیا جائے تو اس کا گوشت حلال ہے تاہم مکروہ ہے کیونکہ یہ ذبح کامل نہیں۔ یا پھر یہ سن کر وہ ہے کہ ایسا کرنا ظلم بھی ہے اور جانور کے ضیاع کا اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ بغیر ذبح کے مر جائے۔

قولہ ”وانما ذکر واحرفاً واحداً“ یعنی محمد بن عمرو سے روایت کرنے والے باقی شاگرد اس حدیث کا صرف یہ حصہ روایت کرتے ہیں ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع“۔ دس باقی حصہ یعنی جمعہ اور حمار انسی کا ذکر نہیں کرتے ہیں گویا یہ زائدہ کا تفرد ہے مگر زائدہ چونکہ ثقہ ہے اس لئے حدیث صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الأکل فی انیۃ الکفار

”عن ابی ثعلبۃ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قدور المحسوس قال

انقوها غسلًا واطبخوا فیہا ونہی عن کل سبع ذی ناب“۔

حضرت ابو ثعلبہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجوس کی دیگوں کے بارے میں پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو دھو کر صاف کرو اور ان میں پکاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دھاڑ والے درندے (کھانے) سے روکا۔

لغات:- قولہ ”قدور“ قدر کی جمع ہے قدر بکسرۃ قاف ہائٹی، دیگی، دیگی اور پکانے کے برتن کو کہتے ہیں۔ قولہ ”المحسوس“ چاند سورج اور آگ کی عبادت کرنے والے یعنی روشنی کے تجاری۔ آتش پرستی ایران

کا قدیم مذہب ہے ان کا بڑا مذہبی پیشوا زردشت تھا۔ قولہ ”انقوہا“ انقواء سے امر کا صیغہ ہے یعنی انہیں دھو کر صاف کر لیا کریں اور (بعد ازاں) ان میں کھانا پکا لیا کریں۔

تشریح:- جمہور فقہاء کے نزدیک اگر کفار کے برتن دھولے جائیں تو ان میں کھانا پکانا اور کھانا، اسی طرح غسل اور وضوء کرنا سب جائز ہیں گو کہ طبعی ناپسندیدگی بدستور باقی رہے گی۔ جہاں تک دھوئے بغیر استعمال کا تعلق ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ لوگ خمر اور خنزیر یا میتہ وغیرہ حرام اور نجس اشیاء کا استعمال کرتے ہوں تو پھر ان کا استعمال بغیر دھوئے جائز نہیں، چونکہ ان اشیاء کا استعمال ضروری نہیں اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ کس جگہ کے کفار صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے ہیں اور کس جگہ کے نہیں رکھتے، پس جہاں ان کی عادت اشیاء محرمہ کے استعمال کی ہوگی وہاں ان کے برتنوں سے اجتناب لازمی ہوگا لہذا جہاں وہ ان اشیاء کا استعمال نہ کرتے ہوں وہاں بلا غسل ان کے برتن مستعمل کئے جاسکتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کی ملکیت یا استعمال بذات خود مانع من الطہارتہ یا مزیل طہارتہ نہیں بلکہ گندی اشیاء کا استعمال ہی محرم ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے کپڑے پاک ہیں۔ ہاں ان کے مستعمل کپڑے دھونے چاہئے کہ وہ استنجاء کا خیال نہیں کرتے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ خود دھوئے تو وہ بھی قابل استعمال ہیں، جیسے ان کے ہونٹوں کے پرتن اور گھروں کے دھوئے ہوئے اوانی کیونکہ من حیث الانسان ہر آدمی صاف پانی سے برتن وغیرہ دھوتا ہے لہذا ہمیں دوبارہ دھونے کی ضرورت نہیں۔

دوسری حدیث:- حضرت ابو ثعلبہ خنیسؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا اللہ کے رسول! ہم اہل کتاب کے علاقہ میں رہتے ہیں تو کیا ہم ان کی ہانڈیوں میں کھانا پکا سکتے ہیں اور ان کے برتنوں میں پانی پی سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ان برتنوں کے علاوہ کوئی اور برتن نہ ملے تو ان کو پانی سے دھولو پھر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم شکار کی زمین میں رہتے ہیں اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنا سدھا ہوا (شکاری) کتا چھوڑ دو اور اللہ کا نام لو، اور وہ کسی جانور کو مار ڈالے تو اسے کھا لو اور اگر وہ کتا سدھا ہوا (شکاری) نہ ہو تو ذبح کی صورت میں کھا لو اور جب اپنا تیر پھینکو اور اللہ کا نام لو اور اس سے کوئی جانور مر جائے تو اسے بھی کھاؤ!۔

لغات:- قولہ ”فار حضوہا“ حاشیہ قوت پر ہے فتح الحاء ای اغسلوہا۔ قولہ ”المکلب“ ای المسلط علی الصيد یعنی معلّم اور شکاری کتا۔ باقی تفصیل ابواب الصيد کے شروع میں گزری ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

”عن میمونۃ ان فارة وقعت فی سمن فماتت فسنل عنها النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال القوها و ما حولها فکلوه۔“

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک چوہیا گھی میں گر گئی اور مر گئی پس اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے پھینکو اور اس کے ارد گرد کو (ماقی کو) پھر کھاؤ۔

لغات:- قولہ ”فارة“ الف اور ہمزہ دونوں کے ساتھ پڑھنا صحیح ہے چوہیا کو کہتے ہیں مذکر کے لئے فأربغیر تاء کے مستعمل ہوتا ہے۔ قولہ ”فی سمن“ گھی یہ لفظ بفتح سین اور سکون میم پڑھا جائے گا۔ جبکہ بکسرہ سین وفتح میم موٹا پے کو کہا جاتا ہے۔ قولہ ”و ما حولها“ ہا کی ضمیر فارہ کی طرف عائد ہے جبکہ ما حول سے مراد چوہیا کی ارد گرد والی جگہ ہے یعنی اس کا بدن جس جس حصہ سے مس ہو چکا ہو اور احتیاطاً تھوڑا زیادہ بھی پھینکا جائے۔

تشریح:- اگر گھی وغیرہ مانع قابل انجماد اشیاء میں چوہا وغیرہ گر کر مر جائے تو جمہور کے نزدیک اگر وہ منجمد نہ ہو تو نجس ہو جاتا ہے تاہم اگر وہ منجمد ہو تو صرف وہ حصہ ناپاک تصور کیا جائے گا جو چوہے کے بدن سے متاثر ہوا ہے لہذا متاثرہ حصہ پھینکنے کے بعد باقی پاک ہوگا۔ جبکہ بعض اہل ظواہر، امام اوزاعیؒ اور امام زہریؒ کے نزدیک گھی خواہ جامد ہو یا بہنے والا دونوں صورتوں میں اس کے آس پاس والے حصہ کو پھینک دیا جائے تو باقی پاک رہتا ہے۔ امام بخاریؒ بھی اس کے قائل ہیں۔ مالکیہ کے نزدیک اگرچہ پانی کی نجاست کا دار و مدار تغیر احوال و اوصاف پر ہے لیکن مانع اشیاء پانی سے مختلف ہیں اس لئے ابن حبیب مالکیؒ اس کو نجس اور امام مالکؒ مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے۔ جو حضرات گھی کے مانع اور منجمد حالتوں میں فرق نہیں کرتے وہ حدیث باب کے اطلاق سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں جامد کی قید نہیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ اول تو بعض روایات میں یہ فرق کیا گیا ہے جیسا کہ ابوداؤدؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے ’اذا وقعت الفارة فی السمن فان کان جامداً فالقوها و ما حولها وان کان مائعاً فلا تقربوه۔‘ ابن حبانؒ وغیرہ

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۱ ج: ۲ باب فی الفارة تقع فی السمن ”کتاب الاطعمہ“

نے اس کی تصحیح کی ہے اگر بالفرض یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ یہ فرق ناگزیر ہے کیونکہ ماحول کا اطلاق ہی جامد کا تعین کرتا ہے کیونکہ مانع میں تو ماحول متصور ہے لیکن اس کا اخراج متحقق نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ جب اس میں چوہا گرے گا اور مرے گا تو وہ تبہ تک پہنچے گا اور سارے گھی کو متاثر کرے گا نیز جب ایک حصہ کو نکالا جائے گا تو وہ خلا خود بخود پُر ہوگا پس اس کا اخراج نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات خود ابن العربی مالکی نے بھی تسلیم کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”الثالثة: قال المفسرون ”القوها و ماحولها“ يدل على انه جامد اذ لو كان مائعاً

لما كان حول“۔ (عارضہ)

پھر جمہور کا آپس میں اختلاف ہے کہ آیا اس گھی سے کھانے کے علاوہ دوسرا استفادہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو حنفیہ کے نزدیک اس کی بیچ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مشتری کو بتلایا جائے کہ اس میں چوہا گرہا اور مرا ہے۔ اسی طرح چراغ جلانے اور کشتیوں پر ملنے کا کام بھی اس سے لیا جاسکتا ہے۔ اور یہی ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی ہے۔ (کافی التھم) جبکہ ابن العربیؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ مسجد کے علاوہ چراغ جلانے کا انتفاع جائز ہے۔ خود ابن العربیؒ کہتے ہیں کہ اس سے چراغ جلانا اور اس کے لئے بیچنا جائز ہے۔ (کذافی عارضۃ الاحوذی) علی ہذا امام مالکؒ و احمدؒ اور ایک روایت میں امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی بیچ جائز نہیں گویا کہ ان کے نزدیک مطلق انتفاع سے روکا گیا۔ جبکہ فریق اول کے نزدیک ”فلا تقربوہ“ کا امر صرف کھانے سے روکنے کے لئے ہے۔ بذل الجہود میں ہے کہ امر حادث کی نسبت اقرب اوقات کی طرف کی جائے گی یہ ضابطہ اس حدیث سے فقہاء نے مستنبط کیا ہے کیونکہ جب گھی میں چوہا مرنے کا علم ہوا اور اس وقت گھی منجمد تھا تو اس میں اگرچہ یہ احتمال تھا کہ گرتے وقت گھی مانع ہو لیکن اس کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تدبر

قولہ ”وحدیث ابن عباس عن میمونۃ اصح“ یعنی یہ حدیث امام زہریؒ سے دو طرح مروی ہے ایک میں حضرت میمونہؓ کا ذکر نہیں ہے بلکہ ابن عباسؓ کی مسندات میں سے ہے، جیسا کہ اس سے سابقہ عبارت میں امام ترمذیؒ نے فرمایا ”وقد روی هذا الحديث عن الزهري“ الخ جبکہ حدیث باب والی سند میں یہ ”عن ابن عباس عن میمونہ“ ہے اور یہی یعنی ”کونہ عن ابن عباس عن میمونہ“ زیادہ صحیح ہے۔^۳

۳ راجع مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۵۰ و ۵۵۱ ج: ۵ ”کتاب الاطعمہ“، قالت عائشة: ان كان جامداً فالقها و ماحولها

و كل ما بقى وان كان مائعاً فلا حائله. ۱۲ الحنفی

قولہ ”وروی معمر عن الزہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃ“ یعنی معمر نے اس کو ابو ہریرہؓ کی مسانید میں ذکر کیا ہے جبکہ یہ حضرت میمونہؓ کی منادات میں سے ہے اس پر امام بخاریؒ کا قول نقل کر کے معمر کی خطا کی تصریح کی ہے۔

باب ماجاء فی النہی عن الأکل والشرب بالشمال

”عن عبد اللہ بن عمران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یأکل احدکم بشمالہ ولا یشرب بشمالہ فان الشیطان یأکل بشمالہ ویشرب بشمالہ“۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک بائیں ہاتھ سے نہ کھائے اور نہ ہی بائیں ہاتھ سے پیئے کیونکہ شیطان اپنے بائیں (ہاتھ) سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

تشریح:- اللہ تبارک و تعالیٰ نے بعض اشیاء معزز و محترم بنائی ہیں۔ جبکہ بعض چیزیں خسیس قسم کی ہیں ان میں سے طیب، طیب کے مناسب ہیں اور اذنی، اذنی کے۔ چونکہ یمن، شمال سے افضل ہے اس لئے جتنے اچھے کام ہیں وہ دائیں ہاتھ سے سرانجام دینے چاہئے جبکہ ایسے کام جو اگر طبعی طور پر ناگوار ہوں لیکن ان کی انجام دہی ایک مجبوری ہو وہ بائیں ہاتھ سے انجام دینے چاہئے جیسے استنجاء وغیرہ۔

چونکہ کھانا پینا اور رزق کی جملہ اشیاء محترم ہیں اس لئے ان کا تبادلہ سیدھے ہاتھ کا وظیفہ مقرر ہے، علاوہ ازیں الٹا ہاتھ ناک صاف کرنے اور استنجاء وغیرہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے تو اس سے کھانے کے دوران ذہن اس طرف بھی جاسکتا ہے اور پاکیزہ انسان اس چیز کو بہت ناپسند کرتے ہیں، اور طبعی طور پر معدہ ایسی چیزوں کو جن کی رغبت کم ہو، ہضم نہیں کر پاتا بلکہ بسا اوقات تو واپس بھی پھینکتا ہے اس لئے شریعت مطہرہ میں کھانے پینے کے لئے دایاں ہاتھ مختص ہے تاہم اس اختصاص کی نوعیت میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ظاہر یہ کہ نزدیک بائیں ہاتھ سے کھانا حرام ہے آدمی پر واجب ہے کہ وہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور پیئے الا یہ کہ اسے کوئی عذر لاحق ہو۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یمن سے کھانا پینا مستحب ہے۔ حافظ عراقیؒ نے شرح ترمذی میں اکثر شافعیہ سے بھی یہی نقل کیا ہے امام غزالیؒ اور امام نوویؒ نے اس پر جزم کیا ہے البتہ قاضی شوکانیؒ نے امام شافعیؒ سے وجوب نقل کیا ہے۔

قائلین وجوب کا استدلال ان روایات سے ہیں جن میں یا تو امر کا صیغہ آیا ہے یا پھر شمال سے کھانے پر وعید وارد ہوئی ہے اور یہ دونوں وجوب کی علامات ہیں چنانچہ صحیحین^۱ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”كنت في ححر رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانت يدي تطيش في

الصحفة فقال لي: يا غلام سمَّ الله وكل بيمينك وكل بمبايليك“

یعنی میں ادھر ادھر سے لیکر کھا رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، سیدھے ہاتھ سے کھا اور اپنے آگے سے کھایا کرو! اور مسلم^۲ میں روایت ہے کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اسے منع کر کے فرمایا ”كُلْ بيمينك“ اس نے کہا ”لا استطعت“ (یہ کہنا تکبر کی وجہ سے تھا کہ میں دائیں سے نہیں کھا سکتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدو عادے کر فرمایا) ”قال لا استطعت فمارفعها الى فيه بعد“، یعنی اس بدو عا کا اثر یہ ہوا کہ وہ شخص سیدھے ہاتھ کے انقاع سے اور اس سے کھانے کی استطاعت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ اسی طرح باب کی حدیث میں بھی بائیں ہاتھ سے کھانے کے بارے میں سخت شناعیت کا اظہار کیا گیا ہے۔

پھر باب کی حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک طبی نے جیسا کہ محشی نے نقل کیا ہے یعنی شیطان اٹنے ہاتھ سے کھانے پر آمادہ کرتا ہے گویا شیطان خود کھاتا پیتا نہیں بلکہ اپنے دوستوں کو غلط طریقے سے کھانے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن ابن العربی^۳ نے عارضہ میں اس توجیہ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ علیٰ ہذا اس کا ظاہری مطلب ہی صحیح ہے کیونکہ شیطاں کا کھانا صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ (کمافی عارضۃ الاحوذی)

جمہور کا استدلال:- بایاں ہاتھ اگرچہ دائیں سے کمتر ہے مگر دھو کر صاف کرنے سے قابل استعمال بن جاتا ہے کیونکہ بذات خود اس میں کوئی گندگی کی چیز نہیں پائی جاتی البتہ اس کا درجہ یمین سے کم ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ وہ کھانے پینے کے لئے بالکل نا قابل استعمال ہے اور اس سے کھانا حرام ہے صحیح نہیں حضور

باب ماجاء في النهي عن الأكل والشرب بالشمال

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۱۰ ج: ۲ باب التسمية على الطعام والأكل باليمين ”كتاب الاطعمة“، صحیح مسلم ص: ۱۷۲

ج: ۲ باب آداب الطعام والشراب الخ ”كتاب الاشرية“۔ ۲۔ صحیح مسلم ص: ۱۷۲ ج: ۲ ”كتاب الاشرية“۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یمن سے کھانے کو پسند اور شمال سے ناپسند فرماتے اس کا مقتضی کراہت ہے نہ کہ حرمت۔ مثلاً بخاری شریفؒ کی حدیث ہے۔

”كان النبي صلى الله عليه وسلم يعجبه التمين في تعله وترجله وطهوره وفي شانه كله“۔

سنن ابی داؤدؒ میں ہے۔

”عن عائشةؓ كانت يدرسون الله صلى الله عليه وسلم اليمنى لطهوره وطعامه

وكانت يده اليسرى لخلاته وما كان من اذى“۔ وغير ذلك من الاحاديث۔

لہذا جن حضرات نے وجوب یمین اور حرمت تیسرے پر جو روایات پیش کی ہیں ہم ان کو مذہب و استحباب یمین اور کراہیت اکل بالشمال پر محمول کرتے ہیں چنانچہ باب کی مذکورہ حدیث کے بارے میں امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”فيه استحباب الأكل والشرب باليمين وكراهتهما بالشمال وقد زادنا نافع الاخذوا الاعطاء الخ“۔ (مسلم ص ۶۷۷ ج ۱)

باقی رہا یہ مسئلہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ سے کھانے والے کے لئے بدعا فرمائی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بلا عذر نظر انداز کیا جس سے معارضہ کی صورت بن گئی اور وہ بدعا کا مستحق ٹھہرا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ”وفى هذا الحديث جواز الدعاء على من خالف الحكم الشرعى بلا عذر“۔ (حوالہ بالا) الکوکب الدرری میں ہے کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کفار وغیرہ کی مشابہت بہر حال مذموم ہے خواہ وہ عمل کی جگہ میں موجود نہ بھی ہوں کیونکہ شیطان وہاں محسوس نہ تھا مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تشبہ سے منع فرمایا۔ لہذا اگر کسی بستی یا شہر میں یہود وغیرہ نہ بھی ہوں تب بھی ان کی مشابہت ممنوع ہے۔

آداب:- امام نوویؒ شرح مسلم میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کی مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

”وفى هذا الحديث بيان ثلث سنن من سنن الاكل، (۱) وهى التسمية

(۲) والاكل باليمين... (۳) والثالثة الأكل مما يليه۔

۳ صحیح بخاری ص ۶۱ ج ۱ باب التیمین فی دخول المسجد وغیرہ ”کتاب الصلوٰۃ“، ایضاً ص ۲۹ ج ۱ باب الوضوء،

ایضاً ص ۸۱۰ ج ۲ ”کتاب الاطعمه“، سنن ابی داؤد ص ۶ ج ۱ باب کراہیۃ مس الذکر بالیمین ”کتاب الطہارۃ“۔

یعنی شروع میں بسم اللہ پڑھنا، داہنے ہاتھ سے کھانا اور اپنے ہی آگے سے کھانا مسنون ہیں کیونکہ دوسرے کے استعمال کی جگہ سے کھانا سوء معاشرہ اور ترک مروت ہے کہ کبھی دوسرا آدمی اس سے گھن محسوس کرتا ہے خاص کر مائع اشیاء میں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ ہر حالت میں اس پر عمل ہو سکتا ہے حتیٰ کہ کھانے پینے کے وقت بھی۔ اس سے کھانے کے آداب کی تعلیم سکھانا بھی ثابت ہوئی جبکہ باب کی حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وفیه انه ینبغی اجتناب الافعال التی تشبه افعال الشیاطین وان للشیطان

یدین“۔ (نودی شرح مسلم ص: ۲۰ ج: ۲)

علاوہ ازیں یہ کہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے اگر شروع میں بسم اللہ بھول جائے تو کھانے کے دوران ”بسم اللہ اولہ و آخرہ“ کہہ لے۔ کیا بارتق کے کنارے سے کھانا چاہئے بیچ سے نہیں۔ اگر برتن میں مختلف اشیاء ہوں تو مرضی کے مطابق جہاں سے جی چاہے اٹھالے۔ اسی طرح حکم دسترخوان کا بھی ہے۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ یہ تدبیر منزل کے خلاف ہے۔ عورتوں کا مزاج ہوتا ہے کہ اس کے کسی کام پر اعتراض اس کو سخت تکلیف سے دوچار کرتا ہے۔ سب کو مل کر کھانا چاہئے۔ (نقش قدم بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم) کچھ مزید آداب و احکام اگلے ابواب میں بیان ہوں گے۔

باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الاکل

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اکل احدکم فلیلعق اصابعه

فانه لا یدری فی ایتھن البرکۃ“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایک کھائے تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ برکت ان میں سے کس والی میں ہے۔

لغات:- ”فلیلعق“ یہ امر کا صیغہ ہے لعق باب سمع سے چاٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ قولہ ”البرکۃ“ خیر اور زیادتی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تغذی اور نفع ہے چونکہ تواضع اور ثواب سب نفع اور فائدہ کی چیزیں ہیں اس لئے انگلیوں کے چاٹنے کو حصول برکت کا سبب قرار دیا۔

تشریح:- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب آدمی کھانے سے فارغ ہو جائے تو اپنی انگلیاں چاٹ

لے کیونکہ کھانے کے بعض اجزاء میں برکت ہوتی ہے اور نہ جانے وہ برکت کس جزء میں پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ ان انگلیوں میں ہو، جیسا کہ گرے ہوئے لقمے اور پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے میں بھی یہ احتمال پایا جاتا ہے لہذا اس احتمال کے پیش نظر ان تینوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ علاوہ ازیں اگر وہ ان انگلیوں کو چاٹنے بغیر تولیہ وغیرہ سے صاف کرتا ہے تو اس کا خراب ہونا یقینی ہے۔ اور اگر دھوتا ہے تو اس میں کھانے کا ضیاع اور بے ادبی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس عمل سے وہ تکبر سے بچ سکتا ہے اس لئے یہ علاج سے کم نہیں۔

اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوئی جو انگلیوں کے چاٹنے کو عیب سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے انگلیاں لعاب آلود ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے منہ میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں لگتا اس سے بذات خود آدمی کو یاد دیکھنے والے کو گھن آتی ہے، لیکن اس کا یہ سفسطہ قابل التفات نہیں کیونکہ یہ لوگ کھانے میں چیچ کا استعمال کرتے ہیں اور اسے بار بار منہ میں داخل کرتے ہیں پھر وہی لعاب آلود چیچ کھانے میں بھی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح دانتوں کی صفائی کے لئے برش کا استعمال کرتے ہیں اور پھر اسے پھینکتے نہیں بلکہ رکھ کر دوبارہ و سہ بارہ استعمال کرتے ہیں جب اس سے گھن نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ اصل علت گھن کی لعاب نہیں بلکہ عادت کا نہ ہونا ہے چونکہ چیچ کی عادت ان لوگوں کو پڑ چکی ہے اس لئے اس سے کوئی گھن نہیں کرتے جبکہ انگلیوں کے استعمال کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے عار محسوس کرتے ہیں۔ رہا دوسرے کا گھن کرنا تو یہ اس وقت ہے جب کھانے کے دوران انگلیوں کو بار بار چاٹتا رہے جو نہیں ہونا چاہئے اگر بالکل اختتام پر ایک آدمی اپنی انگلیوں کو چاٹتا ہے اور پھر وہ ہاتھ کھانے میں نہیں ڈالتا تو اس سے نفرت محض نفسیات پڑتی ہے پھر تو آدمی کو ناک سے بھی گھن آنی چاہئے اور کوئی آدمی دوسرے کے سامنے کھانے کا قابل نہیں ہونا چاہئے بلکہ انسان میں اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جو قابل نفرت ہیں۔ اگر ان وساوس کی رعایت کی جائے تو اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

اس باب میں بھی سابقہ باب کی طرح اختلاف ہے۔ اختلاف اور استدلالات کی نوعیت بھی وہی ہے۔ اہل ظواہر چاٹنے کو واجب جبکہ جمہور مستحب کہتے ہیں۔

پھر طبرانی^۱ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے کھاتے انگوٹھے، مسیمہ

باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الاکل

۱۔ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۵ ج: ۵ رقم حدیث: ۹۲۳ "كتاب الاطعمة" عن عامر بن ربيعة ان النبي ﷺ كان يأكل بثلاث اصابع ويعلقهن اذ الرغ، ايضاً ص: ۱۹ ج: ۵ حدیث: ۹۴۱۔ الحنفی عفی عنہ

اور درمیان کی بڑی انگلی۔ علی ہذا چاٹنے کی ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے وسطی کو چاٹ لے پھر شہادت کی انگلی اور اخیر میں انگوٹھے کو جبکہ ان کا باطن منہ کی طرف ہو۔ تاہم عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ بوقت ضرورت پانچ انگلیوں کو بھی استعمال کرنا جائز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کی بوٹی ہاتھ سے تناول فرمائی ہے جو تین انگلیوں سے نہیں ہو سکتا۔ چاٹنے کے بعد ہاتھ کو کسی کپڑے سے خشک بھی کیا جاسکتا ہے اور دھویا بھی جاسکتا ہے خصوصاً اگر کھانے میں چکناہٹ یا مٹھاس ہو تو دھونا اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے کیونکہ نہ دھونے کی صورت میں ہاتھ پر کھیاں بیٹھیں گی اور سونے کی حالت میں کوئی موزی کیڑے مکوڑے بھی کاٹ سکتے ہیں۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ہاتھ کو سوتے میں چوہے نے کاٹ لیا ہے۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے:

”من نام وفی یدہ غمر (گوشت کی خوشبو) ولم یغسلہ فاصابہ شعی فلا یلو من الانفسہ“۔ (باب فی غسل الید من الطعام، کتاب الاطعمہ ۲)

یعنی جو آدمی ہاتھ دھوئے بغیر سو جائے اور اس کے ہاتھ پر گوشت کی بو ہو (یا چکناہٹ مثلاً) اور اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ سوائے اپنے آپ کے کسی اور کو ملامت نہ کرے کیونکہ غلطی اپنی ہی ہے۔

باب ماجاء فی اللقمة تسقط

”عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اکل احدکم طعاماً فسقطت لقمتہ فلیطط مارآہ منہائم لیطعمہا ولا یدعہا للشیطان“۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک کھانا کھا رہا ہو اور اس سے لقمہ گر جائے تو اس سے وہ چیز ہٹا دے جو اسے تشویش میں مبتلا کر رہی ہے پھر اسے کھا لے اور اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے۔

لغات:- قالہ ”لقمتہ“ التقم الشیء؛ کسی چیز کے ٹگل لینے کو کہتے ہیں کمافی الایۃ ”فالتقمہ الحوت وهو ملیم“ لے لقمہ کھانے کی وہ مقدار کہلاتی ہے جو ایک ہی دفعہ کھائی جانے والی ہو جسے نوالہ کہتے ہیں۔

فولہ ”فلیمط“ بضم الیاء وکسر المیم اماطۃ سے امر کا صیغہ ہے یعنی دور کر دے۔ قولہ ”مارابہ“ فلیمط کا مفعول بہ ہے ”راب“ اور ”آراب“ شک اور تشویش میں ڈالنا۔ ”رب“ اور ”ریبہ“ شک و شبہ، گمان اور تہمت کو کہتے ہیں۔

تشریح:- یعنی اگر اس نوالہ کے ساتھ کوئی ایسی چیز لگ گئی ہو جو ناگواری طبع کا باعث ہو بشرطیکہ وہ نجس نہ ہو تو اسے صاف کر کے کھالینا چاہئے۔ جبکہ نجاست لگنے کی صورت میں اسے کھانا جائز نہ ہوگا الا یہ کہ اسے دھویا جائے۔ اور اگر دھونے کے قابل نہ ہو تو کسی جانور بلی وغیرہ کو کھلایا جائے۔ بہر حال پوری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ کھانا کسی طرح ضائع نہ ہو خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

قولہ ”ولا یبدعہا للشیطان“ لے لقمہ گرنے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں کبھی آدمی بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا شروع کرتا ہے اس صورت میں یہ شیطان کی مداخلت سے بھی گر سکتا ہے جبکہ کبھی کسی اور سبب سے بھی گر سکتا ہے، پس اگر پہلی صورت ہو تو پھر اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ شیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے اموال ضائع کر دے اس میں وہ کامیاب نہ ہونے پائے۔ اور دوسری صورت میں جب وہ خود گرا ہو مطلب یہ ہوگا کہ ایسے نوالہ کو چھوڑنے کی وجہ سے لا پرواہی، تحقیر نفعت اور تکبر ہوتا ہے جو شیطانی اخلاق ہے چونکہ شیطان اس سے خوش ہو جاتا ہے لہذا اسے چھوڑ کر شیطان کو خوش نہ کیا جائے۔

حدیث آخر:- ”عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اکل طعاما لقی اصابعہ الثلث وقال اذا وقعت لقمة احدکم فلیمط عنها الاذی ولیا کلہا ولا یبدعہا للشیطان وامرنا ان نسلت الصحفۃ وقال انکم لا تدرن فی ای طعامکم البرکۃ“۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانا تناول فرمالتے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو اس سے قابل کوفت چیز یعنی عیب کو صاف کر کے اس کو کھالے اور شیطان کے لئے اس کو نہ چھوڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو رکابی کے صاف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے کھانے کے کس حصہ میں برکت ہے۔

لغات:- قولہ ”الاذی“ اذی الشیء، اذی و اذاقہ و اذیۃ گندنا ہونے، تکلیف اور نقصان کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد لقمہ کے ساتھ لگی ہوئی ایسی چیز ہے جس کے ہوتے ہوئے آدمی وہ لقمہ خوشی سے نہیں کھا سکتا جیسے کنکری اور مٹی وغیرہ۔ قولہ ”نسلت“ سلت الصحفۃ باب نصر سے برتن کو انگلی وغیرہ سے چاٹنے اور صاف کرنے

کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الصحفة“ وہ برتن جس میں تقریباً پانچ آدمی کھانا کھا سکیں۔ اس سے بڑا قصہ کہلاتا ہے جس میں بیک وقت دس آدمی کھا سکتے ہیں اور سب سے بڑے طباق کو بھنہ کہتے ہیں۔

تشریح:۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے جیسا کہ سابقہ باب میں گذرا ہے چونکہ عام کھانا تین انگلیوں سے کھایا جاسکتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین پر اکتفا فرماتے ورنہ وہ کھانا جیسے چاول اور بڑی ہڈی وغیرہ جس میں باقی انگلیوں سے مدد لی جاتی ہے، اس میں جتنی انگلیاں آلودہ ہو جائیں سب کو چاٹنا ضروری ہوگا۔

غرض یہاں پر تین چیزوں کا بیان ہے، گرے ہوئے لقمہ کو صاف کر کے کھالیا جائے، انگلیوں کو چاٹ لیا جائے اور رکابی اور برتن کو بھی چاٹ کر صاف کیا جائے ان تینوں کی علت یہ بتلا دی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کس حصہ میں ہے۔ برکت لغت میں زیادتی اور خیر ملنے کو کہتے ہیں۔ یہاں برکت سے مراد کھانے کے منافع ہیں جیسے بھرپور غذا، عبادت کی طاقت اور کھانے کا موافق ہونا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ آدمی جو کھانا کھاتا ہے اس میں برکت تو ہوتی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس جزء میں ہے جو کھالیا اس میں یا جو برتن میں باقی ہے اور انگلیوں پر لگا ہوا ہے یا پھر گرے ہوئے نوالہ میں؟ لہذا تحصیل برکت کی غرض سے ان سب کا اہتمام کرنا چاہئے نیز اس میں کھانے کو ضیاع سے بھی بچایا جاسکتا ہے۔ تاہم ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی دوسرا کھانے والا موجود ہو تو اس کے لئے برتن میں کھانا چھوڑنا زیادہ بہتر ہے۔ غرض ہم برتن میں اتنا سالن نکالیں جو ہم باسانی ختم کر بھی سکیں لیکن اگر زیادہ ہو یا کسی اور کو ضرورت ہو یا ضرورت تو نہ ہو لیکن اسے یقین ہو کہ اگر برتن میں سالن وغیرہ بچ جائے تو ضائع نہ ہوگا بلکہ کوئی دوسرا کھالے گا تو اس صورت میں صرف برتن کو صاف کرنے کی غرض سے سالن کو ختم کر لینا ضروری نہ سمجھا جائے ہاں سالن ختم ہو گیا اب صرف برتن صاف کرنے کا مرحلہ باقی ہے تو اسے صاف کر لینا چاہئے۔ اگر کسی علاقے میں مہمان کے سامنے زیادہ کھانا رکھنے کا رواج ہو یا کھانے پینے والا محترم سمجھا جاتا ہو تو ایسی صورت میں کچھ بچا کر چھوڑنا افضل ہے۔ قالہ النوویؒ فی شرح مسلم اسی طرح اگر لقمہ گر جائے اور اس کے ساتھ اتنی مٹی وغیرہ لگ جائے کہ اسے صاف کرنے میں مشقت ہو تو بوجہ تحقیر و تکبر اگرچہ چھوڑنا جائز نہیں مگر مشقت سے بچنے کی غرض سے اسے اٹھا کر کسی جانور کو جیسے پرندوں وغیرہ کو کھلایا جائے تو اس میں بھی ان شاء اللہ حرج نہ ہوگا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دسترخوان پر جو چاول کے دانے وغیرہ تھوڑا بہت کھانا گر جاتا ہے اسے کچرے

میں نہیں پھینکنا چاہئے بلکہ ایسی جگہ ڈالنا چاہئے جہاں سے پرندے وغیرہ کھا سکیں۔

تیسری حدیث:- حضرت ام عاصم فرماتی ہیں کہ حضرت نبیؐ الخیرؑ ہمارے یہاں تشریف لے آئے اور ہم ایک پیالے میں کھانا کھا رہے تھے تو انہوں نے ہم سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی کہ جس نے کسی برتن میں کھانا کھایا اور پھر اسے چاٹ کر صاف کیا تو وہ برتن اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

فائدہ:- ”باب ماجاء فی فضل الحجر الاسود والركن والمقام“ (تشریحات ص: ۶۱: ج: ۴) میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی احادیث کو ظاہر پر حمل کرنا اولیٰ ہے اور اس میں کوئی استبعاد بھی نہیں ہے کیونکہ ہر چیز میں اللہ نے کچھ نہ کچھ شعور رکھا ہے اور بولنے کی صلاحیت بھی، اسی بنا پر ہر چیز اللہ کی تسبیح و تہنیز کرتی ہے آج کل تو لوہا بھی بولتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کو سمیت کے معنی پر محمول کیا ہے کہ پلیٹ وغیرہ کو صاف کرنا تو اضع اور متشرع ہونے کا عمل ہے جس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اس کا سبب برتن بنتا ہے اس لئے نسبت مجازاً اس کی طرف کی گئی۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل من وسط الطعام

”عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان البرکۃ تنزل وسط الطعام فکلوا من حافتیہ ولا تاكلوا من وسطہ۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک برکت کھانے کے درمیان اترتی ہے لہذا اس کے کناروں سے کھاؤ اور بیچ سے مت کھاؤ!

لغات:- قولہ ”وسط“ یہ لفظ سکون السین اور فتح السین دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے تاہم فتح کی صورت میں اس کا اطلاق بالکل درمیان پر ہوتا ہے۔ جبکہ سکون کی حالت میں طرفین کے درمیان پورے حصے کو کہا جاتا ہے اس لئے کہتے ہیں ”المتحرك ساکن والساکن متحرك“۔

قولہ ”حافتیہ“ حافۃ کا تثنیہ ہے فا کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے کنارہ کو کہتے ہیں۔ تشریح:- اس حدیث میں ایک اور ادب کھانے کا بتلادیا کہ کھانا ہمیشہ ایک جانب سے لینا چاہئے

درمیان سے نہیں خواہ چاول، ٹرید اور سالن وغیرہ ہو یا خشک روٹی۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بیچ میں برکت نازل ہوتی ہے۔ اس برکت سے مراد اضافہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بہت سی صحیح احادیث سے متعدد واقعات ثابت ہیں اور دیگر فوائد بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے کنارے سے کھانا عقل کے بھی موافق ہے اور فطرت کے بھی۔ نیز کنارہ سے کھانے کی صورت میں اگر ہاتھ سے کچھ گرے گا تو اس کے آگے والے حصے میں گرے گا جو دوسروں کے لئے سبب ناگواری نہ ہوگا جبکہ درمیان میں ہاتھ مارنے سے انقطاع برکت بھی ہوگا اور دوسروں کی ناگواری طبع کا سبب بھی بنے گا۔ پھر درمیانی حصہ پر نزول برکت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ”خیر الامور اوسطها“ کے بموجب افضل بھی ہے اور مشترک بھی۔ بہر حال اس حدیث کے مطابق کھانا درمیان سے نہیں کھانا چاہئے۔ بلکہ اپنے آگے سے ہی کھالینا چاہئے درمیان سے کھانا مکروہ ہے بلکہ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں اس آدمی کے لئے جو اس حکم سے واقف ہو حرام قرار دیا ہے۔ اگر برتن میں مختلف اشیاء ہوں جیسے کئے ہوئے مختلف پھل ہوں تو جو مرضی ہوا اٹھالے۔ تاہم اس میں بھی مذکورہ ضابطے کو ملحوظ رکھے اور کوشش یہ ہونی چاہئے کہ درمیانی حصہ اخیر تک محفوظ رہے۔ چونکہ مشکوٰۃ وغیرہ کی روایت میں ”کلوا من جوانبھا“ کے الفاظ آئے ہیں۔ لہذا اس حدیث مذکور میں تنزیہ کے صیغے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ اکل الثوم والبصل

”عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اکل من هذه قال اول مرة الثوم ثم قال الثوم والبصل والکراث فلا یقرینافی مساجدنا“۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اس سے کھایا پہلی مرتبہ فرمایا ”لہسن“ پھر فرمایا لہسن، پیاز اور گند نے میں سے تو وہ ہرگز ہماری مسجدوں میں ہمارے قریب نہ ہو۔

لغات:- قوله ”الثوم“ بضم ”ثاء“ لہسن۔ قوله ”البصل“ بوزن حجر و شجر پیاز۔ قوله ”الکراث“ بوزن رمان گندنا۔ جس کے پتے پیاز اور لہسن کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں اور ہاضم اور بھوک بڑھانے والے

باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل من وسط الطعام

۱۔ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۸ ج: ۵ ”کتاب الاطعمۃ“، مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۵۸ ج: ۵ ”کتاب الاطعمۃ“

ہوتے ہیں۔

تشریح:۔ الثوم وغیرہ کو مجرور پڑھا جائے گا پھر "قال" ول مرة الثوم "الخ" یہ شک اور تردید راوی کی ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

جمہور علماء کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ یہ اشیاء بذات خود حلال ہیں مگر بدبو کی علت کی بنا پر یہ فرشتوں اور لوگوں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اس لئے جو شخص ان کو کھالے یا اس طرح کی کوئی بدبودار شے استعمال کرے جیسے سگریٹ اور بدبو والی دوا وغیرہ تو جب تک بدبو کا ازالہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک مسجد میں آنا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح ان اجتماعات میں بھی وہ شرکت نہ کرے جہاں لوگ جمع ہو جاتے ہیں خصوصاً عبادت کی غرض سے منعقد اجتماعات جیسے عید گاہیں اور جناز گاہیں وغیرہ۔ چونکہ محقق قول کے مطابق جماعت کی نماز واجب ہے اس لئے جماعت سے کچھ پہلے بھی ان اشیاء کا استعمال مکروہ ہے ہاں وقت زیادہ ہو یا اسے کھا کر کسی طرح بدبو کا ازالہ ہو سکتا ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

بہت سے حضرات نے غیر اختیاری بدبو کو بھی اس حکم میں شامل کر کے اسے مسجد میں جانے سے منع کیا ہے جیسے منہ کی بدبو، یا بدن پر کوئی ایسے پھنسیاں ہوں جو بدبودار ہوں یا وہ کوئی ایسا کام کرتا ہو جس سے اس کے کپڑے بدبودار بنتے ہوں جیسے چمڑے اور مچھلیوں سے بننے والے دانے کی فیکٹری میں کام کرنے والے وہ مزدور جن کو اس سے بچنا مشکل ہو۔

پھر جمہور کے نزدیک یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ تمام مساجد کو شامل ہے۔

اس کے برعکس عام ظاہر یہ ہے کہ نزدیک یہ اشیاء بذات خود حرام ہیں کیونکہ یہ نماز باجماعت سے مانع ہیں جو ان کے نزدیک فرض عین ہے چونکہ مقدمہ حرام، حرام ہوتا ہے اس لئے یہ اشیاء حرام ہی ہوں گی۔ نیز قاضی عیاضؒ نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم صرف مسجد نبوی تک محدود ہے کیونکہ بعض روایات^۱ میں لفظ "مسجدنا" مفرد کے صیغے کے ساتھ آیا ہے پس یہ دو مسئلے اختلافی ہو گئے۔

پہلے مسئلے میں جمہور کے دلائل وہ روایات ہیں جو امام ترمذیؒ نے اگلے باب میں نقل کی ہیں۔ علاوہ

باب ماجاء فی کراهیۃ اکل الثوم والبصل

۱۔ کذا فی مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۱ ج: ۵ "کتاب الاطعمه"، مجمع الزوائد ص: ۴۳ ج: ۵ "باب فی اکل الثوم والبصل" کتاب الاطعمه.

ازیں ابوداؤدؒ کے کی متعدد روایات اور صحیحینؒ کے کی احادیث اس بارے میں صریح ہیں کہ یہ اشیاء حلال ہیں گو کہ ان پر خبیث کا اطلاق ہوا ہے۔ مگر اس سے مراد حرمت نہیں بلکہ ناگواری طبع کا موجب ہے۔ اور جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو جمہور کہتے ہیں کہ ”مساجد“ کا لفظ جیسا کہ حدیث باب میں ہے یا ”فلایقربن المساجد“ کا صیغہ جیسا کہ ابوداؤدؒ میں ہے مطلق مسجد پر ناطق ہے لہذا جن روایات میں لفظ ”مسجد“ مفرد کا صیغہ آیا ہے اس سے مراد جنس مسجد لی جائے گی۔ اس پوری بحث کا خلاصہ بذل المجہود میں یوں بیان کیا گیا ہے:

”وهذا الحديث والاحاديث التي في الباب تدل على ان اكل البصل والكراث والثوم مطبوخاً كان او غير مطبوخ جائز وعليه ان يقعد في بيته ولا يحضر المسجد والجماعة حتى يذهب ريحه وكذا من به جرح متعفن يخرج منه رائحة وصاحب البخرو الذفر والذى استعمل دواء كريهة الرائحة يوذى الناس بريحه لا يجوز لهم الخروج الى المسجد والشهود الى الجماعة۔“ (بذل المجہود ص ۶۳ ج ۵، کتاب الاطعمہ)

چونکہ اس نبی کی علت ایذا رسانی ہے خواہ فرشتوں کی تکلیف کا باعث ہو یا انسانوں کی، اس لئے ان اوقات میں پیاز وغیرہ بدبودار اشیاء کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے، جن میں ایک یا دونوں فریقین کی ملاقات متوقع ہو، لہذا درس قرآن وحدیث یا ان کتب کے درس کے وقت جن میں فرشتوں کی آمد ہوتی ہیں۔ اسی طرح شادی شدہ شخص کے لئے رات کے کھانے کے وقت یا کوئی میننگ واجلاس وغیرہ متوقع ہو ان چیزوں کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ کراما کاتبین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ممکن ہے کہ اللہ نے ان کے لئے کوئی ایسا انتظام فرمایا ہو جو اس بدبو سے تکلیف نہ اٹھاتے ہوں، یہی حکم حفظہ کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ فرشتے اگرچہ کھاتے پیتے نہیں تاہم قوت شامہ ان کی انسانوں کی طرح ہے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ فرشتے

۲ سنن ابی داؤد ص: ۷۹ او ۱۸۰ ج: ۲ ”باب فی الثوم“ کتاب الاطعمہ۔ صحیح بخاری ص: ۱۸ ج: ۱ ”باب
ما جاء فی الثوم النی والبصل الخ“ کتاب الصلوۃ، ایضاً ص: ۸۲۰ ج: ۲ کتاب الاطعمہ، صحیح مسلم ص: ۲۰۹ ج: ۱
”کتاب الصلوۃ“، ایضاً ص: ۱۸۳ ج: ۲ ”کتاب الاشریۃ“۔ صحیح کذا فی روایۃ ابن ماجہ ص: ۲۴۱ ابواب الاطعمہ، ایضاً
مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۱ ج: ۵ کتاب الاطعمہ، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۷۹ ج: ۲ کتاب الاطعمہ۔

بسیط مخلوق نہیں بلکہ مرکب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے فرشتے یکساں نہیں۔ اگر کسی کو مزید تفصیل درکار ہو تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجتہ اللہ البالغہ کی طرف مراجعت فرمائیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی أكل الثوم مطبوخاً

عن سماك بن حرب سمع جابر بن سمرة يقول نزل رسول الله صلى الله عليه وسلم على ابي ايوب وكان اذا أكل طعاماً بعث اليه بفضله فبعث اليه يوماً بطعام ولم يأكل منه النبي صلى الله عليه وسلم فلما أتى ابو ايوب النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له فقال النبي صلى الله عليه وسلم فيه الثوم فقال يا رسول الله أحرام هو؟ قال "لا" ولكني أكرهه من أجل ريحه۔

سماک بن حرب نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سنا ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (زمانہ ہجرت میں) ابو ایوبؓ کے یہاں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانا تناول فرماتے تو اپنا بچا ہوا انہی (ابو ایوب) کے پاس بھیج دیتے چنانچہ ایک دن انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا پیش کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول نہیں فرمایا پھر جب حضرت ابو ایوبؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نہ کھانے کے متعلق دریافت کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں لہسن تھا، اس پر ابو ایوبؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا لہسن حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں مگر میں اسے بو کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔

تشریح:۔ اس حدیث سے لہسن اور پیاز وغیرہ کی کراہیت کی وجہ معلوم ہوئی جو یہ ہے اس کی قدرے تفصیل سابقہ باب میں گذر چکی۔ دوسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ ایسے آدمی کے لئے جس سے صاحب خانہ وغیرہ عقیدت رکھتے ہوں تبرک کی غرض سے کچھ کھانا پینا بچانا چاہئے۔ امام نوویؒ نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ اسی طرح اگر گھر والے مہمان کے سامنے ضرورت سے زیادہ کھانا پیش کرتے ہوں یا وہ لوگ خود ضرورت مند ہوں تو بھی بچانا چاہئے اگرچہ بچا ہوا تھوڑا ہی کیوں نہ ہو اور اس لئے بھی تاکہ گھر والوں کو اطمینان ہو جائے کہ مہمان نے پیٹ بھر کے کھا لیا ہے۔

حدیث باب کا واقعہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی مقام قبا سے مختلف قبل کے محلوں سے ہوتی ہوئی موجودہ مسجد نبوی کے دروازے پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے پالان

اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ دیا تھا اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مہمان بن گئے تھے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ حضرت ابویوب خالد بن زیدؓ فرماتے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچا ہوا کھانا واپس فرماتے تو جس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پڑتا میں اور ام ایوب (اہلیہ) اس مقام کو تلاش کرتے اور برکت حاصل کرنے کے لئے اسی مقام سے کھاتے۔ چنانچہ ایک رات ہم نے کھانے میں پیاز یا ہسن ڈالا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس فرمایا جس کا ذکر حدیث باب میں ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت امام ترمذیؒ نے حضرت ام ایوبؓ سے نقل فرمائی ہے بتاتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لائے تو انہوں نے یعنی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پُر تکلف کھانا تیار کیا جس میں بعض سبز سبز چیزیں یعنی بووالی سبزی تھی (جیسے پیاز، لہسن یا گندنا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تناول فرمانا پسند نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا تم اسے کھا لو کیونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اپنے ساتھی (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کو تکلیف نہ پہنچاؤں۔^۱

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مذکورہ اشیاء حلال ہیں اور یہ کہ یہ حکم سب فرشتوں کی بابت نہیں ہے جیسا کہ سابقہ باب میں بیان ہوا۔ اس باب میں بھی ابوالعالیہ کی روایت میں اسے حلال رزق کہا ہے۔ البتہ اگر ان چیزوں کو پکالیا جائے جس سے ان کی بدبو زائل ہو جاتی ہے تو پھر ان کے کھانے میں کسی طرح کراہیت باقی نہیں رہتی جیسا کہ اسی باب میں حضرت علیؓ کی روایت میں اس کی تصریح ہے اور امام ترمذیؒ نے اسی مقصد کے لئے یہ باب باندھا ہے۔

باب ماجاء فی تخمیر الاناء و اطفاء السراج

و النار عند المنام

”عن جابر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: اغْلِقُوا الْبَابَ وَ اَوْكُوا السَّقَاءَ وَ اَكْفُوا الْاِنَاءَ وَ اَوْخِّرُوا الْاِنَاءَ وَ اَطْفِئُوا الْمَصْبَاحَ فَانَ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ غُلْقًا وَلَا يَجْلُ وِ كَاءَ وَلَا يَكْشِفُ اَنِيَةً فَانَ

باب ماجاء فی الرخصة فی اكل الثوم مطبوخاً

۱۔ کذا فی مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۰ ج: ۵ ”من یکرہ اکل الثوم“ کتاب الاطعمہ، عن ام ایوب قالت نزل علینا النبی ﷺ فصنعنا له طعاماً فیه من بعض البقول فکرهه فقال، انی لست مثکم انی اخاف ان اوذی صاحبی۔ الحنفی عفی عنه

الفویسقة تُضرم علی الناس بیتهم۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دروازہ بند کیا کریں اور مشکیزہ کے منہ کو باندھ لیا کریں اور برتن کو الٹا رکھ دیا کریں یا برتن کو ڈھانپ دیا کریں اور چراغ بجھا دیا کریں (یعنی سوتے وقت) اس لئے کہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھول سکتا اور نہ ہی مشکیزے کا منہ کھول سکتا ہے اور نہ ہی کسی برتن کو کھول (سیدھا کر) سکتا ہے اور اس لئے کہ چوہا لوگوں کے گھر جلا دیتا ہے۔

لغات:- قوله "اغلقوا" اغلاق سے امر کا صیغہ ہے غلق بندش کو کہتے ہیں۔ قوله "أو كؤا" مفتح الہزہ وضم الكاف ایكاء سے ہے جو كاء یعنی ڈوری سے باندھنے کو کہتے ہیں۔ قوله "السقاء" بکسر السین مشکیزہ کو کہتے ہیں۔ قوله "اكفئو" كفاً کے معنی الٹا کرنے کے ہیں پس یہ اكفاء سے امر کا صیغہ ہے یعنی اگر برتن خالی ہو تو اسے الٹا کر کے رکھ دو ورنہ اسے ڈھانپ لیا جائے جیسا کہ اگلے جملے میں ہے۔ قوله "أو ختموا" تخمیر کے معنی ڈھانپنے کے ہیں چنانچہ شراب کو خمر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ عقل کو نشے کے غلاف میں چھپا دیتی ہے۔ اسی طرح دوپٹے کو خمار بمعنی ساتر کہتے ہیں۔

قوله "اطفئوا المصباح" مصباح بمعنی سراج اس چراغ کو کہتے ہیں جب وہ روشن ہو یعنی جل رہا ہو "اطفئوا" مفتح الہزہ وکسر الفاء وضم الہزہ الثانیۃ بعد الفاء اطفاء سے امر کا صیغہ ہے آگ یا چراغ اور بتی وغیرہ بجھانے کو کہا جاتا ہے۔ قوله "غلقا" بضم التین مغلّق یعنی بند شدہ کے معنی میں ہے۔ قوله "لا یحل" بضم الحاء، حل العقدہ گرہ کھولنے کو کہتے ہیں۔ کوکب میں ہے کہ یہ حلول سے بھی ہو سکتا ہے۔ اول خلاف العقد بھی یعنی کھولنے کے معنی میں۔ بہتر یہ ہے کہ اسے حلول سے مانا جائے۔ قوله "وکاء" بکسر الواو ڈوری کو کہتے ہیں۔

قوله "الفویسقة" بضم الفاء فاسقۃ کی تصغیر ہے فسق سے ہے جو خروج من شئ الی شئ کو کہتے ہیں خصوصاً شے مذمومہ کی جانب نکلنے کو کہا جاتا ہے۔ چوہا کو فویسقہ اس لئے کہا کہ یہ اپنے بیل سے نکلتا ہے اور عموماً نقصان ہی کرتا ہے۔ قوله "تضرم" بضم التاء وکون الضاد وکسر الراء "ضرم" کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں یعنی چوہا لوگوں کے گھر وں کو خوب جلا دیتا ہے۔

تشریح:- امام ترمذیؒ نے ترجمۃ الباب میں "عند المنام" قید کا اضافہ کر دیا ہے جس سے وہ ایک طرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ احتیاطی تدابیر رات کو سونے سے قبل اختیار کر لینی چاہئے کہ یہ مصلحتیں رات کو ملحوظ رہتی ہیں۔ دوسری جانب یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ احکام اگرچہ ترمذی کی پہلی روایت میں مطلق ہیں لیکن مسلم

وغیرہ^۱ کی اور ترمذی کی دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے۔ اور امام نووی نے بھی اپنی تبویب میں ”عند النوم“ کی قید کا اضافہ کیا ہے، اس لئے سرشام کے وقت بچوں کو باہر جانے سے روکنا چاہئے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دن کو ان آداب کی پابندی میں حرج ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بقول ابن العربی شیطان اگر چہ ناری ہے مگر اس کا دل سیاہ ہے جبکہ انسان اصلاً خاکی ہے لیکن اس کا دل نور ایمان سے منور رہتا ہے اس لئے شیطاں اندھیرے کو پسند کرتے ہیں اور انسان روشنی کو ”وکل جنس یمیل الی جنسہ وما یستریح بہ“۔ اس لئے وہ اندھیرے کی آڑ میں چیزیں بگاڑتا ہے۔ نیز دن کو انسانی آنکھ کھلی رہتی ہے وہ اسباب کی حد تک اپنی اشیاء کی حفاظت کرتی ہے جبکہ رات کو وہ بند ہو جاتی ہے تو شیطاں کھل جاتے ہیں۔ مسلم^۲ کی روایات میں تسمیہ کا بھی ذکر ہے لہذا ان امور کی انجام دہی کے وقت بسم اللہ بھی پڑھ لے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ صرف بسم اللہ ہی اس مقصد کے لئے ثنہا کافی تھی مگر عالم اسباب کے ضابطے کے مطابق تسمیہ کے ساتھ یہ تدابیر بھی بتلادیں، اور یہ کہ ان اشیاء میں تاثیر اللہ کے نام سے ہے۔ مسلم^۳ کی ایک روایت میں ہے کہ سال میں ایک رات ایسی ہے جس میں وباء نازل ہوتی ہے وہ جس کھلے برتن یا مشکیزے سے گذرتی ہے تو اسی میں پڑ جاتی ہے۔ امام لیث بن سعد قلمبے ہیں کہ ہمارے یہاں اعاجم سمجھتے ہیں کہ یہ رات کانون اول میں آتی ہے ”کانون رومی سال کا تیسرا مہینہ ہے“۔ ہمارے حساب سے یہ دسمبر کی چھ تاریخ یا تیرہ تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔

پھر برتن ڈھانکنے کے لئے کوئی دوسرا برتن نہ ہو جو اس پر رکھ دیا جائے تو دوسری روایت کے مطابق کم از کم ایک لکڑی ہی اس کی چوڑائی میں اوپر رکھ دیں۔ چراغ اور آگ بجھانے کی حکمت یہ ہے کہ کبھی رات کو چوہا کوئی بقی، کپڑا یا گھاس وغیرہ لاتا ہو اوہاں سے گذرتا ہے یا شیطاں کے اُکسانے پر لاتا ہے جس سے آگ لگ جاتی ہے۔ ہم بچپن میں بھینسوں کے باڑے میں سردی سے بچنے کے لئے رات آنے سے پہلے آگ جلاتے اور پھر بجھانے کے لئے اس پر پانی پھیرتے۔ کیونکہ ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ کوئی چنگاری

باب ما جاء فی تخمیر الاناء و اطفاء السراج و النار عند المنام

۱۔ صحیح مسلم ص: ۷۰ ج: ۲ ”باب استحباب تخمیر الاناء الخ“ کتاب الاشریة، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۷ ”باب

اطفاء النار عند المیت“ کتاب الآداب، ایضاً ابی داؤد ص: ۳۶۵ ج: ۲ کتاب الآداب۔

۲۔ صحیح مسلم ص: ۷۱ ج: ۲ کتاب الاشریة۔ ۳۔ حوالہ بالا۔

جو بے احتیاطی میں رہ جاتی ہے پورے بارے کو جلا دیتی ہے۔

بعض لوگ مچھروں سے بچنے کے لئے مچھرتی جلاتے ہیں ان کو بھی اس بارے میں احتیاط کر لینا چاہئے کہ وہ کپڑوں کے آس پاس نہ رکھیں۔

غرض پورا اطمینان کر کے سو جانا چاہئے۔ بعض لوگ تفریح وغیرہ پر جاتے ہوئے گھر کا دروازہ تو بند کر لیتے ہیں لیکن مین سوچ بجلی کا بند نہیں کرتے جس سے کئی واقعات آگ لگنے کے رونما ہوتے ہیں۔ عام بلب میں یہ اندیشہ چونکہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ دیوار یا چھت پر لگا رہتا ہے اس لئے اگر زیرو داٹ کا بلب وغیرہ رات کو جلتا رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں دیہاتوں میں لوگ لائٹیں جلاتے ہیں اس کی آگ شیشے میں بند ہونے کی وجہ سے محفوظ ہوتی ہے اُسے جلانے رکھنے میں بھی حرج نہیں۔ تاہم جولاٹین خراب ہو اور وقفاں وقفاں کی آگ بھڑکتی رہتی ہو تو اس میں احتیاط ضروری ہے۔

قولہ ”فان الشیطان“ الخ یہ تعلیمات ہیں بطور لف نشر مرتب کے۔ اور ”فان الفویسقة“ سے مزید تاکید کے لئے اسلوب کلام تبدیل فرمایا کیونکہ آگ کا انجام بہت ہی خطرناک ہے۔

بہشتی زیور کے دسویں حصے میں لکھا ہے کہ ”جب برتن خالی ہو جائے تو اس کو ہمیشہ دھو کر الٹا رکھو اور جب دوبارہ اس کو برتنا چاہو تو پھر اس کو دھو لو“۔ بہشتی زیور میں آداب کا کافی ذخیرہ موجود ہے اس لئے ہر شخص کو اس کا پڑھنا نہایت لازمی ہے۔ آج کل شوکیس کے استعمال کا رواج عام ہو گیا ہے چونکہ برتن شیشے کے اندر محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اگر سیدھے بھی رکھ لئے جائیں تو کافی ہے گوکہ اس میں بھی ادب کا ظاہری تقاضا الٹا رکھنا ہی ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب ماجاء فی کراہیۃ القرآن بین التمرتین

”عن ابن عمر قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقرن بین التمرتین حتی یسئذن صاحبہ“۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کھجوروں کو ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ اپنے ساتھی سے اس کی اجازت لے لے۔

لغات:- قولہ ”ان یقرن“ قرآن بکسر القاف سے مشتق ہے جس کے معنی ملانے کے ہیں چنانچہ حج

قرآن وہ منک ہے جس میں عمرہ اور حج کو ایک ہی سفر اور احرام میں ملا کر ادا کر لیا جائے۔

تشریح:۔ مسلمؑ اور ابوداؤدؑ وغیرہما میں بالترتیب ”حتیٰ يستأذن اصحابہ“ اور ”الا ان تستأذن اصحابک“ کے الفاظ ہیں۔ پھر بذیل المجہود ج ۵ ص ۳۶۵ پر بحوالہ مجمع نقل کیا ہے کہ ”الا ان تستأذن“ الخ ابن عمرؓ پر موقوف ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث صرف ابن عمرؓ ہی سے مروی ہے کہ جب وہ قحط والے سال کچھ لوگوں کے پاس سے گزر رہے تھے اور ابن الزبیرؓ ان کو کھلا رہے تھے تو ابن عمرؓ نے فرمایا:

”لاتسقاروا فان النبى صلى الله عليه وسلم نهى عن الاقرا ن، ثم يقول: الا ان يستأذن الرجل اخاه“۔

اس ارشاد پاک سے معلوم ہوا کہ کھجور اور اس طرح اور اشیاء جیسے انگور وغیرہ کو جب مشترک طور پر کھایا جا رہا ہو تو دو۔ دو دانے اٹھا کر نہیں کھانا چاہئے کیونکہ اس میں یا تو دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے یا کم از کم آداب مجلس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

پھر اس نہی کی حیثیت کیا ہے؟ تو قاضی عیاضؒ نے اہل الظاہر سے تحریم نقل کی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے جیسا کہ امام نوویؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ یہ حالات پر منحصر ہے اگر کھجور وغیرہ مشترک ہے اور اس کے ساتھ قلیل بھی ہے تو پھر قرآن حرام ہے کیونکہ اس طرح جو بے حیا اور بے شرم ہو گا وہ جلدی جلدی کھا کر پیٹ بھر لے گا اور با حیا شرم کے مارے بھوکے رہ جائیں گے۔ اور کبھی سفر وغیرہ میں متبادل انتظام بھی نہیں ہو سکتا خصوصاً غربت کے شکار لوگ تو اس چیز کو بہت محسوس کرتے ہیں البتہ اگر ملکیت کسی ایک کی ہے، اور وہ خود شریک بن کر نہیں کھاتا بلکہ مہمانوں یا فقراء کو کھلا رہا ہے اور ان کو اجازت دیدی کہ جیسا کھانا چاہو اور جتنا کھا سکو کھا لو۔ یا خود بھی شریک ہے مگر ان کو اجازت دیدی۔ یا سب شرکاء نے صراحۃً یا دلالۃً طے کر لیا کہ جو جیسا کھانا چاہے یا ان کو جلدی فارغ ہونا مطلوب تھا۔ یا کھانا صرف تلذذ کے لئے تھا تو ان صورتوں میں قرآن جائز ہے۔ اسی طرح اگر مالک

باب ماجاء فی کراهیة القرآن بین التمرتين

۱۔ صحیح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۲ کتاب الاشربة۔ ۲۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ ”باب الاقرا ن فی التمر عند الاکل“ کتاب الاطعمة ولفظه: نهى رسول الله ﷺ عن الاقرا ن الا ان تستأذن اصحابک، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۹ کتاب الادب، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۲ ج: ۵ کتاب الاطعمة، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۳۶ ج: ۵ ”باب القرآن فی التمر“ کتاب الاطعمة

طعام خود قرآن کرنا چاہے تو بھی جائز ہے تاہم آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ یا خود ایک ایک اٹھالے یا سب کو اختیار دیدے۔

بہر حال کوئی بھی کھانا جو دو یا دو سے زیادہ آدمی مل کر مشترکہ طور پر کھائیں تو یہ اگرچہ اس بات کی اجازت ہے کہ جس نے جتنا کھایا وہ اس کے لئے مباح ہے، تو یقیناً کوئی کم کھائے گا اور کوئی زیادہ کوئی بھی نوالے نہیں گنتا۔ تاہم ان تمام صورتوں میں عرف و عادت کا لحاظ رکھنا لازمی ہے، اور عرف کے مطابق مہذب لوگ اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا ضروری سمجھتے ہیں وہ ایثار پر تو خوش ہوتے ہیں مگر دوسروں کا حق ضائع کرنا گوارا نہیں کرتے۔

جدید تحقیق کے مطابق دنیا میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو دوسروں کو کھلانے سے اتنی خوشی محسوس کرتے ہیں جو خود کھانے سے زیادہ ہوتی ہے اور تجربہ بھی اس پر شاہد ہے۔ گو کہ آج کل بخل کا دور دورہ ہے جو علامات قیامت میں سے ایک ہے۔

باب ماجاء فی استحباب التمر

”عن عائشة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: بیت لا تعرفہ جیاع اہلہ۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس گھر میں کھجور نہیں وہ اہل خانہ بھوکے ہیں۔

تشریح:- جیاع جائع کی جمع ہے۔ یہ ارشاد اہل مدینہ کے لئے ہے کیونکہ ان کی اکثر غذا کھجور ہی تھی لہذا جہاں لوگوں کی غذا کچھ اور چیزیں ہوں ان کو وہی اشیاء گھروں میں رکھنا چاہئے۔ تاہم کھجور کی شان جدا گانہ ہے کہ اسے ہر وقت کھایا جاسکتا ہے، نہ پکانے کی زحمت اس میں ہے اور نہ ہی سڑ جانے کا اندیشہ پایا جاتا ہے اور سفر پر جاتے وقت بھی اپنے ہمراہ لے جائی جاسکتی ہے۔ بہر حال اس حدیث سے دو باتیں نمایاں طور پر ثابت ہوئیں ایک یہ کہ سال بھر کے لئے کھانے کا انتظام زہد اور توکل کے خلاف نہیں، کیونکہ کھجور کی فصل تو سال میں ایک دفعہ آتی ہے، جس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آئندہ فصل کی آمد تک اس کی ذخیرہ اندوزی جائز ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ گھر میں معمولی غذا بھی کافی ہے، زیادہ لحم و ثمن کے پیچھے بھاگنے اور اسے گھر میں ہر وقت رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ جس کے گھر میں کھجوریں ہیں وہ لوگ بھوکے شمار نہیں ہوتے۔ لہذا اس حدیث

سے زہد کی ترغیب بھی معلوم ہوتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں مواسات کی ترغیب ہو کہ مدینہ منورہ چونکہ دارالہجرت تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ لوگ نو آمدہ مہاجرین کی مدد جاری رکھیں اس کے لئے ضروری تھا کہ گھروں میں اس کا انتظام موجود ہو، کیونکہ جب گھر کھجور سے خالی ہوں گے تو وہ لوگ مسافروں اور مہاجرین کی کیا خبر گیری کریں گے۔ علی ہذا ہر علاقے والے کے لئے اس نیت سے گھر میں ہر وقت دستور کے مطابق انتظام کر لینا چاہئے کہ اگر اچانک مہمان آجائیں تو ان کا اکرام و تواضع ہو سکے۔

باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه

”عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ لیرضی عن العبدان یا کل

الاکلة او یشرب الشربة فیحمدہ علیہا“۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ اس بندے سے راضی ہوتے ہیں جو کوئی لقمہ کھائے یا کوئی گھونٹ پانی کا پیے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔

لغات:- قولہ ”الاکلة“ یہ اور ”الشربة“ فاء کلمہ کے فتح کے ساتھ یعنی اول میں ہمزہ مفتوح اور دوم میں شین مفتوح ہے مرۃ کے معنی میں آتے ہیں کیونکہ فعلہ بالفتح مرۃ کے لئے آتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”اکلة“ میں ہمزہ مضموم ہو پھر نوالہ اور لقمہ کے معنی میں ہو جائے گا۔ قولہ ”علیہا“ یعنی اکلة او شربة کے ہر ایک پر۔

تشریح:- اس پر اتفاق ہے کہ کھانے پینے کے بعد حمد مستحب ہے۔ تاہم اس کے الفاظ مختلف ہیں جن میں سے بعض امام ترمذیؒ نے شامل ترمذیؒ ”باب ماجاء فی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل الطعام وبعد ما یفرغ منه“ میں نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے الفاظ مروی ہیں۔^۱ حمد کی اقل مقدار ”الحمد للہ“ ہے۔ شاید یہ اختلاف الفاظ مختلف احوال کی وجہ سے ہو کہ کھانا جتنا اچھا ہو اللہ کی حمد اتنی زیادہ ہونی چاہئے۔ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ نے ”تنبیہ الغافلین“ میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جس کھانے میں چار

باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه

۱۔ راجع مجمع الزوائد ص: ۲۰ ج: ”باب ما یقول بعد الطعام“ کتاب الاطعمه، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۱۰۶

ج: ۳ ”الترغیب فی حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل“۔

باتیں ہوں وہ بہت عمدہ کھانا ہے (۱) حلال ہو (۲) شروع میں اللہ کا نام لیا گیا ہو (۳) کھانے والے زیادہ ہوں (۴) فارغ ہونے پر اللہ کی تعریف کی گئی ہو۔

تفسیر خازن میں سورہ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام سے گفتگو کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان فرشتوں سے پوچھا آپ کیوں نہیں کھاتے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ہم بغیر قیمت ادا نہیں کئے کھاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی قیمت تو ہے انہوں نے کہا کہ کیا قیمت ہے فرمایا: ”تذکرون اسم اللہ علی اولہ وتحمدونہ علی آخرہ“ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: ”حق لہذا ان یتخذہ ربہ خلیلاً“۔

ابن السنی المتوفی ۳۶۳ھ حج نے عمل الیوم واللیلۃ (ص ۴۱۵) میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث ذکر فرمائی ہے۔

”قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اکل طعاماً قال: الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین“۔

یہ روایت ابوداؤدؒ و ترمذی میں بھی ہے۔

ملا علی قاریؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ کھانے کے بعد حمد کرنا بطور شکر بھی ہے اور طلب یادۃ بھی کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ”لئن شکرتم لازیدنکم“ لآیۃؒ اور چونکہ کھانا کھانے سے نجد یدنعت ہوتی ہے اس لئے تجدید حمد بھی ہونی چاہئے، اور ساتھ اس کے بڑے اثرات سے استعاذہ و پناہ بھی ہے۔ پھر اس دعاء میں اہتمام شان اور مقتضائے حال کی وجہ سے حمد کو مقدم کیا۔ اور پانی کی ضرورت تو کھانے کی وجہ سے پیش آتی ہے اس لئے اس کے بعد ”وسقانا“ ذکر فرمایا۔ اور پھر نعمت ظاہری سے نعمت باطنی کی جانب انتقال فرما کر ”وجعلنا مسلمین“ فرمایا۔ (کذا فی المرقات) بہر حال یہ دعا کھانے کے بعد ہے۔ اور جب دسترخوان اٹھالیا جائے تو یہ پڑھے ”الحمد للہ کثیراً طیباً مبارکاً فیہ غیر مکفیّء ولا مودع ولا مستغنیٰ عنہ ربنا“ (کذا فی ابی داؤد، باب ما یقول اذا طعم، من حدیث ابی امامۃ قال کان رسول اللہ

۲ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ ”باب ما یقول اذا طعم“ کتاب الاطعمۃ، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۶ ”باب ما یقول اذا فرغ من الطعام“ ابواب الاطعمۃ۔ ۳ سورۃ ابراہیم آیت: ۷۔ ۴ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ مکتبہ حقانیہ ملتان۔

صلی اللہ علیہ وسلم اذا رفعت المائدة الخ)۔

باب ماجاء فی الأكل مع المجذوم

”عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخذ بيد مجزوم فادخله معه فی القصعة ثم قال کُل بسم اللہ ثقة باللہ وتوکل علیہ“۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کوڑھی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ پیالہ میں داخل کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ اللہ کا نام لیکر، اللہ پر بھروسہ اور اسی پر اعتماد کرتے ہوئے۔

لغات:- قولہ ”مجزوم“ ای صاحب جذام، جذام ایک مشہور بیماری ہے اردو میں اسے کوڑھ کہا جاتا ہے علی ہذا مجزوم کو کوڑھی کہیں گے۔ قولہ ”القصعة“ اس کے بارے میں پہلے گزرا ہے یعنی وہ طباق جس میں دس آدمیوں کا کھانا آ سکتا ہے۔ قولہ ”ثقة“ مصدر ہے بمعنی الوثوق پھر یہ مفعول مطلق ہے فعل مذکور کا یعنی ”کُل ثقة باللہ“۔ اسی طرح توکل بھی کُل کے مفعول مطلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ عموماً کوڑھی اس عار سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی بیماری دوسروں کو لگ جائے تو لوگ ملامت کریں گے، اور کبھی وہ ان لوگوں کی اذیت سے بھی ڈرتا ہے جن کو وہ چاہتا ہے، جیسے بیوی بچے تو ان کے ساتھ بھی نہیں کھاتا یہاں تو حضور محبوب علیہ السلام تھے اس لئے وہ آدمی جھجک محسوس کر رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر اس کو تسلی دیدی کہ نہ تو آپ کو عار لاحق ہوگا اور نہ ہی ندامت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا عامل مقدر ہو اور وہ واحد متکلم کا صیغہ ہو ای کل معی اَنْتُ ثِقَّةٌ بِاللّٰهِ وَاتَّوَكَّلْ نُوکُلْ عَلَیْهِ“۔

تشریح:- جذام کیا ہے؟ قرون وسطیٰ میں یعنی پانچویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی تک جذام سے پوری دنیا میں ڈرموجود تھا لوگ کوڑھی کو مردہ قرار دے کر اسے علامتی جنازے اور تدفین کے بعد شہر بدر کرتے۔ بعض علاقوں کے لوگ تو ملک بدری کے وقت اس کے گلے میں گھنٹی باندھ دیا کرتے، تاکہ اس کے آنے پر دوسروں کو پتہ چل کر بھاگنے کا موقع مل سکے۔ اگر وہ کسی غار میں رہائش پذیر ہو جاتا تو بعض خدا ترس لوگ اس کے کھانے کا انتظام یوں کرتے کہ کھانا لے جا کر اس سے دور رکھ کر اس کو آواز دیتے کہ آؤ کھانا لے جاؤ اور خود اس جگہ سے ہٹ جاتے۔ یہ بیماری آج کی طرح پوری دنیا میں پائی جاتی تھی، تاہم بنیادی طور پر یہ گرم اور مرطوب علاقوں کا مرض ہے پچانوے (۹۵) فیصد کوڑھی دنیا کے صرف گیارہ ممالک میں پائے جاتے ہیں

جیسے ہندوستان اور برازیل وغیرہ۔ اس بیماری کے ازالہ کے لئے علاج کے پروگراموں کی بدولت اس کی شرح میں کافی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۵ء میں جذام کے رجسٹر مریضوں کی تعداد دنیا بھر میں ۵۴ لاکھ تھی اور تخمیناً یہ تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

یہ بیماری ایک بیکٹیریا کی وجہ سے ہوتی ہے، بیکٹیریاں عام جراثیم سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ یہ بجائے گرم حصہ کے نسبتاً ٹھنڈے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں مثلاً جلد، ناک اور منہ وغیرہ، جذام کی ایک قسم تو معمولی نوعیت کی ہے مگر دوسری قسم بہت خطرناک ہے، جذام کے جراثیم بدن میں داخل ہونے کے بعد دس سے دس سال تک جذام ہو سکتا ہے، اس سے جسم کے ٹھنڈے حصوں پر زخم آنا شروع ہو جاتے ہیں اور گہرے ہوتے ہوتے متاثرہ جگہ کو تقریباً ختم کر دیتے ہیں خصوصاً ناک تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور آدمی شیر جیسی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مریض کی ناک کی رطوبت میں موجود بیکٹیریا، چھینک یا کھانسی میں خارج ہو جاتے ہیں، اور قریبی فضا میں تحلیل ہو کر دوسرے آدمی کے سانس کے ساتھ بدن میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے جذام کا حملہ ہو سکتا ہے، خصوصاً زخم یا خراش کے راستہ سے داخل ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔ تاہم سائنسدان اس کے پھیلاؤ کے اسباب جاننے میں ابھی تک سرگرداں ہیں کیونکہ جو لوگ جذامیوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں، ان میں کم ہی شاذ و نادر اگر کوئی کیس ایسا ہوا ہو کہ ڈاکٹر یا کوئی ملازم اس بیماری کا شکار ہوا ہو لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے سائنسدان کہتے ہیں کہ اس کے متعدی ہونے کا امکان صرف پانچ فیصد ہے، اور اسباب کی لاعلمی ہی کی وجہ سے اس بیماری کے مکمل خاتمے کی تدابیر ابھی تک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ ۹۵ فیصد سے زیادہ لوگوں میں خود کار مدافعتی نظام حملہ آور بیکٹیریا کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (مائیکروسوفٹ انسائیکلو پیڈیا)

اس تحقیق و تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جذام عام وبائی امراض کی طرح متعدی بیماری نہیں ہے۔ اور حدیث باب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک اور حدیث میں کوڑھی سے بچنے کا صاف حکم آیا ہے ”فر من المجذوم فرارک من الاسد“^۱ اور مسلم شریف کی روایت میں

باب ماجاء فی الاکل مع المجذوم

۱۔ رواہ البخاری ص: ۸۵۰ ج: ۲ ”باب الجذام“ کتاب الطب ولفظہ: فر من المجذوم کما تفر من الاسد، ایضاً اخرجه بلفظہ ابن ابی شیبہ فی مصنفہ ص: ۵۶۸ ج: ۵ کتاب الاطعمه، ایضاً اخرجه احمد فی مسندہ کذا فی معجم المفہرس ص: ۳۳۰ ج: ۱، ایضاً اخرجه عبدالرزاق فی مصنفہ ص: ۲۲ ج: ۱۰ حدیث: ۴۳۴۵۔

ہے کہ بنو ثقیف کے وفد میں ایک جذامی شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیج کر راستہ سے واپسی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ”ان قد بايعناك فارجمع“ ^۱ اور یہ تو بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کو حل کرنے کے لئے علماء نے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ جن میں سے سب سے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعدی بیماری سے اسباب کی حد تک بچنا چاہئے لیکن اگر بیماری لگ جائے تو اس اختلاط اور مرض کی تعدی کو مؤثر حقیقی اور واجبی قرار دینا عقیدہ توحید کے منافی ہے۔ چونکہ لوگوں میں عام تاثر یہی پایا جاتا تھا کہ ایسے مریض سے اختلاط کی بناء پر لامحالہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لئے صاحب جذام کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تا کہ اس عقیدہ کو باطل قرار دیدیں، جہاں تک اسباب کی حد تک متعدی ہونے کا تعلق ہے تو اپنی جگہ صحیح ہے، یعنی جیسے عام اسباب اپنے درجے میں کچھ تاثر رکھتے ہیں۔ اسی طرح وبائی امراض کا حال بھی ہے۔ لہذا باب کی حدیث اسی طرح ”لا طيرة ولا عدوى“ الحدیث نفی عقیدہ باطلہ کے لئے ہے اور ”قِرَ من المجدوم فرارك من الاسد“ وغیرہ احادیث درجہ اسباب میں احتیاط کے طور پر تعلیم پڑتی ہے۔

قوله ”هذا حديث غريب“ اس حدیث کی تخریج ابوداؤد ^۲، نسائی ^۳، ابن ماجہ ^۴، ابن حبان اور حاکم ^۵ نے بھی کی ہے۔ قوله ”والمفضل بن فضالة شيخ آخر مصري“ امام ترمذی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ”مُفَضِّل بن فَضَّالہ“ نام کے دوراوی ہیں ایک سے باب کی حدیث مروی ہے یہ بصری ہیں جو ضعیف من السابجہ ہیں۔ جبکہ دوسرے مصری ہیں وہ ثقہ ہیں گو کہ ابن سعد نے ان کو بھی ضعیف کہا ہے مگر یہ ان کا سہو ہے وہ ثامنہ میں سے ہیں۔ قوله ”وروى شعبة هذا الحديث“ الخ یعنی شعبہ کی روایت میں یہ واقعہ حضرت عمرؓ کا ذکر کیا ہے تاہم یہ منقطع ہے مگر امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: ”وحدیث شعبہ اثبت عندی واصح“ اس واقعہ میں مجذوم کا نام حضرت معقیب ہے۔

۲ صحیح مسلم ص: ۲۳۳ ج: ۲ ”باب اجتناب المجدوم“ کتاب السلام، ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۵۳ ابواب الطب.
 ۳ سنن ابی داؤد ص: ۱۹۱ ج: ۲ ”باب فی الطيرة والخط“ آخر کتاب الطب. ۴ سنن نسائی ص: ۱۸۳ ج: ۲ ”بیعة من به عاهة“ کتاب البیعة. ۵ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۳ ”باب الجذام“ ابواب الطب. ۶ ایضاً رواہ ابن ابی شیبہ فی مصنفہ ص: ۵۶۸ ج: ۵ ”الأكل مع المجدوم“ کتاب الاطعمة

باب ماجاء أن المؤمن يأكل في معي واحد

”عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الكافر يأكل في سبعة أمعاء والمؤمن يأكل في معي واحد“۔ (حسن صحيح) ^۱

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کافر سات انتڑیوں میں کھاتا ہے اور مؤمن ایک انتڑی میں کھاتا ہے۔

لغات:۔ قولہ ”أمعاء“ فتح الہمزہ معی کی جمع ہے معی بکسر المیم بروزن الی یعنی الف مقصورہ کے ساتھ بھی ہے اور یاپرتوین بھی جائز ہے۔ جبکہ دوسری قرأت اس میں میم مفتوحہ والف ممدودہ کی ہے۔ اسے آنت بھی کہتے ہیں اور انتڑی بھی۔

تشریح:۔ اس حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں علماء و شارحین کے اقوال دس سے متجاوز ہیں، جن میں سے سات تو ترمذی کے حاشیہ پر بھی مذکور ہیں جو باسانی دیکھے جاسکتے ہیں اس لئے ان کو یہاں نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، امام ترمذی کا اشارہ خاص واقعہ کی طرف ہے۔ ان تمام توجیہات میں ہمارے نزدیک سب سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ اس میں تمثیل اور مجازی معنی مراد ہے اور سات کا عدد حقیقی معنی پر محمول نہیں بلکہ مبالغہ پر حمل ہے جیسے اس آیت میں ہے ”والبحریمدہ من بعدہ سبعة ابحر“ ^۲ پس مطلب یہ ہوا کہ کافر اتنا زیادہ کھاتا ہے گویا وہ سات یعنی بہت ساری انتڑیوں کو بھرتا ہے، یہ حکم اگرچہ بظاہر عام نہیں ہے کیونکہ بعض مؤمن کافر سے زیادہ کھاتا ہے، تاہم مؤمن اور کافر کے مقاصد میں فرق ہے کافر کا مقصد خواہش کی پیروی ہے جبکہ مؤمن کا مطلوب رضائے ربانی اور اس کے لئے عبادت پر تقویت حاصل کرنا ہے، اس لئے کافر کی کوشش پیٹ بھر کر کھانا ہوتا ہے جبکہ مؤمن کی کوشش کمرسیدھی رکھنا، تاہم اس کو ایک اور تنقید کی ضرورت ہوگی یعنی کامل مؤمن کی شان یہ ہوتی ہے کیونکہ عام مؤمن بھی اپنا اصلی مقصد سو فیصد ملحوظ نہیں رکھتا۔ البتہ اس مطلب میں

باب ماجاء ان المؤمن يأكل في معي واحد

۱۔ الحدیث أخرجه عبد الرزاق في مصنفه ص: ۳۴ ج: ۱۰ حدیث: ۴۳۷۶، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۳ ابواب

الاطعمه، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۹ ج: ۵ کتاب الاطعمه، ایضاً مسند احمد بن حنبل ص: ۶۱۱ ج: ۲

حدیث ۸۰۵۳ دار احیاء التراث العربی بیروت۔ ۲۔ سورة لقمن آیت: ۲۷۔

عوارض کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ کبھی کافر ریاضت اور بیماری کی وجہ سے کم کھاتا ہے اور مؤمن معدے کی قوت یا مرض کی بنا پر زیادہ کھاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب "عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ یہ خبر بمعنی انشاء کے ہے، یعنی مؤمن کو مناسب یہ ہے کہ وہ کم کھائے، یہ ترغیب اگرچہ عام ہی ہے تاہم وقت اور حالات کے پیش نظر اس کا تقاضا متفاوت سمجھنا چاہئے۔ ہجرت کے زمانہ میں مہاجرین کو جس بھوک اور افلاس کا سامنا تھا اس کے بموجب مقامی لوگوں کو کم کھانے کی بار بار ترغیب دی جاتی جیسا کہ اگلے باب میں بھی ہے۔ اس کا نقد فائدہ یہ ہوتا تھا کہ نو وارد مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انتظام آسان ہو جاتا۔ اسی علت کے پیش نظر حضرت عمرؓ کا قول بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ابن العربیؒ نے عارضہ میں نقل کیا ہے "وقدمهم عمر فی سنة المحاعة ان يجعل مع اهل كل بيت مثلهم" یعنی افلاس اور قحط والے سال حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ جس گھر میں جتنے افراد ہیں ان کے ساتھ اتنے ہی محتاجین شامل طعام کر لیں۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور زیادہ کھانے سے دینی فائدہ ہو تو پھر بجائے کم کھانے کے زیادہ کھانا افضل ہوگا کیونکہ مؤمن کی غرض اصلی تو دینی فائدہ ملحوظ ہونا چاہئے۔

چنانچہ ابن الجوزیؒ اپنی کتاب "صید الخاطر" میں لکھتے ہیں:

"وقد قال احمد بن حنبل: اكره التقلل من الطعام فان اقواما فعلوه فعجزوا عن الفرائض وهذا صحيح فان المتقلل لا يزال يتقلل الى ان يعجز عن النوافل ثم الفرائض ثم يعجز عن مباشرة اهله واعفائهم وعن بذل القوى في الكسب لهم وعن فعل خير قد كان يفعل ولا يهولنك ما سمعته من الاحاديث التي تحت على الجوع فان المراد بها ما الحث على الصوم واما النهي عن مقاومة الشبع فاما تنقيص المطعم على الدوام فمؤثر في القوى فلا يجوز"۔ (صید الخاطر ص: ۲۳ دار الفکر)

مطلب یہ ہے کہ دینی فائدہ کے درپے رہنا چاہئے خواہ وہ کم کھانے میں ہو یا زیادہ میں اچھے کھانوں اور طاقت کی ادویات کا بھی یہی حکم ہے، کہ اگر ان کے استعمال سے نیکی کمانے کا ارادہ ہو تو وہ عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر غلط ارادہ اس کا باعث ہو تو وہ گناہ کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں، گویا نیت اور غرض ہی وہ چیزیں ہیں جو مباحات کو عبادات میں بھی تبدیل کر سکتی ہیں اور محصیت میں بھی۔ ہاں فوق الشیخ بقصد شہوت حرام ہے یعنی اتنا کھانا کہ اس سے نقصان ہو (کمافی الدر المختار، کتاب الحظر والاباحۃ)

الاشباہ میں ہے ”الاكل فوق الشبع حرام بقصد الشهوة وان قصد به التقوى على الصوم او مؤكلة الضيف فمستحب“۔ (الاشباہ والنظائر ص: ۳۳ قدیمی کتب خانہ)

لہذا نہ کم کھانا مطلقاً محمود ہے اور نہ ہی زیادہ کھانا علی الاطلاق مذموم ہے، تاہم عام حالات میں کم کھانا نسبتاً اچھا ہے مگر اتنا کم بھی نہیں کہ اس سے نفس کا حق مارا جائے کیونکہ نفس کو قابو کرنا اگرچہ لازمی ہے مگر اس کی حق تلفی ہرگز روا نہیں۔

دوسری حدیث:۔ امام ترمذی نے ایک اور حدیث بھی نقل فرمائی ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک کافر مہمان ہوا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے واسطے (دودھ دوھنے کا) حکم دیا ایک بکری کے بارے میں چنانچہ وہ دودھ لی گئی تو اس نے سارا دودھ پی لیا پھر دوسری دودھ لی گئی، اس نے وہ بھی پی لیا پھر ایک اور تو وہ اس کو بھی پی گیا یہاں تک کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا پھر صبح کو بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک بکری کا دودھ نکالنے کا حکم دیا جب وہ دودھ دوہا گیا تو اس نے وہ دودھ پی لیا پھر جب دوسری کا حکم دیا تو وہ پورا نہ پی سکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پیتا ہے۔

تشریح:۔ گویا امام ترمذی کے نزدیک سابقہ حدیث کا پس منظر یہی ہے لہذا یہ ایک مخصوص واقعہ کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام لانے سے اس آدمی میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلاً اس پر بحث فرمائی ہے کہ ہر انسان میں دو نفس یا دو رو حیں ہوتی ہیں ایک بے کمی دوسری ناطقہ اور ملکی کبھی ایک غالب رہتی ہے اور کبھی دوسری۔ لہذا جب وہ کافر تھا تو بہیمیت غالب تھی اور جب مسلمان ہوا تو ملکیت غالب آئی۔ بہیمیت کا تقاضا زیادہ کھانا ہے اور ملکوتیت کا تقاضا کم کھانا۔

باب ماجاء فی طعام الواحد یکفی الاثنین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: طعام الاثنین کافی الثلاثة وطعام الثلاثة کافی الاربعة“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو آدمیوں

کا کھانا تین کو کافی ہے اور تین کا کھانا چار کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

تشریح:- اس حدیث میں مل کر کھانے اور کفایت شعاری کی ترغیب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کھانے سے دو آدمیوں کے پیٹ بھر سکتے ہیں وہ تین آدمیوں کی قناعت کے لئے کافی ہو جاتا ہے، مثلاً اگر دو آدمیوں کے لئے چار روٹیاں سیر ہونے کے لئے درکار ہوں تو اگر وہ ایک آدمی اپنے ساتھ اور شریک کر کے ہر واحد ڈیڑھ روٹی سے کچھ کم کھالیں تو یہ بھی کافی ہے کیونکہ اس صورت میں بھوک مارنے کی ضرورت یقیناً ختم ہو جائے گی اور ساتھ ساتھ ایک بھوکے آدمی کا کام بھی ہو جائے گا، علیٰ ہذا القیاس جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اس حدیث کو بھی اسی طرح سمجھا جائے جو سابقہ باب میں بیان ہوا یعنی اس میں کم کھانے کی ترغیب اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کو اجاگر کرنا ملحوظ ہے، اور یہ کہ کم کھانے کے فوائد بہت ہیں جبکہ زیادہ کھانا نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

آج کل کتنے لوگ ہیں جو زیادہ کھانے کی وجہ سے بیمار ہیں شوگر تو وبائی شکل اختیار کر چکی ہے، کم کھانے سے کوئی نہیں مرتا جبکہ کثرت سے کھانا جان لیوا ثابت ہوا ہے۔ آج اگر اس حدیث پر عمل ہو جائے اور سترہ کروڑ پاکستانی عوام اگر دن کے تین اوقات کے کھانے میں سے صرف ایک روٹی کم کر لیں تو یومیہ سترہ کروڑ روٹیوں کی بچت ہوگی جن سے بہت سارے غریب گھرانوں کی کفالت ہو سکتی ہے، اور یہ ممکن ہے کہ آٹے کے موجودہ بحران پر قابو بھی پایا جاسکے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی أكل الجراد

”عن عبد الله بن أبي أوفى أنه سئل عن الجراد فقال غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بست غزوات نأكل الجراد“۔

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی (نزیل کوفہ التونی ۷۷۷) رضی اللہ عنہ سے ٹڈی کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ غزوات میں شریک رہا ہوں، ہم ٹڈیاں کھاتے تھے۔

لغات:- ”الجراد“ بفتح الجیم وتخفيف الراء جمع کا صیغہ ہے مفرد جرادة ہے اس میں تذکیر و تانیث لفظ حمامہ کی طرح برابر ہیں۔ بعض حضرات نے اس کو ”جرذ“ سے مشتق مانا ہیں چونکہ جرد کے معنی نکا کرنے کے ہیں

مڈیوں کا لشکر اور غول جس کھیتی سے گذر جائے تو اس کے پتے کھا کر ساری فصل کو پتوں اور پچاؤں سے فارغ کر دیتا ہے۔

تشریح:۔ امام نوویؒ نے مڈی کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے گو بعض شافعیہ سے اس کی کراہیت منقول ہے تاہم اس میں اتنا سا اختلاف ضرور ہے، کہ آیا یہ بغیر ذبح کے محض مارنے سے حلال ہو جاتی ہیں یا ذبح شرط حلت ہے؟ تو امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور جمہور کے نزدیک مڈی جیسے بھی مر جائے اس کا کھانا جائز ہے چاہے ذبح سے مرے یا شکار کرنے سے خواہ شکار کرنے والا مجوسی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح خود مر جانے والی یا کوئی سبب رونما ہونے سے دم توڑنے والی سب برابر ہیں۔ جبکہ امام مالکؒ ماہوا المشہور کے مطابق اور ایک روایت میں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ تب حلال ہے جب اس کا سر کاٹ لیا جائے یا کوئی عضو کاٹ کر مارا جائے یا اسے زندہ آگ میں ڈال کر پکایا جائے۔ اگر وہ خود بخود مر جائے تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی میں فرمایا ہے کہ یہ حکم تمام مڈیوں کو شامل نہیں بلکہ بعض مڈیاں کھائی نہیں جاسکتیں۔

”والجراد اشکال: منہ ماکول ومنہ مالا یوکل لضررہ وقلة فائدته فی التغذیة ...

وجراد الحجاز کله ماکول وجراد الاندلس غیر ماکول انما هو ضرر محض۔“

(عارضۃ الاحوذی)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ ماہرین نے مڈیوں کی خاصیات میں یہ جو کہا ہے کہ اس میں دس جانوروں کے نمونے موجود ہیں کہ اس کی ران اونٹ کی مانند اور ٹانگیں شتر مرغ کی طرح اور دم سانپ جیسی اور گردن بیل جیسی وغیرہ وغیرہ تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حکم تمام مڈیوں کو شامل نہیں کیونکہ ہم نے جو چھوٹی اقسام مڈیوں کی دیکھی ہیں ان میں یہ خواص نہیں پائے جاتے اس لئے بظاہر یہ وہ مڈیاں ہیں جو پرندوں کی طرح بڑی ہیں۔ پہلے زمانے میں ان کو قحط کی مڈیوں سے تعبیر کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ غول درغول علاقے میں داخل ہو کر کھیتوں کا صفایا کر دیتی تھیں اور ریت میں جگہ بنا کر انڈے دیتی تھیں جبکہ بہت معمولی اور عام مڈیوں میں یہ چیز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کھانا ثابت ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں دونوں قول ہیں

باب ماجاء فی اکل الجراد

۱۔ کذا فی النووی علی مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ ”باب اباحۃ الجراد“ کتاب الصيد والذبائح۔

عام یہی ہے کہ ثابت ہے کیونکہ بخاری^۱ اور ابوداؤد^۲ وغیرہ کی روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کی تصریح ہے۔ بخاری شریف اور ابوداؤد میں ”فکنا ناکل معہ“ کے الفاظ ہیں جس میں صرف موجودگی کا بیان بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھائی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تناول فرمانے کا ذکر بھی ہو سکتا ہے۔

باب ماجاء فی اکل لحوم الجلالة و البانها

”عن ابن عمر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اكل الحلالة والبانها“۔
(حسن غریب)^۱

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلالتہ کے گوشت اور دودھ کے کھانے پینے سے منع فرمایا ہے۔
دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهى عن المحثمة وعن لبن الحلالة وعن الشرب من فی السقاء“۔^۲
حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجثمہ کے کھانے و جلالتہ کے دودھ پینے اور مشکیزہ کے دھانے سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

لغات:- قولہ ”المحثمة“ اس کی قدرے تفصیل ابواب الصيد میں گذری ہے وہاں امام ترمذیؒ نے اس پر باب باندھا ہے ”باب ماجاء فی کراهية اكل المصبورة“ اس حدیث میں مجثمہ کی تفسیر بھی کی گئی ہے ”وهی التي تصبر بالنبل“ یعنی وہ جانور جو نشانہ بازی کے لئے باندھا اور تیروں سے نشانہ بنایا جاتا ہے، جس کا عربوں میں رواج تھا، ج، ث، ہ، مادہ میں زمین کے ساتھ چمٹنے کے معنی پائے جاتے ہیں، جس جانور کو باندھ لیا جاتا ہے وہ مجثمہ اس لئے کہلاتا ہے، کہ وہ اڑنے اور بھاگنے سے قاصر ہو کر پیوست زمین رہتا ہے

۱ صحیح بخاری ص: ۸۲۶ ج: ۲ ج: ۲ ”باب اكل الجراد“ کتاب الذبائح والصيد الخ. ۳ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۸ ج: ۲ ”باب فی اكل الجراد“ کتاب الاطعمہ، ایضاً رواہ مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ کتاب الصيد والذبائح، ایضاً سنن نسائی ص: ۲۰۱ ج: ۲ کتاب الصيد والذبائح، ایضاً سنن کبری للبیہقی ص: ۱۶۱ و ۱۶۲ ج: ۱۳ کتاب الصيد والذبائح.

باب ماجاء فی اكل لحوم الجلالة و البانها

۱ الحدیث اخرجه ابو داؤد فی سننه ص: ۱۷۵ ج: ۲ کتاب الاطعمہ، ایضاً سنن کبری للبیہقی ص: ۳۲۳ ج: ۱۳ حدیث: ۲۰۰۱۵ کتاب الضحایا. ۲ الحدیث اخرجه البيهقي فی سننه الكبرى ص: ۳۲۳ حدیث: ۲۰۰۱۹ ج: ۱۳ کتاب الضحایا.

اگر ایسے جانور کو ذبح نہ کیا جائے تو وہ حلال نہیں، کیونکہ یہ ذبح اضطراری کے حکم میں نہیں۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اس نہی کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ اس سے حیوان کو تکلیف اور اذیت ملتی ہے جو حرام ہے، دوسرے یہ بغیر ذبح کے مر جاتا ہے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی جانور از خود زمین سے چمٹا ہوا بیٹھا ہو تو اسے شکار کرنے میں کوئی کراہیت نہیں۔

قولہ ”الحلالہ“ مفتح الحجم وتشدید اللام الاول وہ جانور جو میٹگنیاں وغیرہ گندگی کھاتا ہو۔ بعض لوگوں نے جلالہ کے لفظ کی تشدید کو اور مبالغہ کے صیغہ کو دیکھ کر کہا ہے کہ وہ جانور جو کثرت سے فضلہ کھائے خواہ وہ انسانی فضلہ ہو یا کسی اور جاندار کا۔ یہ لفظ دراصل ”چلتہ“ بالکسر سے بنا ہوا ہے چلتہ کے معنی میٹگنیوں اور لید وغیرہ کے ہیں۔

تشریح:- گندگی کھانے والے جانور کے گوشت کھانے، دودھ پینے، اور اس پر سواری کرنے کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں:

تحفۃ الاحوذی میں امام خطابی سے مذاہب کی تفصیل کچھ یوں نقل کی گئی ہے، کہ حسن بصریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ اسحاق بن راہویہؒ اچھی طرح دھونے کی شرط پر کھانے کے جواز کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس کا کھانا مکروہ ہے یعنی تحریم اگرچہ عام شافعیہ تنزیہی کے قائل ہیں۔ اور تقریباً یہی اختلاف جلالہ کے اثرے اور قربانی میں بھی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ایسے جانور کی قربانی نہیں کرنی چاہئے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جیسے انسان شراب پینے اور خنزیر کھانے سے ناپاک نہیں ہوتا ایسا ہی جلالہ نجس نہیں ہوتا۔ ہم نے کتاب کے شروع میں بتلایا تھا کہ قلب الحقائق سے حکم تبدیل ہو جاتا ہے لہذا جو چیزیں نجاست سے متولد ہوں مگر ان پر نجاست کا اثر نہ ہو جیسے گوبر میں سبزی اُگائی اور حقیقت تبدیل ہو جائے تو اعتبار مال کو ہوگا، ہاں البتہ صرف صورت کی تبدیلی سے حکم تبدیل نہ ہوگا۔ لہذا اگر جلالہ کے گوشت وغیرہ پر گندگی کا کچھ اثر ظاہر نہ ہوا ہو تو اس کا کھانا اور دودھ استعمال کرنا جائز ہے، جیسا کہ بذل المجہود میں جلالہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا غلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:

”والحلالۃ التي تعاد اكل العنرة وهذا اذا ظهر اثر النجاسة في لحمها ولبنها، واما

مادام لم يظهر اثرها يحوز اكلها وبعد ظهور الاثر ينبغي ان تحبس حتى زال

اثر النجاسة منها“۔ (بذل ص ۳۵۴ ج ۵)

یعنی جلالہ وہ ہے جو کثرت سے گندگی کھانے کا عادی ہو پھر اگر اس پر اثرات رونما ہو جائیں گے تو جب تک باندھ کر اور متبادل غذا کھلا کر ان اثرات کا ازالہ نہ کر دیا جائے اس وقت تک اس کے کھانے سے اجتناب کر لینا چاہئے، گوکہ احتیاط اسی میں ہے کہ بغیر ظہور اثر کے بھی اسے کچھ دنوں تک باندھ کر پاک غذا کھلائی جائے چنانچہ ابن عمرؓ مرغی کو تین یوم تک باندھنے کے بعد ہی ذبح فرماتے۔

حدیث باب میں تیسرا مسئلہ مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پانی پینے کی ممانعت ہے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس نہی کی تین وجوہات ہیں: ایک یہ کہ اس طرح پینے سے منہ کے مستعمل پانی کا کچھ حصہ مشکیزے کے اندر واپس جاسکتا ہے۔ دوم یہ کہ منہ کی بو کا اثر مشکیزے کے دھانے پر باقی رہ سکتا ہے جسے دوسرے لوگ پسند نہیں کریں گے۔ سوم یہ کہ اس طرح اندر کا پانی نظر بھی نہیں آتا اس لئے یہ امکان پایا جاتا ہے کہ کوئی ناگوار چیز منہ کے اندر چلی جائے چنانچہ ایک آدمی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ منہ لگا کر پانی پی رہا تھا تو اس کے منہ میں مشکیزے سے سانپ چلا آیا نیز ایسا کرنے سے منہ میں یک دم زیادہ پانی جاسکتا ہے جو تکلیف کا سبب ہے اور کپڑوں پر گر سکتا ہے۔ اور جس روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اسی طریقے سے پانی نوش فرمایا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ علل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں پائے جاتے تھے ”لیرکھه وعطرینہ وطھارنہ وأمنہ من الغوائل والحوادث“۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہی اس واقعہ سے متاخر ہو۔ یا پھر وہ حاجت پر محمول ہے۔ (انتہی مافی العارضہ)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ رات کو اندھیرے میں پانی پینا ہو تو اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے کہ پانی بالکل صاف ہے۔ آج کل شہروں میں فریجوں کا استعمال عام ہے لوگ بوتلوں میں پانی رکھتے ہیں چونکہ پانی رکھتے وقت اس کا اطمینان کر لیا جاتا ہے اس لئے بند بوتل میں کسی چیز کے داخل ہونے کا امکان نہیں رہتا اس لئے بوتل کے ساتھ منہ لگا کر پانی پینا اس اعتبار سے تو جائز ہونا چاہئے لیکن اگر بوتل میں پانی رہ جاتا ہے اور دوسرے کی ناگواری طبع کا سبب بن رہا ہے تو پھر کراہت باقی رہے گی۔ اسی طرح اگر رات کو گلاس وغیرہ میں پانی ڈال کر پینا ہو تو بھی اطمینان کر لینا چاہئے کہ گلاس صاف اور خالی ہے۔

آج کل ڈبوں میں جوس ملتا ہے، چونکہ وہ پیک ہوتا ہے اور ایک ہی آدمی کے لئے ہوتا ہے پھر اسے

گلاس میں نکالنا بھی کافی دشوار ہوتا ہے اس لئے ننگی کے ذریعے پینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس ننگی اور ڈبے کو پھینکا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی اکل الدجاج

”عن زهدم الحرمی قال دخلت علی ابی موسیٰ وهو یأکل دجاجة فقال أدن فکل فانی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأکله۔“^۱

حضرت زہد م جرمی فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو موسیٰؓ کے یہاں گیا اور وہ مرغی کا گوشت کھا رہے تھے، انہوں نے فرمایا: قریب ہو جاؤ اور کھاؤ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغی کا گوشت تناول فرماتے ہوئے دیکھا ہے۔

لغات :- دجاج جمع ہے اور دجاجہ مفرد ہے دونوں میں دال پر تینوں حرکات جائز ہیں تاہم فتح سب سے اچھا ہے پھر کسرہ اور ضمہ کی صرف گنجائش ہے۔ بعض حضرات نے فتح مرغی کے لئے اور کسرہ مرغ کے لئے مختص مانا ہے، کاش وہ یہ فرق اس کے برعکس کرتے، تدبیر۔ بہر حال دجاج اسم جنس ہے سب پر اطلاق ہوتا ہے مگر مفرد میں مرغ کے لئے دیک آتا ہے نہ کہ دجاجہ۔ دج یدج کے معنی اسراع اور جلدی کرنے کے ہیں چونکہ مرغیاں بھی اکثر متحرک رہتی ہیں بار بار گھر سے باہر آتی جاتی ہیں اس لئے ان کو دجاج کہتے ہیں۔

قوله ”زهدم الحرمی“ مفتی انزاء وسکون الہاء بردزن جعفر جرمی مفتیہ جیم وسکون الراء بصری اور ثقہ راوی ہیں۔
تشریح :- اس حدیث سے مرغی کے کھانے کا جواز ثابت ہوا جو بالا جماع حلال ہے۔ باب کی اگلی حدیث حسن و صحیح ہے علاوہ ازیں بھی متعدد صحیح احادیث سے مرغی کی حلت معلوم ہوئی ہے۔ گوکہ بعض نے جلالہ کو متشکی کیا ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں گذر گیا۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں۔

”فالذی اکل النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللحم الابل والبقر والغنم والدجاج

والارنب والحمار الوحشی والحباری“۔

باب ماجاء فی اکل الدجاج

^۱ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۲۹ ج: ۲ ”باب لحم الدجاج“ کتاب الذبائح، ایضاً صحیح مسلم ص: ۴۷ ج: ۲

کتاب الایمان، ایضاً سنن کبریٰ للبیہقی ص: ۳۲۶ ج: ۱۴ حدیث: ۲۰۰۰۲۵۔

حبارئ کا ذکر اگلے باب میں آ رہا ہے۔

فارمی مرغیوں کا حکم:۔ آج کل فارم میں مرغیوں کو جو دانہ کھلایا جاتا ہے اس میں مچھلی اور خون کو ملایا جاتا ہے چونکہ دم مسفوح نجس اور حرام ہے ان لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان مرغیوں کا کھانا جائز ہے یا حرام و مکروہ اور یہ مسئلہ بھی بظاہر جلالہ کی طرف لوثا ہے تاہم جلالہ جو گندگی کھاتا ہے وہ عین نجاست ہوتی ہے جبکہ مرغیوں کا دانہ مکچر ہوتا ہے نیز دوسری اجناس کے غلبہ کے علاوہ اس خون میں تبدیلی بھی لائی جاتی ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اس غذا میں قلب الحقیقت کی بنا پر خون کا عنصر اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتا چنانچہ جلالہ کا حکم بھی یہی گذرا ہے کہ اگر اس کے جسم پر نجاست کا اثر ہو تو وہ حلال ہے، جیسا کہ در مختار میں جلالہ کے بارے میں لکھا ہے:

”ولو اكلت النجاسة وغيرها بحيث لم يتن لحمها حلت كما حل اكل جدي غُذِيَ بلبن خنزير لان لحمه لا يتغير وما غُذِيَ به يصير مستهلكا لا يبقی له اثر“۔
اس پر علامہ شامی لکھتے ہیں:

”وعن هذا قالوا: لا بأس بأكل الدجاج لانه يخلط ولا يتغير لحمه وروى نانه عليه الصلوة والسلام يأكل الدجاج وروى ان الدجاج تحبس ثلاثة ايام ثم تذبح فذلك على سبيل التنزه۔“ (الدر المختار مع رد المحتار ص ۶۳۳ ج ۶ کتاب الطہر والاباحہ، ایچ ایم سعید کراچی)
اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف گندگی کے کھانے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا اثر بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ اگر اثر رد نما ہو کر باقی ہو تو ازلہ اثر تک کھانا حرام ہے اور اگر اثر نہ پڑا ہو یا ختم ہو چکا ہو تو بلا کراہیت جائز ہے۔
قبولہ ”وفی الحلیث کلام اکثر من هذا“ یعنی یہاں پر امام ترمذی نے اس حدیث کا صرف متعلقہ حصہ نقل کیا ہے ورنہ یہ کافی طویل حدیث ہے، پھر اس حدیث سے نسبت زیادہ حصہ مصنف نے شامل ترمذی میں ”باب ما جاء فی صفة ادم رسول الله صلى الله عليه وسلم“ میں ذکر کیا ہے۔

”عن زهدم الحمری قال کنا عند ابی موسیٰ قال فقدم طعمه و قدم فی طعمه لحم دجاج وفی القوم رجل من بنی تیم الله احمر کانه مولی (رومی) قال فلم یبدن فقال له ابو موسیٰ: یادن فانی قلنا ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل منه قال انی رأیتہ يأكل شیئاً (گندگی) فقلنا فقلنا ان لا اطعمه ابداً۔“ (شکل ص ۱۰، ایچ ایم سعید کراچی)

یہ حدیث زیادہ تفصیلی دیکھنی ہو تو عارضۃ الاحوذی وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ شاکل کے حاشیہ پر اس حدیث سے چند مسائل مستنبط کر کے لکھے گئے ہیں: (۱) جو آدمی عین کھانے کے وقت آجائے اس کو بھی دعوت دینا چاہئے (۲) اگر وہ انکار کرے تو اس کی وجہ پوچھی جاسکتی ہے بلکہ پوچھنا چاہئے (۳) اگر وہ وجہ ممکن الزوال ہو تو اس کا ازالہ کر لینا چاہئے (۴) اگر آدمی کسی چیز سے قسم کھائے مگر اس کی دوسری جانب مقابل شرع کے مطابق ہو تو قسم توڑ لینا چاہئے (اور پھر کفارہ دے) (۵) اگر کوئی کام شرعاً منع نہ ہو گو نفس کو ناگوار گذرتا ہو تو اس پر چلنا چاہئے یعنی نفس کی پیروی کے بجائے شرع کا اتباع کر لینا چاہئے۔

ملفوظ:- بعض لوگ کھانے پینے کی چیزوں میں مہمان کو زبردستی کھلاتے پلاتے ہیں یعنی اتنا اصرار کرتے ہیں کہ مہمان اخلاقاً مجبور ہو جاتا ہے اگر مہمان ازراہ تکلف انکار نہ کرتا ہو تو اتنا اصرار اصرار کے زمرے میں آتا ہے، چنانچہ راقم کی زیادہ چائے پینے سے نیند بھی اڑ جاتی ہے اور بھوک بھی مرجاتی ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں سے جب یہ عذر پیش کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ایک کپ سے کچھ نہیں ہوتا اس طرح کبھی متعدد جگہوں سے کئی کپ پینے کی وجہ سے خواب آور گولی کھانے سے بھی نیند نہیں آتی اور بھوک نہ لگنے کی وجہ سے کمزوری بڑھ جاتی ہے آیا اس طرح کرنا مہمان نوازی کا اعلیٰ نمونہ ہے؟؟؟

باب ماجاء فی اکل الحباری

”عن ابراہیم بن عمر بن سفینۃ عن ابیہ عن جدہ قال: اکلت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحم حباری“۔^۱

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرخاب پرندے کا گوشت کھایا ہے۔

لغات:- قولہ ”حباری“ بضم الحاء اخیر میں الف مقصورہ ہے اسم جنس ہے تذکیر و تانیث اس میں برابر ہیں۔ سرخاب یہ ایک لمبی گردن والا تیز رفتار پرندہ ہے جس کی چونچ طویل اور رنگ خاکی ہوتا ہے۔ حماقت میں ضرب المثل ہے مگر اس کے باوجود اپنے بچے سے شدید محبت کرتا اور اسے اڑنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ کہتے

ہیں کہ اس کے پیٹ میں ایک پتھر ہوتا ہے جو احتکام اور اسہال کے روکنے کے لئے مفید ہے۔

تشریح:- اس روایت سے سُرخاب کا حلال و ماکول ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے تاہم اس مسئلہ میں کسی کو اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے سند میں دونوں ابراہیم کی وجہ سے اثنیہیں پڑتا۔ چنانچہ سخاویؒ نے فتح المغیث میں لکھا ہے:

”وكذا اذا تلقت الامة الضعيف بالقبول بعمل به على الصحيح حتى انه ينزل

منزلة المتواتر في انه ينسخ المقطوع به ولهذا قال الشافعي في حديث ”لاوصية

لوارث“ انه لا يثبت اهل الحديث ولكن العامة تلقت بالقبول وعملوا به حتى

جعلوه ناسخاً لآية الوصية“۔ (مآئس الیہ الحاجۃ دراول ابن ماجہ ص ۲۴، طبع قدیمی کتب خانہ)

فولہ ”و یقول بُرہ بن عمر“ یعنی ابن ابی فدیہ (مصر) اپنی روایت میں ابراہیم کے بجائے بُرہ بن بصیغہ تفسیر کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے بُرہ کو لقب کہا ہے۔ امام بخاریؒ اور امام عقیلیؒ اس حدیث کو مجہول السند قرار دیتے ہیں مگر اس کا مضمون بلا شک صحیح ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کبھی حدیث سنداً ضعیف اور عملاً قوی و صحیح ہو سکتی ہے۔

باب ماجاء فی اکل الشِواء

”قال ابن جریر اخبرنی محمد بن یوسف ان عطاء بن یسار اخبرہ ان ام سلمة اخبرته انها

قربت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنباً مشویاً فأكل منه ثم قام الی الصلوة و ماتوضاً“۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عطاء بن یسار کو خبر دی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بُھنا ہوا پہلو پیش کیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول فرمایا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور وضو نہیں کیا۔

لغات:- قولہ ”الشِواء“ بکسرہ شین والفاء ممدودہ کے ساتھ تاہم شین پر ضمہ بھی جائز ہے بُھنا ہوا

گوشت کہلاتا ہے۔ قولہ ”جنباً“ اس کے کئی معنی آتے ہیں، پہلو، سمت، گوشہ، کنارہ اور بدل و مقابلہ وغیرہ یہاں مراد معنی اول یعنی پہلو ہے جس کو بازو سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ قولہ ”مشویاً“ مفعول کا صیغہ ہے شوی سے یعنی

بُھنا ہوا، حدیذ و مسوط اس کے مراد فین ہیں یہ گوشت انگاروں میں دبا کر پکایا جاتا تھا۔ (لسان العرب)

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قسم کا پکا یا ہوا گوشت کھانا ثابت ہے۔ بھنا ہوا بھی جیسا کہ باب کی حدیث میں ہے۔ اور قدید بھی یعنی گوشت کی بوٹیاں دھوپ میں سکھا کر اس کا سالن بنایا جائے اور قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت حدید کا جوڑ کر آیا ہے، اس سے بھی مشوی یعنی بھنا ہوا مراد ہے۔ ان میں زیادہ لذیذ اگرچہ بھنا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قدید زیادہ مفید ہے کیونکہ اس کی مدح اور ترغیب مروی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت میں زیادہ شوربا بنانے پر زور فرماتے۔ دوسرے اس میں شید بھی بن سکتی ہے جو عمدہ کھانا شمار ہوتا ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ستر اونٹ نحر کرنے کے بعد ان سے ایک ایک بوٹی ہانڈی میں ڈالنے کا حکم فرمایا اور پکنے کے بعد اس کا شوربا نوش فرمایا۔ نیز ترمذی ہی میں ہے ”ان المرق احد اللحمن“۔ (اتھی مانی العارضۃ) یہ حدیث عنقریب آرہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ لذیذ اور عمدہ کھانے جائز ہیں، البتہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ایسے کھانوں کی نوبت زندگی بھر میں شاید انتہائی کم مرتبہ پیش آئی ہوگی وہ بھی اس وقت جب کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کوئی مہمان آئے ہوں، اس کی شاید ایک بھی مثال نہ مل سکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر یا خواہش کے اظہار پر ایسا کیا گیا ہو۔ لہذا ہونا یہ چاہئے کہ چاہت اور خواہش کے باوجود لذیذ کھانوں کے درپے نہیں ہونا چاہئے اور اس میں اسلام کا ایک بڑا فلسفہ مضمر ہے کیونکہ جو قوم لذیذ کھانوں کے درپے ہو جاتی ہے، وہ کام سے دور چلی جاتی ہے وہ عباد الرحمن کے بجائے عباد الزمان بن جاتی ہے جو وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے خصوصاً قوم کے لیڈر اگر ایسا کریں تو اس کی تباہی ان کے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔

ہمیں سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فاتے، تکلیفات اور امت کے لئے آہ و بکا ہی نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر اختیار ہی تھا وہ چاہتے تو قیصر و کسری کی طرح سونے کی میز پر موتی کی طشتری میں کھا سکتے تھے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا نام شاید آج تک منبروں اور گنبدوں کی پرکیف فضاؤں میں باقی نہ رہتا۔ والعیاذ باللہ

باب کی حدیث میں جس گوشت کا ذکر ہے وہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نوادرات میں سے

ہے۔ جہاں تک عام زندگی کا تعلق ہے تو اس کا ذکر اور نقشہ حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے ”ما أكل النبي صلى الله عليه وسلم خبزاً مرققاً ولا شاة مسمومة حتى لقي الله عز وجل“۔ (رواہ البخاری ۱) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چپاتی اور بھنی ہوئی بکری (کا گوشت) تناول نہیں فرمایا۔ تا آنکہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے جا ملے۔ گویا باب کا واقعہ اتنا نایاب اور شاذ ہے جو کالمعدوم ہے۔ یا پھر حضرت انسؓ کو نادر ہونے کی بنا پر اس کا علم نہ ہو سکا اور سب کلی کے طور پر بھنے ہوئے گوشت کے تناول فرمانے کی نفی کر دی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مامت النار کے کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا اس کا محل بیان ترمذی جلد اول ہے جس سے بحمد اللہ ہم فارغ ہو چکے ہیں۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل متکناً

”عن ابی جحیفۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أما أنافلا أکل متکناً“۔^۱
حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں تک میرے مزاج کا تعلق ہے تو میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا ہوں۔

لغات:۔ قولہ ”متکناً“ اِتْکاء سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ متکئی کون ہوتا ہے، اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ کسی چیز کے ساتھ ٹیک لگانے کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ ترجمہ میں یہی مطلب لیا گیا ہے چونکہ یہ اس لفظ کا ظاہری و متبادر مطلب ہے اس لئے اسے اختیار کیا گیا، ورنہ حدیث کے سیاق کو دیکھتے ہوئے یہ مطلب متعین نہ سمجھا جائے جیسا کہ تشریح سے معلوم ہوگا۔ ایک جانب مائل ہو کر (بائیں) ہاتھ کے سہارے بیٹھنے کو بھی اِتْکاء کہتے ہیں اور چار زانو یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو بھی اِتْکاء کہا جاتا ہے۔ بہت سے علماء کرام نے صرف پہلے دو معنی بیان کئے ہیں، جبکہ تیسرا مطلب اس حدیث کے اہم مطالب میں سے ہے چنانچہ ابن قیمؒ زاد المعاد میں متکئی کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وفسر بالتربع وبالاتكاء على الشيء وفسر بالاتكاء على الحنب والثلاثة من

۱ صحیح بخاری ص ۸۱۱ ج ۲: ”باب النخب المرقق الخ“ کتاب الاطعمہ.

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل متکناً

۱ الحدیث أخرجه ابو داؤد ص ۱۷۳ ج ۲: ”باب فی الأکل متکناً“ کتاب الاطعمہ، سنن ابن ماجہ ص ۲۳۵ ”باب

الأکل متکناً“ ابواب الاطعمہ، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص ۵۶۶ ج ۵: کتاب الاطعمہ.

الانكء۔“ (دیکھئے مختصر زاد المعاد ص ۲۴۷، طبع دار السلام ریاض)

اور ابن کثیرؒ سورہ کہف آیت نمبر ۳۱ ”متکین فیہا علی الآرائک“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
 ”الانكء قبل الاضطجاع وقيل التربع فی الجلوس وهو أشبه بالمرادھنا ومنه
 الحديث الصحيح اما ان افلا آكل متکناً فیہ القولان۔“

(تفسیر ابن کثیر ص ۸۴ ج ۳، قدیمی کتب خانہ)

تشریح:- مندرجہ بالا تینوں معانی و مطالب کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جائے گا، کہ کھانا کھاتے وقت ٹیک لگانا، آلتی پالتی مار کر بیٹھنا اور بائیں جانب جھک کر اٹنے یا تھ پر تکیہ لگانا خلاف اولیٰ ہے۔

کھانے کے آداب میں سے بیٹھنے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ یا تو آدمی دو زانو بچوں کے بل بیٹھے جیسا کہ حضرت انسؓ کی روایت میں ہے: ”رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقعياً یا کل تمرأ“ (مسلم ج ۲ ص ۱۸۰، طبع قدیمی کتب خانہ) اور یا پھر بائیں پاؤں کو بچھا کر داہنی پنڈلی کو کھڑا کر کے بیٹھ جائے۔ پہلی صورت میں آدمی جلدی فارغ ہو جاتا ہے اور یہی مطلوب شرعی بھی ہے چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

”عن انس قال أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بتمر فجعل النبي صلى الله عليه وسلم يقسمه وهو محتفزيا كل منه اكلاذر يعاوفى رواية زهير ”اكلاً حثيئاً“۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ”ذریعاً اور حثيئاً“ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی جلدی کھانا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی اپنے کام کے لئے فارغ ہو جائیں۔ (مسلم ص ۱۸۰ ج ۲) اور علامہ عبد الفتاح ابو غدہؒ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ محدث کے لئے ضروری ہے، کہ وہ سریع الحشی، سریع الکتابۃ اور سریع القرات ہو پھر فرماتے ہیں:

”قال عبد الفتاح: وانا اضيف الى تلك الصفات الثلاث فى المحدث وفى طالب العلم ايضاً صفة رابعة وهى ان يكون سريع الأكل لكسب الوقت والاستفادة من الزمن الغالى وان قل۔“

(دیکھئے ”صفحات من صبر العلماء علی شدائد العلم“ تصیل ص ۳۳۳ حاشیہ نمبر ۵، المکتبۃ الغفوریہ کراچی)

اسی بنا پر بہت سے علماء ٹرید کو اس لئے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ اس سے وقت کی بچت ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ ایک ایک پیسہ بچانے کی فکر تو کرتے ہیں مگر ایک ایک لمحہ کی بچت سے بے نیاز رہتے ہیں حالانکہ ایک لمحہ ایک روپیہ سے کئی گنا زیادہ قیمت رکھتا ہے اس سے زیادہ افسوس ان علماء و طلبہ پر ہے،

جو وقت خرچ کرنے میں بڑا اسراف کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے بے دریغ خرچ سے عوام الناس نے بھی کہنا شروع کیا کہ مولوی لوگ تو فارغ ہی ہوتے ہیں، ان کا کام سوائے کھانے پینے اور سونے کے اور کیا ہے۔ اسی تاثر کی بنا پر جب کوئی آدمی ہم سے ملتا ہے تو ایک آسان مسئلہ پوچھنے کے لئے لمبی تقریر شروع کرتا ہے جیسے وہ ہمیں گپ شپ میں مصروف کر کے بڑا احسان کر رہا ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ بات جلدی کرو ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے تو اسے تعجب ہوتا ہے، خدا را اس تاثر کو توڑنے کی کوشش کیجئے۔

کھانے کے آداب کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں قدموں اور سرین پر بیٹھ کر پنڈلیوں یعنی گھٹنوں کو کھڑا کر دیا جائے، مسلم کی جو حدیث اوپر اولاً ذکر ہوئی امام نوویؒ نے اس کا مطلب یہی لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: قوله "مقعیاً ای جالساً علی الیتبہ ناصباً ساقیہ"۔ (شرح نووی بر مسلم ص ۱۸۰ ج ۲، قدیمی کتب خانہ)

اگر کہا جائے کہ صرف قدموں پر بیٹھ جائے اور پہلی صورت میں توڑک کر کے بیٹھ جائے تو یہ بھی اس علت اور منشا کے عین مطابق ہوگا جس کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھنے کا مندرجہ بالا طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ یعنی تواضع کرنا، کم کھانا اور کھانے کی قدر و اہتمام کرنا۔ تاہم اقعاء کی پہلی صورت شاید کھجور ہی میں اختیار کی گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں پر اقعاء کے وہی معنی متعین ہو جو امام نوویؒ نے ذکر کئے ہیں معنی اول مراد نہ ہو علیٰ ہذا کہا جائے گا کہ بین السجدتین اقعاء سے مراد معنی اول اور کھانے میں ثانی ہیں۔ واللہ اعلم

بہر حال مذکورہ بیانات کے علاوہ جو بھی طریقہ ہو گا وہ آداب کے منافی ہوگا۔ تاہم امام غزالیؒ نے پیاز کھانے کو کروٹ لگا کر کھانے کی کراہیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ (کافی التہذیب) لہذا کہا جائے گا کہ پان، ٹافیاں اور چھالیا وغیرہ بھی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ رد المحتار شامی میں ہے: "و لا یاس بالاکل متکناً او مکشوف الرأس فی المختار"۔ (کتاب الخطر والاباحۃ، حاشیہ رد المحتار ص ۳۴۰ ج ۶، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

اس میں "لا یاس" کے لفظ سے جہاں ایک طرف متکئی کھانے کے خلاف اولیٰ ہونے کی طرف اشارہ ہے وہیں دوسری جانب ننگے سر کھانے کو بھی خلاف اولیٰ قرار دیا جا رہا ہے۔

چونکہ متکئی کی مذکورہ صورتوں میں زیادہ قبیح شکل چار زانو یعنی آلتی پالتی مارنے کی ہے، کہ یہ متکبرین کا شیوہ ہے، اس طرح کھانا بھی زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اور اہم نقصان یہ ہے کہ اس سے پیٹ بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ ٹیک لگا کر کھانے کی نسبت زیادہ قابل احترام ہے۔ اوپر ابن کثیر کا حوالہ بھی گذر گیا۔ جس میں انہوں نے حدیث کا مصداق اسی صورت کو بنایا ہے۔ تحفۃ الاحوذی میں ہے۔

”واختلف فی الکراهة واقوى ماورد فی ذالک ماخرجہ ابن ابی شیبہ^۱ من طریق ابراهیم النخعی قال: كانوا یکرهون ان یأکلوا اتکاءً مخافة ان تعظم بطونهم والی ذالک یشیر بقیة ماورد فیہ من الاخبار فهو المعتمد“۔

عرف الشذی میں ہے ”واما التربع فجلوس قبیح“۔

امام ترمذی نے ابواب الفتن میں صحیح حدیث نقل کی ہے:

”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خیر امتی القرن الذی بعثت فیہم ثم الذین یلونہم

ولا اعلم اذکر الثالث ام لائم ینشوء اقوام یشہون ولا یتشہون ویخونون

ولا یؤمنون ویفشو فیہم السمن“۔ (باب ماجاء فی القرن الثالث ص ۳۶ ج ۲ بیچ ایم سعید کراچی)

اس لئے موٹاپے کے شوق اور اس کے اسباب سے بچنا چاہئے تاہم بیٹھنے کی ہیئات سنن زوائد میں سے

ہیں اس لئے مریع بیٹھنے سے گناہ نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی حبِّ النبی ﷺ الحلواء والعسل

”عن عائشة قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب الحلواء والعسل“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

لغات:- ”الحلواء“ مد اور قصر دونوں کے ساتھ پڑھنا لفظ جائز ہے۔ عام علماء و شارحین ہر میٹھی چیز کو

حلوا قرار دیتے ہیں۔ جبکہ امام خطابی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حلوا کا اطلاق صرف ان میٹھی اشیاء پر ہوتا ہے جو مصنوع

ہوں یعنی ان کو بنایا، یا پکایا جائے۔

تشریح:- اگر حلواء سے مراد مطلق میٹھی چیز ہو تو پھر اس کے بعد غسل کا ذکر، ذکر خاص بعد العام ہوگا

جس سے شہد کی شرافت اور افادیت کو اجاگر کرنا مراد ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں ہے ”الایمان

بضع وسبعون شعبۃ... وفیہ... والحياء شعبۃ من الايمان“۔ (مشفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۱۴ ج ۱)

۱ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۵۶۵ ج ۵ کتاب الاطعمہ۔

باب ماجاء فی حب النبی ﷺ الحلواء والعسل

۱ صحیح بخاری ص ۶ ج ۱ ”باب امور الايمان الخ“ کتاب الايمان، صحیح مسلم ص ۴۷ ج ۱ ”باب بیان عدد

شعب الايمان الخ“ کتاب الايمان۔

اور اگر حلواء سے مراد خاص اشیاء ہو۔ جیسا کہ امام خطابیؒ کی رائے کے حوالے سے گذر گیا یعنی جس میں صنعت کو دخل ہو تو پھر اس سے مراد وہ حلواء نہیں ہے، جو آج کل حلواء کے نام سے مشہور ہے جو آٹے سے بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کھجور ہے جو دودھ سے گوندھی جاتی تھی چنانچہ الکوکب الذری کے حاشیہ پر امام ثعلبیؒ کی کتاب اللغۃ سے نقل کیا ہے:

”ان حلوی النبی صلی اللہ علیہ وسلم التی کان یحبھاہی المجیع بالجیم وزن عظیم وهو تمر یعجن بلبن وقد روی انه کان یحب الزبد والتمر وفیه رد علی من زعم ان المراد بالحلوی انه صلی اللہ علیہ وسلم کان یشرب کل یوم قدح عسل یمزج بالماء واما الحلوی المصنوعة فما کان یعرفھا وقیل المراد بالحلوی الفالودج (فالودہ) لا المعقودة علی النار۔

یعنی آگ پر پکایا ہوا آٹے کا بنا ہوا حلوا مراد نہیں ہے، تاہم اس حلوا کے کھانے اور پسند کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کو محض اس لئے اہمیت دینا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے غلط تشریح ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کا یہ مطلب نہیں، کہ وہ اس کے متلاشی اور طالب رہتے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب کھانے میں میٹھی چیز ہوتی تو اسے زیادہ شوق سے تناول فرماتے۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے۔ (کذا فی التھذیب نقل عن الخطابی وابن التین)

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکہ کو پسند کرنا بھی ثابت ہے، حالانکہ وہ کھٹا ہوتا ہے اور بازو کا گوشت پسند کرنا بھی ثابت ہے تو یہ انسانی طبائع ہیں، جو مختلف ہوتے ہیں اور ایک ہی آدمی کی طبیعت میں مختلف رنگ دیکھے جاسکتے ہیں، آدمی ایک وقت میں ایک چیز کو پسند کرتا ہے اور دوسرے وقت بالکل مختلف شے کو چاہتا ہے۔ کما ہوا للشارح

اصل بات یہ ہے کہ جسم میں جس چیز کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، طبیعت خود بخود اس کی طرف بقدر ضرورت مائل ہو جاتی ہے، مثلاً جب بھوک لگتی ہے تو آدمی سیر ہونے تک کھا سکتا ہے زیادہ نہیں، پیاس کی صورت میں پانی کی طلب ہوتی ہے۔ خون کی کمی میں گوشت وغیرہ کا تقاضا بڑھ جاتا ہے، اور مرچ وغیرہ کھانے کے بعد میٹھے کی طلب شروع ہو جاتی ہے وبالعکس۔ لہذا محض اس حدیث کی بناء پر میٹھے کو مسنون سمجھ کر ثواب کی نیت سے کھانا مطلوب شرعی نہیں ہے۔ گوکہ کالمین کا حال یہ ہے کہ جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوتی وہ

ان کو بھی طبعاً پسند ہو جاتی ہے، جیسے حضرت انسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی کے ٹکڑے رکابی میں ٹٹولتے ہوئے دیکھا تو ان کو بھی کدو طبعاً پسند ہو گیا۔ ”ذالك فضل الله يوتيهِ من يشاء“۔^۳

باب ماجاء في اِكثار المَرْقَةِ

”عن علقمة بن عبد الله المزني عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا اشتري احدكم لحماً فليكثر مرقته فان لم يجد لحماً أصاب مرقه وهو احد اللحمين“۔

حضرت عبد اللہ مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص گوشت خریدے تو اس کو چاہئے کہ اس میں زیادہ شوربہ بنائے کہ اگر اسے گوشت (کی بوٹی کھانے کو) نہ ملے تو شوربہ تول جائے گا اور وہ بھی گوشت کی (گویا) ایک قسم ہے۔

لغات:- قولہ ”مرقته“ مَرَقَ بفتح میم وراء شوربہ اور مَرَقَ بالتاء شوربے کی قسم یا تھوڑے شوربے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- مذکورہ بالا حکم گوشت کی خریداری کے ساتھ مختص نہ سمجھا جائے بلکہ عام ہے، خواہ پکانے کے لئے خریدا ہوا گوشت ہو یا اپنے جانور کا یا کسی کی طرف سے ہدیہ کا گوشت ہو۔ بہر صورت ہونا یہ چاہئے کہ اس کو خشک تلنے اور بھوننے کے بجائے سالن کی شکل میں پکائے اور پانی نسبتاً زیادہ ڈالے۔ اس طرح اس کا نفع زیادہ ہو جائے گا۔ کہ اب وہ پانی حکماً گوشت کے مانند طاقت ور بن گیا کہ اس میں گوشت کی طاقت اور چکناہٹ منتقل ہو گئی اور لذت بھی گوشت جیسی ہے اس کا مشاہدہ گوشت کی بخنی اور سوپ میں کیا جاسکتا ہے۔ نیز اس سے دوسروں کی خبر گیری بھی ہو سکتی ہے، کہ انڈس پڑوس میں بھی دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں ہے۔

باب کی پہلی حدیث اگرچہ محمد بن فضال کی وجہ سے ضعیف ہے مگر اگلی حدیث سے اس مضمون کی تاکید ہوتی ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن ابي ذر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحقرن احدكم شيئاً من المعروف وان لم يجد فليلق اخاه بوجه طليق واذا اشترت لحماً او طبخت قدرأفاكثر مرقته

۳ کذا فی صحیح البخاری ص: ۸۱۰ ج: ۲ ”باب من تبع حوالی القصعة الخ“ کتاب الاطعمہ، ایضاً ص: ۸۱۵ ج: ۲

کتاب الاطعمہ، ۳ سورة الجمعة آیت: ۲ پارہ: ۲۸۔

واغرف لِحَارَكٍ مِنْهُ“۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، تم میں سے کوئی شخص نیکی کا کوئی بھی کام معمولی نہ سمجھے اور اگر (ہدیہ، برتاؤ کے لئے) کوئی چیز اسے نہ ملے تو اپنے (اسلامی) بھائی سے خندہ پیشانی سے قول لے اور جب تم گوشت خریدو یا ہانڈی پکاؤ تو اس میں شور بہ زیادہ بناؤ اور اس میں سے چلو بھرا اپنے ہمسایہ کو دیدو۔

لغات و تشریح:۔ معروف کے معنی جانی پہچانی اور مانوس چیز کے ہیں چونکہ نیکی کے کام جیسے انصاف، امداد، خدمت، اکرام اور مالی تعاون وغیرہ لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں، اس لئے ہر نیکی کو معروف کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نیکی کے کام شریعت میں اور مسلمانوں میں جانے پہچانے اور متعارف ہوئے ہیں، بخلاف منکر کے کہ وہ نا آشنا نامانوس ہوتے ہیں جب لوگ اسے دیکھتے ہیں تو اس پر نکیر کرتے ہیں، یعنی مہذب اسلامی معاشرہ میں۔ قولہ ”طلیق“ بشارت اور خوشی کو کہتے ہیں۔ بوجہ طلیق کے معنی ہیں، خندہ پیشانی، خندہ روئی، خوش مزاجی اور شگفتگی و شگفتہ روئی و ہنس کھ و غیرہ۔

یعنی آدمی کو دوسروں کا خیر خواہ ہونا چاہئے، اس کا سینہ جذبہ خیر رسانی سے لبریز ہونا چاہئے، اس سے جو کچھ ہو سکے دوسروں کو خیر اور فائدہ پہنچائے چاہے مالی ہو یا جانی۔ اگر کچھ نہ کر سکے تو کم از کم یہ تو کرے کہ جب دوسروں سے ملے تو اس انداز سے ملے کہ دوسرا دیکھ کر خوش ہو جائے، اور کسی مسلمان کے دل میں سرور و خوشی داخل کرنا بھی نیکی ہے۔ لہذا ملاقات کے وقت چاہئے کہ آدمی سلام میں پہل کرنے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ مسکراہٹ بھی اختیار کرے۔ تاہم بے ہودہ بکواس اور تنزیہ و تہقہہ دلانے والا مزاح اس حدیث کا مصداق یا مراد نہیں ہے، جیسے بعض لوگ مذاق ہی مذاق کرتے رہتے ہیں، اور اس کے لئے لطیفوں اور جھوٹ یا فضول گوئی کو بنیاد بناتے ہیں۔



باب ماجاء فی فضل الثرید

”عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الامیرم بنت عمران واسیة امرأة فرعون وفضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام“۔^۱

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں میں بہت سے لوگ کامل ہوئے۔ جبکہ عورتوں میں سے کامل نہ ہوئیں مگر مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی اور عائشہ کی فضیلت و برتری عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے ثرید کی برتری باقی کھانوں پر۔

لغات:- قولہ ”کمل“ تینوں بابوں سے آتا ہے نصر، کرم اور علم سے لہذا میم پر تینوں حرکات پڑھنا جائز ہیں، کمال سے ماضی کا صیغہ ہے۔ کمال کی دو قسمیں ہیں (۱) کمال اول (۲) کمال ثانی۔ اول متمم اشیٰ فی مرتبہ الذات کو کہتے ہیں اور ثانی متمم اشیٰ فی مرتبہ الصفات کو کہا جاتا ہے۔ یہاں کمال ثانی کا بیان ہے کیونکہ بات صفات اور خوبیوں کی ہو رہی ہے، نہ کہ ذات کی۔ قولہ ”الثرید“ مفتحة ثاء و کسرة راء بروزن عظیم و شریف، وہ کھانا جو شوربہ میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر بنایا جائے خواہ شوربا گوشت والا ہو، اس میں گوشت بھی ہو یا کسی اور چیز کا جیسے ٹائز کا شوربہ ہو یا گوشت کا ہو مگر اس میں بوٹی نہ ہو۔

تشریح:- بعض روایات میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ کا بھی بطور حصر ذکر ہے^۲ چونکہ مردوں میں کاملین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے ان کے بیان میں کلام کو حصر سے خالی رکھا۔ جبکہ عورتوں کے کمال کے لئے ادوات حصر جو لم اور الا کے الفاظ ہیں ذکر فرمادیئے۔ بعض حضرات نے کمال سے مراد صفات نبوت پر فائز ہونا لیا ہے علیٰ ہذا پھر یہ دونوں خواتین انبیاء کی جماعت میں شامل ہوں گی، یہ رائے امام اشعریؒ کی طرف

باب ماجاء فی فضل الثرید

۱۔ الحدیث اخرجه البخاری فی کتاب المناقب ”باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا“ و مسلم فی کتاب فضائل الصحابة والنسابة فی عشرة النساء، وابن ماجہ ”باب فضل الثرید علی الطعام“ ابواب الاطعمة، بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۳۲ ج: ۲ قدیمی کتب خانہ۔ ۲۔ راجع لفضائل فاطمة رضی اللہ عنہا مستدرک حاکم من ص: ۳۶۱ ج: ۳ قاص: ۳۷۱ ج: ۳ ”کتاب معرفة الصحابة“ وفيه ان النبی ﷺ قال حسبک من نساء العالمین اربع، مریم بنت عمران وآسیة امرأة فرعون وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد، هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه ص: ۳۶۸ ج: ۳۔

منسوب ہے کہ وہ چھ عورتوں کو نبیہ قرار دیتے تھے، حواء، سارہ، ہاجرہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، آسیہ اور مریم۔ ان آخری دونوں کا ذکر حدیث باب میں بھی ہے۔ تاہم جمہور علماء نبوت کے لئے ذکر و ثبوت شرط قرار دیتے ہیں لہذا کوئی عورت نبیہ نہیں بن سکتی۔ اس بارے میں فریقین کے دلائل چونکہ ظنی ہیں اس لئے کہا جائے گا کہ یہ مسئلہ عقائد سے تعلق نہیں رکھتا بس یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ جس کی نبوت بعینہ ثابت ہے اس پر بعینہ ایمان لانا لازم ہے اور جس کی نبوت اجمالاً ثابت ہو اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، لہذا جن انبیاء کے نام معلوم ہیں ان پر باشکاہم ایمان لازمی ہے، اور باقی جتنے بھی انبیاء ہیں ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے خواہ ان میں عورت کیوں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ کمال بن ابی شریف التوفیٰ ۹۰۵ھ ہجری شیخ ابن ہمام کی (کتاب المسامیرہ کی شرح المسامیرہ کے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۳۰) پر ایک نفیس بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں: ”والادلة من الجانبيين ظنية... وفيه لك ان تمنع وجوب اعتقاد اشتراط الذكورة في النبي“ الخ۔

بہر حال جمہور کے نزدیک اس حدیث میں کمال سے مراد صفات نبوت تک ارتقاء مراد نہیں بلکہ انسانی اختیاری کمالات اور درجہ ولایت تک رسائی مراد ہے، اس طرح جمہور کے نزدیک یہ حصر تمام عالمین کی عورتوں کی بنسبت نہ ہوگا بلکہ اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے ہوگا کیونکہ ولایت کے درجہ پر تو بہت سی عورتیں فائز ہو چکی ہیں مگر جن عورتوں کی بعینہ مدح سرائی قرآن میں آئی ہے، وہ یہی تین خواتین ہیں باقی بہت سی عورتوں کا ذکر یا تو کسی واقعہ کے ضمن میں آیا ہے یا پھر اجمالاً ہوا ہے لہذا کہا جائے گا کہ ولایت کا مقام پانے والی خواتین بہت زیادہ ہیں مگر قرآنی سند تعریف و عفت اور مقبولیت بعینہ صرف ان تینوں کو حاصل ہے، اور جب ولایت کمال ہے تو نبوت بطریق اولیٰ کمال ہے۔

افضل کون؟۔ یہاں یہ بحث بھی چھیڑی گئی ہے کہ دنیا کی خواتین میں افضل ترین کون ہے؟ حضرت مریم؟ حضرت خدیجہ؟ حضرت فاطمہ؟ یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن چونکہ اس حدیث میں فضیلت کا بیان ہے اور اس فضیلت میں ثرید کی مثال ذکر کی گئی ہے تو ثرید میں بلاشبہ بہت سے فوائد ہوتے ہیں لیکن مع ہذا اس کا تمام کھانوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لئے علماء نے اس پر بحث کی ہے کہ افضل خاتون کون ہے، یہ مسئلہ مناقب کا ہے جو ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں اجمالاً و اختصاراً اتنی سی بات عرض ہے کہ عام علماء کی رائے یہ ہے کہ بعض وجہ سے ایک افضل ہے اور بعض سے دوسری، چونکہ دلائل محتمل و ظنی ہیں اس لئے یہ مسئلہ بھی عقائد کا نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بحث فرمائی

ہے، کہ کن کن مسائل سے آدمی اہل سنت والجماعت سے خارج نہیں ہوتا اس کے ضمن میں ایک مثال یہی دی ہے، یعنی یہ ان مسائل میں سے ہے جو نہ تو قرآن کریم میں صراحتاً مذکور ہیں نہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہیں اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے اس بارے میں لب کشائی کی ہے، تا آنکہ کچھ اہل علم آئے جنہوں نے ان مسائل کو چھیڑا اور اختلاف رونما ہوا "کفضل الانبياء على الملائكة وفضل عائشة على فاطمة رضی اللہ عنہما"۔ قالہ فی مقدمۃ الكتاب

باب ماجاء انہشوا اللحم نهشاً

"عن عبد اللہ بن الحارث قال زوجنی ابی فدعا اناساً فيهم صفوان بن أمية فقال: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: انہسوا اللحم نهساً فانه آهناً وامراً"۔^۱

حضرت عبد اللہ بن حارث سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے میری شادی کر دی، تو کچھ لوگوں کو مدعو کیا جن میں حضرت صفوان بن امیہؓ بھی تھے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے گوشت دانتوں سے نوج نوج کر کھا لیا کرو کہ اس طرح کھانا مزیدار اور خوشگوار تر ہوتا ہے۔

لغات:- قوله "اناساً" اناس اصل ہے اللہ ناس کی پھر کثرت استعمال سے ہمزہ ساقط ہوا اور لام کو نون میں مدغم کر دیا تو الناس ہو گیا۔ (لسان العرب) "والناس اسم جمع" تفسیر روح المعانی۔

قولہ "انہسوا" نہسا سے امر کا صیغہ ہے بعض نسخوں اور روایتوں میں شین کے ساتھ آیا ہے، بعض اہل لغت نے دونوں میں فرق نہیں کیا ہے مگر بعض اہل لغت یہ فرق بتاتے ہیں کہ اگر اگلے دانتوں سے نوج لیا جائے تو اس کے لئے نہس کا لفظ یعنی سین مہملہ کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے جبکہ ڈاڑھوں سے نوچنے کو نہش بالشین المعجمہ کہا جاتا ہے۔^۲ قوله "آهناً" جو کھانا مرغوب اور غرض کے مطابق ہو اسے نہشی کہتے ہیں۔ اور قوله "امراً" مرئی سے ہے جو کھانا ہضم ہو کر بخوبی جز و بدن اور موجب صحت و قوت بنے وہ مرئی ہے۔

باب ماجاء انہشوا اللحم نهشاً

۱۔ الحديث أخرجه الدارمي ص: ۱۳۵ ج: ۲ حديث: ۲۰۷۰ كتاب الاطعمة، أيضاً رواه احمد في مسنده ۳/۳۰۰.

۲۔ نہس و نہش میں فرق: نہس هو اخذ اللحم بانيابهم من اعلی العظم واخذ اللحم باطراف اللسان والنهش الاخذ بجمعها، حاشیہ: ۲ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۴ ج: ۲ کتاب الاطعمة.

تشریح:۔ چونکہ عربوں میں نیم پختہ گوشت کھانے اور پسند کرنے کی عادت تھی، اور بڑی بڑی بوٹیاں بناتے تھے جن میں ہڈی پر گوشت لگا رہتا تھا اس لئے ہمارے زمانے کی طرح انگلیوں سے گوشت علیحدہ کرنا مشکل ہوتا تھا، کیونکہ ہم تو گوشت کو گلا کر کھاتے ہیں بلکہ کبھی تو وہ گوشت دیگ کے اندر ہی ہڈی سے خود بخود علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے نوچنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی نیز ہمارے ہاں بوٹیاں چھوٹی چھوٹی بنانے کا دستور ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوچ کر کھانے کا مشورہ دیا جو لذیذ تر بھی ہوتا، خاص کر وہ گوشت جو ہڈی کے ساتھ چپکا ہوا ہو چونکہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر معدے میں جاتا ہے اس لئے زود ہضم بھی ثابت ہو جاتا ہے، پھر ابن العربی نے عارضہ میں لکھا ہے کہ خالی ہڈی کو واپس برتن میں نہ رکھے، بلکہ اپنے سامنے دسترخوان پر رکھ دے یا پھر اپنے ہاتھ ہی میں تھامے رکھے۔ آج کل تو وسعت کا زمانہ ہے کھانے کے لئے دسترخوان بچھانے کا رواج عام ہو گیا ہے بلکہ سلیقہ مند لوگ زائد بوٹیوں کے لئے الگ خالی پلیٹ بھی دسترخوان پر رکھتے ہیں، اور بعض ہوٹلوں میں میز کے نیچے برتن یا ڈبہ وغیرہ ہوتا ہے لہذا اسی کا استعمال کیا جائے۔

اس حدیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ گوشت کا یہی طریقہ کھانے کے لئے مستحسن ہے، بلکہ اگلے باب میں ٹھہری سے کاٹ کر کھانا بھی ثابت ہے، اور ابوداؤدؒ و بیہقی کی جس روایت میں ٹھہری کے استعمال سے منع آیا ہے وہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چونکہ اس روایت میں کھانے کے مذکورہ طریقے کی علت لذیذ تر اور خوشگوار ہونا بتلائی ہے اس لئے اگر یہ علت کسی اور طریقے میں پائی جائے تو وہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

قوله "وقد تکلم بعض اهل العلم فی عبد الکرم المعلم" مگر اس تکلم کے باوجود عبد الکرم ضعیف نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ ہے۔

۱۱ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۴ ج: ۲ "باب فی الاکل من اعلی الصفحة" کتاب الاطعمہ، سنن کرمی للبیہقی ص: ۱۰۴ ج: ۱۱ حدیث: ۱۴۹۹۱ ابواب الولیمة قال رسول اللہ ﷺ لا تقطعوا اللحم بالسکین فان ذالک من صنع الاعاجم ولكن انهموه فانه اهنأ و امراً. حفیظ الرحمن الحنفی ندوة العلم کراچی۔

باب ماجاء عن النبی ﷺ فی الرخصة

فی قطع اللحم بالسکین

”عن جعفر بن عمرو بن أمية الضمري عن ابيه انه رأى النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتزمن
کتف شاة فاکل منها ثم مضى الى الصلوة ولم يتوضأ“۔^۱

حضرت جعفر بن عمرو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو
دیکھا ہے، جو ٹھہری سے بکری کے شانے سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر تناول فرمایا۔

لغات:- قولہ ”احتز“ حَزَّ سے اِقتعل کے وزن پر فعل ماضی ہے، حَزَّ کے معنی کاٹنے کے ہیں۔
قولہ ”کتف“ بفتح اول و کسرہ ثانی مونث ہے اور کندھے کو کہتے ہیں جبکہ ”سکین“ ٹھہری کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس روایت سے گوشت کو ٹھہری کے ذریعے کاٹ کر کھانا ثابت ہوا جیسا کہ گذشتہ باب
میں اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اسی پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ پھلوں کے کھانے میں بھی اختیار ہے
چاہے تو آدمی سب اور کھیر وغیرہ دانتوں سے کاٹ کر کھائے یا ٹھہری سے کاٹ لے۔ اسی طرح اگر روٹیوں
کو ٹھہری سے کاٹنے کی ضرورت پیش آجائے جیسے بعض مدارس اور بعض بڑے بڑے لنگر خانوں میں ہوتا ہے تو وہ
بھی جائز ہے، اور اس سلسلہ میں نبی کی روایت صحیح نہیں۔ کامز کیونکہ اس میں ابو محشر ہیں جو ضعیف ہیں۔^۲

باب ماجاء أَى اللحم کان أحب الى رسول اللہ ﷺ؟

”عن ابی هريرة قال أَمَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَحْمٍ فَنَدَفَعَ إِلَيْهِ الذَّرَاعَ وَكَانَ يَعْجَبُهُ
فَنَهَسَ مِنْهَا“۔

باب ماجاء عن النبی ﷺ فی رخصة فی قطع اللحم بالسکین

۱۔ الحديث أخرجه البخاری ص: ۸۱۴ ج: ۲ کتاب الاطعمة ومسلم ص: ۱۵۷ ج: ۱ کتاب الحيض، سنن کبری
للبيهقي ص: ۱۰۳ ج: ۱۱ ابواب الوليمة. ۲۔ قال البيهقي بعد نقل حديث البخاری، وفي هذا دلالة على جواز قطعه
بالسکین وان الخبر الذى قبله ان صح فانما اراد به واللہ اعلم انه اذا نهسه كان اطيب كالخبر الاول ص: ۱۰۳ ج: ۱۱.

الحنفی عفی عنه

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازو پیش کیا گیا چونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا تو (اس لئے قبول فرما کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دانتوں سے نوچ نوچ کر تناول فرمایا۔

لغات:- قولہ ”الذراع“ بکسر الذال بروزن کتاب اصل میں کلائی کو کہتے ہیں، یعنی کہنی سے ہتھیلی تک کا حصہ جسے ساعد بھی کہتے ہیں۔

تشریح:- اس کو پسند کرنے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ جلدی تیار اور پک جاتا ہے، جس سے دقت کی بچت اور تکلفات سے اجتناب مقصود تھا۔ دوم یہ لذیذ بھی ہوتا ہے۔ سوم یہ نجاست کے مواضع سے دور بھی ہوتا ہے۔ مع ہذا اس میں اور دانتوں سے نوچنے میں تواضع بھی ہوتی ہے۔ ایک وجہ اگلی روایت میں بیان کی گئی ہے۔

دوسری حدیث:- یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازو کا گوشت صرف اس لئے زیادہ پسند تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کبھار گوشت میسر ہوتا پس بازو کا گوشت جلدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا کیونکہ یہ جلدی پک جاتا۔

لغات:- اس حدیث میں ”یعمجل“ مجہول کا صیغہ ہے اور ”الیہ“ کی ضمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے جبکہ ”لأنہ“ کی ضمیر لحم ذراع کی جانب لوٹتی ہے۔ قولہ ”نضجاً“ پکنے اور تیار ہونے کو کہتے ہیں اس لئے یہ لفظ کھجور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے نفع التمر بھی کہتے ہیں اور نضج اللحم نضجاً بھی۔

تشریح:- اس حدیث میں اور باب کی سابقہ روایت میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے، کیونکہ اس میں پسندیدگی کی مطلق نفی مراد نہیں ہے بلکہ پسند کرنے کی ایک وجہ بتلائی ہے جبکہ سابقہ روایت مطلق عن القید ہے لہذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ اپنی اس روایت میں اس توہم کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کو کیسے پسند فرمایا حالانکہ یہ تولد ائذ میں سے ہے تو انہوں نے دفع کی غرض سے فرمایا کہ یہ پسندیدگی بھی زہد کی بنا پر تھی کہ اس سے فراغت جلدی ملتی ہے۔

باب ماجاء فی الخل

عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: نعم الإدام الخل۔^۱

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سرکہ کیا ہی اچھا سالن ہے۔

لغات:- ”حلّ الخاء وتشدید اللام سرکہ کو کہتے ہیں جبکہ بکسر الخاء جگری دوست کو کہا جاتا ہے، سرکہ گنے یا پھلوں کے رس کو دھوپ میں رکھ کر بنایا جاتا ہے، جو ترش اور کھٹا ہوتا ہے شراب سے بھی بنایا جاسکتا ہے اگرچہ شراب سے بنانے کے جواز میں اختلاف ہے جو فقہ میں بیان ہوا ہے۔ قولہ ”الإدام“ مفرد ہے اور جمع أدام آتی ہے جیسے کتاب اور کتب، ادام ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو روٹی کے ساتھ کھائی جائے یعنی سالن۔

تشریح:- سرکہ کو سالن قرار دینے کا مطلب امام خطابی نے یہ بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کی چیزوں میں تکلفات سے بچنے کی ایک ترغیب دی ہے، کہ جو چیز بآسانی میسر ہو اور عام ہو اسی پر اکتفا کر لینا چاہئے لہذا کھانوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہئے کہ ہوس پرستی سے دین تباہ ہو جاتا ہے اور آدمی ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا ہے، جیسا کہ آج کل عام مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے کہ زیادہ اور اچھے کھانوں کے چکر میں سارا وقت دنیا کمانے پر خرچ کرتے ہیں، اور پھر بھی خواہشات پوری نہیں ہوتیں نتیجہ یہ نکلا کہ نہ کسی کے پاس خشوع والی نماز پڑھنے کی فرصت ہے اور نہ ہی تلاوت کی۔ بلکہ بہت سے بے چارے تو نماز ہی نہیں پڑھتے ہیں۔

حدیث آخر:- ”عن ام ہانئ بنت ابی طالب قالت دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: هل عندکم شئی؟ فقلت: ”لا“ إلا کسرہا سعة وعمل فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ”قریبہ فما اقفر بیت من أدم فیہ خلّ“۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میرے یہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی الخل

۱ الحدیث أخرجه ابو داؤد ص: ۱۷۹ ج: ۲ ”باب فی الخل“ کتاب الاطعمہ، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۸ ابواب الاطعمہ.

تشریف لائے، تو فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی چیز (کھانے کی) ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں البتہ خشک (روٹی کے) ٹکڑے اور سرکہ ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ پیش کر دو کیونکہ جس گھر میں سرکہ ہو وہ سالن سے خالی نہیں ہوتا۔

لغات:- ”کسر“ بکسر الکاف وفتح السین روٹی کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں اس کا مفرد کسرة آتا ہے۔
 قولہ ”اقفر“ قفر خالی کو کہتے ہیں اور قفار وہ زمین جو پانی سے خالی ہو ”قبر حرب بمكان قفر“ اسی طرح قفار بغیر سالن والے کھانے کو بھی کہتے ہیں۔ قولہ ”من ادم“ بسكون الدال مفرد کا صیغہ ہے ”فیہ خل“ جملہ ”یت“ کی صفت ہے اور ”من ادم“ درمیان میں فصل ہے۔

تشریح:- حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس گھر میں سرکہ موجود ہو وہ سالن سے خالی نہیں کہلاتا، اس میں بھی زہد کی ترغیب ہے، کہ چونکہ کھانے کا اصل مقصد پیٹ پالنا ہے اور طاعات کے لئے کمر کو سیدھا رکھنا ہے لہذا اور نفس کو خوش کرنا نہیں ہے، لہذا جس چیز سے اصلی مقصد پورا ہو سکتا ہے اس کی نفی نہیں کرنی چاہئے، جیسے نفس لباس سے زینت نہ بھی ہو ستر تو ہوتا ہے۔

قولہ ”وام هانتی ماتت بعد علی بن ابی طالب بزمان“۔

امام ترمذی دراصل ایک اعتراض کا جواب دینا چاہتے ہیں، کہ ام ہانی کی یہ روایت تو منقطع ہے کیونکہ امام شعبی کا سماع ام ہانی سے ثابت نہیں جیسا کہ امام بخاری کی رائے ہے، اور امام ترمذی نے بھی علل کبیر میں نقل فرمایا ہے، تو امام ترمذی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ امام شعبی کا سماع حضرت علیؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے عورت کو رجم کرنے کے بعد فرمایا ”رحمتها بسنة النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کما عند البخاریؒ اور ام ہانی اپنے بھائی حضرت علیؓ کے بعد وفات پائی ہیں لہذا سماع ممکن ہے، اس لئے انقطاع کا اعتراض صحیح نہیں غرض روایت جہور کی شرط پر پوری ہے۔

باب ماجاء فی اکل البطیخ بالرطب

”عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان يأکل البطیخ بالرطب“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ تازہ کھجور کے ساتھ

تناول فرماتے۔

لغات :- ”البطیخ“ بکسرۃ باء وتشدید الطاء المسکورة بروزن مَرَّخ عام اہل لغت و شارحین کے نزدیک خر بوزے کو کہتے ہیں۔ الکوکب الدری کے حاشیہ پر ہے کہ ملا علی قاریؒ نے شرح شامل میں اس کو تر بوز کے معنی میں لیا ہے جو بظاہر غلط نہیں ہے۔ حضرت گنگوہی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس غلطی کا منشاء یہ ہے کہ ابوداؤدؒ کی روایت میں ہے ”نکسر حرّ هذا ببر دھذا“ یعنی ہم اس کی گرمی کو اس دوسرے کی ٹھنڈک سے توڑتے ہیں، اور کھجور تو گرم ہے اور خر بوزہ بھی گرم ہے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد تر بوز ہی ہے، مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اس برودت سے مراد حسی ٹھنڈک ہے نہ کہ مزاج کی برودت، اور جن لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں پر کچا خر بوزہ مراد ہے، کیونکہ پکا ہوا گرم ہوتا ہے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ کچا تو کھایا نہیں جاتا کذا فی الکوکب الدری۔ قولہ ”الرتب“ بضمۃ راء اور فتحۃ طاء پکی ہوئی تازہ کھجور کو کہتے ہیں۔

تشریح :- مجسم اوسطؒ میں طبرانی نے اور ابو نعیم نے طب میں ایک ضعیف حدیث میں دونوں کو ایک ساتھ کھانے کا طریقہ یہ نقل کیا ہے، کہ کھجور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیدھے ہاتھ میں ہوتیں اور خر بوز بائیں ہاتھ میں۔ اس کی حکمت ابوداؤدؒ کی مندرجہ بالا روایت میں خود بیان ہوئی ہے، کہ ملا کر کھانے سے ان کے مزاج میں اعتدال پیدا ہوتا ہے، کیونکہ ہر ایک دوسرے کی حدت اور تیزی کو توڑ دیتا ہے، جیسا کہ عناصر و مفردات کا ضابطہ ہے، نیز اس سے خر بوزہ کی میٹھاس میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور کھجور کی خشکی مضحمل ہو جاتی ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے علاج کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ کسی مضر چیز کا مقابلہ اس کی ضد سے کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ بیک وقت ایک سے زائد اشیاء کھانے میں شامل کرنا جائز ہیں خصوصاً جب وہ متضاد ہوں۔ تاہم بعض متضاد اشیاء کو ملانے سے ایسا مزاج جنم لیتا ہے جو صحت کے لئے مضر ہوتا ہے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی اکل البطیخ بالرتب

۱ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ ”باب الجمع بین اللونین عند الاکل“ بکتاب الاطعمه.

۲ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۳۲ ج: ۵ حدیث: ۷۹۹۷ کتاب الاطعمه عن انس بن مالک ان رسول اللہ ﷺ کان

یاخذ الرطب بيمينه والبطیخ بيساره فیاکل الرطب بالبطیخ وکان احد الفاکهۃ الیہ. ۱۲ الحنفی عفی عنہ

۳ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ کتاب الاطعمه.

باب ماجاء فی اکل القثاء بالرطب

عن عبد اللہ بن جعفر قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کل القثاء بالرطب“
حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ککڑی کھجور کے ساتھ
کھاتے تھے۔

لغات :- قوله ”القثاء“ بکسرة قاف وتشدید الثاء ککڑی کو کہتے ہیں کھیرے پر بھی اطلاق ہوتا ہے تاہم
یہاں ککڑی مراد ہے۔

تشریح :- اس کی حکمت بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی علاوہ ازیں یہ دونوں ایک ساتھ کھانے سے
صحت مندی اور وزن میں اضافہ بھی ہوتا ہے، اس لئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میری والدہ نے مجھے رخصتی
سے قبل یہ دونوں چیزیں کھلائیں جس سے میرے جسم میں فربہی ہو گئی۔

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

عن انسؓ ان اناسا من عرینة قدموا المدينة فاجتووا فباعنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فی ابل الصدقة وقال: اشربوا من البانہا وابلہا“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ مدینہ آئے تو آب و ہوا موافق نہ
آنے سے ان کے پیٹ پھول گئے اور رنگ زدہ ہو گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں
کی طرف بھیجا اور فرمایا تم ان کے دودھ پیا کرو اور پیشاب کو۔

اہم حدیث کی تشریح جلد اول میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد اول ”باب ماجاء فی
بول ما یوکل لحمہ“ ص: ۲۳۵)

باب الوضوء قبل الطعام وبعده

”عن سلمان قال قرأت فی التوراة ان برکة الطعام الوضوء بعده فذکرت ذالک للنبی
صلی اللہ علیہ وسلم واخبرته بما قرأت فی التوراة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: برکة

الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده۔^۱

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا، کہ کھانے کی برکت وضوء کرنا (منہ ہاتھ دھونا) ہے، کھانے کے بعد پس میں نے اس کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور جو میں نے تورات میں پڑھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیدی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانے کی برکت تو اس سے پہلے ہاتھ دھونا اور اس کے بعد ہاتھ منہ دھونا ہے۔

تشریح:- حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے سے پہلے تورات میں یہ مضمون پڑھا تھا، تو جب اسلام لائے اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور ان سے اس کی تصدیق کرانا چاہی کہ کہیں یہود نے اس میں تحریف نہ کی ہو یا پھر مقصد یہ تھا کہ برکت کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے ساتھ مختص ہے یا اس سے پہلے بھی دھونے سے برکت ہو جاتی ہے؟ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اور آخر دونوں میں برکت ہے۔ اگر سوال تصدیق کے بارے میں تھا تو جواب کا مقصد یہ ہے کہ اس میں تحریف ہوئی ہے، کیونکہ اصل حکم کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد دونوں پر مشتمل تھا مگر یہود نے پہلے والے حکم کو غائب کر دیا۔ اور دوسری صورت میں جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہماری شریعت میں کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھونے سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔

وضوء کا اطلاق اگرچہ شریعت میں ہاتھ پاؤں سمیت منہ وغیرہ دھونے اور سر کے مسح پر ہوتا ہے، تاہم لغت اور عرف میں اس کے معنی صرف ہاتھ دھونے یا ہاتھ اور منہ دھونے کے ہیں اور یہاں یہی مراد ہیں، گو کہ بعض حضرات نے جیسے صوفیہ کرام وغیرہ اس کو شرعی وضوء پر بھی حمل کرتے ہیں۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں ”والناس يرون الوضوء قبل الطعام ينفى الفقر وبعدہ ينفى اللمم“ اور ابن ماجہ کی ایک ضعیف ثلاثی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔^۲

حدیث باب کے بارے میں امام منذریؒ فرماتے ہیں کہ یہ درجہ حسن سے کم نہیں۔ لہذا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے بارے میں اگرچہ کوئی صحیح روایت نہیں ہے تاہم ایسی روایات ہیں جو اشارۃً اس پر دلالت

باب الوضوء قبل الطعام وبعدہ

۱ الحدیث أخرجه الحاكم في المستدرک ص: ۳۵ ج: ۵ کتاب الاطعمه. ۲ سنن ابن ماجه ص: ۲۳۵ ”باب الوضوء عند الطعام“ ابواب الاطعمه قال رسول الله ﷺ من احب ان يكثر الله خير بيته فليتزأ اذا حضر غداؤه واذا رفع. ۱۲

کرتی ہیں، مثلاً صفائی ستھرائی کے متعلق احادیث جن سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھاتے وقت ہاتھ دھونا کھانے کے آداب اور مستحبات میں سے ہے، اور باب کی روایت بھی حسن ہے۔

آج جبکہ راقم یہ باب لکھ رہا ہے اخبارات میں لاکھوں روپیہ کے اشتہارات اقوام متحدہ اور صابن بنانے والی کمپنیوں کی جانب سے چھپے ہیں یہ اشتہارات ہاتھ دھونے کے عالمی دن منانے کے موقع پر شائع کئے گئے ہیں جن میں ایک بہت بڑے ہاتھ کی تصویر کے ساتھ لکھا ہے کہ زندگی بچانے کی طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے، عالمی سطح پر آج پروگرام کئے جا رہے ہیں اور اس بات کی تشہیر کی جا رہی ہے کہ صابن سے ہاتھ دھونے سے ڈائیریا (اسہال) اور نمونیا کی اموات میں کمی واقع ہو جاتی ہے ہاتھ دھونے سے ہیپائٹس سے بھی بچا جاسکتا ہے۔ تاہم کھانے کے بعد ہاتھ کی انگلیاں چاٹ کر دھوئے یا کسی کپڑے اور ٹشو پیپر وغیرہ سے خشک کر دے چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے۔

”عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اکل احدکم فلا یمسحن یدہ بالمندیل حتی یمسحہا و یمسحہا“۔^۱

یہاں برکت سے مراد نفع اور فوائد ہیں کہ ہاتھ دھونے سے آدمی صحت مند رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی گھن نہیں آتی اور کھانے کے بعد ہاتھوں کی صفائی سے آدمی بہت سی ناگوار چیزوں سے بچا رہتا ہے۔ نہ ہاتھ پر کھیاں بیٹھیں گی نہ رات کو کیڑے کوڑے اور چوہے کاٹیں گے اور نہ ہی کپڑے میلے ہوں گے وغیرہ وغیرہ کچھ مزید باتیں اگلے باب میں آئیں گی۔

باب ماجاء فی ترک الوضوء قبل الطعام

”عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرج من الخلاء فقرب الیہ طعام فقالوا: الّا ناتیك بوضوء؟ قال انما امرت بالوضوء اذا قمت الی الصلوۃ“۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے نکلے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا لایا گیا، تو حاضرین نے کہا کہ کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضوء کا پانی نہ لائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے وضوء کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب میں نماز پڑھنے کے لئے اٹھوں۔

لغات :- ”خلاء“ سماء کے وزن پر خالی جگہ کو کہتے ہیں۔ تاہم منقول عرفی کے طور پر اس کا استعمال بیت الخلاء کے لئے ہوتا ہے کہ وہ بھی ضرورت کے سوا اوقات میں خالی رہتا ہے۔ قولہ ”فقالوا“ یعنی حاضر مجلس میں سے بعض صحابہ کرامؓ نے فرمایا۔ قولہ ”بوضوء“ بفتح الواو، وضوء کا پانی جبکہ بضم الواو معنی مصدری یعنی وضوء کرنے کے لئے آتا ہے یہاں بفتح الواو ہی ہے۔

تشریح :- صحابہ کرامؓ کا یہ کہنا از قبیل عرض ہے جیسے ”آلاتنزل عندنا“ یعنی کیا آپ وضوء نہیں کرتے ہیں؟ چونکہ صحابہ کرامؓ یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد الحدیث وضوء واجب ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیت الخلاء سے نکلے ہیں تو دیگر مصروفیات کھانے وغیرہ سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضوء یاد دلایا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ظن رد کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے وضوء کا حکم ہے، جب میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوں، یہ مطلب حدیث کے ظاہر کے موافق ہے اس میں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہر نماز کے لئے وضوء کرنا کسی پر بھی واجب نہیں اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں جواب عام احوال پر مبنی ہے، ورنہ با وضوء ہونے کی صورت میں تجدید وضوء لازمی نہیں۔ یہ مسئلہ تفصیلاً تشریحات ترمذی جلد اول ص ۲۱۰ تا ۲۱۴ پر گزرا ہے دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فمن شاء الاطلاع فليراجع (باب الوضوء لكل صلوة وباب ما جاء انه يهتلى الصلوات بوضوء واحد)

تاہم امام ترمذیؒ نے جس مقصد کے لئے یہ باب باندھا ہے وہ اس طرح اُجاگر ہو سکتا ہے کہ یا تو اس حدیث میں وضوء سے نظافت یعنی لغوی وضوء لیا جائے اور صحابہ کرامؓ کا مقصود یہ تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ نہیں دھوتے؟ چونکہ صحابہ کرامؓ اس کو لازمی تصور کرتے تھے، تو جواب کا مطلب یہ ہوگا کہ جب ہاتھوں یا جسم پر نجاست حسی نہ ہو تو اس کو دھونا طہارت حکمی کے ضمن میں آتا ہے۔ اور طہارت حکمی کا حکم تو نماز کے وقت ہے لہذا جن اعمال کے لئے طہارت حکمی لازمی نہیں وہاں پانی کا استعمال واجب نہیں، غرض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض نفی وجوب وضوء شرعی و لغوی ہے، نفس وضوء کی نفی مراد نہیں ہے، علیٰ ہذا اس سے ہاتھ دھونے یا وضوء کرنے کی کراہیت پر استدلال کرنا درست نہیں جیسا کہ امام سفیان ثوریؒ نے کیا ہے، اور امام ترمذیؒ نے ان کا قول اسی باب میں نقل کیا ہے ہاں اگر کوئی شخص بہر حال ہاتھ دھونے یا وضوء کرنے کو ضروری اور سنت تصور کرتا ہو اور پابندی سے اس پر عمل پیرا ہو تو پھر سب کے نزدیک مکروہ ہونا چاہئے۔ علیٰ ہذا امام احمدؒ اور امام مالکؒ کی طرف جو عدم استحباب یا کراہیت کے قول کی نسبت کی جاتی ہے اس کو اسی لزوم والی صورت پر حمل کیا جائے گا، پھر جنبی آدمی ہاتھ کے ساتھ منہ بھی دھوئے عام حالات میں کلی کرنا سنت نہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اگر ہاتھ گندے یا میلے ہوں تو کھانے سے پہلے انہیں دھونا لازمی یا کم از کم مستحب ہے یعنی نجاست اور میل کے تناسب سے حکم میں زیادتی و کمی آتی رہے گی لیکن اگر ہاتھ صاف ہوں آدمی پہلے با وضوء ہو یا کچھ دیر پہلے ہاتھ صاف کر چکا ہو تو کھانے سے پہلے غسل کی تجدید کو لازمی قرار دینا مکروہ ہوگا جیسا کہ باقی احکام مندوبہ کا حکم و ضابطہ ہے۔ واللہ اعلم

قولہ ”وكان يكره ان يوضع الرغيف تحت القصعة“ یعنی امام سفیان ثورنی روئی پر برتن وغیرہ رکھنے کو مکروہ اور ناپسند فرماتے، کیونکہ اس سے روئی کی بے قدری اور بے ادبی ہوتی ہے۔ استاد محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی نور اللہ مرقدہ نے اس موقع پر درس میں فرمایا کہ حضرت بنوری صاحب رحمہ اللہ جب طالب علم کو روئی پر پلیٹ رکھتا ہوا لیجاتے دیکھتے تو اسے منع فرماتے۔

باب ماجاء فی اكل الذبأ

”عن ابی طالبوت قال: دخلت علی انس بن مالك وهو ياكل القرع وهو يقول: يا لك شجرة ما احبك الىّ لحب رسول الله صلى الله عليه وسلم اياك“۔

حضرت ابوطالوت فرماتے ہیں کہ میں حضرت انسؓ کے یہاں چلا گیا دریں حالیکہ وہ کدو کا سالن تناول فرما رہے تھے، اور فرماتے اے پیڑ تو کس قدر مجھے پسند ہے؟ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے محبت تھی۔

”عن انس بن مالك قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يتبع في الصحفة يعني الذبأ فلا زال أجبه“۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پیالے میں کدو کے ٹکڑے (ٹکڑے) تلاش کر رہے تھے پس میں اس سے ہمیشہ کے لئے (مستقل) محبت کرنے لگا۔

لغات:- ”الذبأ“ بضم الدال وتشديد الباء والهمزة، قصر بھی جائز ہے کدو کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ”قرع“ بفتح القاف وسكون الراء بھی کدو کو کہتے ہیں۔ قولہ ”يا لك اور ما احبك“ تعجب کے صیغے ہیں۔ ”شجرة“ تمیز ہے۔

تشریح:- اس باب کی دونوں حدیثوں سے لوکی اور کدو کی فضیلت معلوم ہوئی اور اطباء نے بھی اس

کے بہت سے فضائل بیان کئے ہیں، گویا کہ یہ غذا بھی ہے اور دوا بھی آج کل اگرچہ مصنوعی کھاد کی وجہ سے ترکاریوں کی لذت معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے، لیکن جب اس کا رواج عام نہیں ہوا تھا تو ہم اپنے باغ میں لوکی کاشت کرتے بلاشبہ تمام سبزیوں سے لوکی زیادہ لذیذ معلوم ہوتی۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا ہے، اس لئے اس نیت سے اس کا اہتمام کرنا ایک مستحسن اقدام ہے امام نوویؒ وغیرہ نے اسے افضل قرار دیا ہے، اور حضرت انسؓ کا اسے پسند کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں گوکہ قابل رشک ضرور ہے۔ جس طرح باپ کی صورت و سیرت اولاد میں دیکھی جاسکتی ہے کہ ”الولد سیرایہ“ اسی طرح استاذ اور مرشد کی طبیعت بھی شاگرد اور مسترشد کے جسم میں سرایت کرتی ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ قوی تعلق والے اساتذہ و مشائخ کی بیماریاں بھی خویوں کی مانند عقیدت مندوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، تو جس طرح خویاں و بیماریاں موروثی ہوتی ہیں اسی طرح روحانی وراثت میں بھی خویاں مل جاتی ہیں۔ اس کا عام مشاہدہ بچوں میں باسانی کیا جاسکتا ہے جب ماں باپ کسی چیز اور پیشے کو پسند کرتے ہیں تو بچے بھی اس کو پسند کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال باعث قلق نہیں بننا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے میں ادھر ادھر کیوں ہاتھ گھمایا جبکہ وہ دوسروں کو اپنے ہی آگے سے کھانے کا حکم دیتے؟ کیونکہ یا تو مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سائیڈ اور جانب میں ہاتھ دائیں بائیں پھراتے تھے یا پھر منع کرنے کی وجہ شرکاء کا گھن کرنا ہے جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک سے صحابہ کرامؓ کو کسی طرح کوئی گھن نہیں ہوتی بلکہ وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب مبارک حتیٰ کہ پیشاب کو باعث برکت سمجھتے وضوء کا پانی پسینہ اور سر کے بال بے بدل تو ان کے نزدیک حصول برکت کے قوی اسباب تصور کئے جاتے اور سارے صحابہ کرامؓ ان مبارک اشیاء کی تحصیل کے لئے کوشاں رہتے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی شخصیت شرکاء کی نظر میں بہت ہی محترم ہو اور کسی کے آگے سے کھانے یا چیز اٹھانے سے عقیدت پر منفی اثر نہ پڑتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں تاہم درمیان سے نہیں کھانا چاہئے اسی طرح ظاہر احادیث کی وجہ سے اپنے آگے سے ہی کھانا چاہئے۔

باب ماجاء فی اکل الزيت

عن زید بن اسلم عن ابيه ان عمر بن الخطاب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كلو الزيت وادهنوا به فانه من شجرة مباركة۔^۱

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ زیتون کھالیا کرو اور اس کا تیل بدن پر ملا کر دو کہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔

لغات:- قوله 'الزيت' زیتون درخت کے تیل کو کہتے ہیں۔ قوله 'ادهنوا به' ادھان پتشدید الدال سے امر کا صیغہ ہے یعنی زیتون کا تیل روٹی کے ساتھ کھاؤ اور بدن کو اس سے مالش کرو۔ قوله 'مباركة' برکت کے معنی زیادتی کے ہیں مگر پہلے گزرا ہے کہ فائدہ اور نفع کو بھی برکت کہتے ہیں یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ عربستان خشک علاقہ ہے اس لئے بدن کی مالش خشکی سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تشریح:- اس حدیث سے زیتون کی فضیلت معلوم ہوئی جو ہر زیتون کو شامل ہے تاہم مشرق وسطیٰ شام وغیرہ کے زیتون بالخصوص مبارک ہیں کہ ایک تو اس کی فضیلت سورہ نور کی آیت سے معلوم ہوتی ہے^۲ دوسرے وہ سرزمین حضرات انبیاء علیہم السلام کی مولد و مرقد ہے اس لئے وہ باقی اراضی سے ممتاز ہے۔ جب اصل مبارک ہوگی تو فرع بھی برکت سے لبریز ہوگی۔ علیٰ ہذا باب کی حدیث میں برکت کو اصلی معنی یعنی خیر پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ گویا جس طرح کھجور حجاز مقدس کا خاص پھل ہونے کی بدولت برکت کا حامل ہے، اسی طرح زیتون ارض انبیاء کی بناء پر مبارک ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے تاہم امام منذری فرماتے ہیں کہ امام حاکم نے اسے صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے^۳ لہذا یہ باوجود غرابت کے صحیح ہوئی۔

باب ماجاء فی اکل الزيت

۱۔ الحدیث أخرجه الدارمی ص: ۱۳۹ ج: ۲ حدیث: ۲۰۵۲ کتاب الاطعمہ۔ ۲۔ كما قال الله تعالى، يوفد من شجرة مباركة زيتونة لا شرقية ولا غربية الخ سورة النور آیت: ۳۵۔ ۳۔ كذا فی مستدرک للحاکم ص: ۳۹ ج: ۵ کتاب الاطعمہ، قال رسول الله ﷺ ابتدوا بالزيت وادهنوا به فانه من شجرة مباركة هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه۔ ۴۔ الحنفی

باب ماجاء فی الأكل مع المملوک

عن ابی ہریرۃ یخبرہم ذالک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا کفی احدکم خادمہ طعامہ حرّہ ودُخانہ فلیأخذ بیدہ فلیقعہ معہ فان ابی فلیأخذ لقمۃ فلیطعمہ ایاہا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ابو خالد کو اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا غلام (یا خادم) اس کے کھانے یعنی پکانے کی گرمی اور دھوئیں کی مشقت اپنے ذمہ لے لے تو اسے چاہئے کہ اس خادم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک نوالہ لیکر اسے کھلا دے۔

لغات :- قولہ ”کفا“ الف مقصورہ کے ساتھ فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ اور ”اخذکم“ مفعول بہ ہے جبکہ ”خادمہ“ فاعل ہے خادم سے مراد یہاں صرف غلام نہیں بلکہ ہر قسم کے ملازم کو شامل ہے خواہ وہ آزاد کیوں نہ ہو۔ ہاں گھر کی آزاد ملازمہ کا ہاتھ پکڑنا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھانا جائز نہیں لہذا وہ دیگر نصوص کی وجہ سے مستثنیٰ ہے۔ کفی کے معنی کسی کی طرف سے کسی کام کی کفایت کرنے یعنی قائم مقام ہونے کے ہیں۔ ”طعامہ“ مفعول ثانی اور ”حرہ ودخانہ“ طعام سے بدل ہیں۔

قولہ ”فلیقعہ“ اور ”فلیطعمہ“ دونوں بضم الیاء اور کسر العین ہیں کہ دونوں متعدی افعال ہیں۔ قولہ ”ایاہا“ مفعول بہ ہے۔

تشریح :- اس حدیث پاک میں مکارم اخلاق کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے، کہ اگر کسی کا خادم اور ملازم اس کی خدمت میں کھانا تیار کر کے پیش کرے یا تیار کھانا لا کر رکھ دے تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانے میں شریک کیا جائے تاکہ اس کی دلجوئی بھی ہو جائے اور بھوک کی ضرورت بھی پوری ہو جائے، تاہم جو شخص ایسا نہیں کرتا اور اپنے ملازم کے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا ہے جیسے اکثر لوگ اپنے خانا ماں اور باروچی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تو کم از کم اتنا تو کر دے کہ اسے محروم نہ چھوڑے بلکہ کچھ نہ کچھ اسے پکڑا دے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے ”فلیسنا ولہ اکلۃ او اکلتین“۔ بضم الہزۃ، کیونکہ بڑی بے مروتی کی بات ہوگی کہ خادم

باب ماجاء فی الأكل مع المملوک

کے سامنے کھایا جا رہا ہے اور اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس لئے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ اسے اپنے ساتھ شریک کیا جائے لیکن بعض طبائع نفیس ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگ طبعاً متکبر ہوتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے بطور تنزل فرمایا کہ چلو اسے ہاتھ میں دو مگر بالکل محروم تو نہ کر دو یہ صورت اگرچہ اس کے لئے اچھی نہیں لیکن سب سے بُری صورت یعنی کچھ بھی نہ دینے سے تو پھر بھی بہتر ہے کیونکہ اس سے احساس بیدار ہوگا۔

باب ماجاء فی فضل اطعام الطعام

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: أفشوا السلام وأطعموا الطعام واضربوا الھام تورثوا الجنان۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلام پھیلاد! کھانا کھلاؤ اور کھوپڑیوں کو مارو! تم جنت کے وارث بنادیئے جاؤ گے۔

لغات:- قولہ ”افشوا“، مفتحة الہزۃ افشاء اور فشو کے معنی ظاہر کرنے اور منکشف ہونے کے ہیں عام کرنے اور پھیلانے کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو سلام کرو کسی خاص آدمی تک مخصوص نہ کرو۔ قولہ ”الھام“ ہامۃ کی جمع ہے کھوپڑی کو کہتے ہیں یہاں مراد کافروں کی کھوپڑیاں ہیں ان کی کھوپڑیاں اڑانا اور مارنا جہاد سے کنایہ ہے۔ قولہ ”الجنان“ بکسر الجیم جنت کی جمع ہے ”جن“ مادہ میں اخفاء کے معنی پائے جاتے ہیں، چنانچہ جنات نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے جن کہلاتے ہیں، جنت بھی نظروں سے غائب یا درختوں میں مستور ہوتی ہے۔ قولہ ”تورثوا“ بھیغہ مجہول ہے۔

تشریح:- یہ ارشاد پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقعہ پر مدینہ پہنچنے پر فرمایا تھا، چونکہ حدیث شریف میں ہے ”المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“^۱ اس لئے اول ملاقات میں سلام کے الفاظ مسنون قرار دیئے گئے تاکہ دوسرا شخص مطمئن ہو جائے۔ اور اس میں دعا بھی ہے، پھر سلام میں

باب ماجاء فی فضل اطعام الطعام

۱۔ رواہ البخاری ص: ۶ ج: ۱ ”باب المسلم من سلم المسلمون الخ“ کتاب الایمان، ایضاً صحیح مسلم ص: ۴۸ ج: ۱ کتاب الایمان۔

ضابطہ کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے اول یہ کہ اس کی بنا تواضع پر ہونی چاہئے، گویا کہ یہ حصول تواضع کا قوی سبب ہے۔ دوم یہ کہ اس میں دوسرے کے احترام کو اُجاگر کرنا ملحوظ ہے، اس لئے بادی السلام یعنی پہل کرنے والے کو تکبر سے خالی قرار دیا گیا اور فرمایا کہ راکب غیر راکب پر سلام کرے، جیسا کہ مسلم شریف میں ہے ”یسلم الراكب على الماشي والماشي على القاعد والقليل على الكثير“۔^۱

آداب سلام:- امام نوویؒ شرح مسلمؒ میں اس مرفوع حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہ آداب سلام میں سے ایک ہے، پھر آگے لکھتے ہیں کہ سلام میں پہل کرنا سنت اور جواب واجب ہے۔ اگر سلام کرنے والے زیادہ ہوں تو گو کہ سب کو سلام کرنا چاہئے تاہم ایک شخص کے کرنے سے باقی کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، یعنی سنت کفایہ ہے۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک ہو تو اس پر جواب دینا واجب ہو جاتا ہے کئے ہاں جماعت کی صورت میں جواب فرض کفایہ ہے یعنی واجب کفایہ بن جاتا ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ سب جواب دیں مگر ایک کا جواب بھی کافی ہو جاتا ہے، امام ابو یوسفؒ سب کے لئے جواب لازمی قرار دیتے ہیں، سلام کی اقل مقدار السلام علیکم ہے اور مخاطب واحد ہونے کی صورت میں بھی جمع کا صیغہ یعنی علیکم افضل ہے، اگرچہ علیک بھی جائز ہے اس پر رحمۃ اللہ وبرکاتہ کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے، جس کی دلیل ایک تو وہ آیت ہے جس میں سلام کے بعد ”ورحمۃ اللہ وبرکاتہ علیکم اهل البيت“^۲ مذکور ہے۔ دوم نماز میں سب مسلمان تشہد میں ”السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ پڑھتے ہیں، سلام کرتے وقت ”علیکم السلام“ کہنا مکروہ ہے، کہ حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”لا تنقل علیک السلام فان علیک السلام تحیۃ المؤمنین“^۳ تاہم اگر کسی نے ایسا کیا تو عند بعض جواب کا مستحق نہ ہوگا مگر ماہواجح والمشہور کے مطابق جواب کا مستحق ہوگا۔

سلام کے جواب میں بھی ”ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ کا اضافہ افضل ہے سلام اور جواب سلام کم از کم اتنا زور سے کہنا چاہئے کہ مخاطب سن سکے، جواب فوری دینا لازمی ہے۔ اگر خط میں یا زبانی غائب کی طرف سے سلام پہنچے تو پڑھتے ہی اور سنتے ہی جواب دینا لازمی ہے۔ (شرح مسلم للنووی ص ۲۱۲: ج ۲)

۱ صحیح مسلم ص: ۲۱۲ ج: ۲ کتاب السلام، ایضاً سنن دارمی ص: ۳۵۷ ج: ۲.

۲ النووی علی مسلم حوالہ بالا۔ ۳ راجع لاحادیث السلام سنن دارمی من ۳۵۷ تا ۳۶۰ ج: ۲ کتاب الاستیذان.

۴ سورة هود آیت: ۷۳۔ ۵ الحدیث اخرجه ابو داؤد ص: ۳۶۱ ج: ۲ ”باب کراهیۃ ان یقول علیک السلام“ کتاب

الادب، ایضاً مسند احمد ص: ۵۳۲ ج: ۴ حدیث: ۱۵۵۲۵ دار احیاء التراث العربی بیروت.

فائدہ:- اگر ایک آدمی دور ہے تو سلام کرتے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنا جائز ہے تاکہ اسے سلام یا جواب کا علم ہو جائے مگر قریب ہی سے ہاتھ کا اشارہ مکروہ ہے کہ غیر مسلموں کا شعار ہے۔ جنت کے وارث ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا جہنم والاٹھکانا ختم کر دیا جاتا ہے اور جنت ہی میں اسے بسایا جاتا ہے گویا کہ ہر آدمی کے دو مقامین ہیں، وہ جہنم میں ہمیشہ کی زندگی گزارنے سے جنت کے مقام سے محروم کر دیا جاتا ہے والعیاذ باللہ بالعکس۔

یا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے وہاں سے دنیا میں بھیجے گئے اب جس کو جنت ملے گی گویا وہ اپنے جدا مجد کی قیام گاہ میں جاتا ہے۔ یا پھر مطلب یہ ہے کہ جس طرح میراث ایک قوی سبب ہے ملک کا اسی طرح یہ اعمال جنت ملنے کے قوی اسباب ہیں۔

حدیث ثانی:- میں ”اعبدوا الرحمن“ کا مطلب یہ ہے کہ ”وَجِدُوا اللَّهَ“ تنہا اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی اور کو شریک مت کرو وہاں عام عبادت کے معنی میں لینا بھی صحیح ہے۔

باب ماجاء فی فضل العشاء

عن انس بن مالک قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تَعَشُّوا لَوْلَا بَكْفٍ مِنْ خَشَفٍ
فَانْ تَرَكَ الْعَشَاءَ مَهْرَمَةً۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کا کھانا کھایا کرو، اگرچہ مٹھی بھر روڑی کھجور ہی ہو کیونکہ رات کا کھانا چھوڑنا بڑھاپے کا سبب ہے۔

لغات:- قولہ ”عَشَاءٌ“ بفتح العین بروزن سماء شام کے کھانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”تَعَشُّوا“ عشی اور عشیہ سے ماخوذ ہے شام اور آخر النہار کو کہتے ہیں، چونکہ اہل عرب رات کا کھانا عموماً غروب آفتاب کے وقت کھاتے اس لئے اس کو عشاء کہا جاتا ہے، اگرچہ اس حدیث میں غروب سے پہلے کھانے کی ترغیب نہیں ہے بلکہ سونے سے پہلے کھانے کی بات کی گئی ہے اس لئے ترجمہ میں اسے رات کے کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ قولہ ”لَوْلَا بَكْفٍ“ ای بملء الکف۔ قولہ ”خَشَفٍ“ ثخین ناقص اور روڑی کھجور کو کہتے ہیں۔ قولہ ”مَهْرَمَةً“ بفتح المیم والراء ای مظہر للضعف والهرم، ہر م بڑھاپے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رات کو کچھ کھائے بغیر سونے سے کمزوری لاحق ہوتی ہے جو بڑھاپے کا سبب ہے۔

تشریح:- یہ حدیث اصحاب کتب ستہ میں سے صرف امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے، سند کے اعتبار سے بہت کمزور ہے جیسا کہ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں ”ہذا حدیث منکر“ کیونکہ عنبرہ راوی ضعیف اور عبد الملک بن علاق مجہول ہیں، لہذا متن میں تعشوا اگرچہ امر کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، مگر اس سے وجوب ثابت نہیں ہو سکتا تاہم طبی نقطہ نظر سے رات کا کھانا اگرچہ کم مقدار کا ہو صحت اور توانائی برقرار رکھنے کے لئے مفید ہے کیونکہ جب آدمی خالی پیٹ سوتا ہے تو خالی معدے کی حرارت، اس کی رطوبت کو خشک اور کم کر دیتی ہے، جو نشوونما میں بہت اہم ہے یہ قدیم اطباء کی بیاں کردہ وجہ ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق اس کی دو وجہ ہیں (۱) اگر کوئی معدے کا مریض ہو تو خالی پیٹ سو جانے سے معدے کی تیزابیت بڑھے گی۔ (۲) خالی پیٹ سونے سے شوگر کا لیول کم ہو جاتا ہے اور چونکہ دماغ تو گلوکوز اور چکنائٹ استعمال کرتا ہے اس لئے دماغ کی غذا میں کمی آئے گی جس سے سستی اور اُکٹا ہٹ جنم لے گی چونکہ عربوں میں صبح دس بجے اور مغرب کے وقت کھانا ہوتا تھا اس لئے یہ دورانیہ تقریباً چوبیس گھنٹے بن جائے گا بخلاف روزے کے۔

باب ماجاء فی التسمیہ علی الطعام

”عن عمر بن ابی سلمۃ انه دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعنده طعام قال: اُدنْ یا بُنَّی فسمَّہ اللہ وکلْ یَیمینک وکلْ مَما یَلیک“۔^۱

حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں داخل ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانا رکھا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ننھے قریب ہو اور بسم اللہ پڑھ کر سیدھے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے پاس سے کھاؤ!

تشریح:- حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب ہیں، جب ان کے والد ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی التسمیہ علی الطعام

۱ الحدیث اخرجه البخاری فی کتاب الاطعمه ”باب التسمیہ علی الطعام“ ومسلم فی کتاب الاشربة ”باب آداب الطعام والشراب“ وابوداؤد فی کتاب الاطعمه ”باب الأكل باليمين“ ومالك فی الموطأ كتاب صفة النبي ﷺ ”جامع ماجاء فی الطعام والشراب“ بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۲۹ ج: ۲ کتاب الاطعمه.

سے ہوا، دستور جاہلیت کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت اور شفقت فرماتے اور پیار کرتے ”یابنی“ فرما کر ان کو اپنی صلیبی اولاد کی طرح پکارتے، اور اپنے پاس کھانے میں شریک فرماتے۔

قوله ”بسم اللہ“ یعنی بسم اللہ پڑھو جیسا کہ اگلی روایت میں ہے ”اذا اکل احدکم طعاماً فليقل بسم اللہ“ حضرت شاہ صاحب عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ روایات سے فقط ”بسم اللہ“ کے الفاظ ثابت ہیں اس سے زیادہ نہیں لہذا امام نوویؒ اور امام غزالیؒ نے اس پر جو اضافہ مستحسن قرار دیا ہے وہ بلا دلیل ہے۔ تاہم مستدرک حاکم نے ایک روایت کی تخریج کی ہے ”قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبز ولحم وتمرو بسر ورطب اذا اصبتم مثل هذا فضریتکم بایدیکم فکلوا بسم اللہ وبرکۃ اللہ“ اور کہا ہے هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه (مستدرک ص: ۳۶ ج: ۵)۔ واللہ اعلم

اگر کوئی شخص بسم اللہ پڑھنا شروع میں بھول جائے تو کھانے کے دوران پڑھ لے جیسا کہ اگلی روایت میں تصریح ہے۔ جتنے لوگ کھانے میں شریک ہوں ان سب کو بسم اللہ پڑھنا چاہئے جیسا کہ باب کی اگلی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ گوکہ حاضرین کی جانب سے ایک کاتسمیہ کافی ہے بعد میں آنے والے سے نہیں۔ پھر امام نوویؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنی چاہئے تاکہ دوسرے شرکاء کے لئے یاد دہانی ہو۔ ہاں البتہ کھانے کے اختتام پر الحمد للہ آہستہ پڑھنا چاہئے تاکہ دوسروں کے کھانے کے انتقطاع کا سبب نہ بنے۔ ہاں اگر سب لوگ فارغ ہوئے ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح بسم اللہ حلال کھانے پر پڑھنی چاہئے۔ شامیؒ میں تا تاریخانیہ اور قنیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

”واذا قلت بسم اللہ فارفع صوتک حتی تلقن من معک، ولا یرفع بالحمد الا ان

یکونوا فرغوا من الأکل وانما یسمی اذا کان الطعام حلالاً ویحمد فی آخرہ

کیف ما کان۔ (شامی ص: ۳۴۰ ج: ۶، ایچ ایم سعید کراچی، کتاب الطھر والاباحۃ)

پھر بسم اللہ جس طرح کھانے کی چیزوں پر پڑھنا مسنون یا مستحب ہے اسی طرح مشروبات پر بھی مستحب ہے حاضیہ، جب وغیرہ سب کے لئے یہ حکم یکساں ہے۔

بذل المجود میں ہے کہ خنابلہ کے نزدیک تسمیہ واجب ہے جبکہ جمہور کے نزدیک سنت ہے ”واختلفوا

فی التسمیۃ علی الطعام فقال اصحاب احمد بالوجوب والجمہور علی انه سنة (بذل ص: ۳۵۱)

ج: ۵) در مختار کی کتاب الطظر والاباحۃ میں ہے ”وسنة الأكل البسملة اوله والحمد لله آخره، وغسل اليدين قبله وبعده وبيدأ بالشباب قبله وبالشيوخ بعده“ اس پر علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے وقت کلی کرنا مسنون نہیں الا یہ کہ وہ جنب ہو۔ (ص: ۳۴۰ ج: ۶)

حدیث آخر:- اس باب میں دوسری حدیث حضرت عکراش بن ذویبؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ بنومرہؓ نے مجھے اپنی زکوٰۃ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، پس جب میں مدینہ پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے پایا، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ام سلمہؓ کے گھر میں لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ چنانچہ ایک پیالہ بہت تریداور گوشت والا لایا گیا، تو ہم اس کی طرف متوجہ ہو کر کھانے لگے میں اس کے اطراف میں اپنا ہاتھ ادھر ادھر گھمانے لگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آگے سے تناول فرما رہے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا دہنا ہاتھ پکڑا اور پھر فرمایا، عکراش! ایک ہی جگہ سے کھاؤ کیونکہ سارا ہی کھانا ایک جیسا ہے۔ پھر بعد ازاں ایک طباق لایا گیا جس میں کئی قسم کی کھجوریں تھیں، ترم و رطب عبید اللہ (راوی) کو شک ہے (کہ ترم کہا یا رطب) پس میں اپنے آگے سے کھانے لگا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ طباق میں گھوم رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عکراش! جہاں سے چاہو کھاؤ کیونکہ یہ ایک قسم کی چیز نہیں ہے، پھر پانی لایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ دھو لئے اور اپنے ہاتھوں کی تری سے اپنے چہرے، بازوؤں اور سر کو مسح کیا اور فرمایا: اے عکراش! یہاں سے وضوء ہے جو آگ سے پکی ہو۔

لغات:- قولہ ”جفنة“ بڑا پیالہ اور ڈونگا اس کی جمع جفان اور جفن آتی ہے قرآن مجید میں ہے ”وجفان كالجواب“۔ قولہ ”الثرید“ شوربے میں روٹی کو چور کر بھگونا عرب اس کے ساتھ گوشت کی بوٹیاں شامل کرتے تھے، جیسا کہ حدیث باب میں ہے۔ قولہ ”الوزر“ الفتح الواو گوشت کی ایسی بوٹیاں جو ہڈی سے خالی ہوں۔ قولہ ”فخبطت“ یعنی میرا ہاتھ اس ڈونگے میں بے ترتیب سا گھوم رہا تھا۔ قولہ ”الوان“ لون کی جمع ہے اس کے ایک معنی رنگ کے ہیں اور دوسرے نوع اور قسم کے ہیں یہاں یہی مراد ہے۔

تیسری حدیث:- باب کی تیسری حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو ”بسم اللہ“ پڑھ لے اگر وہ شروع میں پڑھنا بھول جائے تو یوں کہے ”بسم اللہ فی اولہ و آخرہ“ اور اسی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھ صحابہؓ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے، کہ ایک بادیہ نشین آیا اور وہ کھانا دو ہی لقموں میں کھا کر ختم کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھئے اگر یہ بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کے لئے کافی ہو جاتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ سب کے لئے پڑھنی چاہئے، اور یہ کہ تسمیہ سے کھانے میں برکت ہو جاتی ہے اور یہ کہ تسمیہ بہر حال پڑھنا چاہئے۔ شروع میں بھول جائے تو کھانے کے دوران کسی بھی وقت یاد آنے پر پڑھ لے۔ کھانے کے دوران پڑھنے سے بظاہر سابقہ کوتاہی کا ازالہ اور برکت کا تدارک ہو جاتا ہے، بخلاف وضوء کے کہ اگر آدمی وضوء کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں تسمیہ مسنون نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کھانے میں تسمیہ آغاز کے بعد مذکورہ باب کی حدیث سے ثابت ہے، جبکہ وضوء کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وضوء امر بسیط ہے جبکہ کھانا مرکب یعنی کئی حصوں پر مشتمل ہے چنانچہ دو لقمے بھی کھانا ہے اور بیس بھی۔ جبکہ وضوء میں تھوڑی سی جگہ خشک رہنے سے وضوء متحقق نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیخ ابراہیم حلبی شرح منیۃ المصلیٰ میں لکھتے ہیں:

”ولونسی التسمیۃ فذکرہافی خلال الوضوء فسمی لا تحصل السنۃ بخلاف الأکل کذا فی العناۃ معللاً بان الوضوء عمل واحد بخلاف الأکل وهو یستلزم فی الأکل تحصیل السنۃ فی الباقی لا استدراک ما فات قالہ ابن ہمام والاولیٰ انہ استدراک لمافات بالحديث وهو قوله عليه السلام اذا اكل احدكم فمسی ان یذکر اسم اللہ علی طعامہ فلیقل بسم اللہ اولہ وآخرہ۔ رواہ ابو داؤدؒ والترمذی ولا حدیث فی الوضوء۔ (کبیری ص ۲۲، سنن اکبری لاہور)

باب ماجاء فی کراہیۃ البیتوتۃ وفی یدہ ریح غمر

عن ابی مریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشیطان حساس لحاس

مع کذا فی الاحادیث الی فی مجمع الزوائد ص: ۱۰۱ تا ۱۰۲ ج: ۲، کتاب الاطعمہ۔ مع سنن ابی داؤد ص: ۴۳ ج: ۲
 ”باب التسمیۃ علی الطعام“ کتاب الاطعمہ، قال اذا اكل احدكم فليذكر اسم الله فان نسي ان يذكر اسم الله في اوله فليقل بسم الله اوله وآخره، ايضاً رواه الطبرانی في الكبير مجمع الزوائد ص: ۱۲ ج: ۵، كتاب الاطعمه.

فاحذروه علیٰ انفسکم من بات وفی یدہ ریح غمر فاصابہ شئی فلا یلومنّ الانفسہ۔“^۱

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ شیطان تیز حس و ادراک اور بہت چاٹنے والا ہے تم اس سے اپنے آپ کو بچائے رکھو، جو شخص رات گزارے دریاں حالیکہ اس کے ہاتھ میں سے گوشت کی بو آرہی ہو اور اسے کوئی تکلیف و اذیت پہنچے تو وہ سوائے خود کے کسی کو ملامت نہ کرے۔

لغات:- قولہ ”حساس“ جس سے مشتق ہے بمعنی ادراک کے۔ قولہ ”لحاس“ لحس کے معنی زبان سے ہاتھ وغیرہ آلودہ و چکنی چیز کو چاٹنے کے ہیں، دونوں الفاظ تشدید کے ساتھ ہیں جو مبالغے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ قولہ ”غمر“ بشتین چکناہٹ و دسومت وغیرہ آلودگی کو کہتے ہیں۔

تشریح:- باب کی دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا بطور خاص اہتمام کرنا چاہئے، کیونکہ سوتے میں کوئی چیز جیسے کپڑے مکڑے اور چوہے وغیرہ کھانے کے اثرات اور خوشبو سونگھتے سونگھتے ہاتھ تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر اسے کاٹنا شروع کر دیتے ہیں، ایسے واقعات کئی دفعہ پیش آئے ہیں کہ سوتے میں چوہے نے لوگوں کو کاٹا ہے یہ بے احتیاطی کے نتائج ہوتے ہیں

چونکہ اصل مقصد ان موذی جانوروں سے بچنا ہے اس لئے اگر صابن کا استعمال کیا جائے تو وہ زیادہ مفید ہے، ہاں بغیر صابن کے دھو کر کسی کپڑے وغیرہ سے اس طرح خشک کرنا کہ کھانے کے اثرات بالکلیہ ختم ہو جائیں تو یہ بھی کافی ہے، علاوہ ازیں نظافت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ ہر حالت میں صاف ستھرے ہوں اور یہی شریعت مطہرہ کی تعلیم ہے۔

مسئلہ:- بعض لوگ کھانے کے دوران روٹی کے ٹکڑے سے ہاتھ پونچھتے ہیں۔ بعض چھری اس سے صاف کرتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ روٹی کے اوپر پیاز اور سلا وغیرہ یا پلیٹ رکھتے ہیں، یہ سب خلاف ادب و مکروہ ہیں۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:- ”یکره وضع الملحہ والقصعة علی الخبز ومسح البیداء السکین بہ“۔

(ص ۳۴۰ ج ۲، کتاب اللہ والاباحۃ)

آخر ابواب الاطعمہ

باب ماجاء فی کراهیة البیتونۃ وفی یدہ ریح غمر

۱۔ الحدیث أخرجه ابو داؤد کتاب الاطعمہ ”باب غسل الید من الطعام“ واحمد فی مسنده وابن ماجہ وابن حبان فی صحیحہ بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۴۲ ج: ۲ حدیث: ۲۰۶۳ کتاب الاطعمہ۔

أَبْوَابُ الْأَشْرِبَةِ

چونکہ کھانا اصل ہے اور پیاس عموماً کھانے کی وجہ سے لگتی ہے، اس لئے اطعمہ کو پہلے ذکر کیا اور اشربہ اس کے بعد، نیز قرآن مجید کی ترتیب ذکر کی کو بھی ملحوظ رکھا گیا، اللہ عز وجل نے فرمایا: ”كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا“^۱ گو ہمارے نزدیک دائرہ ترتیب پر دال نہیں۔ اشربہ، شراب کی جمع ہے جس کا اطلاق پانی اور باقی مائع تمام مشروبات پر ہوتا ہے چنانچہ اس بحث میں نمید کی جملہ اقسام اور پانی پینے کے آداب وغیرہ احکام کا ذکر ہوگا جو مختلف ابواب کے ذیل میں مذکور ہونگے جبکہ پہلا باب شراب کی وعید پر مشتمل ہے۔

باب ماجاء فی شارب الخمر

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل مسكر خمر وكل مسكر حرام، ومن شرب الخمر في الدنيا فمات وهو يدمنها لم يشربها في الآخرة“۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نشہ آور چیز خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ آور شے حرام ہے، اور جس نے دنیا میں شراب پی اور مر گیا دراصل حالیکہ وہ ہمیشگی سے پیتا رہا (اور پھر بغیر توبہ کے مر گیا) تو وہ آخرت (جنت) میں اسے نہیں پیئے گا۔

لغات:- قولہ ”مسکر“ مسکر سے ہے جس سے نشہ پیدا ہو۔ قولہ ”خمر“ اس کے لغوی معنی پھپھانے کے ہیں چنانچہ چادر اور دوپٹے کو خمار اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اوڑھنے سے جسم اور سر چھپ جاتا ہے، اس کے دوسرے معنی شدت اور قوت کے ہیں۔ کما صرح بہ صاحب الہدایہ اور شراب میں یہی معنی ہمارے نزدیک ملحوظ ہے۔ قولہ ”یدمنہا“ ادمن یدمن بمعنی مداومت کے ہیں ادمن الشئ ای آدامہ کسی چیز پر مداومت اور ہمیشگی سے عمل کرنا۔

تشریح:- اس حدیث مبارک میں تین باتیں قابل ذکر ہیں:- (۱) یہ کہ ہرنشہ آور مشروب خمر ہے یا یہ نام بعض مخصوص قسم کا ہے؟ (۲) یہ کہ مسکرات کی قلیل و کثیر سب کا حکم ایک ہے یا مختلف؟ (۳) شراب پینے کا عادی آدمی جنت میں جانے کی صورت میں شراب پینے کا یا نہیں؟ ان میں سے پہلے دونوں مسائل اختلافی ہیں یہاں ان دونوں پر قدرے تفصیل سے بحث کرنا مناسب ہے۔

(۱) پہلے مسئلے میں ائمہ ثلاثہ اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک ہرنشہ آور مشروب خمر ہے خواہ وہ کسی بھی چیز سے بنایا گیا ہو انگور، کھجور، جو، گندم اور شہد وغیرہ اس میں برابر ہیں۔ جبکہ امام اعظمؒ کے نزدیک خمر صرف انگور سے بنائی گئی شراب کو کہا جاتا ہے، جس کی تعریف یہ ہے ”ہی عصیر العنب اذا غلی واشتد وقذف بالزبد“ بعض حضرات نے ”ہی النبی من ماء العنب اذا صار مسکراً“ سے تعریف کی ہے مصداق دونوں کا ایک ہے، یعنی انگور کا وہ کچا اور خام رس اور شیرہ جب اسے کچھ دنوں کے لئے بغیر پکائے یوں ہی خام چھوڑ رکھا جائے یہاں تک کہ وہ جوش مارے اور تیز ہو کر جھاگ اٹھا دے اس وقت وہ مسکر بھی بن جاتا ہے، اور بالا جماع خمر بھی کہلاتا ہے، اس کے علاوہ مسکرات کی جو باقی اقسام ہیں وہ اگرچہ مسکر اور نشہ کی وجہ سے ناجائز ہوں گی۔ مگر خمر اور ان کے احکام میں فرق ہے۔ تاہم صاحبین کے نزدیک خمر کی تعریف میں آخری قید یعنی ”قذف بالزبد“ خمر بننے کے لئے لازمی نہیں ہے بلکہ صرف جوش مارنا کافی ہے۔ اس لئے ہدایہ^۱ میں ہے ”وقیل یؤخذ فی حرمة الشرب بمجرد الاشتداد احتیاطاً“ گویا پینا تو قذف زبد کے بغیر بھی حرام ہے مگر ”حد“ نافذ کرنے کے لئے قذف الزبد کا لحاظ رکھا جائے گا اسی میں احتیاط ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے دلائل:- (۱) ان کا پہلا استدلال باب کی حدیث سے ہے کہ ”کل مسکر خمر“۔^۲
(۲) دوسرا استدلال ترمذی وغیرہ کی مرفوع حدیث سے ہے جو ترمذی میں ”باب ماجاء فی الحبوب النبی

باب ماجاء فی شارب الخمر

۱۔ ہدایہ ج: ۳ ابواب الاشربة۔ ۲۔ الحدیث اخرجه البخاری ص: ۶۲۳ ج: ۲ کتاب المغازی، ایضاً اخرجه فی کتاب الادب و کتاب الاحکام، ومسلم ص: ۱۶۷ ج: ۲ ”باب بیان ان کل مسکر خمر وان کل خمر حرام“ کتاب الاشربة، اسوداؤد ص: ۱۶۲ ج: ۲ ”باب ماجاء فی السکر“ کتاب الاشربة، سنن ابن ماجہ ص: ۲۴۲ ”باب کل مسکر حرام“ ابواب الاشربة، سنن نسائی ص: ۳۲۴ ج: ۲ کتاب الاشربة مؤطا لمالک ضحایا، مسند احمد ص: ۴۵۲ ج: ۱۔

يتخذ منها الخمر“ میں آرہی ہے ”ان من الحنطة خمرأو من الشعير خمرأو من التمر خمرأو من الزبيب خمرأو من العسل خمرأ“۔ اسی باب میں ایک اور مرفوع حدیث ہے ”الخمر من هاتين الشجرتين النخلة والعنبه“۔ یہ حدیث مسلمؒ میں بھی ہے۔ جبکہ پہلی حدیث نسائی کے علاوہ نمسہ نے روایت کی ہے۔ (۳) خر، خمارۃ العقل سے مشتق ہے یعنی بمعنی ستر و اختلاط کے اور یہ خصوصیت تو ہر نشہ آور چیز میں پائی جاتی ہے۔ خفیفہ کی دلیل:۔ احناف کہتے ہیں کہ خمر کی حرمت قطعی ہے، جیسا کہ اللہ عز و جل کا ارشاد ہے:

”انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه

لعلكم تفلحون“ (سورہ مائدہ آیت نمبر: ۹۰ پارہ نمبر: ۶)

دوسری طرف انگور سے بنائی گئی شراب بغیر کسی اختلاف کے خمر ہے، جبکہ باقی اجناس اور خمر کی مذکورہ تعریف کے علاوہ باقی صورتوں میں مسکرات کی اقسام کے خمر ہونے میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ بعض اہل لغت اگرچہ انہیں بھی خمر کہتے ہیں، مگر جمہور اہل لغت ان کو خمر نہیں مانتے ہیں۔ لہذا انگور کا مذکورہ قیود سے موصوف مشروب قطعی اور بالاجماع خمر ہوا۔ جبکہ باقی میں اختلاف کی وجہ سے ظن پیدا ہوا پس انگور سے بنی ہوئی شراب خمر کا قطعی مصداق ہے جبکہ باقی مسکرات مظنون معانی ہیں۔ اور لفظ کو قطعی مصداق پر حمل کرنا اولیٰ واضح ہوتا ہے بمقابلہ ظنی کے یہ ایسا ہے جیسے اُتمہ ثلاثہ نبیذا لتمر کو پانی نہیں مانتے اور اس سے وضوء کو جائز نہیں سمجھتے جیسا کہ ”باب الوضوء بالنبيذ“ میں تفصیلاً گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۲۸۲ ج: ۱ پر)

جوابات:۔ جمہور کے دلائل کا جواب یہ ہے، کہ جن روایات میں عام مسکرات کو خمر کہا ہے تو یہ اطلاق باعتبار لغت کے نہیں ہے، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ عربوں کو ان کی زبان سکھادیں، بلکہ بیان احکام کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ لہذا ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام نشیات بعلت سکر و نشہ کے حرام ہیں لہذا جس چیز میں یہ علت ہوگی تو وہ حرمت کے زمرے میں آئے گی اور کسی کو نشہ چڑھ جائے تو اس پر حد بھی لگے گی، جبکہ خمر یعنی انگور کی شراب من حیث الذات حرام، نجس، رجس اور موجب حد ہے۔ اور جن احادیث مبارکہ میں سکر کی علت بیان نہیں کی گئی ہے جیسے ان کے دوسرے استدلال کی روایات، تو ان اشیاء پر خمر کا اطلاق مجاز ہے، کیونکہ جو خمر یعنی انگور کے خام پانی سے ہوتا ہے، یعنی نشہ تو وہ باقی اجناس کی شراب میں بھی

پایا جاتا ہے۔ اور قرآن و سنت میں مجاز کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ابن الملک اور ابن سیدہ وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے صاحب تحفۃ الاحوذی نے ”باب ماجاء فی الجبوب التي يتخذ منها الخمر“ میں ”ان من الحنطة خمرًا“ کی شرح میں لکھا ہے: ”قال ابن الملک تسميته خمرًا مجاز لا زالته العقل“ گو کہ اپنے طور سے پھر اس کی تردید کی ہے اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

”نعم حزم ابن سیدہ ”فی المحکم“ بان الخمر حقیقته انما هی للعنب و غیرها من المسکرات یسمی خمرًا مجازًا۔“

اعتراض:- اگر باقی اقسام حقیقتاً خمر نہیں تو پھر جب خمر کی حرمت نازل ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس فی عنب (یعنی شیرہ) کے سوا اجناس کی شراب تھی تو اسے کیوں بہا کر ضائع کر دیا؟ حالانکہ وہ اہل لسان تھے۔
جواب:- اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شیرہ انگور کے سوا تمام اقسام کو خمر سمجھتے تھے، بلکہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مسکرتھا اور مسکرات تو حرام ہیں لہذا جب خمر کی حرمت نازل ہوئی اور علت تو اس حرمت کی سکر ہی تھی اس لئے انہوں نے سب کو ضائع کر دیا۔

جہاں تک جمہور کے تیسرے استدلال کا تعلق ہے کہ عصیر العنب اور باقی اقسام میں علت یکساں ہے یعنی عقل کو مغلوب کرنا اور پٹھپانا لہذا سب برابر ہیں کیونکہ اس لحاظ سے سب خمر ہیں۔

اس کا جواب صاحب ہدایہ نے دیا ہے: ”وانما سُمی خمرًا لتخمره لا لمخامرته العقل“ یعنی شیرہ انگور کو خمر عقل کو چھپانے کی بناء پر نہیں کہتے، بلکہ تخمر یعنی تغیر، اشداد اور قوت کی وجہ سے کہتے ہیں، اور یہ علت فی العنب میں جس پیمانے پر پائی جاتی ہے باقی اقسام میں اس طرح نہیں پائی جاتی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہدایہ کے بعض شارحین نے اس عبارت کا دوسرا مطلب بیان کیا ہے جس کو شیخ ابن ہمام نے رد کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے تنزیلی جواب بھی دیا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ شراب کو خمر ستر عقل کی وجہ سے کہا جاتا ہے، تو پھر جواب یہ ہے کہ اس عموم کے باوجود خمر کی تخصیص فی العنب کے ساتھ ہوئی ہے یعنی لغت میں جیسے نجم ظہور کے معنی میں ہے، مگر پھر بھی یہ مخصوص ستاروں کے لئے بولا جاتا ہے اُنق پر ہر نمودار ہونے والے ستارے کو نہیں کہتے ہیں، بلکہ صرف ثریا پر اس کا اطلاق ہوتا ہے فلذا ہذا۔

دوسری بحث:- اس بحث کا موضوع یہ ہے کہ آیا تمام مسکرات حرام ہیں اور ان کا حکم بھی خمر ہی کا ہے یا ان میں اور عصیر العنب کے احکام میں فرق ہے؟ تو پہلے یہ جاننا چاہئے کہ انگور کے خام شیرہ کے علاوہ جو مسکرات

ہیں ان کی اقسام میں فرق ہے۔ آسان لفظوں میں ہم ان کی مجموعی اعتبار سے دو قسمیں بنا سکتے ہیں پہلی قسم میں تین قسم کے مشروبات آتے ہیں (۱) انگور کا شیرہ پکا کر شراب بنانا جب ثلاثین یا نصف بچ جائے۔ (۲) کھجور سے بنائی ہوئی شراب۔ (۳) اور تیسری کشمش کی خام شراب یہ تین اقسام عصیر العنب جس کی تعریف ابھی گزری یعنی ہسی عصیر العنب اذا علی الخ کے ساتھ شمار کر کے اشربة اربعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کے مشروبات ان کے علاوہ گندم اور جو یا شہد وغیرہ کسی بھی چیز سے بنائی ہوئی شراب کی ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ ان اقسام میں اور شراب کی اس قسم میں جو انگور سے بنائی گئی ہو فرق نہیں کرتے ہیں بلکہ سب کو خمر کہتے ہیں اور سب کا حکم ایک ہی بتاتے ہیں یعنی جس طرح ان مسکرات کی مقدار کثیر حرام ہے اسی طرح مقدار قلیل بھی حرام اور موجب حد ہے اگرچہ اس سے نشہ نہ چڑھتا ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ حنفیہ میں سے ارباب فتویٰ نے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے، اور حضرت تھانوی صاحبؒ نے بھی المسک الذی میں فرمایا ہے کہ امام صاحب کو جمہور کی مستدل حدیث پہنچی نہ ہوگی ورنہ وہ اس پر ضرور عمل فرماتے، کیونکہ اصولی طور پر جب حدیث ثابت ہو جائے تو اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے۔ بہر حال شیخینؒ کے نزدیک قسم ثانی کے مسکرات میں ضابطہ یہ ہے کہ ان کی تھوڑی سی مقدار جس سے نشہ پیدا نہ ہوتا ہو عبادت کی قوت کے حصول کی نیت سے پینا جائز ہے، جبکہ زیادہ پینا یا مستی و شادمانی کی نیت سے پینا حرام ہے۔ جبکہ اشربة اربعہ مطلقاً حرام ہیں تاہم عصیر العنب اور باقی تینوں میں اتنا سا فرق ہے کہ عصیر العنب کی حرمت باقی تینوں سے اشد ہے، اور متعدد احکام میں ان کے مابین فرق ہے چنانچہ صاحب ہدایہ نے وہ احکام کچھ یوں بیان کئے ہیں۔ خمر کی عین ذات حرام ہے لہذا ایک قطرہ پینا بھی حرام ہوگا اگرچہ سکر نہ ہو۔ یہ پیشاب کی طرح نجس ہے، اس کو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ مسلمان کے لئے اس کی خرید و فروخت وغیرہ جائز نہیں۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ اس کی تھوڑی سی مقدار پینے سے بھی حد لگے گی اور اس کو سرکہ بنانا ہمارے نزدیک جائز ہے۔

باقی تینوں اشربة کے بارے میں صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

”الآن حرمة هذه الاشربة (الثلاثة) دون حرمة الخمر حتى لا يكفر مستحلها

ويكفر مستحل الخمر لان حرمتها اجتهادية وحرمة الخمر قطعية ولا يجب

الحدیث بھا حتی یسکر“ الخ یعنی سابقہ احکام کے برخلاف۔

(راجع للتفصیل ہدایہ کتاب الاثریہ جلد چہارم)

حضرت شاہ صاحب العرف الشذی میں فرماتے ہیں: ”ان هذه المسئلة لم اجد فيها ما يشفى

الصدور“۔

یہ بحث مانع مسکرات سے متعلق تھی جہاں تک جامد منشیات کا تعلق ہے جیسے افیون تو المسمک الذکی میں ہے کہ اجماعاً ایسی چیزوں کا اس قدر کھانا جائز ہے جو مسکر نہ ہو، اور اگر زیادہ کھانا چاہے جس میں نشہ پیدا ہونے کا احتمال ہو تو ان چیزوں میں کوئی ایسی چیز ملا دے جو مانع سکر ہو پھر کھالے کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ انتہی علی ہذا جو لوگ نسوار کھانے اور سگریٹ پینے کو حرام قرار دیتے ہیں ان کا دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ ان کے عادی لوگ نشے کی زد میں نہیں آتے ہاں البتہ ان چیزوں کی دوسری قباحتیں اپنی جگہ مسلم ہیں جیسے بدبو، بیماری کا اندیشہ، بلا وجہ پیسوں کا ضیاع اور دوسروں کو تکلیف اور گھن وغیرہ کا موجب بننا وغیرہ وغیرہ۔ البتہ چرس اور ہیروئین دونوں تباہ کن ہیں اور اس کے پینے سے ایک تو آدمی نشے میں ڈھت رہتا ہے۔ دوسرے جسمانی اور مردانہ لحاظ سے ان کا پینے والا طاقت و توانائی سے محروم ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں اس سے عقل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ادویات اور پرفیوم میں شامل کیا جانے والا ”الکحول“:- عام طور سے ادویات یا سپرے والی خوشبو میں بغرض حفاظت الکحول یا الکھول نامی مانع مادہ ملایا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ بھی شراب کی طرح نجس ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ الکحول دو طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے (۱) خام تیل یعنی پیٹرول سے۔ (۲) گلوکوز سے۔ پہلی صورت میں پچانوے (۹۵) فیصد سے زیادہ حصہ پیٹرول کا ہوتا ہے اور باقی کچھ نباتات اور زہر وغیرہ ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری صورت میں گنتے اور چقندر وغیرہ کے رس کے جھاگ سے کیمیائی عمل سے اور بذریعہ تخمیر بنایا جاتا ہے دونوں صورتوں میں انگور کی کوئی آمیزش اس میں نہیں ہوتی ہے لہذا ادویات وغیرہ میں اس کے ہونے سے کوئی مضائقہ لازم نہیں آتا۔

تیسری بات:- اس باب میں تیسری بحث حدیث کے جز ثانی سے متعلق ہے کہ عادی شرابی جنت میں شراب پی سکے گا یا نہیں؟ اس حدیث کے مطابق جو آدمی بکثرت شراب پیتا ہے اور جسے عرف میں شرابی کہا جاتا ہے وہ جنت میں شراب نہیں پیئے گا۔ اس حکم کے بارے میں شارحین کافی پریشان ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ وجہ اشکال یہ ہے کہ نہ تو مرتکب کبیرہ کافر ہو جاتا ہے اور نہ ہی جنت میں کسی چیز پر پابندی ہوتی

ہے بلکہ وہاں تو ہر وہ چیز ملتی ہوگی جس کی دل میں خواہش پیدا ہوگی۔

عام ضابطے کے مطابق جو مؤمن گناہ سے توبہ کر لے تو وہ ایسا ہی شمار ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ ”النائب من الذنب کمن لا ذنب له“^۱ اور جو شخص بغیر توبہ کے انتقال کر جائے تو اس کا معاملہ اللہ عزوجل کے دست اختیار میں ہوتا ہے چاہے تو معاف فرمادے اور چاہے تو اسے سزا دیدے۔ تاہم اہلسنت والجماعت کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، بلکہ سزا کاٹنے کے بعد اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل ہوگا۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ جو آدمی شراب حلال سمجھ کر پیتا رہے یا خاتمہ بالخیر سے محروم ہو جائے۔ والعیاذ باللہ تو پھر تو مطلب آسان اور واضح ہے کہ حلال سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے اور خاتمہ بالخیر سے محروم جنت میں داخل نہیں ہوگا تو شراب نہیں پی سکے گا۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے باوجود نہیں پیئے گا تو یہ مشکل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تو ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ توجیہ کی ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز کے حصول میں غلٹ اور جلدی سے کام لیا جس کی تاخیر اور انتظار کا حکم تھا تو جس طرح اپنے مورث کو قتل کرنے سے قاتل وارث کو محروم از میراث کر دیا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی محروم کر دیا جائے گا۔

مگر اس سے وہ اشکال حل نہیں ہوا کہ جنت میں ہر خواہش پوری کر دی جائے گی۔ بعض نے کہا کہ اس شرابی کی چاہت ختم کر دی جائے گی جیسے دنیا میں بعض لوگ میٹھے کو پسند نہیں کرتے اسی طرح باوجود دستیابی کے شرابی، شراب کی خواہش نہیں کرے گا، تو سزا بھی مل جائے گی اور اسے محسوس بھی نہ ہوگا، اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کم درجے کے جنتی اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھتے ہوں گے اور کسی طرح احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں گے،

فلذہذا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

دوسری حدیث:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شراب پی لی تو اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہ ہوں گی، پس اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ (توبہ) قبول فرمائیں گے، اگر وہ دوبارہ لوٹے گا (یعنی ثانیاً پیئے گا) تو اللہ اس کی چالیس ایام کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے، رپھر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ قبول فرمائیں گے، اور اگر وہ پھر لوٹتا ہے تو اللہ اس کی چالیس روز کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے پس اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ قبول کریں گے، پس اگر وہ چوتھی بار لوٹ آئے تو اللہ

اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے، پس اگر وہ (آب کی بار) توبہ کرے گا تو اللہ قبول نہیں فرماتا اور اسے نہر خبال سے پلائیں گے، کہا گیا: اے ابو عبد الرحمن نہر خبال کیا چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ دوزخیوں کے پیپ کی نہر ہے۔

تشریح:- ابو عبد الرحمن، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ یعنی اہل جہنم کے زخموں سے کثیر مقدار میں جو پیپ خارج ہوتا ہے وہ نہر کی شکل اختیار کرے گا اور اسی میں سے شرابیوں کو پلایا جائے گا۔ اس حدیث میں ”صبح“ کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف صبح کی نماز مراد ہو اور وجہ تخصیص اشرفیت ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ اس سے پورے دن کی نمازیں مراد ہیں اور ذکر الجزء والمراد منہ الکل عام استعمال ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گندی غذا کا اثر چالیس دنوں تک باقی رہتا ہے، تاہم بعض صوفیہ نے اس میں غلو سے کام لیا ہے کہ اگر کسی بکری کا بچہ مادہ خنزیر کا دودھ پئے تو اسے چالیس دن تک صاف ستھری غذا کھلائی جائے گی اس کے بعد ذبح کر کے کھانا جائز ہوگا۔ مسئلہ کی وضاحت جلالہ کے ضمن میں گزری ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تین بار اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں اس کے بعد نہیں، تو ابن العربی تو فرماتے ہیں کہ موت تک توبہ قبول ہونے پر اجماع ہے لہذا اس حدیث کو وہ صحیح نہیں مانتے لیکن پہلے گذرا ہے کہ قاضی شوکانی نے فرمایا کہ جمہور کے نزدیک حدیث حسن بھی حجت ہے۔ جبکہ امام بخاری اور ابن العربی حسن کو صحیح نہیں مانتے، اس لئے جمہور کے نزدیک اس کی توجیہ لازمی ہے۔

لہذا جمہور کے نزدیک یا تو یہ تشدید اور تغلیط پر محمول ہے اور نفی توبہ سے رحمت کاملہ کی نفی ہے یعنی اس کی توبہ قبول تو ہو جاتی ہے مگر دل میں جو کدورت گناہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے وہ مکمل صاف نہ ہوگی اور باری تعالیٰ کی رحمت کاملہ اسے اپنی آغوش میں نہیں لے گی۔

یا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے پھر آدمی یا تو توبہ کرتا ہی نہیں ہے یا پھر ہلکا سا ارادہ کرتا ہے مگر اس میں عزم نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق نہیں دیتا اور یہی وجہ ہے کہ گناہ پر اصرار سے خاتمہ بالسوء کا خطرہ رہتا ہے، پھر نماز کے علاوہ باقی اعمال قبول ہوں گے یا وہ بھی قبول نہیں ہوتے تو اس میں دونوں احتمال ہیں ظاہر یہ ہے کہ کوئی عمل قبول نہیں ہوگا کیونکہ نماز عماد الدین ہے جب یہ قبول نہ ہوگی تو باقی تو بطریق اولیٰ قبول نہیں ہوں گے۔

ملا علی قارئی مرقات میں لکھتے ہیں کہ عدم قبول سے مراد ثواب نہ ملنا ہے باقی اگر اس نے شرائط کے

ساتھ نماز پر بھی ہوگی تو اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا اور قضا واجب نہ ہوگی۔

باب ماجاء کل مسکر حرام

”عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سُئِلَ عن البتَع فقال: کل شراب اسکر فهو حرام“۔^۱

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شہد کی نبیذ کے بارے میں پوچھا گیا (یعنی حل و حرمت کے متعلق) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی مشروب جو نشہ پیدا کرے تو وہ حرام ہے۔

لغات:- قولہ ”البتع“ مبکسر الباء وسکون التاء جبکہ تاء کی حرکت بھی جائز ہے شہد کی نبیذ اور شراب کو کہتے ہیں۔ بعض اہل لغت نے انگوڑی کی شراب پر بھی اطلاق کیا ہے۔

تشریح:- حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ الکوکب الدری میں فرماتے ہیں کہ سوال اگرچہ مخصوص نبیذ کے بارے میں تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون کلی کے عنوان میں جواب دیا تا کہ اس پر جزئیات کی تعریفات ہو سکیں۔ اس ضابطے کا مطلب یہ ہے کہ جو مشروب نشے کے درجے میں داخل ہو جائے یعنی اس کے پینے سے نشہ پیدا ہوتا ہو تو وہ حرام ہے اور اس پر اجماع ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے، البتہ اختلاف اس میں ہے کہ شہد وغیرہ کی شراب مطلقاً حرام ہے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر یا پھر نشے کی مقدار کثیر ممنوع اور قلیل جائز ہے؟ بشرطیکہ تقویٰ علی العبادۃ کی نیت سے ہو تو ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے، جبکہ شیخین رحمہما اللہ دوسری صورت کو پسند کرتے ہیں کیونکہ حدیث سے علت سکر کی طرف اشارہ ملتا ہے، تاہم ارباب فتویٰ نے امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے تفصیل گذشتہ باب کی دوسری بحث میں گذری ہے فلا تعیدہ۔

باب ماجاء کل مسکر حرام

۱ الحدیث أخرجه البخاری ومسلم وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ ومالك فی الموطأ واحمد فی مسنده بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۵۳ ج: ۲ حدیث: ۲۰۹۷ کتاب الاشریہ.

باب ما سکر کثیرہ فقلیلہ حرام

”عن جابر بن عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما سکر کثیرہ فقلیلہ حرام“۔^۱

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز (مشروب) کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے تو اس کا قلیل بھی حرام ہے۔

تشریح:- جیسا کہ پیچھے گزرا ہے کہ قلیل کی حرمت خمر میں تو متفقہ ہے اور باقی اشرہ ثلاثہ میں بھی قلیل ممنوع ہے گو خمر اور اشرہ ثلاثہ کی حرمت میں قدرے فرق پایا جاتا ہے، تاہم حنفیہ کے نزدیک خمر کے علاوہ باقی اشرہ جیسے گندم، جو اور شہد وغیرہ کی شراب میں اصل علت سکر ہے لہذا جس چیز میں سکر ہوگا وہ حرام ہوگی اور جس میں نشہ نہ ہوگا وہ حرام نہ ہوگی، البتہ یہاں دوسری علت بھی حرمت کی پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر نبیذ وغیرہ مشروبات بطور تلبی و مستی اور ہيجان پیدا کرنے کی غرض سے ہو، یا وہ قلیل، زیادہ پینے کا سبب بنتا ہو تو پھر قلیل مسکرات کا بھی حرام ہوگا اگرچہ قلیل میں نشہ پیدا کرنے کی بالفعل طاقت نہ ہو، اور یہی حنفیہ کے نزدیک مفتی بہ ہے حضرت شاہ صاحبؒ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے بعد المعروف الشذی میں فرماتے ہیں:

”واقعه) فی شرح الهدایۃ ان اباحفص الکبیر افتی بحرمة النبیذ فقلیل له خالف

اباحنیفۃ انفقال: ما خالفته فانه یحرم اذا کان للتلبی و اناس الزمان یشربونه علی

التلبی“۔۔۔

وہ مزید فرماتے ہیں: ”ویجب العمل بما قال الجمهور و محمد بن حسن“، یعنی مفتی بہ قول جمهور کا ہے۔ ہدایہ کے شارحین نے امام صاحبؒ سے نقل کیا ہے، کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر مجھے ساری دنیا کی چیزیں اور ان جیسی مزید دی جائیں تو بھی میں نبیذ ایک قطرہ نہیں پیوں گا، کیونکہ اس میں اختلاف ہے اور اگر مجھے دنیا کی ساری اشیاء دی جائیں تاکہ میں نبیذ کو حرام قرار دوں تو میں ایسا بھی نہیں کروں گا کیونکہ اس میں اختلاف

باب ما سکر کثیرہ فقلیلہ حرام

^۱ اخرجه النسائی ص: ۳۲۶ ج: ۲ کتاب الاشرہ، اخرجه الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۳۸۸۰ وفی الاوسط ایضاً

حدیث: ۶۳۳۶، کذا فی مجمع الزوائد ص: ۵۸ ج: ۵ حدیث: ۸۱۰۹ کتاب الاشرہ.

ہے۔ (راجع للتفصیل العرف الشذی علی الترمذی)

دوسری حدیث:- ”عن عائشة قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كل مسكر حرام ما سكر الفرق منه فملاً الكف منه حرام قال أحدهما في حديثه الحسوة منه حرام“۔
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ہر نشہ آور چیز (مشروب) حرام ہے جس کا ایک فرق (بڑا پیاناہ ہے) نشہ پیدا کرے تو اس کا ایک چلو بھی حرام ہے (اور میرے دونوں شیخین محمد بن بشار یا عبد اللہ معاویہ) ایک ان دو میں سے اپنی حدیث میں کہتے ہیں کہ اس کا ایک گھونٹ بھی حرام ہے یعنی ایک نے چلو کا لفظ استعمال کیا اور دوسرے نے گھونٹ کا۔

لغات:- قولہ ”الفرق“ را کا سکون اور فتح دونوں جائز ہیں وہ پیاناہ جس میں سولہ رطل آجائیں یہاں یہ کنایہ ہے کثرت سے۔ فرق کی مقدار میں اور بھی اقوال ہیں۔ قولہ ”حسوة“ بضم الحاء و سکون السين ایک مٹھی اور چلو کو کہتے ہیں یہاں پر چلو اور گھونٹ دونوں تحدید کے لئے نہیں ہیں بلکہ قلت سے کنایات ہیں۔

باب ماجاء فی نبیذ الجر

”عن طاؤس ان رجلاً أتى ابن عمر فقال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نبیذ الجر؟ فقال: نعم فقال طاؤس: والله انی سمعته منه“۔

حضرت طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑے میں نبیذ بنانے سے ممانعت فرمائی ہے؟ تو ابن عمرؓ نے فرمایا: ”ہاں“ طاؤس فرماتے ہیں: بخدا میں نے ابن عمرؓ سے یہ کہتے سنا ہے۔^۱

لغات:- قولہ ”نبیذ“ فعیل وزن ہے گویا مفعول سے بنا ہے یعنی منبوز سے، انگور یا کھجور وغیرہ پانی میں ڈال کر رکھ اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ پانی میٹھا ہو جائے خواہ اس میں نشہ آئے یا نہ آئے دونوں صورتوں

باب ماجاء فی نبیذ الجر

۱۔ اسی مضمون کی روایت عن سويد بن مقرن قال اتيت رسول الله ﷺ بنیذ جر فسالته عنه فنهاني عنه فاخذت الجر فسكرتها، رواه احمد في مسنده ص: ۴۷۷ ج: ۴، حديث ۱۵۲۷، ايضاً مجمع الزوائد ص: ۵۹ ج: ۵، ايضاً مصنفه عبدالرزاق ص: ۱۲۳ ج: ۹، كتاب الاشرية والظروف.

میں اسے نبیذ کہتے ہیں۔ قولہ ”جر“ نسخہ الحکم و تشدید الراء جرۃ کی جمع ہے جیسے تمر اور تمرۃ اس کی جمع جرار بھی آتی ہے اس منۃ اور جرۃ کو کہتے ہیں جو منی سے بنایا جائے۔

تشریح:- طاؤس ابن کیسان التوفی ۱۰۶ تا ۱۱۰ م یعنی ہیں بعض نے نام ذکوان اور طاؤس لقب بتلایا ہے طاؤس مور کو کہتے ہیں جو ایک خوبصورت پرندہ ہے۔ یہاں سائل کے سوال میں ہمزہ استفہامیہ مقدر مانا جائے گا جیسا کہ نسائی کی روایت میں مذکور ہے انہی۔^۱

عربوں میں یہ دستور تھا کہ منکوں اور گھڑوں کے مسامات تارکول وغیرہ سے بند کر کے ان میں نبیذ بناتے تھے، اور اس چیز سے نبیذ میں جلد ہی سکر آ جاتا تھا اس لئے شراب کی حرمت کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام اوانی و ظروف پر پابندی لگا دی جن سے نبیذ میں سکر پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تاہم یہ پابندی جمہور کے نزدیک پھر اٹھالی گئی تھی۔ جبکہ امام مالک، امام احمد اور ایک روایت کے مطابق امام اسحاق کے نزدیک یہ بدستور باقی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا مذہب بھی یہی بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

”ثم ان هذا النهی كان في اول الامر ثم نسخ بحديث بریده رضى الله عنه.... الى ان قال.... هذا الذي ذكرناه من كونه منسوخاً هو مذهبنا ومذهب جماهير العلماء قال الخطابي: القول بالنسخ هو اصح الاقوال وقال قوم: التحريم باق وكرهوا الانتباذ في هذه الاعية ذهب اليه مالك واحمد واسحق وهو مروي عن ابن عمرو وابن عباس رضى الله عنهم۔ (مسلم مع النووي ص ۳۳۰ ج ۱:)

نسخ کی دلیل اگلے سے پیوستہ باب میں آ رہی ہے۔

ابن العربیؒ نے بھی عارضہ میں لکھا ہے:

”اختلف العلماء في هذا اختلافاً كثيراً روى عن مالك منع ذلك وبه قال احمد واسحق وروى عنه (اي عن اسحق) اجازته الخ۔

علیٰ ہذا حضرت ابن عمرؓ کے جواب ”نعم“ کی کسی توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ انہوں نے یہ جواب اپنے ذوق کے مطابق دیا ہے تاہم وہ نسخ کے قائل کیوں نہیں تھے، تو ممکن ہے کہ وہ بطور سد ذرائع اس کی ممانعت فرماتے ہوں، کیونکہ لوگ عموماً احتیاط نہیں کرتے ہیں اور نبیذ کو زیادہ دیر کے لئے چھوڑ لیتے ہیں یہاں تک

کہ وہ مسکر بن جاتی ہے یا ادنیٰ درجے کا سکر اس میں آجاتا ہے مگر لوگ پھر بھی اسے پیتے ہیں تو پابندی کا فائدہ حرام سے دور رکھنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ امام ابوحنیفہؒ نے ہدی کے شعار سے منع فرمایا تھا کیونکہ لوگ اس میں نلویا کرتے تھے گویا مفتی کو حالات کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ أن ینبذ فی الدباء والنقیور والحنتم

”عن عمرو بن مَرْءَةَ قَالَ سَمِعْتُ زَاذَانَ يَقُولُ سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ عَمَانِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْأَوْعِيَةِ وَأَخْبَرَنَا بِلَفْتِكُمْ وَفَيْسِرَهُ لَنَا بِلَفْتِنَا قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحَنْتَمَةِ وَهِيَ الْحَرَّةُ وَنَهَى عَنِ الدُّبَاءِ وَهِيَ الْقِرْعَةُ وَنَهَى عَنِ النَّقِيرِ وَهِيَ أَصْلُ النَّخْلِ يُنْقَرُ نَقْرًا أَوْ يُنْسَجُ نَسَجًا وَنَهَى عَنِ الْمَزْفَتِ وَهُوَ الْمَقِيرُ وَأَمْرَانِ يُنْتَبَذُ فِي الْأَسْقِيَةِ“۔

عمرو بن مَرْءَةَ فرماتے ہیں میں نے زاذان سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابن عمرؓ سے ان برتنوں کے بارے میں دریافت کیا جن کے استعمال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اس کا بیان اپنی زبان میں کیجئے اور وضاحت ہماری زبان میں کیجئے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنتم سے منع فرمایا ہے اور وہ ہرے رنگ کا گھڑا ہوتا ہے، اور منع فرمایا ہے دبء سے اور وہ خشک کدو ہے۔ اور منع فرمایا ہے تقیر سے اور وہ کھجور کی جز کا تراشا ہوا گھڑا ہوتا ہے یا چھلا ہوا مٹکا، اور منع فرمایا ہے مزفت سے اور وہ تار کول کا لپ دیا ہوا مٹکا ہوتا ہے۔ اور مشکیزوں میں نیذ بنانے کا حکم دیا ہے۔

لغات:- قوله ”الاولعية“ وعاء بكسر الواو کی جمع ہے برتن کو کہتے ہیں۔ قوله ”الحنتم“ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کے چھ معانی نقل کئے ہیں اور ان میں سے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ ہرے رنگ کے مٹکے کو کہتے ہیں ”واما الحنتم فاختلف فيها فاصح الاقوال واقواها انها جرار خضر“^۱ بہر حال یہ لفظ بفتح الحاء و سکون النون اور بفتح تاء پڑھا جائے گا۔ قوله ”الحرة“ بفتح الحاء و فتح الراء المشددة مٹی کا مٹکا۔ قوله ”الدباء“ بضم الدال وتشديد الباء کدو کو کہتے ہیں۔ اس میں سے بیج اور گودا نکال کر بوتل کی طرح بناتے ہیں، ہمارے ہاں پہلے لوگ جب کھیت میں کام کرتے تو اس میں پانی اپنے پاس رکھتے خصوصاً لسی اس میں کافی ٹھنڈی رہتی ہے۔

قولہ ”القرعة“ بروزن نملۃ یہ وہی مذکورہ کدو ہے۔ قولہ ”النقییر“ یہ قلیل کی طرح بمعنی منظور کے ہے نفقہ کے لغوی معنی کریدنے، تراشنے اور کھودنے کے ہیں اصطلاح میں اس کی تفسیر وہی ہے جو حدیث باب میں کی گئی ہے، یعنی کھجور کے تنے کا جڑ والا حصہ اندر سے خالی کر کے مٹکا مٹکانا۔ قولہ ”اوینسج“ اس لفظ کو جیم اور حاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے اگر جیم کے ساتھ ہے تو اس کا مطلب وہی ہے جو تفسیر کی تفسیر میں بیان ہوا تاہم بعض حضرات نے جیم کے ساتھ پڑھنے کو وہم قرار دیا ہے اور حاء کی روایت کو صحیح کہا ہے جس کے معنی بیرونی حصہ کو کھیل کر ملائم کرنے اور اندرونی کو خالی کر کے مٹکا مٹکانے کے ہیں۔

قولہ ”المزفت“ تشدید الفاء المفتوحہ اس کے معنی وہی ہیں جو حدیث میں اس کے بعد بیان کئے گئے ہیں یعنی ”مقیر“ چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: ”واما المقیر فهو المزفت“^۱ مقیر بضم المیم وفتح القاف وتشدید الیاء المفتوحہ پڑھا جائے گا۔ زفت اور قیر دونوں کے معنی تارکول کے ہیں۔ تارکول لگانے سے مسامات بند ہو جاتے ہیں پھر اس میں بھی نبیذ مسکر بن جاتی ہے جس طرح سابقہ برتنوں کی اقسام میں نبیذ جلدی مسکر بن جاتی ہے۔

تشریح:- جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ان برتنوں کا استعمال ابتداء زمانہ حرمتِ خمر میں ممنوع قرار پایا تھا بعد میں اس کی اجازت دی گئی تھی، اور اب جمہور کے نزدیک ان کا استعمال جائز ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس کے لئے مستقل باب اس باب کے بعد قائم کیا ہے، بہر حال یہ ممانعت مطلق استعمال سے نہ تھی بلکہ نبیذ بنانا اور رکھنا ان میں ممنوع تھا، کیونکہ ایک تو مسامات بند ہونے کی وجہ سے سکر کا قوی اندیشہ تھا۔ دوم یہ برتن عموماً شراب کے لئے استعمال ہوتے تھے تو ان کے نخس ہونے کے ساتھ ان کے استعمال سے شرایبوں سے مشابہت آتی یا شراب یاد آ جاتی۔ علاوہ ازیں شریعت مطہرہ کا یہ بھی اصول ہے کہ جب کسی چیز پر سخت پابندی لگاتی ہے تو اس کے مقدمات پر بھی پہرہ بٹھا دیتی ہے جیسے فرمایا: ”ولا تقربوا الزنا“^۲ لآ یہ سہ۔ تاہم ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ جس چیز کو لعینہ حرام و ممنوع قرار دے دیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے حرام و ناجائز ہوتی ہے جبکہ کسی چیز کو علت کی وجہ سے حرام دینے کی صورت میں اس علت کی نفی سے عندالغایہ حرمت مرتفع ہو جاتی ہے۔

”واذا نهى عن الشيء بعينه لم تؤثر فيه الحاجة واذا كان لمعنى في غيره اثر فيه

الحاجة لارتفاع الشبهة معها“۔ (عارضۃ الاحوی)

علیٰ ہذا جب صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں شراب کی نفرت شدت اختیار کر گئی تو ان برتنوں کے استعمال میں تشدید کی ضرورت ختم ہو گئی اور عند الحاجة صحابہ کرامؓ کی درخواست پر حرمت ختم کر دی گئی۔

باب ماجاء فی الرخصة أن ینتبذ فی الظروف

”عن سلیمان بن بُریدة عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انی كنتُ

نهيتكم عن الظروف وان ظرفاً لا یحل شيئاً ولا یحرمه وکل مسکر حرام۔“

حضرت بُریدة بن الحصیبؓ فرماتے ہیں: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے تمہیں (چار) برتنوں (میں نبیذ بنانے کے لئے ان) کے استعمال سے روکا تھا تاہم کوئی برتن کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کرتا اور ہر نشاء اور (چیز) حرام ہے۔

دوسری حدیث:- اس باب میں دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا تو (کچھ عرصہ بعد) انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس دوسرے برتن نہیں ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تو ان کے استعمال میں حرج نہیں۔

تشریح:- یہ حدیث نسخ پر صریح ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی جمہور کا مذہب ہے۔ عارضہ میں ہے کہ امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ نے نسخ کی علت دفع حرج اور تخفیف کو بتایا ہے۔

چونکہ ممانعت کی علت گویا ان وجوہات میں سے ایک تھی جن کا ذکر سابقہ بابوں میں کیا گیا مثلاً سد ذرائع وغیرہ مگر دوسری جانب ضرورت جب ان سے مزاحم بن گئی اور حرمت کی علت اتنی طاقتور بھی نہ تھی، اس لئے حاجت کی علت اباحت کو ترجیح دے کر ان کے استعمال کو جائز فرمایا، اور اگر ہم یہ کہیں کہ حرمت موقت تھی یا جب صحابہ کرامؓ نے درخواست فرمائی تو من جانب اللہ اسی وقت وحی جواز کی نازل ہوئی تو پھر کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔

تاہم یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آج کل ہوس پرستی کا دور ہے لوگ معمولی ضرورت کی بناء پر حرام اشیاء کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں یا درکھنا چاہتے ہیں کہ اصحاب ترجیح صاحب ہدایہ اور قاضی خان جیسے لوگ

ہوتے ہیں یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں ہے، کہ جو ضرورت سمجھ میں آجائے تو اسے میخ قرار دیدے کلا و حاشا۔ اگر کسی کی جوان لڑکی کالج میں پڑھتی ہے تو اسے اس لئے یاری کی اجازت دینا تاکہ وہ اپنی تعلیم تسلی سے مکمل کرے ایک خیالی ضرورت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

باب ماجاء فی الانتباز فی السقاء

”عن عائشة قالت کُنَّا نَنْبِذُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَقَاءٍ يَوْكَا اَعْلَاهُ لَه عَزْلَاءٌ، نُنْبِذُهُ غَدُوَّةً وَيُشْرِبُهُ عِشَاءً وَنُنْبِذُهُ عِشَاءً وَيُشْرِبُهُ غَدُوَّةً“۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نبیذ بناتے تھے ایسے مشکیزہ جس کے اوپر کامنہ باندھا جاتا تھا اور اس کے نیچے میں ایک چھوٹا سوراخ ہوتا تھا ہم صبح کھجوریں ڈالتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے شام کو پیتے اور شام کو بناتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو نوش فرماتے۔

لغات :- قولہ ”نُبِذَ“ بکسرۃ باء باب ضرب سے بھی آتا ہے اور باب افعال و تفعلیل سے بھی آتا ہے علیٰ ہذا پھر نون اول مضموم ہوگا۔

قولہ ”سقاء“ بکسرۃ سین والفاء ممدودہ پانی کے مشک اور دودھ کے مشکیزے کو کہتے ہیں۔

قولہ ”یوکا“ بصیغہ مجہول مہوز اللام ہے ”ای یوکا بالیو کاء“ یعنی جس چیز کا منہ ڈوری سے باندھا جاتا ہے۔ تاہم امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ مہوز نہیں ہے بلکہ صحیح ”بسوکی“ یاء کے ساتھ ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے چاہے مہوز ہو یا معتل۔

قولہ ”عزلاء“ بفتح الغین وسکون الزاء وبالمدودہ چھوٹا سوراخ جو مشکیزے کے نیچے حصہ اور جانب میں ہوتا ہے اور اسی سے پانی پیا جاتا ہے گویا اس سے ٹوٹی کا کام لیا جاتا ہے جیسے کلر میں اوپر سے پانی ڈال کر بند کر دیا جاتا ہے اور نیچے ٹوٹی سے پانی نکالا جاتا ہے۔

قولہ ”غَدُوَّةٌ“ بضم الغین عموماً بدن کے پہلے حصے کو اور ”عِشَاءٌ“ بکسر الغین مابعد الزوال کو کہتے ہیں۔

تشریح :- اس روایت سے مشکیزے میں نبیذ بنانے کا جواز معلوم ہوا۔ ترمذی کی روایت اگرچہ درجہ حسن میں ہے کیونکہ حضرت ابن بصریؒ کی والدہ ”خیرہ“ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مولاۃ مقبولہ

ہیں تاہم یہ حدیث مسلم^۱ و ابوداؤد^۲ وغیرہ میں بھی ہے۔

البتہ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ مسلم وغیرہ کی حدیث میں تین دنوں کا ذکر ہے جبکہ باب کی حدیث میں ایک دن کا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

”كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يبتذله الزبيب في السقاء فيشربه يومه والغدو بعد الغد فاذا كان مساء الثالثة شربه وسقاه فان فضل شئى اهراقه“۔

اور یہ تو بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کے حل کے لئے ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اختلاف موسموں کے تفاوت پر مبنی ہے چونکہ گرمیوں میں تغیر جلدی آتا ہے اس لئے حضرت عائشہؓ کی حدیث موسم گرما پر محمول ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سردی کے موسم سے متعلق ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں مقدارِ قلیل کا ذکر ہے یعنی تھوڑی سی مقدار میں غنیمت تیار کی جاتی تھی جو ایک وقت میں ختم ہو جاتی اگر زیادہ ہوتی تو تین دن تک بھی استعمال فرماتے جیسا کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مشکوں کا فرق ہو حضرت عائشہؓ کے گھر میں جو مشک تھی وہ چھوٹی یا پرانی ہوگی اور حضرت میمونہؓ کے گھر میں جو مشک تھی وہ بڑی یا نئی ہوگی، چھوٹی میں قلیل بنید ہی بن سکتی ہے اور پرانی میں مسامت کی بندش کی وجہ سے سکر جلد آنے کا اندیشہ ہوتا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت میمونہؓ کے گھر کا حال بیان کیا ہے جہاں مشک میں یہ دونوں علتیں نہ تھیں، پھر یہ اختلاف اسی طرح ہو جائے گا جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے طریقے میں حضرت عائشہؓ اور حضرت میمونہؓ کی حدیثوں میں اختلاف ہے جسکی ایک توجیہ امام ملائکؒ کے قول کے ضمن میں یہی کی گئی ہے کہ یہ دو الگ الگ غسل خانوں پر مبنی ہے۔ کما مر فی بابہ فلا نعیده

باب ماجاء فی الانتباذ فی السقاء

۱۔ صحیح مسلم ص: ۱۶۸ ج: ۲ کتاب الاشریہ۔ ۲۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۶۶ ج: ۲ ”باب لی صفة النبیز“ کتاب الاشریہ، سنن نسائی ص: ۳۲۸ ج: ۲ کتاب الاشریہ۔ الحنفی عفی عنہ

باب ماجاء فی الحبوب التي يُتخذ منها الخمر

”عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان من الحنطة خمرًا ومن الشعير خمرًا ومن التمر خمرًا ومن الزبيب خمرًا ومن العسل خمرًا“۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گندم کی بھی شراب ہوتی ہے، جو کی بھی شراب بنتی ہے چھواروں کی بھی خمر ہوتی ہے اور کشمش سے بھی بنتی ہے اور شہد کی بھی شراب ہوتی ہے۔

لغات:- قوله فی ترجمة الباب ”الحبوب“ حَبّ کی جمع ہے اور حَبَّة کی جمع ”حبات“ آتی ہے دانے کو کہتے ہیں تاہم مطلق غلوں اور پھلوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔
قوله ”الحنطة“ بکسر الحاء گیہوں اور گندم کو کہتے ہیں۔ قوله ”الشعير“ جو۔ قوله ”التمر“ خشک کھجور اور چھوارے کو کہتے ہیں۔ قوله ”الزبيب“ کشمش۔

تشریح:- ابن الملک فرماتے ہیں کہ ان اشیاء کی بنی ہوئی شراب کو خمر بطور مجاز کہا ہے۔ ابن سیدہ نے بھی محکم میں جزم کیا ہے اس پر کہ اصل خمر تو انگور کی ہوتی ہے باقی مسکرات کو مجازاً خمر کہا جاتا ہے (کذا فی تحفة الاحوذی)۔ حدیث سے متعلقہ بحث تفصیل سے ”باب ماجاء فی شراب الخمر“ میں گذری ہے۔ فلیراجع۔

باب کے اخیر میں حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث ہے ”الحممر من هاتین الشجرتین النخلة والعنب“ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اہل مدینہ کے لئے تھا کیونکہ ان کی شراب انہی دونوں یعنی کھجور اور انگور سے بنتی تھی۔

ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ جو لوگ انگور کے علاوہ اشرہ پر خمر کا اطلاق حقیقی مانتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد حقیقۃ شرعی ہو اور جو لوگ اس کی نفی کرتے ہیں وہ لغوی اعتبار سے نفی کرتے ہیں۔ (کذا فی التحفة عن فتح الباری) اس میں حنفیہ کے موقف کو تسلیم کیا گیا ہے۔

باب ماجاء فی خلیط البسر والتمر

”عن جابر بن عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یتبذ البسر والرطب جميعاً۔“^۱

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچی پکی کھجوروں کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

دوسری حدیث:- اس باب کی دوسری حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں انگور اور چھوڑوں کے ملانے اور مشکوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کا اضافہ ہے۔

لغات:- قوله فی ترجمۃ الباب ”خلیط مختلف النوع چیزوں کے مجموعے کو خلیط کہا جاتا ہے گویا کہ فعلیل بمعنی مفعول ہے خلط الشيء بالشيء کے معنی ملانے اور خلط ملط کرنے کے ہیں۔ قوله ”البسر“ نیم پختہ کھجور، گد رکھجور۔ ویسے ہر تازہ شے کو بھی کہتے ہیں مگر یہاں کچی و نیم پختہ کھجور مراد ہے۔ قوله ”الرطب“ ضم الراء وفتح الطاء پکی ہوئی تازہ کھجور۔

تشریح:- اس باب کی حدیث سے مرکب نبیذ بنانے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے مگر اس ممانعت کا درجہ کیا ہے تو اس میں متعدد اقوال ہیں۔ امام احمد اور امام الحنفی اور عام شافعیہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں، اگرچہ اس میں سکر نہ آیا ہو۔ جبکہ مالکیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں ایک تحریم کا دوسرا کراہت کا۔ یہ اختلاف ابن العربی نے عارضہ میں نقل کیا ہے۔ جبکہ امام نووی شرح مسلم جلد دوم صفحہ ۱۶۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

”ومذهبنا ومذهب الجمهور ان هذا النهی لكرهية التنزيه ولا يحرم ذلك مالم

يصر مسكراً وبهذا قال جماهير العلماء وقال بعض المالكية هو حرام وقال

ابو حنيفة وابو يوسف في رواية عنه لا كراهية فيه ولا بأس به“ الخ۔^۲

جبکہ ترمذی کے حاشیہ پر اختلاف اس طرح نقل کیا ہے:

باب ماجاء فی خلیط البسر والتمر

۱۔ الحدیث اخرجه ابن ابی شیبہ فی مصنفه ص: ۵۰۴ ج: ۵ کتاب الاشریة والطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۵۶

ج: ۵۔ ۲۔ النووی علی مسلم ”باب کراهية ابتذال التمر والزبيب مخلوطين“ کتاب الاشریة.

”قال مالك واحمد يحرم شرب نبيذ خلط فيه شيان وان لم يسكر عملاً بظاهر الحديث وهو احد قولى الشافعى وقال ابو حنيفة لم يحرم ان لم يكن مسكراً وهو القول الثانى للشافعى۔“

گویا کہ ائمہ کے اقوال اس بارے میں کافی سارے ہیں۔ بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ خلیط میں نشہ داخل ہونے کے بعد اس کی حرمت پر اتفاق ہے لیکن سکر سے پہلے حنفیہ کے نزدیک یہ بلا کراہت جائز ہے۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یہ بھی منع ہے۔ ایک ایک قول کے مطابق حرام ہے اور ایک ایک قول میں مکروہ ہے وہ اس حدیث کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے اسے اطلاق پر رکھتے ہیں۔ مگر بعض حضرات اتنے سے فرق کے قائل ہیں کہ نبی کی علت سکر ہے لہذا قبل السکر کراہت تنزیہی ہوگی اور بعد از سکر تحریم ہوگی۔ جبکہ بعض حضرات یہ فرق بھی نہیں مانتے جیسے امام احمد۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ چونکہ بعض روایات سے خلیط کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ ابوداؤد^۳ و کتاب الآثار^۴ میں ہے لہذا باب کی حدیث کا جواب صاحب ہدایہ نے یہ دیا ہے، کہ یہ شروع زمانہ ہجرت پر محمول ہے کیونکہ اس میں غربت زیادہ تھی اور کھانے کی اشیاء کی کمی تھی، تو خلیط پر پابندی کا مقصد یہ تھا کہ لوگ کنایات شعاری کو اپنائے اور دوسروں کے ساتھ مواسات اور ہمدردی رکھیں۔ پھر یہ نبی صرف منصوص علیہ اشیاء تک محدود ہے یا باقی اشیاء بھی ان پر قیاس کی جاسکتی ہیں؟ تو اس بارے میں دونوں اقوال ہیں۔ جبکہ ضابطہ یہ ہے ”کل مسکر حرام“^۵ کماتر۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الشرب فی آنیۃ الذهب والفضۃ

”عن الحكم قال سمعت ابن ابی لیلی يحدث ان حذیفۃ استسقى فاتاہ انسان باناء من فضۃ فرماہ بہ وقال انی کنت قد نهیتہ فابی ان یتہی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الشرب فی آنیۃ الذهب والفضۃ ولبس الحریر والدیاج وقال: ہی لهم فی الدنیا ولکم فی الآخرة۔“

^۳ سنن ابی داؤد ص: ۱۶۵ ج: ۲ ”باب فی الخلیطین“ کتاب الاشریہ.

^۴ کتاب الآثار ص: ۱۹۰ مکتبہ امدادیہ ملتان، ایضاً حاشیہ: ۳ المؤطا لمحمد ص: ۳۱۶ کتاب الحدود.

^۵ قد مر تخریجہ ”باب ماجاء فی شارب الخمر“.

حضرت حکم سے مروی ہے کہ میں نے (عبدالرحمن) ابن ابی لیلیٰ کو بیان کرتے سنا ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے پانی طلب کیا تو ایک آدمی نے چاندی کے برتن میں پانی پیش کیا حضرت حذیفہؓ نے اس پیالے کو پھینک دیا اور فرمایا: میں نے اسے منع کیا مگر یہ نہ مانا ابے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور چاندی کے برتنوں میں پینے سے منع فرمایا ہے اور ریشم و دیباچ کے پہننے سے (بھی) منع فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اشیاء کفار کے لئے ہیں دنیا میں اور آپ کے لئے ہیں آخرت میں۔

لغات:- قولہ ”استسقی“ سقیا فتح السین پانی کو اور بضم السین بارش کو کہتے ہیں باب ضرب سے آتا ہے سین تا طلب کے لئے ہیں یعنی پانی طلب کیا۔ یایوں کہنا چاہئے کہ از روئے لغت استسقاء پانی مانگنے کو کہتے ہیں، اور از روئے شرع بارش مانگنے کو یہاں معنی لغوی مراد ہے۔ قولہ ”الححریر“ ریشم اور ریشمی کپڑے دونوں کو کہتے ہیں یہاں مراد ثانی ہے کیونکہ ممانعت پہننے کی ہے بچنے یا خریدنے کی نہیں۔ قولہ ”الدیباج“ وہ کپڑا جو اعلیٰ قسم کے ریشم یعنی ابریشم سے بنا ہوا ہو لہذا یہ ذکر خاص بعد العام ہے۔

تشریح:- بخاری شریف^۱ کی ایک روایت میں ہے کہ پانی لانے والا شخص دہقان تھا جو ایک پیالے میں پانی لایا تھا۔ حافظ فرماتے ہیں کہ دہقان فارسی میں بستی کے بڑے شخص کو کہتے ہیں۔ جبکہ بخاری^۲ ہی کی ایک دوسری روایت میں مجوسی کی تصریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ذمی تھا۔ حافظ فرماتے ہیں کہ اس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔^۳

پھر ترمذی کی روایت سے اس برتن کا فقط پھینکا ثابت ہے مگر حافظؒ نے اسماعیلی کی روایت نقل کی ہے جس سے ثبوت ثابت ہوتا ہے، گویا کہ مقصود پھینکنے سے تو زنا نہ تھا بلکہ صرف تنبیہ اور تادیب ملحوظ تھی۔

سونے چاندی کا استعمال:- اس پر اتفاق ہے کہ عورتیں سونے چاندی کے زیورات بنوا سکتی ہیں اور استعمال بھی کر سکتی ہیں، کیونکہ زیورات میں زینت ہے جو عورتوں کے لئے اپنے محل و موقع پر مطلوب و محمود ہے، لیکن باقی استعمال سونے اور چاندی کا جائز نہیں، خواہ کھانے پینے کے لئے ہو یا دوسرے کاموں کے لئے ہو

باب ماجاء فی کراهیة الشرب فی آنية الذهب والفضة

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۳۱ ”باب الشرب فی آنية الذهب“ کتاب الاشربة، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۷ ج: ۵۔
کتاب الاشربة وفيه: فاراد ان يضرب به وجه الخ. ۲۔ صحیح بخاری ص: ۸۱۶ ج: ۲۔ ”باب الاكل فی اثناء مفضض“
کتاب الاطعمة. ۳۔ کذا فی فتح الباری ص: ۱۱۷ ج: ۱۰۔ قدیمی کتب خانہ۔

جیسے سرمہ دانی، سلائی وغیرہ استعمال کرنا اس میں مرد، عورتیں اور بچے سب برابر ہیں۔ تاہم چاندی کی انگوٹھی اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ مرد بھی ساڑھے چار ماشے کم استعمال کر سکتا ہے۔ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں اس پر زور لگا کر کہا ہے کہ یہ ممانعت صرف کھانے پینے کی اشیاء کے استعمال تک محدود ہے باقی استعمال کی چیزیں ان دونوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں، ان سے پہلے داؤد ظاہری نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا، جبکہ بعض شافعیہ عراقیین نے کہا ہے کہ امام شافعی کا قول قدیم عدم تحریم کا ہے گو کہ کراہیت کے وہ بھی قائل ہیں تاہم شافعیہ کا مفتی بہ قول وہی ہے جو باقی ائمہ اور جمہور کا ہے یعنی مطلقاً تحریم خواہ کسی بھی استعمال کے لئے ہو۔

چنانچہ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

”واجمع المسلمون على تحريم الأكل والشرب في اناء الذهب واناء الفضة على الرجل وعلى المرأة لم يخالف في ذلك احد من العلماء الا ما حكاه اصحابنا العراقيون ان للشافعي قولاً قديماً انه يكره ولا يحرم وحكوا عن داؤد الظاهري تحريم الشرب وجواز الأكل وسائر وجوه الاستعمال. وهذان النقلان باطلان... الى ان قال... وانما فرق بين الرجل والمرأة في التحلي لما يقصد منهما من التزين للزوج والسيد... قال: هذا مذهبنا وبه قال مالك وابو حنيفة والعلماء كافة“۔ (نودی شرح مسلم ص: ۱۸۷، ۱۸۸ ج: ۲)

جمہور کی دلیل کے طور پر ان تمام روایات کو پیش کیا جاسکتا ہے جن میں سونے چاندی کے استعمال پر وعیذیں آئی ہیں۔^۴ حدیث باب کے علاوہ اس قسم کی احادیث کافی زیادہ ہیں۔ علاوہ ازیں صاحب ہدایہ نے کتاب الکراہیۃ میں ممانعت کی ایک اور وجہ بھی بیان فرمائی ہے، کہ اس سے مشرکین کے طور و طریقہ اور وضع و قطع میں مشابہت لازم آتی ہے اور اس کے استعمال سے دنیا دارانہ و تکبرانہ تاثر ابھرتا ہے جو ممنوع و مذموم ہے، چنانچہ معروف حدیث ہے ”من تشبه بقوم فهو منهم“۔^۵ ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب

۴ راجع للتفصيل مجمع الزوائد ص: ۸۵ ج: ۵ کتاب الاشریة، ايضاً مصنفه ابن ابى شيبه ص: ۵۱۷ و ۵۱۸ ج: ۵ کتاب الاشریة. ۵ الحديث اخرجه عبد الرزاق في مصنفه ص: ۳۷۱ ج: ۱۰ حديث: ۲۱۱۵۲، ايضاً معجم اوسط للطبرانی حديث: ۸۳۲۵ مجمع الزوائد ص: ۲۲۶ ج: ۱۰، ايضاً سنن ابى داؤد ص: ۲۰۳ ج: ۲ کتاب اللباس، ايضاً جمع الفوائد ص: ۶۰۲ ج: ۱ کتاب اللباس.

بنام اقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الجحیم“ لکھی ہے اس میں جہاں کفار کی مشابہت کی ممانعت پر احادیث مبارکہ نقل کی ہیں، وہیں اعاجم کی مشابہت کی ممانعت پر بھی روایات نقل کی ہیں ”وقد روی عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه نهی عن التشبه بالاعاجم“^۱ پھر اس پر تفریع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ سے سندھی نعال کے استعمال کی بابت پوچھا گیا کہ آدمی پہن کر گھر سے باہر جاسکتا ہے؟ تو انہوں نے مرد اور عورت دونوں کے لئے ناپسند کیا البتہ بیت الخلاء کے لئے اور ان میں وضوء کرنے کی اجازت دی۔

”قال محمد بن حرب شیل احمد عن نعل سندھی یخرج فیہ؟ فکفره للرجل والمرأة وقال ان کان للکنیف والوضوء فلا بأس وقال اکره الصرار وقال هو من زبی الاعاجم“۔ (ص: ۸۴)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی ہی ثقافت اور شناخت ہونی چاہئے، وہ غیر مسلموں کی کسی بھی تہذیب و ثقافت کے مجاز نہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں سندھ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ان کی ثقافت غالب تھی اس لئے سندھی نعال کو مکروہ قرار دیا ورنہ آج بحمد اللہ سندھ کی اکثریت مسلمان ہے۔

مطلق تشبہ مذموم نہیں:- یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح کفار کی مشابہت مکروہ یا حرام ہے تو اسی طرح اعاجم کی بھی ممنوع ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے مگر یہ تشبہ علی الاطلاق مکروہ نہیں بلکہ جو امر مذموم میں ہو اور تشبہ کی نیت ہو۔ بلا قصد اگر کسی ضرورت کی چیز میں مشابہت آجائے تو اس میں کراہیت نہ ہوگی۔ چنانچہ در مختار میں ہے:

”فان التشبه بهم لا یکره فی کل شئی بل فی المذموم وفيما یقصد به التشبه کما فی البحر“۔

اس پر علامہ شامیؒ رد المحتار میں لکھتے ہیں:

”فاننا ناکل ونشرب کما یفعلون بحر.... قال هشام رأیت علی ابی یوسف نعلین معوضین بمسامیر فقلت: أتری بهذا الحديد بأماً؟ قال: ”لا“ قلت: سفیان وثور

۱۔ اسی طرح طبرانی کبیر میں ہے ان النبی ﷺ قال لا تقطعوا الخبز بالسکین کما تقطعه الاعاجم الخ مجمع الزوائد ص: ۳۰

بن یزید کسرھا ذالک لان فیہ تشبہا بالرہبان فقال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم یلبس النعال التی لہا شعروانہما من لباس الرہبان“ فقد اشار الی ان صورة

المشابهة فیما تعلق بہ صلاح العباد لا یضر“ الخ۔ (شامی ص: ۲۴۳ ج: ۱)

”ہذا آج کل گاڑیوں اور جدید آلات کا استعمال جائز ہوا۔ تاہم حضرت گنگوہی صاحب امر حسن میں بھی

مشابہت کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ (انظر تشریحات ص: ۳۱۴ ج: ۳)

قولہ ”ولیس الحریر والدیبا“ حدیث کے اس ٹکڑے سے ریشم کے استعمال کی بھی ممانعت معلوم

ہوتی۔ تاہم اس میں بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں: مثلاً عورتیں اس کو استعمال کر سکتی ہیں، جنگ میں اگر مجاہد کو ضرورت

ہو۔ تاہم آج کل اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پہلے اس پر سے تلواریں پھسلتی تھیں جو آج استعمال نہیں

ہوتی۔ اس سے دشمن پر زعب طاری ہوتا تھا اگر آج کل دشمن دور سے حملہ کرتا ہے۔ اگر کسی ریشمی کپڑے کا تانا ریشم

کا نہ ہو جانا اگر چہ ریشم کا ہو تو اس کا استعمال درجہ حرمت سے کم ہے۔ اسی طرح تین چار انگلیوں کی مقدار میں کوئی

ذی زائن وغیرہ بنا ہوا ہو تو بھی جائز ہے۔ اسی طرح ریشمی کپڑے پر ٹیک لگانے کی بھی گنجائش ہے، کسی کو خارش کی

بیاری ہو تو وہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مگر ہدایہ میں ہے:

”لا یحل للرجال لبس الحریر ویحل للنساء..... الا ان القلیل عفو و هو مقدار ثلثة

اصابع أو اربع کالاعلام والمکفوف بالحریر.... قال... (ای القدوری) ...

ولا بأس بتوسده والنوم علیہ عندابی حنیفة وقالابکرہ.... قال.... ولا بأس

بلبس الحریر والدیبا جلی الحرب عندہما.... ویکرہ عندابی حنیفة... قال

ولا بأس بلبس ماسدہ حریر ولحمته غیر حریر کالفطن والخزفی الحرب

وغیرہ“ الخ۔ (کتاب التراحیم ج: ۴)

واضح رہے کہ فقہاء جہاں بھی ”لاباس“ کا لفظ استعمال کریں تو اس میں خلاف اولیٰ کی طرف اشارہ

ہوتا ہے۔

قولہ ”وقال ہی لہم فی الدنیلو لکم فی الآخرة“ یعنی کفار چونکہ اپنے آپ کو شریعت کے احکام

کا پابند نہیں سمجھتے اس لئے سونا چاندی اور ریشم مردوں کے اوپر حرام ہونے کے باوجود یہ لوگ انہیں استعمال کرتے

ہیں، چونکہ آپ پر یہ منع ہیں لہذا کفار آخرت میں ان سے محروم ہوں گے اور آپ کو یہ سب چیزیں ملیں گی۔

پھر غاہریہ ہے کہ ریشم کی ممانعت تنعم سے اجتناب کی تلقین ہے لہذا ریشم کے علاوہ ایسی چیزوں سے بھی پرہیز کرنا چاہئے جو اہل تنعم کے رغائب و مشاغل میں بطور خاص شامل ہوں۔

باب ماجاء فی النہی عن الشرب قائماً

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یشرب الرجل قائماً، فقيل: ”ألا کل“ قال:

ذاك اشد (حسن صحیح)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کو کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ (ان سے) کھانے کے بارے میں پوچھا گیا (کہ کھڑے ہو کر کھانا کیسا ہے؟) فرمایا کہ وہ تو اور بھی بُرا ہے۔

دوسری حدیث:۔ اس باب میں دوسری حدیث حضرت جارد بن العلاء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ بھی نہی پر صریح ہے۔ تاہم باب کی تیسری حدیث ترجمۃ الباب سے مطابق نہیں اس کو امام ترمذی نے صرف اس مقصد کے لئے ذکر کیا ہے، کہ قنادہ کبھی ابو مسلم سے بلا واسطہ بھی روایت کرتے ہیں۔ جیسا کہ جارد کی پہلی حدیث نبی عن الشرب قائماً میں ہے اور کبھی بواسطہ یزید بن عبد اللہ عن ابی مسلم بھی روایت کرتے ہیں جیسا کہ جارد کی دوسری حدیث ”ضالة المسلم حرق النار“ میں ہے۔ لہذا بلا واسطہ حدیث کو منقطع نہ سمجھا جائے۔

قولہ ”ضالة“ گمشدہ اونٹ یا گائے ایسے جانور مراد ہیں جن کو گمشدگی کے باوجود کوئی خطرہ نہ ہو لہذا اس کو لینا ”حرق النار“ قرار دیا حرق بفتح الحاء والراء جبکہ راء کا سکون بھی جائز ہے، ای سبب حرق النار یعنی اگر کسی نے بیت تملک لے لیا تو یہ اس کے عذاب کا سبب بنے گا۔ کیونکہ اگر اس کو چھوڑ دیا جاتا تو مالک کو مل جاتا کہ زمانہ دیانت کا تھا۔ یعنی ایسی چیز جس کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اسے بیت تملک نہیں اٹھانا چاہئے۔ گمشدہ چیزوں سے متعلق بحث ابواب الاحکام ”باب ماجاء فی اللطیفة وضالة الابل والغنم“ میں گزری ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً

”عن ابن عمر قال کنا ناکل علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نمشی ونشرب ونحن قیام“۔ (حسن صحیح غریب)^۱

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چلتے پھرتے کھایا کرتے تھے اور کھڑے کھڑے پیا کرتے تھے۔

دوسری حدیث:- اس باب میں دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوئے زمزم کا پانی پیا ہے۔

تیسری حدیث:- اور باب کی تیسری حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے دونوں حالتوں میں پیتے دیکھا ہے۔

تشریح:- چونکہ کھڑے ہوئے شخص کے لئے پانی پینے کے بارے میں دونوں طرح کی روایات ثابت ہیں، ایک قسم نبی کی اور دوسری قسم جواز کی۔ اس لئے امام ترمذی نے بالترتیب دو الگ الگ باب قائم کر لئے پہلا نبی کے لئے اور دوسرا جواز کے لئے۔

یہ مسئلہ اگرچہ (تشریحات ترمذی ص ۱۹۶ جلد اول ”باب فی وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کیف کان“) میں گزرا ہے مگر وہاں ضمناً ذکر ہوا تھا اس لئے یہاں دوبارہ معاد کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اس بارے میں روایات دونوں جانب ثابت ہیں، نبی کے بارے میں ترمذی نے پہلے باب میں حدیث ذکر کی ہے۔ امام مسلم^۲ نے بھی (مسلم شریف جلد ثانی ص ۱۷۳ پر) اس کے لئے متعدد احادیث ذکر فرمائی ہیں ”وفیه... لایشر بن احد منکم قائماً فمن نسی فلیستقیء“۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً

۱ الحدیث اخرجه ابن ماجه واحمد، بحواله سنن دارمی ص: ۱۶۲ ج: ۲ حدیث: ۲۱۲۵ کتاب الاشریة، ایضاً شرب قائماً کی روایات کیلئے دیکھیے مجمع الزوائد ص: ۹۰ ج: ۵ کتاب الاشریة.

۲ صحیح مسلم ص: ۱۷۳ ج: ۲ ”باب الشرب قائماً“ کتاب الاشریة.

جبکہ اثبات کی روایات بھی صحیح ہیں جیسا کہ اسی باب میں ہیں۔ مسلمؒ میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آب زمزم کھڑے ہو کر پینا مروی ہے۔ بخاریؒ میں ”باب الشرب قائماً“ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر پانی پیا پھر فرمایا کہ بعض لوگ اسے مکروہ سمجھتے ہیں، حالانکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے جیسا میں نے کیا۔ (بخاری شریف ص ۸۴۰ ج ۲)

- اس بناء پر علماء نے مختلف موقف اختیار فرمائے ہیں، جن میں قابل ذکر پانچ اقوال ہیں۔
- (۱) صاحب منیۃ المصلیٰ نے فرمایا کہ زمزم اور وضوء کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے باقی مکروہ ہے ”ویکرہ الشرب قائماً الا هذا“ (ای فضل الوضوء) و شرب ماء زمزم۔“
- (۲) بعض اہل ظاہر کہتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی روایات نبی کی احادیث سے منسوخ ہیں اور زمزم کا پانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عذر کی بناء پر کھڑے ہو کر پیا تھا۔
- (۳) بذل میں ہے امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کی روایات منسوخ ہیں۔
- (۴) امام نوویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نبی کی روایات کراہیت تنزیہی پر محمول ہیں، یہی امام خطابیؒ، ابن بطلالؒ وغیرہ جمہور کا قول معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ”و هذا أحسن المسالك واسلمها وابعدها من الاعتراض“۔ ابن العربیؒ نے بھی عارضہ میں بحث کے اخیر میں لکھا ہے: ”فاشرب قاعداً تادباً واعلم جوازہ قائماً“۔

ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہو تو کھڑے ہو کر پینا چاہئے جیسے راستوں کا پانی اور گئے کا شربت وغیرہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا شائستگی کے خلاف ہے، جبکہ بیٹھ کر پینا عمدہ ہیئت ہے ”فان الشرب قاعداً من الهيئات الفاضلة واقرب لجموع النفس والرتی“ الخ۔

(۵) ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کی روایات طبعی نقطہ نظر پر محمول ہیں کہ کھڑے کھڑے پانی

۳ صحیح مسلم ص: ۴۳ و ۴۴ ج: ۲ کتاب الاشریہ، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۳ ج: ۵ کتاب الاشریہ.

۴ صحیح بخاری ص: ۸۴۰ ج: ۲ ”باب الشرب قائماً“ کتاب الاشریہ، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۳ ج: ۵.

کتاب الاشریہ، مجمع الزوائد ص: ۸۹ ج: ۵ حدیث: ۸۲۲۴.

پینے سے معدہ متاثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح پانی معدے کی تہہ تک جا پہنچتا ہے۔ واللہ اعلم

پھر آخری حدیث میں ”یشرب قائماً وقاعداً“ کا یہ مطلب نہیں کہ قائماً وقاعداً دونوں یکساں معمول تھے بلکہ یہاں نفسِ فعل کا اثبات مقصود ہے ورنہ عام معمول بیٹھ کر ہی پینے کا تھا، لہذا اگر ایک دودفعہ کھڑے ہو کر پانی پینا ثابت ہو جائے تو اس کو سنت نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ عام ضابطہ ہے کہ خلافِ عادت کام صرف بیانِ جواز یا کسی عذر پر محمول ہوتا ہے جیسے را کباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طوافِ ثابت ہے مع هذا سے سنت نہیں کہہ سکتے اس طرح کی اور بھی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

حضرت تھانوی صاحب المسک الذی میں فرماتے ہیں کہ ہمیشہ بیٹھ کر کھانے پینے میں تکبر پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ بے حدود قار کبھی تکبر کا باعث ہو جاتا ہے، اور پادری لوگ کھڑے ہو کر کھانے کو بڑا معیوب سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بُری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ بیٹھ کر کھائے پئے۔ اور اگر کبھی اظہارِ تواضع کے لئے یا ویسے ہی کھڑے ہو کر بھی کھاپی لے تو جائز ہے بلکہ اظہارِ تواضع کے لئے کبھی ایسا کرنا یہ بھی مستحب ہے۔ انتہی المسترشد عرض کرتا ہے: کہ کبھی آدمی میں آداب پر مسلسل عمل کرنے سے ایک گونہ عجب پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے کبھی کبھار اس کے خلاف کرنے سے اپنی تقصیر کا بوجھ سر پر آ پڑتا ہے جو ایک مطلوبہ چیز ہے پس کہا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیانِ تعلیم کے لئے کیا۔ (تدبر)

رہا کھڑے ہو کر کھانے کا مسئلہ تو اس میں دو اعتبار ہیں ایک یہ ہے کہ کوئی سوکھی اور خشک قسم کی اشیاء یا کھجور جیسی چیزیں ہوں۔ دوم یہ کہ اس چیز کا کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے کھانا خلافِ مروت اور معیوب نہ سمجھا جاتا ہو اور نہ ہی وہ لاپرواہی کی وجہ سے ہو تو ایسی چیز اگر چلتے پھرتے کھالی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں گو کہ اس کا معمول بنانا اچھا نہیں جبکہ اس کے برعکس اشیاء چلتے پھرتے یا بازاروں میں کھانے سے عدالتِ مجروح ہو جاتی ہے۔

پہلے باب کی حدیث میں کھانے کو حالتِ قیام میں پینے کی نسبت جو اشد یعنی زیادہ بُرا قرار دیا ہے یہ اس لئے کہ کھانے کا ادب و احترام پانی سے زیادہ ہونا چاہئے۔

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

”عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتنفس فی الاناء ثلاثاً ویقول
هو امرؤ واری“۔^۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم برتن سے پانی پینے کے دوران
تین مرتبہ سانس لیتے اور فرماتے کہ اس طرح پینا زیادہ خوشگوار اور پیاس زیادہ بجھانے والا ہوتا ہے۔

”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تشربوا واحداً کشر
البعیر ولكن اشربوا منی وثلث وسموا اذا انتم شربتم واحمدوا اذا انتم رفعتم“۔

یعنی اونٹ کی طرح یک بارگی مت پیو بلکہ دو، تین سانسوں میں پیا کرو اور جب پینے لگو تو بسم اللہ
پڑھو اور جب برتن ہٹاؤ تو الحمد للہ پڑھو۔

لغات:- ”یتنفس“ تنفس کے معنی سانس لینے کے ہیں۔ قولہ ”امرؤ“ جو موافق آئے خواہ کھانا ہو
یا پانی وغیرہ، فارسی میں اسے گوارتر کہتے ہیں جیسا کہ بین السطور لکھا ہے اردو میں خوشگوار کہہ سکتے ہیں۔
قولہ ”اری“ ”ری“ بکسر الراء سے اسم تفضیل ہے یعنی پیاس زیادہ بجھانے والا، فارسی میں بین
السطور ترجمہ سیراب کنندہ تر کیا ہے۔

تشریح:- ترمذی کی پہلی روایت میں ”یتنفس فی الاناء“ کا لفظ ہے۔ مگر مسلم^۲ کی ایک حدیث
میں ”یتنفس فی الشراب“ کے الفاظ ہیں اس لئے ترجمہ میں ”پینے کے دوران“ الفاظ میں مسلم شریف کی
روایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاکہ یہ اعتراض وارد نہ ہو کہ برتن کے اندر تو سانس لینا منع ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔
لہذا ترمذی کی روایت میں فی الاناء سے مراد ”فی اثناء الشراب“ ہے۔^۳

اس حدیث مبارکہ میں اس عمل کی حکمت بھی مذکور ہے کہ اس طرح پینے سے کوئی نقصان بھی نہیں

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

۱۔ الحدیث اخرجه مسلم وابوداؤد وابن ماجہ ومالك في الموطأ واحمد بحواله سنن دارمی ص: ۱۶۱ حدیث: ۲۱۲۰،
ایضاً مجمع الزوائد ص: ۹۱ ج: ۵ حدیث: ۸۴۵۵ ج: ۲، صحیح مسلم ص: ۱۷۴ ج: ۲ ”باب کراهية التنفس فی
نفس الاناء الخ“ کتاب الاشریہ۔ ۳۔ والافضل ان یتنفس خارج الاناء قبل الشرب او عند الاستراحة من جرعة لشرب
جرعة اخرى، مصنفه ابن ابی شیبہ ص: ۵۲۱ ج: ۵ کتاب الاشریہ۔

ہوتا ہے اور پیاس بھی اچھی طرح سمجھ جاتی ہے۔ ایک اور حکمت اگلی حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی دفعہ میں پینے سے اونٹ سے مشابہت آتی ہے جو کہ مذموم ہے۔ لے ہم نے بڑے جانوروں کو دیکھا ہے کہ پانی پیتے وقت منہ پانی میں رکھ کر ناک کے ذریعے سانس لیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قطرے پانی میں ناک سے آکر گرتے رہتے ہیں، انسان کو ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ہم نے اس کا بھی تجربہ کیا ہے کہ جب آدمی شدید گرمی اور پیاس کا شکار ہوتا ہے مثلاً کوئی وزنی چیز اٹھا کر چڑھائی چڑھنے کے بعد متصل پانی پیئے اور یکبارگی پیئے تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور گلہ وسینہ تو یک دم خراب ہو جاتے ہیں جس کا تجربہ راقم نے خود بھی کیا ہے اس لئے ہمارے ہاں دیہاتوں میں یہ عام سی بات ہے کہ جب لوگ مذکورہ پوزیشن میں ہوتے ہیں تو ان کو جلدی پانی نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح ”ایکسڈنٹ“ اور آپریشن کے بعد بھی۔ جانوروں کے بچے کی ولادت کے بعد جب لوگ پانی دیتے ہیں تو پانی کے اوپر گھاس ڈالتے ہیں تاکہ بھینس وغیرہ اسے جلدی جلدی نہ پی سکیں۔

اس کی مثال محسوسات میں یوں دی جاتی ہے جیسے آگ بجھانے کے لئے اگر یک دم سے پانی ڈالا جائے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور جب پہلے آہستہ آہستہ پانی چھڑک دیا جائے اور پھر پانی ڈالا جائے تو راکھ بھی نہیں اڑتی اور آگ بھی باسانی بجھ جاتی ہے۔ اس لئے پہلے تھوڑا سا پانی پیا جائے پھر نسبتاً زیادہ اور ثالثاً جتنا پینا چاہے، یکبارگی پینے سے معدے کی حرارت دماغ میں چلی جاتی ہے۔

تاہم یہ نہی طبی اعتبار سے شفقہ ہے یا تشبہ بالحوانات کی وجہ سے ہے اس لئے اگر کسی نے ایک ہی سانس میں پیا تو گناہ گار نہ ہوگا مگر خلافِ ادب ضرور ہوگا۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو صرف اپنے آپ کو ہی ملامت کرتا رہے۔

باب ما ذکر فی الشرب بنفسین

”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا شرب یتنفس مرتین۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے

تو دوسانوں میں نوش فرماتے۔

تشریح:۔ اس کے ظاہری مطلب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسانوں میں بھی پینا ثابت ہے، یہ اس وقت ہوگا جب آدمی کو پیاس زیادہ نہ لگی ہو۔ سابقہ باب کی آخری حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ”ولکن اشربوا منی وثلاث“۔ مگر اس کو حافظؒ نے تین بار پینے کی طرف راجع کیا ہے کہ جب دومرتبہ سانس لیا جائے گا تو بھی تین مرتبہ پینا متحقق ہوگا گویا تیسری بار سانس جو اختتام کے لئے ہوتا ہے اسے نہیں گنا گیا۔ (تدبر) ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

”وَبُذِّكَرَ عَنْهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) أَنَّهُ كَانَ إِذَا شَرِبَ تَنَفَسَ فِي الْإِنَاءِ ثَلَاثَةَ أَنْفَاسٍ

يُحْمَدُ اللَّهُ فِي كُلِّ نَفَسٍ وَيُشْكِرُهُ فِي آخِرِهَا“۔^۱ (مختصر زاد المعاد ص ۱۰۴)

بعض دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ تینوں بار برتن منہ کے قریب کرتے وقت بسم اللہ پڑھتے اور ہٹاتے وقت الحمد للہ۔^۲ علی ہذا ہر مرتبہ برتن منہ سے الگ کر کے سانس لیا جائے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی کراہیۃ النفخ فی الشراب

”عن ابی سعید الخدری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن النفخ فی الشراب فقال رجل: القاذۃ أراها فی الإناء فقال: اهرقها فقال فانی لا اروی من نفس واحد قال: فأبى القدح عن فیک۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا تو اس پر ایک شخص نے پوچھا کہ اگر میں برتن میں کوئی چیز کا دیکھ لوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے بہادو، اس نے پھر پوچھا کہ میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو برتن کو منہ سے دور کرو (یعنی سانس لینے کے بعد دوبارہ دوسہ بارہ پیو)۔

باب ماجاء فی الشرب بنفسین

۱۔ رواہ الطبرانی فی الكبير ۱۰۴۷۵ مجمع الزوائد ص: ۹۲ ج: ۵.

۲۔ كذا فی معجم اوسط للطبرانی، عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ كان يشرب في ثلاثة أنفاس إذا أدنى الإناء إلى فيه سمي الله فاذا أخره حمد الله يفعل ذلك ثلاث مرات، مجمع الزوائد ص: ۹۲ ج: ۵ حديث: ۸۲۵۹ كتاب الاشرية.

لغات:- قولہ ”النفع“، ”فتح النون وسكون الفاء، منہ سے پھونک مارنا۔ قولہ ”القذاة“، آنکھ میں گر جانے والے تینکے کو بھی کہا جاتا ہے اور مطلق تینکے کو بھی کہتے ہیں یہاں مطلق تینکا مراد ہے۔ یہ لفظ بفتح القاف پڑھا جائے گا اعراب کے لحاظ سے یہاں منصوب علی شریطۃ التفسیر ہے۔ قولہ ”فابن“ امر کا صیغہ ہے ابانت سے۔

قولہ ”القدح“ پیالے اور گلاس وغیرہ کو کہتے ہیں۔ (یعنی برتن کو منہ سے الگ کرو)

تشریح:- اس باب میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت بھی آئی ہے ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ جس طرح برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے اسی طرح اس میں پھونک بھی نہیں مارنی چاہیے، جس کی متعدد وجوہات ہیں مثلاً جو ہوا سانس یا پھونک کے ذریعے خارج ہوتی ہے تو اس میں لعاب کے ذرات مکس ہو جاتے ہیں جن سے گھن محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ لعاب برتن میں کرے گا۔ اسی طرح اس ہوا میں بدبو کا بھی امکان ہے اور یہ گھن کا سبب ہے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سانس کے ذریعے جو تازہ ہوا ہم اندر داخل کرتے ہیں اس میں موجود آکسیجن ہمارے پھیپڑوں کے ذریعے رگوں اور خلیوں تک پہنچ کر مخلول غذا اور خون کے ذرات کو جلا دیتی ہے، تاکہ انرجی پیدا ہو جائے جس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہو جاتی ہے یہ ایک سمی اور زہریلی کثیف گیس ہوتی ہے جو ناک اور منہ کے ذریعے عمل تنفس سے خارج ہو جاتی ہے، چونکہ وہ نسبتاً ثقیل اور کثیف ہوتی ہے اس لئے برتن میں سانس لینے سے وہ کھانے پینے کی چیز سے مل جاتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ صحت کے لئے کوئی مفید چیز نہیں اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم صرف پانی تک محدود نہیں بلکہ ہر مائع کھانے پینے کی چیز کو شامل ہے خاص کر جب آدمی کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہوں، لہذا اگر برتن میں کوئی ناگوار چیز نظر آجائے تو اسے یا تو برتن کو میز پر ہا کر کے گرا دیا جائے یا پھر کسی چیز جیسے چمچ وغیرہ سے نکال دیا جائے۔ اسی طرح اگر چائے، دودھ یا دوسرا کھانا وغیرہ گرم ہو تو اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی نہ پھونکے بلکہ انتظار ہی کیا جائے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التنفس فی الاناء

”عن عبد اللہ بن ابی قتادة عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا شرب

احدکم فلا یتنفس فی الاناء۔“

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک پیئے تو برتن میں سانس نہ لے۔

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیة

”عن ابی سعید رواة انه نهی عن اختناث الاسقیة“۔^۱

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزوں کے منہ الٹ کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

لغات :- فوله ”اختناث“ غَنَتْ باب ضرب سے مشک کا منہ الٹا کر کے اس طرح موڑنے کو کہتے ہیں جس سے اس کی اندرون طرف باہر آجائے۔ فوله ”الاسقیة“ سقاء کی جمع ہے چمڑے کا مشکیزہ۔

تشریح :- ادنیٰ تامل سے یہ بات آسانی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ اکبیم والعلمین نے منہ کے اوپر ناک اور ناک کے اوپر آنکھیں پیدا فرمائی ہیں جس کا مطلب یہ ہے، کہ جب ہم کوئی چیز کھاتے اور پیتے ہیں تو دوری سے دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ چیز کھانے پینے کے قابل ہے یا نہیں اور جب اسے منہ کے قریب لاتے ہیں تو اس کی بو سے مزید علم حاصل ہو جاتا ہے، پھر مزید علم قوت ذائقہ سے ہو جاتا ہے جبکہ معدہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے۔

علیٰ ہذا کھانے پینے کی کوئی بھی چیز پہلے ہمیں اچھی طرح دیکھ لینی چاہئے اور پھر سونگھ لینی اور پھر چکھ لینی چاہئے تب ہم فیصلہ کر لیں کہ وہ نگلنے کے قابل ہے یا نہیں۔

اگر کوئی چیز ہماری نظر سے اوجھل ہو تو اس میں یہ حکمت ملحوظ نہیں رہ جاتی۔ علیٰ ہذا اندھیرے میں یا آنکھوں سے پوشیدہ چیز کو منہ میں نہیں ڈالنا چاہئے بلکہ دیکھ بھال کر ہی کھانا چاہئے۔

اسی بناء پر مشکیزے کے منہ کو منہ میں ڈال کر پانی پینے سے ممانعت آئی کہ اندر کا پانی خراب بھی ہو سکتا ہے، اس میں موذی چیز تنکے یا جاندار بھی ہو سکتے ہیں جو سیدھے معدے میں داخل ہوں گے، علاوہ ازیں اس

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیة

۱۔ الحدیث اخرجه البخاری، وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ ومالك فی الموطا واحمد بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۶۰

ج: ۲، حدیث: ۲۱۱۹ کتاب الاشریة.

سے ایک دم سے پانی منہ میں جا بھی سکتا ہے جو سانس کی نالی میں جا سکتا ہے، مع ہذا مشکیزے کا منہ، پینے والے کے منہ کی بدبو سے بدبودار بھی ہو سکتا ہے جو دوسروں کے لئے گھن کا سبب اور پانی کے ضیاع کا موجب بنے گا، اس آخری وجہ کی بناء پر ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کھانا کھاتے وقت جب پانی پئے تو پہلے منہ کو صاف کر دے پھر گلاس وغیرہ برتن کے کنارے کو منہ کے اندر زیادہ داخل نہ کرے بلکہ ہونٹ پر رکھ کر پانی چوس لے یا برتن کو جھکائے تو پانی خود بخود اندر چلا جائے گا۔

بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے جب وہ بوتل پیتے ہیں تو بوتل کا منہ پورا کا پورا اپنے منہ میں داخل کرتے ہیں۔ اگر بڑی بوتل ہو اور اس کے پینے میں اور لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہوں اور کوئی گلاس نہ ہو تو وہ اس میں خاص خیال رکھیں کہ بوتل کا کنارہ ہونٹ پر رکھ کر بوتل کو جھکائیں چونکہ بوتل کا اندرون حصہ باہر سے نظر آتا ہے اس لئے اس میں پہلی وجہ متحقق نہیں ہوتی۔ پس اگر چھوٹی بوتل ہو جو انفرادی پینے کے لئے ہو اور پینے میں اس طرح احتیاط ہو سکتی ہو کہ پانی ایک دم سے منہ میں داخل سے روک سکتا ہو تو اس طرح پینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ شائستگی اس میں ہے کہ گلاس میں ڈال کر پی لے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

”عن عیسیٰ بن عبد اللہ بن أنیس عن ابيه قال: رأيت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام الى قربة معلقة فحَنَسَها ثم شرب من فیها“۔

حضرت عبد اللہ بن أنیس (بالتصغیر) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جو لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہو کر اس کا منہ موڑا اور پھر اس کے منہ سے پانی پیا۔ دوسری حدیث:- اس باب میں دوسری روایت حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے تو ایک لٹکے ہوئے مشکیزے سے کھڑے کھڑے پانی پیا تو میں نے جا کر اس مشکیزے کا منہ کاٹ لیا (تاکہ بطور تبرک ہمارے پاس رہے)۔^۱

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

۱۔ اسی مضمون کی روایت عن ام سلیم ان النبی ﷺ دخل علیہا ولی بیتہا قربة معلقة قال فشرب من القربة قائماً قال فعمدت الى قم القربة وقطعتها، وعن عائشة ان النبی ﷺ دخل علی امرأة من الانصار ولی البیت قربة معلقة فاختننها فشرب وهو قائم، بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۸۹ ج: ۵ کتاب الاشریہ. حلیظ الرطن الخفی عنی عنہ

لغات:- قوله ”قربة“ بکسرۃ قاف مشکیزہ۔ قوله ”معلقہ“، تعلیق سے ہے یعنی لٹکا ہوا۔ قوله ”فختشہا“ اس کا منہ پلٹا جیسا کہ سابقہ باب میں گزرا ہے۔

تشریح:- اس باب کی روایات سے معلوم ہوا کہ سابقہ باب کی احادیث میں وارد نہیں تحریم کے لئے نہیں اگرچہ بعض اہل ظواہر اس کو تحریم پر حمل کرتے ہیں، مگر جمہور کے نزدیک وہ ارشاد اور بیان آدابِ شائستگی کے لئے ہے۔ لہذا اس کا درجہ مکروہ تنزیہی سے زیادہ نہیں۔ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزے کے منہ سے پینا یا تو ضرورت پر محمول ہے، ہو سکتا ہے کہ کوئی برتن نہ ہو یا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ مبارک خوشبو کا منبع تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہی کی روایات بڑے مشکیزے پر محمول ہوں جبکہ باب کی روایات اباحت چھوٹے پر محمول ہیں۔ تدبر

اس سے معلوم ہوا کہ تل اور ٹونٹی پر منہ لگا کر پانی نہیں پینا چاہئے مگر عند الضرورت بلا کراہت جائز ہوگا۔ حضرت کبشہ کا مشکیزے کا منہ کا ثنا تبرک کے حصول کے لئے تھا جس کی کچھ تفصیل (تشریحات ترمذی جلد چہارم ص ۱۲۶) پر گزری ہے ”باب ماجاء باقی جانب الرأس بہدانی الخلق“ (حج) کے ضمن میں۔ فلیراجع

باب ماجاء أن الأيمنین أحقُّ بالشرب

”عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أتى بلبن قد شیب بقاء وعن یمنہ اعرابی وعن یسارہ ابو بکر فشرب ثم اعطی الاعرابی وقال: الايمن فالایمن“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسا دودھ پیش کیا گیا جس میں پانی ملا یا گیا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ایک اعرابی اور بائیں ابو بکر بیٹھے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے بنفس نفیس نوش فرمایا پھر باقی اعرابی کو دیا اور فرمایا کہ زیادہ حق دار دایاں ہے پھر اس کے دائیں۔

لغات:- قوله ”شیب“ شوب اور شیب خواہ داوی ہو یا یائی دونوں کے معنی ملانے کے ہیں قال اللہ تعالیٰ: ثم ان لهم علیہا الشوباً من حمیم“ (سورہ صفت آیت ۶۷) پھر ان کو کھولتا ہوا پانی (پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا۔ یہاں حدیث میں اس کو کچی لمی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

تشریح:- ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ سے امام مالکؒ کی مذکورہ روایت

مختصر ہے جبکہ زہریؒ سے سفیان بن عیینہ کی روایت پوری ہے جس میں ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے جبکہ میں دس برس کا تھا اور وصال ہوا تو میں بیس سال کا تھا میری ماں مجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ترغیب اور حکم دیا کرتی تھیں چنانچہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے ان کے لئے اپنی ایک بکری کا دودھ دوہا اور اس میں پانی ملایا۔

”فشرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر عن یسارہ واعرابی عن یمینہ وعمرناحیہ فقال عمر: یا رسول اللہ ناول ابابکر، فناول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاعرابی وقال: الایمن فالایمن۔“

اعراب کے لحاظ سے اس کو منصوب و مرفوع دونوں پڑھنا جائز ہیں۔ بنا بر نصب یہ مفعول بہ ہے فعل ناصبہ مقدر کا جو ”اعطی“ یا ”أقدم“ بصیغہ متکلم یا ”قدموا“ بصیغہ خطاب ہے۔ جبکہ رفع کی صورت میں اس کو خبر اور مبتدا ہر دو بنانا جائز ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں ”الایمنون“ حالت رقی میں آیا ہے جس سے رفع کی تائید ہوتی ہے ”ای الایمن احق یا مقدم“ مثلاً یا ”الاحق بالتقدیم الایمن ثم الایمن“۔^۱

یہاں دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ یمین والے کا یہ استحقاق کس درجے کا ہے۔

اور دوسری یہ کہ یہ حکم عام ہے اور ہر شے کو شامل ہے یا صرف کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ خاص ہے؟؟؟

(۱)..... پہلی بات کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ یہ حکم جھگڑا ختم کرنے اور نظم کے لئے ہے، کیونکہ اگر افضل کو مد ار حکم بنایا جاتا تو بسا اوقات افضل کی معرفت اور تمیز مشکل بلکہ متنازعہ بن جاتی ہے اور جنگ دلی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ تیسرے اس شخص کی فضیلت کی وجہ سے نہیں بلکہ جہت یمین کی وجہ سے ہے کیونکہ یمین شمال سے افضل ہے۔ علی ہذا یمین پر کوئی بھی ہو مگر وہ مقدم ہوگا۔ پھر جمہور کے نزدیک یمین کی ترجیح صرف مستحب ہے واجب نہیں ہے البتہ ابن حزمؒ اس کو واجب مانتے ہیں۔

(۲)..... دوسری بات کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ صرف پانی میں ہے کیونکہ وہ مباح الاصل ہے۔ مگر ابن العربیؒ نے اس کو مسترد کیا ہے کہ پانی اگر چہ اصلاً تو مباح ہے مگر وہ جس کے قبضے میں

ہوتا ہے اسی کی ملک ہوتا ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

”فی هذه الاحادیث بیان هذه السنة الواضحة وهو موافق لماتظاهرت عليه
دلائل الشرع من استحباب التيامن في كل ماكان من انواع الاكرام... الى ان
قال... واما تقديم الافاضل والكبار فهو عند التساوى في باقى الاوصاف ولهذا
يقدم الأعلم والاقراء على الاسن الشيب في الامامة في الصلوة“۔

(نووی شرح مسلم ص: ۴۱۷ ج: ۲)

یعنی جہاں یمنیں اور شمال کا فرق ہوگا تو اکراماً للیمنیں دائیں کو مقدم کیا جائے گا اور جہاں یہ تمایز نہ ہو تو پھر الا فضل فالافضل کا ضابطہ ہوگا۔

ابن العربیؒ نے عارضہ میں کچھ مسائل اس حدیث سے مستنبط کئے ہیں:

(۱) اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بہت قدر فرماتے اس لئے فرمایا: ”یا رسول اللہ ناول ابا بکر“۔

(۲) دودھ میں پانی ملانے سے اس کا حکم خلیطین (ممنوع) کی طرح نہیں۔ (انتہی) البتہ جو دودھ پیچنے کے لئے ہو اس میں پانی وغیرہ کی ملاوٹ حرام ہے کہ یہ غش محرم میں داخل ہے۔

(۳) دیہاتیوں کے ساتھ مجالست میں اگر کوئی فائدہ ہو تو یہ جائز ہے۔

المستتر شد:۔ چونکہ دیہاتی لوگ عموماً فضول باتیں اور لالچیں مباحث میں الجھتے رہتے ہیں تو شاید ان کو یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہوگی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عموماً چونکہ گنواروں کی مجلسوں میں فضولیات کی بھرمار ہوتی ہے اس لئے ان سے بچنا چاہئے خصوصاً جب وہ علماء کی قدر بھی نہ جانتے ہوں اور ان کے سامنے بکواس کرتے رہتے ہوں۔ ہاں اگر کوئی ہوشیار سادہ بیہاتی ہو تو اس کے ساتھ مجالست میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۴) اگر ایک آدمی کسی عالم کے پاس (یا مسجد وغیرہ میں) پہلے آکر بیٹھ جائے تو وہ اس نشست کا نسبت افضل کے زیادہ مستحق ہے چنانچہ یہاں اعرابی پہلے بیٹھے ہوں گے اس لئے ان کو حضرت ابو بکرؓ کے لئے نشست سے اٹھایا نہیں البتہ افضل کو جگہ دینا چاہئے۔

البتہ یہ ضابطہ عام مجالس کا ہے جہاں تک خصوصی محفلوں کا تعلق ہے تو وہاں افضل بہر حال مقدم ہوں

گے۔ چنانچہ نماز کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا تھا کہ میرے قریب بڑے اور دانا لوگ کھڑے ہوں، علیٰ ہذا اگر کوئی مشورہ ہو یا جلسہ ہو تو ہر آدمی کو اس میں شرکت اور اسٹیج پر بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح امور انتظامیہ میں بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں (مع الزیادۃ)۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء أن ساقی القوم اخرهم شرباً

”عن ابی قتادۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ساقی القوم اخرهم شرباً“۔^۱
حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قوم کو پلانے والا خود آخر میں پیئے گا۔

تشریح:- حضرت گنگوہی رحمہ اللہ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ جب تقسیم کنندہ اس چیز کا مالک نہ ہو بلکہ صرف تقسیم پر مامور ہو پس مالک کو اختیار ہے کہ اگر کریمانہ اخلاق ایثار ہے۔
ابن العربی عارضہ میں اس حکم کی حکمت یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر تقسیم کرنے والا خادم اور مفضل ہو تو اس کو چاہئے کہ پہلے مخدوم اور افضل کو دیدے اور اگر تقسیم کرنے والا افضل شخص ہو تو کمال فضیلت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیدے۔

نیز خود پہلے لینے میں حرص کا اظہار ہوتا ہے جو کہ مذموم ہے علاوہ ازیں شریعت کا یہ زین اصول ہے کہ حقوق اور خصوصاً مشترک حقوق میں احتیاط کی تلقین کرتی ہے کہ آدمی حتی الامکان خود کو دوسروں کی حق تلفی سے بچانے کی کوشش کرے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ پہلے دوسرے مستحقین کو مطمئن کرے تاکہ کسی کو اپنے حق کا دعویٰ نہ رہے پھر اخیر میں اپنا حق وصول کر لے۔

۱ عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لینتی منکم اولوا الاحلام والنہی الخ صحیح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۱ کتاب الصلاة.

باب ماجاء ان ساقی القوم آخرهم شرباً

۱ رواہ مسلم بنحوہ وابدؤد، ابن ماجہ واحمد، بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۶۳ ج: ۲ حدیث: ۲۱۳۵، ایضاً آخرجہ الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ص: ۹۵ ج: ۵، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۲۸ ج: ۵ کتاب الاشریہ.

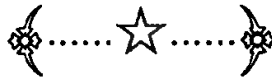
باب ماجاء ائی الشراب کان احب الی رسول اللہ ﷺ؟

عن عائشة قالت کان أحب الشراب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحلو البارد۔^۱
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پینے کی چیزوں میں
سب سے زیادہ پسند میٹھا ٹھنڈا مشروب تھا۔

لغات:- ”الحلو“ بضم الحاء وسكون اللام میٹھا۔

تشریح:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار پانی میں شہد ملا کر نوش فرماتے۔ اور کبھی کھجور وغیرہ جن سے
پانی میٹھا ہو جاتا، اور چونکہ مشروبات کی خواہش گرمیوں میں عموماً پیدا ہوتی ہے اس لئے ٹھنڈا پانی میٹھا کر کے
پینے کو پسند فرماتے۔ یہ پسندیدگی اس پانی کی افضلیت کی وجہ سے نہ تھی ورنہ افضل تو زمزم ہے، بلکہ لذت کی وجہ
سے تھی۔ پہلے گدرا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ میں ملایا ہوا پانی بھی پیا ہے لہذا یہ تمام صورتیں مختلف
مواقع پر رونما ہوئیں ان میں کسی طرح کا تعارض نہ سمجھا جائے۔ لہذا کبھی ایک مشروب کو پسند فرماتے اور کبھی
دوسرے کو۔

”باب ماجاء ما یستحب علیہ الا افطار“ میں نیل الاوطار کے حوالے سے گدرا ہے کہ حلاوت کو ایمان سے
ایک گونہ مناسبت ہے شاید اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلو بار کو پسند فرماتے۔ اگرچہ یہ طبعی طور پر بھی ممکن ہے
جیسا کہ آج کل بازاروں میں میٹھے مشروبات کی دوکانوں پر رش دیکھا جاسکتا ہے۔



باب ماجاء ائی الشراب کان احب الی رسول اللہ ﷺ

۱۔ الحدیث أخرجه مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۲۳ ج: ۵ کتاب الاشریہ، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۸۸ ج: ۵
حدیث: ۸۲۳۰، ایضاً مستدرک حاکم ص: ۶۵ ج: ۵ حدیث: ۳۵۷ کتاب الاشریہ، مسند احمد ص: ۵۵۵ ج: ۱
حدیث: ۳۱۱۹۔

ابواب البر والصلۃ

عن رسول اللہ ﷺ

قولہ ”البر“ بکسر الہاء وتشدید الراء نیکی اور حسن سلوک کے معنی میں آتا ہے۔ تاہم جب اس کا اطلاق ماں باپ اور رشتہ داروں کے حوالے سے ہوتا ہے تو اس وقت یہ حقوق کے مقابل آتا ہے۔ چونکہ حقوق کے معنی نافرمانی، بدسلوکی اور حقوق تلفی کے ہیں اس لئے پر بمعنی فرمانبرداری، نیک سلوک یعنی اچھے برتاؤ اور حقوق کی ادائیگی کے ہے۔ تاہم یہاں بر سے عام معنی یعنی مطلق نیک برتاؤ مراد ہے تاکہ تمام ابواب کو شامل ہو۔

قولہ ”الصلۃ“ مقابل قطع ہے وصل کے معنی ملانے کے ہیں مگر یہاں مراد صلہ رحمی ہے تو چونکہ قطع رحم، رشتہ داروں اور عزیزوں سے لاقلمی کو کہتے ہیں اس لئے صلہ رحمی اچھے تعلقات کا نام ہے، اور اچھے تعلقات کا مفہوم ہر ایک جانتا ہے۔ جس کا خلاصہ، ایک دوسرے کی مدد برحق، میل جول اور ہر قسم کا جائز تعاون ہے۔ علیٰ ہذا صمد نا ذکر بعد البر ذکر خاص بعد العام ہے۔

باب ماجاء فی برِّ الوالدین

حدثنا بہز بن حکیم حدثنی ابی عن جدی قال قلت یا رسول اللہ مزہ لکیر؟ قال: امک، قال قلت ثم من؟ قال: امک قال قلت ثم من؟ قال: امک قال قلت ثم من؟ قال: ثم ابائک ثم الاقرب فالاقرب۔

بہز بن حکیم بیان کرتے ہیں کہ میرے والد یعنی حکیم نے مجھے یہ حدیث میرے دادا یعنی معاویہ بن حیدہ سے بیان کی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اللہ کے رسول! میں کس کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ، میں نے پھر پوچھا کہ پھر کس سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں سے، میں نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کس سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اپنی ماں سے، میں نے پھر پوچھا کہ پھر کس سے؟ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ اور پھر جو رشتہ میں جتنا قریب ہو تو اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

لغات:۔ قولہ ”ابرفلح الہزمہ والباء وتشدید الراء واحد متکلم کا صیغہ ہے اور بر سے مشتق ہے جس کے معنی حسن سلوک کے ہیں کما مر۔ قولہ ”امک منسوب ہے ای بر امک!۔

تشریح:۔ اس حدیث سے ماں باپ اور عزیزوں و دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین و تاکید ثابت ہوئی۔ تاہم برادر نیک سلوک میں ماں باپ باقی اقربہ پر اور ماں سب پر مقدم ہے۔ یہ رائے بہت سے علمائے کرام کی ہے جیسا کہ حاشیہ پر علامہ سیوطیؒ سے نقل کیا ہے۔ اور امام نوویؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ نیز اس حدیث میں ماں کے ساتھ برکوتین مرتبہ ذکر کرنے میں اس کی تثلیث کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ماں بچے کی پانی کی حالت سے جوانی کے وقت تک کئی مشکل مراحل سے گذرتی ہے جن کو چار مراتب پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ حمل کا ہے۔ دوسرا جنم دینے کا۔ تیسرا دودھ پلانے اور نہلانے دھلانے کا ہے۔ جبکہ چوتھا تربیت کا ہے۔ پہلے تین میں ماں تنہا سب صعوبتیں جھیلی ہے اس لئے اس کو امتیازی طور پر تین باریک سلوکی کا حکم دیا۔ جبکہ چوتھے میں وہ باپ کے ساتھ شریک ہے اس آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ”حَمَلَتْہُ اُمُّہَا وَوَضَعَتْہَا وَحَمَلُہُ وَفَضْلُہُ ثَلَاثُونَ شَہْرًا“۔ (سورۃ احقاف آیت: ۱۵)

اس بارے میں اہل علم کی دوسری رائے یہ ہے کہ حدیث شریف میں یہ تکرار تکثیر حق کے لئے نہیں بلکہ تاکید کے لئے ہے کیونکہ اکثر لوگ باپ کا خیال زیادہ رکھتے ہیں اور ماں کی پرواہ کم کرتے ہیں تو حقوق اگرچہ دونوں کے برابر ہیں اور اولاد کو دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنا لازمی ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا ذکر کر فرما کر لوگوں کی کوتاہی اور تقصیر کو دور کرنے کی تاکید فرمائی۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ تعظیم و اکرام تو باپ کا زیادہ ہونا چاہئے اور خدمت ماں کی زیادہ، یہ توجیہ کوئی تیسری رائے نہیں ہے بلکہ یہ بھی وہی مساوات والی صورت ہے اور مطلب یہ ہے کہ ماں باپ دونوں اولاد پر حقوق میں برابر کے شریک ہیں، البتہ بعض اعتبارات سے ایک کا حق زیادہ ہے اور بعض دیگر اعتبارات سے دوسرے کا حق زیادہ ہے ”تکلیک بتکلیک“۔ چونکہ باپ کا درجہ فی نفسہ ماں کے درجے سے زیادہ بلند ہے اور یہ تفاوت جنسی، طبعی اور شرعی ہے اس لئے ادب باپ کا زیادہ کرے تاکہ تدبیر المنزل پر اثر نہ پڑے اور ویسے بھی عورتوں میں تواضع ہوتی ہے وہ اولاد سے زیادہ ادب کا تقاضا و مطالبہ بھی نہیں کرتیں، بلکہ اولاد سے بے تکلفی پسند کرتی ہیں اس کے برعکس ماں کا تعلق صنف نازک سے ہے اس لئے اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑے جبکہ باپ کو زیادہ خدمت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی دوکان سے سودا سلف خریدنے اور منگوانے کی ضرورت عام

طور پر عورتوں کو پڑتی ہیں۔ تدبیر

ہاں جب دونوں بوڑھے ہو جائیں تو پھر دونوں خدمت کے یکساں محتاج ہو جاتے ہیں اس لئے ماں کی خدمت کے ساتھ ساتھ باپ کی خدمت بھی بڑھائے اور باپ کے اکرام کے ساتھ ماں کے اکرام کا درجہ بھی بڑھائے۔

ماں باپ کے مختلف حقوق:- اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا“ (الآیہ)۔^۱ امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام کو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے ”اِنَّ اشْكُرْلِي وَلِوَالِدَيْكَ“^۲ یعنی میرا شکر ادا کرو اور والدین کا بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے اور اللہ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا واجب ہے۔

امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اگر والدین ظلم کریں تب بھی ان کی فرمانبرداری کی جائے گی اور ان کو راضی رکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا اگر وہ ظلم کریں تب بھی۔ ماں باپ کا صرف یہی حق نہیں کہ ان کی خدمت کی تو بس حق پورا ادا کیا، بلکہ جن لوگوں سے ان کی قرابت یا دوستی ہو ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے اور والدین کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان کے متعلقین کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ ایک اعرابی (بدوی عرب) سفر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اس اعرابی کا باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوست تھا، اعرابی نے ابن عمرؓ سے کہا: تم عمرؓ کے بیٹے نہیں ہو؟ ابن عمرؓ نے کہا کہ کیوں نہیں، اس کے بعد آپؓ نے اعرابی کو ایک گدھا دیدیا جسے وہ ساتھ لائے تھے اور اپنے سر سے عمامہ اتار کر دیدیا، اس پر بعض ساتھیوں نے کہا کہ اس اعرابی کے لئے تو دو درہم بھی بہت تھے، تو ابن عمرؓ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے باپ کی دوستی کو نبھاؤ، اسے ختم نہ کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارا نور بجھا دے گا۔

ابواب البر والصلۃ

باب ماجاء فی بر الوالدین

۱۔ سورۃ الاسراء آیت: ۲۳۔ ۲۔ سورۃ لقمان آیت: ۱۴۔

(الادب المفرد باب نمبر ۲ حدیث نمبر ۴۰ و کذا رواہ مسلم بمعناہ ص ۳۱۲ ج ۲، باب فضل صلتہ اصدقاء الاب والام ونحوہا ^۱) اس کی مزید تفصیل دیکھنی ہو تو راقم نے نقش قدم حصہ دوم یا نقش اخلاق میں تیسرے باب کے شروع میں قدرے زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے فلیراجع۔

عاصمۃ الاحوذی میں ہے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”الْبِرُّ شَعْيٌ هَيِّنٌ، وَجِهَةٌ طَلِقٌ وَكَلَامٌ لَيِّنٌ“ وَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى ”وَلَا تَقْلُ لَهُمَا فِئَةً وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا“ وَخَفِضَ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا“۔ (سورۃ اسراء آیت نمبر: ۲۳، ۲۴)

باب منہ

”عن ابن مسعود قال سألتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم فقلت: يا رسول الله أيُّ الأعمالِ أفضل؟ قال: الصلوة لميقاتها، قلتُ: ثم ماذا يا رسول الله؟ قال: برُّ الوالدَيْنِ، قال قلتُ: ثم ماذا يا رسول الله؟ قال: الجهاد في سبيلِ الله ثم سكنتُ عني رسول الله صلى الله عليه وسلم ولو استزددته لزدني“۔ حسن صحيح

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! اعمال میں سب سے اچھا کونسا عمل ہے؟ فرمایا اپنے وقت پر نماز پڑھنا فرماتے ہیں میں نے پھر کہا کہ یا رسول اللہ اس کے بعد کون سا ہے؟ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا، فرمایا میں نے کہا کہ یا رسول اللہ اس کے بعد کون سا افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی، تاہم اگر میں مزید پوچھتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید جوابات دیتے۔

لغات :- قولہ ”ای“ یہ لفظ چار معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (۱) شرطیہ کے لئے جیسے ”إِنَّمَا الْآجِلِينَ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ“۔ الْآيَةُ ۱ (۲) استفہامیہ جیسے ”إِيَّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ

مع اسی مضمون کی روایات کیلئے مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۹۹ ج: ۶، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۷۵ ۱۸۵ تا ۱۸۶ ج: ۸ کتاب البر والصلة۔

إِيمَانًا“۔ (۳) موصولہ جیسے ”ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَنِ عِتِيًّا“۔

(۴) برائے بیان کمال جیسے ”مُحَمَّدٌ رَجُلٌ أَتَى رَجُلٌ“۔ اس حدیث میں بمعنی ثانی برائے استفہام ہے۔

قولہ ”ثم ماذا“ ثم یہاں تراخی زمان کے لئے نہیں ہے بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے یعنی نماز کے بعد کس عمل کا درجہ بلند و بالا ہے؟ قولہ ”ولو استزدته“ عبد اللہ بن مسعودؓ کا مقولہ ہے اور میں طلب کے لئے ہے یعنی اگر میں مزید جوابات طلب کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے۔

تشریح:- یہ سوال ارکان اسلام کے بارے میں نہیں تھا ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں ”الایمان باللہ“ فرماتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ منشاء سوال سمجھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لہذا کہا جائے گا کہ یہ سوال تصدیق کے علاوہ اور اعمال قلب کے علاوہ جو ارجح کے اعمال کے متعلق تھا، اور اگر اس سوال کو عام مانا جائے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سائل پر اعتماد کی وجہ سے ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن مسعودؓ کے علم پر اعتماد تھا کہ وہ ایمان کو تو بہتر اور بنیاد سمجھتے ہی ہیں اس لئے اس کو جواب میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

اس حدیث کے اس جزء کی شرح (تشریحات ترمذی جلد ۱ ص ۴۱۷) پر گزری ہے ”باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل“ میں تاہم وہاں یہ روایت حضرت ام فروةؓ سے بھی مروی ہے اور یہی سائلہ ہیں اور وہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور بھی ہے اور وہاں جواب ”الصلوة لاول وقتها“ سے دیا گیا ہے جبکہ یہاں ”الصلوة لم یقاتھا“ کے الفاظ ہیں۔

بہر حال اس قسم کے سوالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحابہ کرامؓ نے پوچھے ہیں۔ مگر سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نماز کو مقدم فرمایا ہے جیسا کہ حدیث الباب میں ہے اور کبھی ایمان کو اور کبھی جہاد کو بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے۔

اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں مگر دو جواب افضل ہیں۔

(۱)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے اور ماہر حکیم مریض کے مزاج کے مطابق اور موسم کے موافق علاج کرتا ہے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میں ایک پہلو سے نماز کو وقت پر ادا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تو اس کو وہی جواب دیتے۔ اور جب دوسرے میں جہاد کرنے کی ضرورت محسوس فرماتے تو اس کے لئے وہی

علاج تجویز فرماتے۔ یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم موسم اور حالات کو دیکھتے جب جہاد کا موقع ہوتا تو اس پر زور دیتے۔ اور جب غزوہ سے واپس ہوتی تو دیگر اعمال پر زور دیتے۔ اور یہی چیز بلاغت کہلاتی ہے ”مطابقتہ الکلام لمقتضی الحال“۔

(۲) افضلیت کلی مشکلک ہے اس کے افراد جہاد وغیرہ ہیں لہذا ایک کے افضل ہونے سے دوسرے کا مفضول ہونا لازم نہیں آتا۔

اس حدیث مبارکہ میں پہلے نماز کا ذکر ہوا اور پھر بر الوالدین کا۔ یہ گویا اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے ”ان اشکری ولوالدیک“۔^{۱۴} اس لئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ پانچوں نمازوں کے بعد ان کے لئے دعا مانگی جائے۔

باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین

عن ابی حرداء قال ان رجلا اتاه فقال ان لی امرأۃ وان امی تأمرنی بطلاقہا فقال ابو الدرداء: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: الوالد اوسط ابواب الحنفۃ فان شئت فاضع ذالک الباب او احفظہ وربما قال سفیان ”ان امی وربما قال:“ابی“۔ (حدیث صحیح)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک شخص نے آکر کہا کہ میری ایک بیوی ہے اور میری ماں اس کو طلاق دینے کا حکم دیتی ہے، تو ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کے دروازوں میں سے بہتر دروازہ ہے پس اگر تو اسے ضائع کرنا چاہتا ہے تو ضائع کر دیا اس کی حفاظت کر۔ سفیان بن عیینہ کبھی والدہ اور کبھی والد نقل کرتے۔

لغات:- قولہ ”اوسط“ درمیانہ، معتدل اور ممتاز کو کہتے ہیں۔ قولہ ”اضیع“ امر کا صیغہ ہے اضاع سے۔ تقول کے قانون کے مطابق بنا ہے یعنی اصل میں اضیع تھا یا کی حرکت جو کسرہ ہے ماقبل کو دیا پھر یراء التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کی گئی تو اضیع بن گیا۔

تشریح:- اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ جنت کے دروازوں میں اوسط یعنی اعلیٰ اور بہترین دروازے ہیں، ان کی رضا مندی اور خدمت ہی سے اس دروازے سے داخل ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔ جس

روایت میں لفظ ”امی“ اور ”ابی“ کا ذکر ہے تو وہ صراحۃً معلوم ہوا اور دوسرا اس پر قیاس ہوگا۔

اس حدیث سے ماں باپ کی حد درجہ اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین و ترغیب معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ اپنی مرضی و خواہش کو بھی ماں باپ کی خواہش پر قربان کرنے کا حکم ہے خصوصاً جب ماں باپ سنجیدہ ہوں، چنانچہ اگر وہ مرضی کی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیں تو بھی ان کی اطاعت کرنی چاہئے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پیغام طلاق چھوڑا تھا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس پر عمل بھی کیا جس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اسی طرح ترمذی ابواب الطلاق میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی گزری ہے:

”قال كانت تحتي امرأة أجبتها وكان أبي يكرهها فامرني ان اطلقها فایت فذكرت ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم فقال: يا عبد الله بن عمر! طلق امرأتك۔“

کیونکہ سنجیدہ ماں باپ کبھی بھی اولاد کو غلط مشورہ نہیں دیتے ہیں، لہذا ان کی اطاعت میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی البتہ یہ ضابطہ بھی ملحوظ ہونا چاہئے کہ ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“۔^۱

اگر ماں باپ ایسے الٹے سیدھے مطالبے کریں جن کو پورا کرنے سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو یعنی شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ایسے میں اطاعت والدین جائز نہیں مثلاً بیوی پردہ کرتی ہے اور نیک صالح ہے اور ماں باپ پردہ کی وجہ سے اس کو نہیں چاتے ہیں تو بیٹے کو دیکھنا چاہئے کہ اگر طلاق دینے سے بیوی کو تکلیف ہوتی ہو، اس کے دوسرے نکاح کا انتظام آسانی سے نہیں ہو سکتا ہو اور اس شخص کو خود بھی ایسی ہی مشکل درپیش ہو تو اسے طلاق سے بچنا چاہئے اور کوئی صورت بچ کی اختیار کر لینی چاہئے، مثلاً ماں باپ سے کہے کہ میں سمجھا دوں گا یہ ٹھیک ہو جائے گی وغیرہ۔ بہر حال ایسے میں اطاعت لازمی نہیں خصوصاً جب بیوی پر ظلم کا خطرہ ہو۔ لیکن اگر دونوں کا متبادل انتظام ہو سکتا ہو یا آدمی کا انتظام دوسرے نکاح کا تو نہیں ہو سکتا، لیکن وہ بیوی کے بغیر بھی رہ سکتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر اطاعت مستحب ہے۔ غرض ماں باپ کو ایذا رسانی سے بچنا واجب ہے۔ لہذا بیوی اگر ان کو ناجائز طریقہ سے ایذا پہنچاتی ہو تو طلاق واجب ورنہ نہیں۔ لہذا ماں باپ کے کہنے پر بیوی

باب ماجاء فی الفضل فی رضا الوالدین

۱۔ رواہ احمد فی مسنده ص: ۴۷۶ ج: ۱ حدیث: ۳۸۷۹ ولفظہ: لا طاعة لمخلوق في معصية الله عز وجل، ايضاً مصنفہ

عبدالرزاق ص: ۲۵۵ ج: حدیث: ۳۷۹۸ کتاب الصلوة، ايضاً رواہ ابن ماجہ بحوالہ مصنفہ عبدالرزاق۔

پر ظلم اور ناجائز دباؤ دانا یا ایسی طلاق دینا جس سے عورت بُری حالت کا شکار اور ظلم میں گرفتار ہوتی ہو جائز نہیں۔

مسئلہ:- معارف القرآن میں ہے کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں، اس میں مکمل علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جس کو حاصل ہو وہ عالم (مجتہد) بننے کے لئے سفر کرے یا تبلیغ و دعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔ (معارف ص: ۳۵۳ ج: ۵)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں والدین رشتہ کرنے پر راضی نہ ہوں تو اس رشتہ پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب والدین بنا بنایا رشتہ توڑوا سکتے ہیں تو ابتداء رشتہ طے کرنے سے بطریق اولیٰ روک سکتے ہیں۔

دوسری حدیث:- ”عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رضا الرب فی رضا الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد“۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کی رضا مندی والد کی خوشنودی میں ہے اور رب تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔^۱

لغات:- ”رضا“ بکسر الراء والف مقصورہ جبکہ مدودہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے خوشی، رضامندی اور مرضی کے معنی میں آتا ہے۔ قولہ ”سخط“ یفتحین بروزن شجر جبکہ بضم السین وسکون الهمزة بھی استعمال ہوتا ہے اس کے معنی رضا کے برعکس ہیں یعنی ناگواری، غصہ اور ناراضگی کے۔

تشریح:- والد سے مراد ”من له الولد“ بھی لے سکتے ہیں پھر والدہ بھی اس فضیلت میں شامل ہوگی یا پھر والدہ اس پر قیاس ہے کیونکہ دونوں کی رضا کی علت مشترک ہے، چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے والدین کو راضی رکھنے اور ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس لئے جو شخص والدین کو راضی رکھے گا اور ان کی اطاعت کرے گا وہ درحقیقت اللہ کے حکم کی تعمیل کرے گا، گوکہ والدین کو راضی رکھنا ایک طبعی سا امر بھی ہے تاہم یہ جذبہ ایک وقت تک رہتا ہے پھر کمزور یا ختم ہو جاتا ہے، مثلاً اپنے بچے پیدا ہو گئے تو اب محبت کا زرخ والدین سے ان کی طرف مڑ جاتا ہے خصوصاً جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں اور اٹنے سیدھے مطالبے کرنے لگیں ایسے میں ان کو خوش رکھنا

۱ ایضاً رواہ البزار مجمع الزوائد ص: ۱۷۵ ج: ۸ حلیث: ۱۳۳۸۹ وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ طاعة الله طاعة الوالد ومعصية الله معصية الوالد، حوالہ بالا۔ الحنفی عفی عنہ

اس شرعی کی تکمیل ہی ہے ورنہ تو اہل مغرب ان کو گھروں سے نہ نکالتے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا اچھا خاصا فرمانبردار ہوتا ہے مگر والدین اپنی غیر سنجیدہ فرمائشوں سے اس کو نافرمانی پر گویا مجبور کرتے ہیں اس لئے والدین کو چاہئے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار نہ کریں جس سے اولاد میں نافرمانی کا بیج بویا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی عقوق الوالدین

”عن عبدالرحمن بن ابی بکرۃ عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا احديثكم باكبر الكبائر؟ قالوا: ”بلى“ يا رسول الله قال: الاشرار بالله وعقوق الوالدین قال وَجَلَسَ وَكَانَ مَتَكُمَا قَالَ وشهادة الزور او قول الزور فما زال رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لها حتى قلنا ليتہ سکت۔“

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرہ اپنے والد (ابو بکرہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (سیدھے) بیٹھ گئے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے: فرمایا اور جھوٹی گواہی یا فرمایا جھوٹی بات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل یہ بات دہرا رہے تھے یہاں تک کہ ہم (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جائیں۔ (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھک رہے ہیں)۔

لغات:- ”اکبر الكبائر“ بڑے سے بڑے گناہ۔ قولہ ”عقوق“ بضم العین اصل میں ”عق“ سے مشتق ہے جو قطع اور شق یعنی پھنسنے کو کہتے ہیں چونکہ نافرمانی سے دونوں الگ الگ ہو جاتے ہیں، بیٹا ایک طرف اور ماں باپ دوسری جانب ہو جاتے ہیں اس لئے اس کے معنی نافرمانی کرنے اور تکلیف دینے کے بتاتے ہیں۔ پہلے گزرا ہے کہ برادر صلہ، دونوں عقوق کے مقابل ہیں۔ قولہ ”شهادة الزور او قول الزور“ اس میں لفظ ”او“ ٹمک من الراوی کے لئے ہے، شہادت خاص ہے قول سے۔

تشریح:- کبار، کبیرۃ کی جمع ہے کبیرہ گناہوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اس حدیث میں ان کا احاطہ

نہیں کہا گیا ہے۔ کبیرہ گناہ کون سے اور کتنے ہیں اس کی تفصیل (تشریحات ترمذی ص ۲۸۸ ج ۱) ”باب فی فضل الصلوٰۃ الخمس“ میں گذری ہے ابواب الصلوٰۃ بعد بحث الاذان ملاحظہ ہو۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اہل علم نے کبار کو معدود و محصور مانا ہے اور درجن بھر گناہوں کو کبیرہ کہا ہے جو مختلف احادیث میں مروی ہے مثلاً تین باب کی حدیث میں چوتھا اگلی حدیث میں، زنا، ربوا، قتل نفس ناحق طریقے سے، پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا، سحر اور جادو، یتیم کا مال کھانا، فرار عن الزحف، الحاد فی الحرم، شراب پینا اور چوری کرنا وغیرہ۔

مگر بعض علماء ان کے منضبط و منحصر فی العدد کے قائل نہیں پھر ان کے مختلف اقوال ہیں:۔ کسی نے کہا کہ جس پر وعید آئی ہے وہ کبیرہ گناہ ہے۔ کسی نے کہا کہ جس گناہ پر اصرار کیا جائے وہ کبیرہ ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ کبیرہ و صغیرہ امور اضافیہ میں سے ہیں ہر گناہ اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے اور ما فوق گناہ کی نسبت صغیرہ ہے۔ علی ہذا سب سے زیادہ اور سب سے بڑا گناہ شرک ہے، کہ اس کے اوپر کوئی بڑا گناہ نہیں اور باقی گناہ حسب تفاوت کبار ہیں پھر وہی کبار اپنے ما فوق کے نسبت صغائر بھی ہیں۔

باب کی حدیث میں حقوق والدین کو شرک کے بعد دوسرے نمبر پر ذکر کرنے میں اس کی شاعت کی طرف اشارہ ہے، گویا کہ ماں باپ کے حقوق، حقوق اللہ کے بعد سب حقوق العباد پر مقدم ہیں چنانچہ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں:

”جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم بر الوالدین ثانی التوحید لقوله ”اکبر الکبائر الاشراک باللہ ثم عقوق الوالدین“^۱ وقوله فی افضل الاعمال ”الصلوٰۃ لمیققاتہا ثم بر الوالدین“^۲ جعلہ فی ضمن حق اللہ فی حدیث آخر فقال رضا الرب فی رضا الوالدین مسخط الرب فی مسخط الوالد“۔^۳

چونکہ حدیث کی اس ترتیب نزولی سے شہادۃ الزور کی اہمیت بظاہر کم ہونے کا اندیشہ تھا، کہ اس کو تیسرا درجہ دیا گیا اس لئے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے بیٹھ گئے اور اسے

باب ماجاء فی عقوق الوالدین

۱۔ رواہ مسلم ص: ۶۳ ج: ۱ ”باب الکبائر و اکبرھا“ کتاب الایمان۔

۲۔ رواہ البخاری ص: ۷۶ ج: ۱ کتاب مواظبت الصلوٰۃ، مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۹۹ ج: ۶ کتاب الادب۔

۳۔ رواہ الترمذی والبخاری کذا فی مجمع الزوائد ص: ۷۵ ج: ۸۔

بار بار مکر کرتے رہے جیسے تاکید میں ہوتا ہے۔ اور محبوب کی بات چیت تو اگرچہ طوالت سے احسن بن جاتی ہے اور لذت میں اضافہ ہوتا ہے مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اطناب و تکرار سے مشقت و تکلیف اٹھانا پڑ رہی تھی اس لئے صحابہ کرامؓ نے خاموشی کی تمنا کی۔

حدیث آخر:- حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبار میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا اپنے والدین کو بھی کوئی شخص گالی دیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں“ ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور یہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔

لغات:- سب اور شتم میں بعض حضرات کے نزدیک تراویف ہے، دونوں کے معنی گالی گلوچ کرنے کے ہیں۔ مگر بعض اہل لغت نے یہ فرق کیا ہے کہ سب عام ہے ہر طرح بُرے بھلے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا حصہ مسجد میں سے مت روکو اگر وہ اجازت چاہیں، تو ان کے صاحبزادے بلال نے فرمایا ”واللہ لَئِمْنَعُنَّ وَفِيہ...“ فاقبل علیہ عبداللہ فسبہ سباً مسمعتُ سبہ مثله قط۔“ (رواہ مسلم) جبکہ ”شتم“ خالص گالیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

تشریح:- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ذہن میں یہ بات تھی کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماں باپ کو براہ راست اور رو برو گالی کی بات فرما رہے ہیں، اس لئے ان کو تعجب ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے کہ جو اپنے ماں باپ کو براہ راست گالیوں کا نشانہ بنائے۔ آج کل تو یہ چیز اور یہ صورت بھی واقع ہے مگر اس وقت یہ بہت مستبعد تھا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ آدمی جب دوسرے کے ماں باپ کی توہین کرتا ہے تو یہ اس کے اپنے ماں باپ کی تذلیل کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی چیز دراصل گالی دینے کے برابر ہے۔ (تشریحات ترمذی جلد سوم ص: ۲۶۷) پر ابن العربیؒ کے استاذ ابو بکر الشاشی کا یہ قول گزرا ہے کہ ”کل من رضى فى الشريعة بالسبب حکم عليه انه رضى بالمسبب الا من نام فى رمضان فاحتلم“، یعنی جو سب پر راضی ہوا اسے مسبب پر راضی سمجھا جائے گا سوائے احتلام کے۔ (انظر) باب

ما جاء فی من استقاء عمداً تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب میں براہ راست سب و شتم کی نفی نہیں فرمائی جس میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ خیر القرون میں اگرچہ یہ صورت مستبعد ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوگا۔

مسئلہ:- اس حدیث مبارکہ سے سد ذرائع کا اصول بھی معلوم ہوا جو اسلام کے زرین اصولوں میں سے ایک ہے ہمارے حنفیہ کے یہاں اگرچہ اس کی اتنی زیادہ رعایت نہیں کی جاتی۔ مگر مالکیہ کے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے اور ہونی بھی چاہئے کیونکہ بقول ابن العربیؒ کے اہل کتاب اس اصول سے لاپرواہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئے۔ آج کل چونکہ ہوس پرستی کا لیول کافی اونچا ہے اس لئے علماء کو اس اصول پر سختی سے عمل بھی کرنا چاہئے اور اپنے فتاویٰ مرتب کرنے میں اس کو ملحوظ بھی رکھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی اکرام صدیق الوالد

”عن ابن عمرؓ قال: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول إن أبا البرّان یصل الرجل اہل وُذابیہ“۔ (صحیح)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نیکوں میں سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے۔ لغات:- قولہ ”ابراہم“ پہلا صیغہ اسم تفصیل کا ہے اور دوسرا مصدر ہے۔ نیز پہلا لفظ بفتح تین اور دوسرا بکسر تین پڑھا جائے گا۔ قولہ ”وُذابیہ“ بضم الواو و تشدید الدال محبت و مودۃ کو کہتے ہیں، یعنی باپ سے محبت کرنے والے جو محاورہ میں دوست کہلاتے ہیں اوپر ترجمہ میں یہی مختصر ترجمہ کیا گیا ہے۔

تشریح:- شریعت مطہرہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے اچھا سلوک کرتے رہے لیکن یہ طرز سلوک چونکہ بڑے پیمانے پر تو مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ اجنبی ہوتے ہیں۔ پھر مزاجوں میں بھی فرق بلکہ کبھی کبھی منافرت پائی جاتی ہے، جیسے دابر حرب اور دار اسلام کے لوگ باہم محبت نہیں کرتے۔ اس لئے کم از کم اس حد تک ان تعلقات کو خوشگوار بنانے اور ان میں بہتری لانے کا حکم ہوا جو یا کسی خونی رشتے کی بناء پر ہیں یا کسی اور قد مشترک کی بناء پر۔ پھر یہ بھی ضابطہ ہے کہ جب تعلق بن جائے تو حتی الامکان اسے توڑنا نہیں چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ طلاق بصورت شدید ضرورت مباح تو کر دی گئی ہے مگر تمام مباحات میں اسے مغفوض ترین قرار دیا گیا ہے کہ اس سے بنا بنایا تعلق ختم اور رشتے کی عمارت مسمار ہو جاتی،

ہے۔ چونکہ دوستانہ تعلق بھی ایک گونہ رشتے کی مانند ہے کہ جس طرح رشتے سے لوگ بلکہ اجانب ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں اسی طرح دوستانہ تعلقات سے دوست آپس میں شکر و شکر بن جاتے ہیں۔ اور اچھا تعلق بھی ایک نیکی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”أحب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل“ (رواہ البخاری و مسلم ^۱)

اس لئے دوستانہ تعلقات کو بھی جاری و باقی رکھنا مطلوب ہے اور یہ شرافت کا بھی تقاضا ہے کہ اشراف اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ رکھتے ہیں، تو جس طرح قطع رحم جائز نہیں اور ماں باپ کے عزیز و اقارب کا رشتہ محفوظ رکھنا لازمی ہے اسی طرح ان کے دوستوں کے ساتھ قطع تعلق بھی جائز نہیں اور یہ حکم حسب مراتب سب کو شامل ہے، علیٰ ہذا اپنے ماں باپ کے تعلقات والوں کے ساتھ، اپنے تمام رشتہ داوروں، اساتذہ و مشائخ اور اپنی بیوی وغیرہ سب کے متعلقین کا خیال رکھنا چاہئے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں ایک حسن حدیث کی تخریج کی ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا:

”هل بقى على من برّ والدتي شئى أبرهما بعد وفاتهما؟ قال: نعم الصلوة عليهما، والاستغفار لهما وإنفاذ عهدهما واکرام صديقهما وصلة الرحم التي لا توصل إلا بهما“۔ ^۲

لہذا بعد الموت بھی والدین کا حق باقی رہتا ہے۔

باب ماجاء فى بر الخالة

”عن البراء بن عازب عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الخالة بمنزلة الام“۔

باب ماجاء فى اکرام صديق الوالد

^۱ صحیح بخاری ص: ۹۵۷ ج: ۲ ”باب القصد والمداومة على العمل“ کتاب الرقاق، صحیح مسلم ص: ۲۶۶ ج: ۱ ”باب فضيلة العمل الدائم الخ“ کتاب الصلوة، سنن نسائی ص: ۱۲۳ ج: ۱ کتاب القبلة، ابن ماجہ ص: ۳۱۲ کتاب الزهد، ابناً رواہ ابو داؤد فی صلاة التطوع واحمد فی مسنده، المعجم المفهرس ص: ۱۶۱ ج: ۲ دار الدعوة، استنبول۔
^۲ رواہ ابو داؤد ص: ۲۵۳ ج: ۲ ”باب فى بر الوالدین“ کتاب الادب، ابناً سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۰ و ۲۶۱ ”باب صل من كان يصل ابوك“ کتاب الادب، ابناً الترغیب والترہیب ص: ۲۲۲ ج: ۳ ”الترغیب فى بر الوالدین“ دار الکتب العلمیة بیروت۔ الحنفی غفرلہ ولوالدیہ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالہ ماں کی مانند ہے۔

تشریح:۔ خالہ کو ماں کی مانند قرار دینے کا مطلب تقریباً وہی ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے ”العم صنوایہ“۔^۱ اور عقلی و طبعی اعتبار سے بھی یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جب اصل ایک ہی ہو تو فروع میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہوتا ہے۔ تو جس طرح ایک درخت کی دو شاخیں صنوان کہلاتی ہیں اور ان کی جڑ اور اصل ایک ہی ہوتی ہے اس لئے بہت سے احکام میں وہ دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ماں اور خالہ بھی ہیں لہذا یہ بھی کافی سارے احکام میں شریک ہیں۔ اور جس طرح چچا عصبہ ہے اسی طرح خالہ کو حضانت کا حق حاصل ہے۔ علی ہذا جب بچے کی ماں فوت ہو جائے تو پرورش کے ایام میں وہ خالہ کے پاس رہے گا تا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ کیونکہ باقی عورتوں میں ماں جیسی شفقت نہیں پائی جاتی ہے۔ جبکہ بچے کو مادری شفقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو صرف خالہ میں ہوتی ہے۔

قولہ ”وفی الحلیث قصة طويلة“ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ طویل حدیث جس کی طرف امام ترمذی نے اشارہ کیا ہے (بخاری شریف ص ۶۱۰ جلد دوم) میں مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرۃ القضاء سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے ”یاعم یاعم“ کہتی ہوئی چل پڑی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا ”دونک ابنة عمک“، یعنی اپنی چچا زاد کو پکڑو اور سنبھال کر رکھو چنانچہ انہوں نے اٹھالیا، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت جعفر اور حضرت زید (بن حارثہ) رضی اللہ عنہما نے بھی حق حیانت کا دعویٰ کیا کہ اس کی پرورش کا حق ہمیں ہی حاصل ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دلیل پیش کی کہ میں نے اسے پہلے لیا ہے اور وہ میری چچا زاد بھی ہے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چچا زاد تو میری بھی ہے مگر اس کے ساتھ میری بیوی اس کی خالہ بھی ہے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مابین مواخاة فرمائی تھی) ”فقضى بها النبي ﷺ“

باب ماجاء فی بر الخالة

۱۔ رواہ مسلم ص ۳۱۶ ج ۱: کتاب الزکوۃ، من ابی داؤد ص ۲۳۶ ج ۱: ”باب فی تمجیل الزکوۃ“ کتاب الزکوۃ،

مسند احمد ص ۱۵۱ ج ۱: حلیث: ۷۲۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم لِحَالَتِهَا وَقَالَ الْحَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْإِمَامِ“ (چنانچہ وہ حضرت جعفرؓ کی بیوی کی پرورش میں آئی) حدیث کا مزید حصہ دیکھنا ہو تو (بخاری شریف جلد ۲ باب عمرۃ القضاء الخ میں ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث آخر:- ”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان رجلاً اتى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انی اصببت ذنباً عظیماً الخ۔

یعنی ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا اے اللہ کے رسول! میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے تو کیا میری توبہ ہو سکتی ہے؟ یعنی قبول ہو سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری کوئی خالہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

تشریح:- اس گناہ کو عظیم کہنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:- ایک یہ کہ وہ گناہ صغیرہ تھا مگر نفوس قدسیہ پر صغائر کا بھی انتہائی بوجھ اور ثقل محسوس ہوتا ہے اس لئے اسے عظیم سے تعبیر کیا۔ دوسرا یہ کہ ممکن ہے کہ وہ بذات خود بڑا گناہ ہو جو بظاہر قطع رحمی کی صورت میں تھا، اس لئے اس کے تدارک کے لئے صلہ رحمی سے علاج کا طریقہ بتلایا۔ اور اگر کوئی دوسرا گناہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کے ازالے کا یہ طریقہ اس صحابی کی خصوصیت ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عام ہو کیونکہ بڑی نیکی سے کبیرہ گناہ کم یا ختم ہو جاتا ہے جس کی کچھ تفصیل ”باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرة“ میں (تشریحات ترمذی جلد سوم ص ۴۱۲) پر گزری ہے اور کچھ تذکرہ ”باب ما جاء فی فضل الطہور“ (تشریحات ترمذی جلد اول ص ۷۱) پر بھی گذرا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام نیکیوں سے صغائر تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن کیا کبار بھی معاف ہو جاتے ہیں؟ تو متقدمین سے اس بارے میں کوئی تفصیل مروی نہیں۔ عام متاخرین کہتے ہیں کہ کبار کے لئے توبہ شرط ہے۔ تاہم بعض حضرات کے نزدیک بڑی نیکی سے بھی کبیرہ معاف ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ حقوق سے اور خاص کر حقوق العباد سے متعلق نہ ہو کیونکہ اس کے لئے معافی یا تلافی بھی شرط ہے۔

اشکال:- حدیث باب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس صحابی کو شدید ندامت لاحق ہو گئی تھی اور اصل توبہ تو ندامت سے عبارت ہے تو پھر خالہ سے حسن سلوک پر غفویوں مشروط کیا گیا؟ حالانکہ توبہ سے توبہ بالاتفاق ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔

حل:- اولاً تو توبہ بھی کبھی مشروط بشرط ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب تو ہے نہیں لہذا وہ

قبولِ توبہ کے پابند نہیں وہ رد بھی کر سکتا ہے اور مؤخر بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوا ہو کہ ان کی قبولیتِ توبہ کی شرط یہ ہے کہ وہ والدین یا خالہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

ثانیاً، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا گناہ معاف ہوا تھا مگر پھر بھی خالہ کے ساتھ برائی کی حکم دیا تاکہ تصفیہ قلب مکمل طور پر ہو جائے جیسے بعض صحابہ گناہ کے بعد توبہ کے ساتھ صدقہ بھی دیا کرتے تھے تاکہ گناہ سے جو میل دل پر آتا ہے اس کا مکمل ازالہ ہو اور روحانی کیفیت جلد بحال ہو جائے۔

قولہ ”هل لك من ام“ اس میں لفظ ”من“ تبعیض کے لئے بھی ہو سکتا ہے لہذا پھر لفظ ام نانی کو بھی شامل ہوگا۔ جبکہ بعض روایات میں ”والدین“ بھینچہ نشینی آیا ہے^۱ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ ”من“ زائد ہو پھر مطلب یہ ہوگا ”آلک ام“ بہر حال اس حدیث سے خالہ کا مقام معلوم ہوا کہ وہ والدہ کی قائم مقام ہے۔

باب ماجاء فی دعاء الوالدین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ثلاث دعوات مستجابات لا شک فیہن دعوة المظلوم ودعوة المسافر ودعوة الوالد علی ولده“۔^۲

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین دعائیں ایسی ہیں جن کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں (یعنی ضرور قبول ہوتی ہیں) مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور والد کی بددعا اولاد کے حق میں۔

لغات:- ”دعاء“ اگر چہ لغت میں مطلق پکارنے کے معنی میں آتا ہے مگر اصطلاح میں اس پکار کو کہا جاتا ہے جس میں اللہ عزوجل کی مدد مانگی جاتی ہے۔ اس کے صلہ میں اگر لام آجائے تو بمعنی نیک دعاء کے آتا ہے جیسے دعاء، اور اگر صلہ میں علی آجائے جیسے دعا علیہ تو بمعنی بددعاء کے آتا ہے۔ امام ترمذی نے ترجمہ میں مطلق چھوڑا کیونکہ دعوة الوالد اگر چہ علی کے ساتھ آیا ہے لیکن باقی دونوں میں صلے مذکور نہیں اگرچہ مظلوم کی دعا سے بھی

۱ کذا فی المستدرک للحاکم ص: ۸۱ ج: ۵ ”کتاب البر والصلة“ حدیث: ۷۳۱۹، ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۲۲ ج: ۳۔

باب ماجاء فی دعاء الوالدین

۲ الحدیث أخرجه ابن ماجہ ص: ۲۷۵ ”باب دعوة الوالد ودعوة المظلوم“ کتاب الدعاء، ایضاً مسند احمد ص: ۲۳ ج: ۳ حدیث: ۸۳۷۵ ایضاً ص: ۱۷۲ ج: ۳۔

بظاہر بددعا ہی مراد ہے، دعا کی جمع ادعیہ آتی ہے۔

تشریح:۔ اس روایت میں ان تینوں دعاؤں کی قبولیت کی تصریح ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اگرچہ مجہول ہے لیکن اصول اس کی تائید کرتے ہیں ”والحدیث مجہول وریعاً شہدت له الاصول ابو جعفر المؤذن راویہ عن ابی ہریرۃ لا یعرف“ امام ترمذی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ تاہم امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں اس کے کثرت طرق کا دعویٰ کیا ہے۔ ترمذی ”باب ماجاء فی کراہیۃ اخذ خیار المال فی الصدقۃ“ ابواب الزکوٰۃ میں ابن عباسؓ کی صحیح حدیث گزری ہے کہ نبی علیہ السلام نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا تو ان کو جو ہدایات دی تھیں ان کے اخیر میں ہے ”واتق دعوة المظلوم فانہا لیس بینہا وبين اللہ حجاب“ اس پر مسند احمد کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے ”وان کان کافراً“ لے یعنی مظلوم کی بددعا بہر حال قبول ہوتی ہے گو کہ وہ ایسے اعمال کا ارتکاب کر چکا ہو جو دعا کی قبولیت سے مانع ہوں۔ تاہم اگر مظلوم فاسق یا کافر ہو تو دعا کی قبولیت سے مراد حصول مطلوب ہوگی نہ کہ مقصود اصلی جو کہ اکرام اور اللہ کی رضا ہے۔ (انظر تشریحات جلد ۳: ص ۳۶)

بہر حال یہ طے ہے کہ جو دعا دل کی جتنی گہرائی اور بے بسی کے عالم میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قابل قبول ہوگی، چونکہ مظلوم بے بس ہوتا ہے اور اللہ کے سوا اپنا کوئی سہارا نہیں دیکھتا وہ تمام اسباب سے کٹا ہوا ہوتا ہے اس کی آخری امید اللہ کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے اور یقیناً ایسے میں اللہ عز و جل ضرور مدد کرتا ہے۔ اسی طرح مسافر بھی اجنبیت کے عالم میں اللہ کو پکارتا ہے جو بے بسی کا اظہار ہے۔ رہا والد تو ہر ایک جانتا ہے کہ جب تک ماں باپ کو اولاد سے خیر و بھلائی کی توقع ہوتی ہے اس وقت تک وہ اولاد کے حق میں ترقی کی دعائیں مانگتے ہیں مگر جب اولاد نافرمانی کی حد کراس کرتی ہے تو ناامید ہو کر ماں باپ اس سے جان چھڑانے کے لئے اللہ سے دعا مانگنے لگتے ہیں جو قبول ہوتی ہے۔ اور چونکہ ماں باپ کی نیک دعا بھی اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہے مگر نیک دعا اور بددعا میں واضح فرق ہے کہ اول الذکر حالت اختیار میں ہوتی ہے جبکہ ثانی الذکر حالت اضطرار میں ہوتی ہے اس لئے حدیث میں اسی کی تخصیص کی گئی کیونکہ یہاں ان دعاؤں کا ذکر مقصود ہے جو بہر حال قبول ہوتی ہیں نفس قبولیت کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی حق الوالدین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یجزی وَلَدُو الدَّاءِ الا ان یجدہ مملو کاً فیشتریہ فیعتقہ“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی اولاد اپنے باپ کا بدلہ نہیں دے سکتی الا یہ کہ اسے غلام پائے اور اس کو خرید کر آزاد کر دے۔

تشریح:- اس حدیث میں اور اس سے سابقہ باب کی حدیث میں والد کے لفظ سے حکم کو باپ تک محدود نہ سمجھا جائے کیونکہ والد بمعنی ”من له الولد“ بھی آتا ہے جو ماں کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح ولد کے لفظ سے صرف بیٹا ہی مراد نہ لیا جائے کیونکہ ولد بمعنی مولود بھی آتا ہے جس کا اردو ترجمہ اولاد کے ہے۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں:- ایک زندگی اور حیات کا سبب بننا۔ دوم تربیت و پرورش۔ جہاں تک تربیت و پرورش کا تعلق ہے تو اگرچہ اس احسان کا بدلہ ہو، وہو اسی شکل میں چکانا تو ممکن نہیں تاہم ان کی خدمت کر کے بطور جزا بالمثل کے ممکن ہے لیکن پہلے احسان کا بدلہ خدمت سے کہاں ممکن ہے؟ یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ وہ غلام ہوں اور ان کو خریداجائے تاکہ وہ غلامی سے آزاد ہوں، چونکہ غلامی بھی ایک قسم کی موت ہے اس لئے گویا یہ بھی جزا بالمثل کی طرح بدلہ شمار کیا گیا۔

قولہ ”فیعتقہ“ اس میں اعتاق کی نسبت بیٹے کی طرف کی گئی ہے جس سے بعض اہل ظواہر نے یہی سمجھا کہ خریدنے کے بعد بطور استیفاف کے عتاق کی ضرورت ہوگی نفس ملک میں آنے سے وہ آزاد نہ ہوگا۔ مگر ائمہ اربعہ فرماتے ہیں کہ باپ ہو یا کوئی بھی ذی رحم محرم وہ ملک میں آتے ہی خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ یہاں نسبت سبب کی وجہ سے کی گئی کہ بیٹا اس کی آزادی کا سبب بن گیا ہے۔ جمہور کا مستدل اس حدیث سے ہے ”من مملک ذارحم محرم فهو حر“ (رواہ ابوداؤد ص ۵۵۰ ج ۲، باب فین ملک ذارحم محرم، ابن ماجہ ص ۱۸۱، ولفظہ للترمذی وغیرہ)

باب ماجاء فی قطعية الرحم

”عن ابی سلمة قال اشتكى ابو الدرداء فعاده عبدالرحمن بن عوف فقال: خیرهم واصلهم ما علمت ابو محمد، فقال عبدالرحمن سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: قال الله تبارك وتعالى: انا الله وانا الرحمن خلقت الرحم وشققت لها من اسمي فمن وصلها وصلته ومن قطعها قطعته“۔^۱

ابوسلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ بیمار ہوئے تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ عیادت کرنے ان کے پاس گئے، ابودرداءؓ نے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق ابو محمدؓ سب سے بہتر اور سب سے زیادہ تعلق گزار ہیں تو عبدالرحمنؓ نے فرمایا: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: کہ میں اللہ ہوں، اور میں رحمن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا ہے (یعنی اپنے نام رحمن کے مطابق وہنام) پس جو شخص اس کو جوڑے گا میں بھی اسے (اپنی رحمت سے) جوڑوں گا اور جو اس کو کاٹے گا میں بھی اس کو (اپنی رحمت سے) کاٹوں گا۔

ترکیب:- ”فقال“ کی ضمیر ابودرداءؓ کی طرف لوٹی ہے۔ ”خیرهم واصلهم“ معطوف علیہ ومعطوف مل کر مبتدأ ہے اور ”ابو محمد“ خبر ہے جو عبدالرحمن بن عوفؓ کی کنیت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ابو محمد“ کو مبتدأ مؤخر بنا کر ”خیرهم واصلهم“ کو خبر مقدم مانا جائے۔ بنا ہر دو تقدیر ”ما علمت“ جملہ مقررہ ہے جس کی وجہ آگے تشریح میں آرہی ہے۔

لغات:- قولہ ”اشتكى“ شکایت کرنے اور بیمار ہونے کے معنی میں آتا ہے اور یہاں یہی بیمار ہونے کے معنی مراد ہیں۔ شکا يشكو نصرہ نصر سے بمعنی بیماری کی تکلیف محسوس کرنے کے آتا ہے۔ قولہ ”الرحم“ رحم، مادہ میں شفقت کے معنی پائے جاتے ہیں اصطلاح میں بچہ دانی کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد قرابت کا رشتہ ہے یعنی خونی رشتہ خواہ محارم ہوں جیسا کہ بعض کی رائے ہے یا مطلق رشتہ دار ہوں جیسا کہ بعض دیگر کا خیال

باب ماجاء فی قطعية الرحم

۱۔ اخرجه ابو داؤد ص: ۲۳۵ ج: ۱ ”باب فی صلة الرحم“ کتاب الزکوة، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۲۹ ج: ۳ دارالکتب العلمیہ بیروت۔

ہے۔ قولہ ”بتہ“ بتُ الشئ بتوتاً بمعنی منقطع ہونے کے ہیں جبکہ بتُ متعدی استعمال ہوتا ہے یعنی بمعنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے۔

تشریح :- حضرت ابووداء رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے موقع پر جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ عیادت کی غرض سے ان کے پاس تشریف لائے یہ تحمیدی کلمات ارشاد فرمائے کیونکہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے یا تو کسی دور کی قربت کا خیال رکھتے ہوئے عیادت فرمائی۔ یا پھر محض مواخاة اسلامی اور دوستانہ تعلقات کی بناء پر عیادت کی چونکہ ایسا شخص جو عام سے رشتے کی اتنی قدر کرتا ہوا قرینہ کامقیناً قدر داں ہوتا ہے اس لئے حضرت ابووداءؓ نے اس پر ان کی تعریف فرمائی۔ تاہم بیچ میں ”ما علمت“ کا اضافہ کر کے تعلیمات نبوی پر عمل کر کے دائرہ مدح و تعریف کے اندر اندر رہے کیونکہ کسی کی ایسی تعریف نہیں کرنی چاہئے جو آدمی کے علم میں نہ ہو۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے منہ پر تو بہت زیادہ تعریفیں کرتے ہیں لیکن دل میں اور غائبانہ طور پر اس کی تصدیق کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں، دوسری طرف عجب اور خود نمائی کے شوق کے شکار کو ایسے کلمات سے نوازنا جو اس کے مرتبے سے زیادہ ہوں زہر آلود شہد کی مانند ہے، بخاری شریف میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص نے دوسرے کی تعریف کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ارے تم نے تو اس کی گردن کاٹ ڈالی کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کو دہرایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے اگر کوئی کسی کی تعریف کرنا چاہے تو ”احسب فلاناً“ کہہ دے یعنی تعریف میں یہ کہے کہ میرے علم کے مطابق یہ شخص ایسا ہے ”باب اذ رکب رجل رجلاً کفاه“ اور ”باب ما یکرہ من الاطباء فی المدح ویقلل ما یعلم“۔ (ص: ۳۶۶ ج: ۱)

ان تعریفی کلمات کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے مذکورہ حدیث قدسی بیان فرمائی۔ قولہ ”خلقت الرحم“ اگر رحم سے مراد بچہ ڈانی ہو تو پھر خلق بمعنی ایجاد کے ہے یعنی میں نے رحم کو وجود بخش کر اس کو جسم بنایا اور اگر بمعنی قربت کے ہو تو پھر خلق بمعنی تقدیر کے ہے یعنی میں نے قرابتیں مقرر و مقدر کی ہیں۔

قولہ ”و شققت لہامن انسمی“ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ بعض ملحدین نے اس سے اللہ اور رحم کے درمیان نسب ثابت کیا ہے جو سراسر غلط ہے کیونکہ یہاں مراد تشبیہ دینا مقصود ہے جیسے اللہ کو بھی عالم کہا جاتا ہے اور بندے کو بھی حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی نسب اور مماثلت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ نے رحم کے اندر شفقت اور باہمی محبت ڈالی ہے، جو رحمن ذات کی رحمت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی علی ہذا یہ محض اسکی مشارکت

ہے نہ کہ معنوی۔ ہاں اسم کا اثر ہوتا ہے اور اپنے معنی سے مناسبت بھی ہوتی ہے جو یہاں موجود ہے۔ (مذہب)
 قولہ ”فمن وصلها وصلته“ یعنی جو شخص قرابت کی رعایت کرے گا، تو میں اس کو پورا ثواب دوں گا اور جو اس میں کوتاہی کرے گا تو میں اس کو ثواب سے محروم کر دوں گا۔

اس حدیث مبارکہ سے صلہ رحمی کی تاکید اور اسے نظر انداز کرنے پر وعید معلوم ہوتی ہے۔ بخاری شریف میں ہے ”لا یدخل الجنة قاطع“ ^۱ قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا یہ روایت اگلے باب میں بھی آ رہی ہے۔ جبکہ صلہ رحمی سے آخرت اور دنیا دونوں اعتبار سے برکات کا نزول ہوتا ہے۔ دنیا میں خوشی اور عزت اور دولت اور موت کے بعد یر تک شہرت و ذکر خیر نصیب ہوتا ہے اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور جنت ملتی ہے۔ مزید تفصیل اگلے باب میں۔

اخیر میں امام ترمذی نے معمر کے طریق کو غلط قرار دیا ہے جس میں ابو سلمہ اور ان کے والد عبد الرحمن بن عوف کے درمیان رد اکا واسطہ بڑھایا ہے ”وفیه مافیہ“۔

باب ماجاء فی صلة الرحم

”عن عبد الله بن عمرو عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس الواصل بالمكافئ ولكن الواصل الذي اذا قطعت رحمه وصلها“۔ ^۱ (حسن صحیح)

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو صلہ رحمی کے بدلے میں صلہ رحمی کرے بلکہ (درحقیقت) صلہ رحمی کر نیوالا وہ شخص ہے کہ اس کا رحم کاٹا جائے تو وہ اسے جوڑ دے، یعنی جب اس سے تعلق منقطع کیا جائے تو یہ اسے بحال کرے۔

لغات:- ”صلة“ اصل میں وصل تھا لہذا اس میں ہاء واو محذوفہ کے عوض میں آیا ہے جیسے عدة۔ قولہ ”الواصل“ باب کی اگلی روایت میں قاطع کا لفظ آ رہا ہے جس کے مطلب میں امام سفیانؒ نے فرمایا یعنی قاطع الرحم

۱ صحیح بخاری ص: ۸۸۵ ج: ۲ ”باب اثم القاطع“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۳۱۵ ج: ۲ ”باب صلة الرحم وتحریم قطعہا“ کتاب البر والصلة، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۳۳ ج: ۳، ابو داؤد ص: ۲۴۵ ج: ۱ کتاب الزکوۃ۔

باب ماجاء فی صلة الرحم

۱ الحدیث اخرجه البخاری ص: ۸۸۶ ج: ۲ ”باب ليس الواصل بالمكافئ“ کتاب الادب و ابو داؤد ص: ۲۴۵ ج: ۱ ”کتاب الزکوۃ“ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۱ ج: ۳۔

لہذا یہاں واصل الرحم مراد ہوا یعنی صلہ رحمی کرنے والا۔ قولہ ”المکافی“ بروزن مجازی لفظاً ومعناً کافاً یکافئ مکافاً کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔

تشریح:- اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ احسان کے بدلے میں احسان کرنا اور اچھے تعلقات کے رد عمل میں اچھے تعلقات اور نیک سلوک سے پیش آنا تو ہر آدمی کا کام ہے یہ تو ادنیٰ شخص بھی کر سکتا بلکہ کرتا ہے یہ کوئی اتنی باکمال شخصیت کا کارنامہ نہیں۔ اصل اور کامل واصل وہ شخص ہے جس سے ناطہ توڑ جائے اور یہ اسے دوبارہ و سہ بارہ پھر بحال کرتا رہے۔

دوسری حدیث:- ”لا یدخل الجنة قاطع“ ای قاطع رحم^۲ اس کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ قطع رحمی کرنے والا شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ شارحین نے اس کے متعدد مطالب بیان کئے ہیں۔ (۱) جو شخص قطع رحمی کو حلال سمجھتا ہے تو چونکہ حرام کو حلال سمجھنے والا دائرہ ایمان سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ جنت میں نہیں جائے گا لہذا یہ عدم دخول مؤبد و دائمی ہے۔

(۲) یہ سابقین کے ساتھ نہیں جائے گا یعنی بقدر گناہ عذاب پہنچنے کے بعد جائے گا۔ حضرت شاہ صاحب کی عرف شذی والی توجیہ بھی اس کے قریب ہے یعنی جب تک وہ اس وصف سے موصوف ہوگا تو جنت میں داخل نہ ہو سکے گا مگر جب عذاب سے پاک ہوگا تو پھر یہ گناہ اس کے ذمہ نہیں رہے گا۔ (۳) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خاصیت مفرد کا بیان ہو یعنی قطع رحمی کی اپنی خاصیت و تاثیر جنت سے روکنا ہے گو قیامت کے دن فیصلہ مجموعہ اعمال پر ہوگا۔ پہلے دو جواب حاشیہ پر ہے۔ جبکہ تیسرا جواب امام راغب کے مفردات قرآن کے ضابطے پر مبنی ہے۔

باب کی دونوں ارشادات سے صلہ رحمی کی تاکید معلوم ہوئی۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی کی وجہ سے نسب یاد رکھنا واجب ہے۔

صلہ رحمی کرنے کا طریقہ:- فقیہ ابواللیث سمرقندی فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں سے قریب رہتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ حسب استطاعت کبھی بکھار ان کو تحفہ و ہدیہ بھیجا کرے، ان سے ملنے کے لئے جائے۔ اگر ہدیہ کی طاقت نہ ہو تو نفس زیارت کے لئے ضرور جائے، اگر اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو اسے بخوشی قبول کرے۔ اگر وہ اقارب سے دور رہتا ہو تو خط و کتابت کا رابطہ رکھنے سے بھی یہ حق ادا ہو جائے گا۔ آج

کل فنون کی سہولت نے اس مقصد کے حصول کو اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی نہ ان سے ملتا ہے نہ ہدیہ بھیجتا ہے اور نہ ہی کوئی رابطہ رکھتا ہے تو وہ صلہ رحمی کو توڑتا ہے۔ (تنبیہ الغافلین ص: ۵۰)

غرض اپنے رشتہ داروں سے ملنا، ان کی ایذا رسانی پر صبر کرنا، ان کی خدمت کرنا، ان کی خیر خواہی کا جذبہ رکھنا اور ان سے بہتر تعلقات سنوارنا صلہ رحمی ہے حتیٰ کہ اگر اقارب میں کوئی غیر مسلم ہو تو بھی ان سے اچھے مراسم رکھنے چاہئے۔ امام بخاریؒ نے اس کے لئے مستقل دو باب قائم کئے ہیں۔ ایک میں ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ جو مشرک تھی صلح کے زمانے میں مدینہ آئی حضرت اسماءؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ”ان امی قدمت وہی راغبة أفأصلها؟ قال نعم صلی امک“ یعنی میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ کچھ راغب ہے تو کیا میں اس کی خدمت اور خاطر تواضع کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیکر فرمایا ہاں ان سے نیک سلوک اور اچھا برتاؤ کرو۔ (باب صلۃ الوالد المشرک ص: ۸۸۴ ج: ۲ ص: ۲)

فقہ ابو الیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی میں دس حکمتیں ہیں: (۱) اس سے اللہ عزوجل خوش ہوتے ہیں (۲) یہ فرشتوں کی خوشی کا بھی ذریعہ ہے (۳) اس سے اہل قرابت بھی خوش ہو جاتے ہیں (۴) لوگ بھی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں (۵) یہ ابلیس کی مایوسی و پریشانی کا بہترین ذریعہ ہے (۶) اس سے عمر میں برکت حاصل ہوتی ہے (۷) اس سے رزق و مال میں زیادتی ہوتی ہے (۸) اس کے فوت ہونے والے بزرگ باپ دادا بھی اس سے خوش ہوتے ہیں (۹) اس سے لوگوں میں اس کی محبوبیت بڑھ جاتی ہے (۱۰) یہ موت کے بعد اجر کا ذریعہ ہے یعنی دعائیں لینے کا بہترین سامان ہے۔ (تنبیہ الغافلین ص: ۵۰، نقش قدم کامل ص: ۳۷۹)

باب ماجاء فی حُبِّ الولد

عن ابرہیم بن میسرۃ قال سمعت ابن ابی سؤید یقول سمعتُ عمر بن عبد العزیز یقول: زعمت المرأة الصالحة حولة بنت حکیم قالت خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم وهو محتضن أحد ابنتی ابنته وهو یقول: انکم لتبخلون وتُحِبُّون وتُحِبُّون وانکم لَمِنْ ریحان

۳۔ إخراجہ البخاری فی الہبۃ باب: ۲۹ والجزیۃ باب: ۱۸ والادب باب: ۸ ومسلم فی کتاب الزکوۃ، ایضاً ابو داؤد فی

کتاب الزکوۃ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۲۱ ج: ۳.

اللہ۔ (منقطع و آخره احمد فی مسندہ) ۱

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک نیک خاتون خولہ بنت حکیم کہتی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، درازاں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کے دو صاحبزادوں میں سے ایک کو گود میں لئے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے تم لوگ (اولاد) بخل پر مجبور کرتے ہو اور بزدل بناتے ہو اور جہل پر اُکساتے ہو، تم لوگ اللہ کی طرف سے تسکین بخش رزق ہو۔ (یا بہت خوشبودار ہو)

لغات:- قولہ ”زعمت“ زعم دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے (۱) اعتقادِ فاسد (۲) قول، یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔ قولہ ”حولہ بنت حکیم“ یہ المرأة الصالحة سے بدل ہے۔ قولہ ”محتضن“ احتضان سے ہے گود میں لینے کو کہتے ہیں، حضن سینے سے بغل اور پہلو تک کے حصے کو کہتے ہیں۔ حضائے پرورش کو کہتے ہیں کہ اس میں بھی گود میں لینا پڑتا ہے۔ قولہ ”لتبخلون“ بتیوں صیغے باب تفعیل سے ہیں۔ قولہ ”ریحان“ رحمت، راحت اور رزق کو کہتے ہیں بمعنی خوشبو کے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بچوں کو پیار کرتے وقت منہ سے لگایا جاتا ہے ان کا بوسہ لیا جاتا ہے اور سونگھے جاتے ہیں۔ علامہ عینیؒ نے سونگھنے کے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس کی تائید بعض روایات سے ہوتی ہے۔

تشریح:- یہ واقعہ حضرات خشنین میں سے کس کا ہے؟ تو اس میں دونوں احتمال ہیں حضرت حسن رضی اللہ بھی ہو سکتے ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ بھی۔ بنا برہر تقدیر حدیث میں ”ابنتہ“ سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ حدیث میں جن تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کسی طرح کا تردد نہیں، کیونکہ اولاد کی محبت ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی بخل اختیار کرتا ہے کہ اسے ہر وقت اپنے بچوں کی خوشی اور روشن مستقبل کی فکر لاحق رہتی ہے اور پھر وہ پیسوں سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اس سے بھی بچوں کے لئے خوشی خریدی جاسکتی ہے۔ اسی طرح آدمی موت سے بھی ڈرتا ہے کہ اس پر ہر وقت یہ سوچ سوار رہتی ہے کہ اگر میں مر جاؤں گا تو میرے بچے یتیم بن جائیں گے اس طرح وہ شفقت پداری سے محروم ہو جائیں گے ان کی صحیح پرورش نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ نتیجتاً وہ بزدل بن جاتا ہے۔

پھر بعض لوگ اپنی اولاد کی وجہ سے بسا اوقات نامناسب روش بھی اختیار کر لیتے ہیں جو ایک گونہ جہل

ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہل سے مراد مقابل علم ہو کیونکہ بعض لوگ اولاد کی وجہ سے ضروری علم یا تجربہ علمی سے محروم رہتے ہیں۔

چونکہ ان باتوں سے اولاد کے مقام کا انحطاط معلوم ہوتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ تم اللہ کی طرف سے سونگھنے کا عطیہ ہو جس سے تسکین و راحت نصیب ہوتی ہے، یعنی ایک طرف اولاد کی وجہ سے آدمی نقصان اٹھا سکتا ہے جبکہ دوسری جانب اولاد چین اور سکون کا سامان ہے لہذا کوئی آدمی فرط محبت کی وجہ سے اولاد کی طرف سے نقصان نہ اٹھانے پائے۔ بلکہ اپنے دین کا بھی خیال رکھے اور ان کی تربیت بھی کرتا رہے گو اس کے لئے بچوں کو مارنا پڑے ہاں زیادہ مارنا ممنوع ہے تین تھپڑ تک مارنے کی اجازت ہے بشرطیکہ منہ پر نہ ہوں، غرض ان سے محبت بھی کرو اور ادب بھی سکھاؤ۔

باب ماجاء فی رحمة الولد

”عن ابی ہریرۃ قال ابصر الاقرع بن حابس النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یقبل الحسن وقال ابن عمر: ”الحسن او الحسنین“ فقال: ان لی من الولد عشرة ما قبلت احدا منهم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انه من لا یرحم لا یرحم“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ اقرع بن حابس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ کو چوم رہے تھے ابن ابی عمر (راوی) کہتے ہیں کہ وہ حسن تھے یا حسین؟ (یعنی دونوں میں سے ایک تھے) تو حابس نے کہا کہ میرے تو دس بچے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چوما ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی پر رحم نہیں کرتا (یعنی شفقت نہیں کرتا) تو اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا ہے۔

تشریح:۔ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ میں نے اپنے دس بچوں میں سے کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا ہے اس رسم پر مبنی تھا جو جاہلیت میں عام تھی کہ بچوں کو پیار کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے پٹھانوں میں بھی یہ رسم جڑیں پکڑ چکی ہے اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ کے سامنے اپنی بیوی سے بات کرے یا بچہ گود میں اٹھائے تو لوگ اسے بے شرم سمجھتے ہیں، گویا کہ یہ جاہلی عرفی حیا ہے چونکہ یہ قساوت قلبی کی علامت ہے اس لئے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی فرما کر واضح کر دیا کہ اس کے نتائج ایسے شخص کے بارے میں اچھے نہیں نکلتے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر آدمی کے ساتھ اس کے حال کے مطابق معاملہ و سلوک فرماتے ہیں، نرم دلوں کے ساتھ نرمی کا اور سخت مزاجوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے ہیں چنانچہ ایک حدیث قدسی میں ہے ”انما عند ظن عبدی بسی“،^۱ گویا اعتقاد کے بارے میں ہے تاہم اس سے برتاؤ کا اصول لیا جاسکتا ہے کہ جو معاملہ آدمی کا اللہ کے ساتھ ہو اور اس پر جو سزا جزا ملتی ہیں اسی طرح جو سلوک آدمی کا اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہو گا اس کی بھی اچھی بُری سزا ملے گی، چونکہ اہلاد کے ساتھ شفقت اپنے اوپر اللہ کے رحم کا سبب ہے جبکہ اس کے برعکس بچوں کے ساتھ سختی کرنا اپنے اوپر سختی کا موجب ہے اور بوسہ لینا اس سلوک کی علامات میں سے ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حکم لگایا، اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو چومنا بہیمانہ شہوت کا نتیجہ نہیں بلکہ رحیمانہ اخلاق اور مشفقانہ طرز حیات کی نشانی ہے۔

باب ماجاء فی النفقة علی البنات

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من كانت له ثلاث بنات او ثلاث اخوات او ایتنان او اُختان فاحسن صحبتھن واتقى اللہ فیھن فله الجنة“۔ (حسن)

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں یا تین بہنیں ہوں یا دو لڑکیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے تو اس کو جنت ملے گی۔

تشریح:- اس روایت میں لفظ ”او“ راوی کے شک کے لئے نہیں بلکہ تنويع کے لئے ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے اتنی قوی تو نہیں تاہم اس مضمون کی متعدد احادیث مروی

باب ماجاء فی رحمة الولد

۱۔ رواہ البخاری ص: ۱۱۰۱ ج: ۲ ”باب قول اللہ وبحکم اللہ نفسه الخ“ کتاب الرد علی الجہمۃ وغیرہم التوحید، مسلم ص: ۳۵۴ ج: ۲ کتاب التوبۃ، سنن ابن ماجہ فی الادب، سنن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲ حدیث: ۲۷۳۱ کتاب الرقاق مسند احمد ص: ۵۳۶ ج: ۴ حدیث: ۵۵۸۶ ایضاً رواہ الحاکم فی المستدرک والطبرانی وابن المبارک وابن حبان والذوالبی، بحوالہ حاشیہ سنن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲۔ حفیظ الرحمن الحنفی غفرلہ ولوالدہ ولاسلطتہ

ہونے کی وجہ سے کم از کم درجہ حسن کی ہے۔ اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیٹیوں یا بہنوں کی صحیح پرورش کرے تو وہ اس عمل کی وجہ سے جنت کا مستحق ہو جاتا ہے گو کہ اللہ پر کوئی چیز واجب تو نہیں لیکن اس کی عادت شریفہ یہ ہے کہ نیک مخلصانہ اعمال پر جنت دیتے ہیں چونکہ لڑکوں کی پرورش، ان کی تعلیم پر خرچ کرنا تو ہر ایک برداشت کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کل یہ لوگ مجھے کھلائیں گے۔ جبکہ لڑکیوں کی بہترین تربیت دنیوی لالچ سے خالی ہوتی ہے یہ صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہوتی ہے اس لئے عند اللہ لڑکیوں کی تربیت پر اتنا بڑا انعام مقرر کیا گیا کیونکہ یہ عمل تکلیف سے خالی نہیں کہ ایک ایسی جگہ پیسے لگانا، تکلیف اٹھانا اور صبر کرنا جہاں سے دنیاوی مفادات ملنے کا خاطر خواہ امکان نہ ہو یقیناً کسی نیک جذبے سے ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ابتلى بشئ من البنات فصبر عليهن كن له حجاباً من النار“۔ (حسن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس شخص کو کچھ لڑکیوں میں مبتلا کیا گیا اور اس نے ان پر صبر کیا تو وہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم سے آڑ ہوں گے۔

لغات:- قولہ ”ابتلى“ بصيغة مجبول بلاء کے معنی آزمانے اور مصیبت میں گرفتار کرنے کے آتے ہیں۔ یہاں بمعنی امتحان و آزمائش کے ہے۔

قولہ ”من شئ“ اگر من بیانہ ہو تو شئ سے مراد عدد ہے۔ اور اگر ابتدائیہ ہو تو شئ سے مراد ناگواری

ہے۔

تشریح:- چونکہ لوگ لڑکوں کی پیدائش پر خوش ہوتے ہیں اور لڑکیوں پر خوش نہیں ہوتے کہ ان کے دُعم میں یہ ان پر بوجھ ہوتی ہیں، یا ان کی وجہ سے وہ عار سے دوچار بھی ہو سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس لئے اس حدیث میں ان کی پیدائش اور ان کی تادیب و تعلیم وغیرہ کو ابتلاء سے تعبیر کیا کہ لوگ ان کو بادل نا خواستہ قبول کرتے ہیں۔ تو اس حدیث مبارکہ میں ان کو بتلایا گیا کہ جو شخص ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت اور شادی وغیرہ مراحل سے یوں گذرے کہ ان تمام مراحل میں پیش آنے والی تکلیفات پر صبر کرے اور ان پر اجر و ثواب کی نیت کرے تو یہ لڑکیاں قیامت کے دن عذاب سے آڑ بن کر والدین کی نجات کا ذریعہ بنیں گی گویا جس طرح بعض اعمال کے فوائد نقد

اور جلد دنیا میں ملتے ہیں اور بعض کے آخرت میں تو بچوں کا معاملہ بھی کچھ اس طرح ہے کہ لڑکوں کی کمائی اور محنت و مزدوری و دیگر فوائد دنیا ہی میں سامنے آتے ہیں مگر لڑکیوں کے ساتھ جو اجر و ثواب وابستہ کیا گیا ہے وہ آخرت میں ملے گا۔ عقلمند شخص وہ ہوتا ہے جو اشیاء کے لوازمات اور تاثیرات کو جانتا ہو۔ اگر کھجور کا درخت جلد پھل نہ دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درخت ہی فضول ہے۔ چونکہ آخرت کا ثواب کمانے کے لئے نیت بھی شرط ہوتی ہے اس لئے ان لڑکیوں کی پرورش کے دوران ثواب کی نیت بھی کر لینی چاہئے۔ اور یہ کہ ان کی تربیت اور تعلیم بھی ایسی ہونی چاہئے جو آخرت کے کاموں میں سے ہو۔ ویسے تو لوگ آج کل روشن خیال بنانے کو بھی تعلیم و تربیت کہتے ہیں۔

تیسری حدیث:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت ان کے یہاں آئی جس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، اس نے بھیک مانگی لیکن وہ میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ پاسکی جو میں نے اسے دیدی پس اس نے اس کے دو ٹکڑے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دیئے اور خود اس میں سے نہیں کھایا پھر اٹھ کر چلی گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصے کی خبر دیدی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص ان لڑکیوں کی طرف سے کچھ آزمائشوں میں مبتلا ہو جائے تو وہ (بشرط مابصر) اس کے لئے جہنم سے حجاب ہوں گی۔

تشریح:- حضرت گنگوہی رحمہ اللہ ”الکوکب“ میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ پر تعجب ہوا حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر ام المؤمنین چونکہ اولاد کی حلاوت سے واقف نہ تھیں اس لئے یہ منظر ان کو عجیب لگا کہ ایک بھوکی عورت نے کس طرح اپنے آپ پر بچیوں کو ترجیح دی۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسائل کو محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر زیادہ چیز دینے کے لئے نہیں مل رہی یا اس کے دینے کی استطاعت نہیں تو کم از کم کچھ نہ کچھ دینا چاہئے گو کہ وہ بہت معمولی کیوں نہ ہو، سوال کے متعلق تفصیلی بحث باب من تحلل لہ الزکوٰۃ میں گذری ہے فلا نعیہ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد سوم ص: ۱۰۱ تا ۱۰۸ بحث اول و ثانی)

یہاں علامہ عینیؒ نے ایک اعتراض کیا ہے کہ بعض روایات میں تین کھجوروں کا ذکر ہے کہ اس عورت نے ایک ایک کھجور لڑکیوں کو دی اور تیسری کو خود کھانے کا ارادہ کیا مگر جب اسے منہ کے قریب کیا تو لڑکیوں نے وہ

بھی مانگ لی تو ماں نے اس کے دو ٹکڑے کر کے ان کو ایک ایک ٹکڑا دیدیا اس طرح دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ راوی کی نظر مغزو معنی پر ہوتی ہے لہذا ممکن ہے کہ اصل میں تین کھجوریں ہوں مگر اختصاراً تیسری کا ذکر کیا گیا کیونکہ اصل غرض اسی سے متعلق ہے کہ خود بھوک رہی اور بچیوں کو کھلایا۔

حدیث آخر:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ عَالَ جَارَيْتَيْنِ دَخَلَتْ اَنَا وَهُوَ الْحَنَّةُ كَهَاتَيْنِ وَاشَارَ بِاصْبَعِيهِ“ جس نے دو لڑکیوں کو کھلا پلا کر پالا تو میں اور وہ جنت میں ان دو (انگلیوں) کی طرح ساتھ داخل ہوں گے اور اشارہ کیا دو انگلیوں سے۔

عول کے معنی روزی اور مدد وغیرہ کے آتے ہیں لیکن یہاں وہ سب چیزیں مراد ہیں جو عیال داری کے لئے درکار ہوتی ہے مثلاً کپڑے، تعلیم و تربیت کے اخراجات اور علاج کی سہولت وغیرہ، پھر یہ ذمہ داری کم از کم شادی کے وقت تک لازمی ہے صرف چند دن کے حسن سلوک سے یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی بلکہ پیدائش سے لیکر مسلسل بلوغت اور شادی تک مراد ہے شادی کے بعد چونکہ یہ ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے اس لئے باپ فارغ ہو جاتا ہے ہاں لازمی سلوک کے علاوہ درجہ استحباب میں کچھ نہ کچھ خیال پھر بھی رکھنا چاہئے کہ گاہے بگاہے کچھ کپڑے یا پیسے وغیرہ بھیج دے یا جب وہ اپنے میکے آجائے تو ان کا حسب استطاعت خیال رکھے تاکہ ان کا دل نہ ٹوٹے۔ بعض لوگ بچیوں کا مہر لیکر خود ہڑپ کر جاتے ہیں اور بچیوں کو فروخت کئے ہوئے مال کی طرح بھول جاتے ہیں یہ ظلم ہے اور سراسر نا انصافی قطع رحمی ہے اس سے بچنا لازمی ہے۔

پھر جنت میں داخل ہونے میں معیت کا مطلب اتصال ہے یعنی جنت کا دروازہ تو اگرچہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھولا جائے گا تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دوسرے لوگ حائل و رکاوٹ نہیں بنیں گے جیسے صدیقین اور علماء ہیں تو یہ شخص بھی صدیقین اور علماء کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ داخل ہوگا تو جس طرح خاص خادم اپنے مخدوم کے ساتھ قریب قریب رہتا ہے اسی طرح یہ شخص بھی ہوگا گو خادم اور مخدوم میں اتصال کے باوجود بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ فضیلت خاصیات المفردات میں سے ہے۔ (تذکرہ تدبر)

باب ماجاء فی رحمة الیتیم و کفالتہ

”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من قبض یتیم آمن بین المسلمین الی طعامہ و شرابہ ادخلہ اللہ الجنة البتۃ الا ان یعمل ذنباً لا یغفر“۔ (تفرد الترمذی بتخریجہ) ^۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شامل کرے تو اللہ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا گناہ کرے جس کی بخشش نہ ہوتی ہو۔ یعنی کفر و شرک

لغات:- ”من قبض“ قبض کے معنی ہاتھ میں لینے اور قبضے میں لینے کے آتے ہیں یہاں مراد کھانا دینا ہے۔ قولہ ”یتیم“ ”تم یتیم“ ”تمنا“ باب ضرب سے تہارہ جانے کے آتا ہے اصطلاح میں وہ نابالغ بچہ جس کا باپ مر جائے گویا وہ بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے تنہا ہوتا ہے۔ قولہ ”من بین المسلمین“ قبض کے ساتھ متعلق ہے۔ قولہ ”الی طعامہ و شرابہ“ یتیم کو اپنا کھانا کھانا مراد ہے خواہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھائیں یا الگ الگ گو پہلی صورت افضل ہے۔ قولہ ”البتۃ“ بتانا بمعنی قطعاً و یقیناً کے آتا ہے ہمزہ قطعی ہے لہذا درج کلام میں ساقط نہیں ہوتا۔

تشریح:- سابقہ باب اور اس باب کی احادیث کا مضمون تقریباً ایک ہے کہ بچیوں اور یتیموں کی کفالت پر جنت ملتی ہے وجہ اشتراک یہ ہے کہ یہ دونوں کمزور مخلوق ہیں، لڑکیاں عموماً احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہیں جبکہ یتیم بچے احساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں پس جو شخص ان کو سہارا دے گا اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کو عجز و محرومی کی آگ سے نکال باہر کر دے کیونکہ محروم آدمی اپنی محرومی کی وجہ سے ہر وقت تڑپتا رہتا ہے۔ دوسری جانب یہ اصول ہے کہ اخروی مکافات آدمی کے عمل کے مطابق ہوتی ہے تو جس طرح لڑکیوں اور یتیم کے کفیل نے ان کو محرومی کی شہسی سے نکال دیا اسی طرح اللہ عز و جل اس کو قیامت کے دن جنت کی محرومی سے محفوظ اور جہنم کی آگ سے مامون بنا کر جنت میں داخل فرمائے گا۔

باب ماجاء فی رحمة الیتیم و کفالتہ

۱۔ ایضاً رواہ الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۱۱۵۴۲ ما من مسلم قبض یتیم آمن بین مسلمین الی طعامہ و شرابہ الا ادخل الجنة البتۃ الا ان یعمل ذنباً لا یغفر الخ مجمع الزوائد ص: ۲۰۹ ج: ۸ حدیث: ۱۳۵۲۵۔

تاہم اس قسم کے فضائل میں یہ ضابطہ ذہن میں رہے کہ یہ خاصیات مفرد ہوتے ہیں جن کے بارے میں پہلے بارہا عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ فضیلت اس فعل کی ہوتی ہے لیکن اگر اس کے ساتھ مخالف عمل مخلوط ہوگا تو اس کی قوت کے مطابق اس عمل کی تاثیر کم یا ختم ہوگی اس لئے حدیث باب کے اخیر میں فرمایا 'الا ان يعمل ذنباً لا يغفر' لہذا اگر اس سے مراد شرک ہو تو پھر تو سارے نیک اعمال رائیگاں چلے گئے۔ اور ذنب سے مراد اگر مادون الشکر گناہ ہوں جیسے حقوق العباد تو پھر کفالت یتیم پر یہ فضیلت زیادہ مؤثر نہ ہوگی بلکہ حقوق کا حساب پہلے دینا پڑے گا الا یہ کہ صاحب حق معاف کر دے۔

دوسری حدیث:- حضرت اہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دونوں کی طرح ہوں گے اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں سے اشارہ فرمایا یعنی سبابہ (اشارہ کی انگلی) اور درمیانی سے۔ قولہ "کافل" کفالت کرنے والا یعنی مربی اور پرورش کرنے والا۔

تشریح:- یتیم کی کفالت سے مراد اس کی پرورش ہے جس میں ہر زمانے کے عرف کے مطابق معروف اشیاء داخل ہیں مع ہذا چونکہ وہ شفقتِ پدری سے محروم ہوتا ہے تو اس پر شفقت کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی شخص یتیم کو گھر میں جگہ تو دیتا ہے اور اسے کھلا پلاتا بھی ہے مگر اس سے غیر معمولی خدمت لیتا ہے یا اس سے کما کر اسی کی کمائی میں سے اس کو دیتا ہے تو یہ للہیت نہ ہوئی بلکہ ذاتی مفادات ہیں، ہاں اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ یتیم سے بالکل خدمت نہ لے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنے بچوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے اسی طرح یا اس کے قریب قریب سلوک اس سے کرے گو قلبی محبت میں فرق ناگزیر ہے، غرض کفیل، یتیم کے لئے بمنزلہ باپ بن جائے تو وہ اس فضیلت کو حاصل کر لے گا۔

پھر جنت میں معیتِ ظاہری سے من کل الوجوہ مساوات لازم نہیں آتی بلکہ باوجود اس معیت کے معنوی و باطنی تفاوت رہے گا جیسے ایک ہی دفتر میں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں مگر ان کے گریڈز اور مناصب و عہدوں میں فرق ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ آخرت کے مراتب چونکہ ایمان و عرفان و عمل کے تفاوت پر مبنی ہوتے ہیں، تو جس طرح ایک بڑے اور چھوٹے عالم میں ظاہری کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن باطن میں

بڑا فرق ہوتا ہے اسی طرح جنتیوں کے باطنی کیفیات و احوال و مقامات بھی مختلف ہوں گے (تدبر و تشکر) بلاشبہ اعمال میں یہ بڑی خوشخبری ہے کہ یتیم کا مربی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں بھی معیت کی نعمت حاصل کرے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہ شخص ہوں جس کے لئے جنت کا دروازہ سب سے پہلے کھولا جائے گا، میں ایک عورت کو دیکھوں گا جو مجھ سے آگے جانے کی کوشش کرے گی میں اس سے پوچھوں گا تو کون ہے؟ وہ کہے گی میں نے اپنے یتیموں کی پرورش کی تھی۔ (اخرجہ ابو یعلیٰ وقال رواۃ لابأس بهم۔ کذا فی التلخیص الاحوالی)

باب ماجاء فی رحمة الصبيان

”عن زریسی قال سمعت انس بن مالك يقول جاء شيخ يريد النبي صلى الله عليه وسلم فأبطل القوم عنه ان يستعوا له فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ليس منا من لم يرحم صغيرنا ولم يُوقر كبيرنا“۔

حضرت زریبی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا ہے کہ ایک بزرگ شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو حاضرین نے ان کو جگہ دینے میں دیر کی پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے۔

تشریح: بقولہ ”لیس منا“ الخ جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ہمارے طور و طریقے پر نہیں۔ یا ہمارے کامل دین پر نہیں کیونکہ جب کوئی آدمی آداب زندگی کا خیال نہیں رکھتا تو وہ کامل مومن کیسے ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس باب کے اخیر میں نقل کیا ہے۔ تاہم امام سفیانؒ اس تفسیر کو پسند نہیں فرماتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اسے ظاہر پر چھوڑنا چاہئے تاکہ زیادہ موثر ثابت ہو یعنی عوام کے سامنے ایسی روایات میں تاویل کرنے سے ان کی نظر میں اہمیت ختم یا کم ہو جاتی ہے کہ وہ یہ سوچیں گے کہ ہم تو ویسے بھی کامل نہیں لہذا اس پر عمل نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا۔

ع رواہ ابو یعلیٰ واسنادہ حسن ان شاء اللہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۶ ج: ۳ وقال العلامة الهیثمی، رواہ ابو یعلیٰ وفیہ عبد السلام بن عجلان وثقہ ابو حاتم وابن حبان وقال یخطی ویخالف بقیہ رجال ثقات. مجمع الزوائد ص: ۲۰۸ ج: حدیث: ۱۳۵۱۹ کتاب البر والصلة.

پھر سفیان سے مراد ثوری ہے یا ابن عیینہ تو دونوں قول ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے اس لئے کامل مؤمن وہی ہوتا ہے جو اپنی پوری زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے مطابق بنائے۔ دوسری طرف اسلام میں اخلاق و آداب کا بھرپور خیال رکھنا اور باری تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا انسانی زندگی کا نقطہ عروج ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ بلکہ ہر مخلوق کے ساتھ اس کی شان اور حیثیت کے مطابق سلوک کیا جائے لہذا معاشرے میں جو لوگ کمزور ہوں تو وہ قابل رحم ہیں ان پر شفقت کی جائے۔ اور جو لوگ قابل قدر ہیں تو ان کی عزت افزائی کی جائے۔ پس جو شخص ایسا نہیں کرے گا وہ اس اصول کو پامال کرنے کی وجہ سے کامل مؤمن نہیں بن سکتا۔

لہذا کامل مؤمن بننے کے لئے ضروری ہے کہ بچوں پر رحم کیا جائے کہ وہ کمزور اور محتاج ہوتے ہیں جبکہ اپنے سے عمر میں یا فضل و علم میں بڑے کی قدر کی جائے۔

تیسری حدیث:- باب کی تیسری حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی ضابطہ پایا جاتا ہے۔ پس جو شخص نیکی و بھلائی کا حکم نہیں دیتا اور بُرائی سے نہیں روکتا وہ بھی اس وعید میں شامل ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس کی ذمہ داری ہے؟ تو صاحب ہدایہ نے جلد سوم کے آخری صفحہ پر ایک مسئلہ کے ضمن میں امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ ہاتھ سے روکنا حکومت کا کام ہے کہ اسے قدرت حاصل ہے۔ عام لوگ گو یا فقط زبانی تنقید کے مجاز ہیں ہاتھ سے تنفیذ ان کی ذمہ داری نہیں ”والامر بالمعروف بالید الی الامراء لِقدرتهم، وباللسان الی غیرهم“ مگر جس مسئلے کے ضمن میں یہ قول ذکر کیا گیا ہے یعنی ”ومن کسر لمسلم بربطاً“ الخ۔ اس میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں ”وقیل الفتوی فی الضمان علی قولہما“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف جس طرح زبانی طور سے لازمی اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح ہاتھ سے روکنا بھی سب کے لئے ہے اور یہی رائج ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بھی العرف الشذی میں فرماتے ہیں ”ولا یختص الامر والنہی بالامام بل لیکل واحد من المسلمین“ الخ۔ البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرق کیا ہے کہ اگر ایک آدمی گناہ کرتا ہوا ملے تو اسے روکنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اسے ڈانٹے اور مار بگائے مگر گناہ سے فراغت کے بعد تعزیر دینے کا حق صرف حکومت کی ذمہ داری ہے۔

باب ماجاء فی رحمة الناس

”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لم يرحم الناس لا يرحمه الله“۔

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا۔

تشریح:- جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان کے اعلیٰ مقاصد میں سے سب سے اعلیٰ، اخلاق ربانی سے مطلق ہونا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات میں سے ایک رحم بھی ہے اس لئے جو شخص اس وصف سے محروم ہو گا وہ مکافات عمل کی بنیاد پر اللہ کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا، جبکہ ترس کھانے والا شخص اللہ کے رحم و کرم کے زیر سایہ رہتا ہے۔ پھر طبرانی کی روایت میں ہے ”من لا یرحم من فی الارض لا یرحمہ من فی السماء“^۱ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حکم اور معاملہ صرف انسانوں کے لئے مختص نہیں بلکہ ہر تر جگر والے کے ساتھ ہونا چاہئے، گویا ان اشیاء کو سرکاری مال سمجھ کر ان کی حفاظت کو اپنا فرض بنانا چاہئے۔ چنانچہ ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے دوزخ میں چلی گئی جس نے اسے باندھ لیا تھا نہ تو اسے کھلاتی پلاتی تھی اور نہ ہی اسے کھول کر آزاد چھوڑتی تاکہ وہ خود کھائے۔^۲ جبکہ ایک بدکردار عورت پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے جنتی بن گئی۔ یہ دونوں روایتیں بخاری شریف میں ہیں۔^۳

پھر ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ رحم میں سے یہ بھی ہے کہ اگر آپ پر کسی کا حق ہے تو اسے ادا کریں اور آپ کا حق دوسروں پر ہو تو اسے معاف (یا کم) کر دیں۔ پھر محشی نے رحمت کی نفی کامل کے ساتھ مقید کی ہے جو خاص قسم ہے۔

ہمارے یہاں پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں آج صورت حال یہ ہے کہ لوگ اپنے حقوق کی وصولی کے لئے تو لڑنا جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں مگر دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھا جاتا یہ تاثر نہ صرف

باب ماجاء فی رحمة الناس

۱۔ طبرانی کبیر حدیث: ۲۵۰۲ مجمع الزوائد ص: ۲۲۲ ج: کتاب البر والصلة ولفظه ارحم من فی الارض یرحمک

من فی السماء، ایضاً رواہ الطبرانی بلفظہ باسناد جید بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۱۳۰ ج: ۳۔

۲۔ رواہ البخاری ص: ۳۱۸ ج: ۱ ”باب فی فضل سفی الماء“ کتاب المساقاة۔

۳۔ صحیح بخاری ص: ۴۹۵ ج: ۱ کتاب الاتیاء، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۱۷۷ ج: ۳۔

یہ کہ غلط ہے بلکہ حدیث باب کے بموجب خدائے تعالیٰ کی رحمت سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر آپ اس کے اثرات دیکھنا چاہتے ہیں تو حالات و واقعات کے تسلسل میں غور کریں۔

دوسری حدیث:- شعبہ کہہ رہے ہیں کہ منصور نے یہ حدیث مجھے خط کی صورت میں بھیج دی تھی پھر جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے زبانی بھی پڑھادی ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رحمت بد بخت انسان ہی سے سلب کی جاتی ہے۔^۴

لغات:- قولہ ”لاتنزع“ بصیغہ مجہول نزاع کے معنی اُتارنے، سلب کرنے اور نکالنے کے ہیں۔ چونکہ قلب کی نرمی عند اللہ مطلوب ہے بلکہ قلب کی تخلیق اور جبلت ہی نرمی کے ساتھ ہوئی ہے مگر جو شخص اسے بروئے کار نہیں لاتا تو وہ قلب قاسی اور سخت ہو جاتا ہے اور قسوت قلب بد بختی کی علامت ہے، قساوت قلبی کے اسباب میں سے اہم سبب معاصی میں انہماک ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بد بختی کی بنا پر ہوتی ہے، قساوت قلبی، اس کے اسباب اور علاج کی تفصیل مطلوب ہو تو راقم کی کتاب (نقش قدم، فصل نمبر: ۱۴) میں ملاحظہ ہو۔

تیسری حدیث:- رحم کرنے والوں پر رحم فرماتے ہیں تم زمین والوں پر رحم کرو سو آسمان والے تم پر رحم کریں گے۔

لغات:- رحم، رحمٰن کی طرف سے ابھی ہوئی شاخ (کی مانند) ہے جو شخص اسے جوڑے گا اللہ بھی اسے جوڑے گا اور جو شخص اسے توڑے گا اللہ بھی اسے توڑے گا۔^۵ قولہ ”ارحموا من فی الارض“ مراد اگرچہ عالم سفلی اور زمینی سب جاندار ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تاہم ذوی العقول کو تغلیب دے کر لفظ ”من“ لایا گیا۔ قولہ ”من فی السماء“ مراد اللہ تعالیٰ ہے اور آسمان کی طرف نسبت تعظیماً ہے نہ کہ بطور ظرف و مکان۔ یا مراد فرشتے ہیں کیونکہ جب اللہ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو اعلان ہوتا ہے کہ فلاں شخص سے میں محبت کرتا ہوں فرشتوں تم بھی اس سے محبت کرو پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ اعلان فرماتے ہیں حتیٰ کہ سب سے نچلے آسمان والے فرشتے دنیا والوں میں یہ اعلان کرتے ہیں اس کی مزید تفصیل اور بہترین تحقیق کے لئے حجۃ اللہ البالغہ لشاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا مطالعہ مفید ہے۔ قولہ ”شجنہ“ شین کی تینوں حرکات یعنی زبر، زیر اور پیش جائز ہیں مگر کسرہ

۴ ایضاً أخرجه ابو داؤد كتاب الادب باب: ۵۸ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۱۴۲ ج: ۳ قال، رواہ ابو داؤد واللفظ لہ

والترمذی وابن حبان فی صحیحہ وقال الترمذی حدیث حسن وفي بعض النسخ حسن صحيح.

۵ أخرجه ابو داؤد فی الادب باب: ۵۸ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۱۴۰ ج: ۳.

اولیٰ ہے جیم ساکن ہے گھنی ٹہنی، ابھی ہوئی شاخ اور گھنے درخت کو کہتے ہیں۔ بعض نے ابھی ہوئی جڑوں پر بھی اطلاق کیا ہے اس میں اقارب کے میل ملاپ کی طرف اشارہ ہے۔ قولہ ”من الرحمن“ یعنی اللہ کی طرف سے اس میں شفقت و دیوت کی گئی ہے جس کی بناء پر ذوی الارحام ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ دیکھئے ماں کس طرح اپنے بچے سے پیار کرتی ہے یہ اسی محبت مودعہ کا اثر تو ہے، اس کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے فلا نعيدہ۔

باب ماجاء فی النصیحة

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الدین النصیحة ثلاث، مرار قالوا: یا رسول اللہ لمن؟ قال: للہ ولکتابہ ولأئمة المسلمین وعامتہم“۔^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ خیر خواہی کرنا دین کا خلاصہ ہے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول کس کی؟ فرمایا اللہ کی، اس کی کتاب کی، ائمہ مسلمین کی اور سب مسلمانوں کی، یہ روایت مسلم شریف میں تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں ولکتابہ کے بعد در رسولہ کا بھی ذکر ہے۔^۲

لغات:۔ قولہ ”الدین“ سید شریف التعریفات میں لکھتے ہیں کہ دین اور ملت دونوں متحد بالذات اور مختلف بالاعتبار ہیں کہ شریعت کو جب اس حیثیت سے ملحوظ کیا جائے کہ اس کی اطاعت ہوتی ہے تو وہ دین ہے اور اس حیثیت سے کہ اسے لکھا اور جمع کیا جاتا ہے ملت کہلاتی ہے۔ خیالی نے بھی یہی بات کی ہے گویا کہ ملت الملاء سے ہے، جبکہ اس حیثیت سے کہ اس سے رجوع ہوتا ہے مذہب کہلاتا ہے وقیل ”الفرق بین الدین والملة والمذہب ان الدین منسوب الی اللہ تعالیٰ والملة منسوبة الی الرسول والمذہب منسوب الی

باب ماجاء فی النصیحة

۱۔ رواہ مسلم ص: ۵۴ ج: ۱ ”باب بیان ان الدین نصیحة“ کتاب الايمان وابوداؤد ص: ۳۲۸ ج: ۲ ”باب فی النصیحة“ کتاب الادب، ایضاً رواہ النسائی فی البیعة باب النصیحة للامام، ورواہ البزار عن ابن عمر ورجاله رجال الصحیح، بحوالہ سنن دارمی ص: ۴۰۲ ج: ۲ حدیث: ۲۷۵۴۔

۲۔ صحیح مسلم ص: ۵۴ ج: ۱ کتاب الايمان. حفیظ الرحمن عفی عنہ ندوة العلم کراچی

قولہ ”النصبیحة“ نصیح الشی نصحاً کسی چیز کا خالص ہونا جو غیر کی ملاوٹ و آمیزش سے خالی ہے گویا یہ غش اور کھوٹ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کا اردو ترجمہ خیر خواہی سے کرنا گویا لازم المعنی ہے کیونکہ جب دل ہر قسم کے حسد اور دیگر امراض سے خالی ہوگا اور کسی کے ساتھ برتاؤ اور سلوک جعل سازی و خود غرضی سے خالی ہوگا تو وہ دل اور سلوک خالص ہوگا جس کو اردو میں خیر خواہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامع کلمہ و جملہ میں دین کا مفہوم سمجھا دیا کہ بندہ اپنے اور خدا کے مابین کوئی کھوٹے کا معاملہ نہ رکھے۔ اسی طرح اس کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ائمہ اور سب اہل ایمان کے ساتھ اپنا معاملہ باطن و ظاہر میں صاف رکھنا ہی دین کا لب لباب ہے۔

پس اللہ کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات و صفات کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھے، اس کی عبادت میں نیت خالص رکھے اور اس کے اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب کرے۔ کتاب اللہ کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تصدیق کرے، اس پر عمل کرے، اس کی تلاوت اور نشر و اشاعت میں پوری مستعدی کا اظہار کرے، اس کے متعلق غلط تاویلات، تحریفات اور اقوال منبتہ کی مدلل نفی کرے۔ اللہ کے رسول کی نصیحت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نبوت پر ایمان لائے، ان کی تعظیم و توقیر کرے، ان کے لائے ہوئے دین کو من و عن مانا جائے، اس کے آگے سر تسلیم خم کرے، ان کے لائے ہوئے دین کی مدد کرے اور دشمنان دین کا مقدور بھر مقابلہ کرے اور مع ہذا سے پھیلانے کی کوشش کرے۔ ائمۃ المسلمین کی نصیحت یہ ہے کہ بلا وجہ ان کی مخالفت نہ کی جائے اگر ان کو جائز طریقے سے نصرت کی ضرورت ہو تو خود کو پیش کرے اور اگر وہ ظلم کریں تو اس پر صبر کر کے لوگوں کو ان کی مخالفت پر نہ اُکسائے، افسوس ہے آج کل مسلمانوں کی حالت زار کو الفاظ میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر ایک طرف حکمرانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ راتوں رات اپنے ہم وطنوں کے ایمان کا سودا کر لیں گے جبکہ دوسری طرف جو لوگ ان کے خلاف سڑکوں پر مظاہرے کرتے رہتے ہیں ان کا ساتھ دینا ایک طرف اس حدیث کے ظاہر کے خلاف ہے اور دوسری جانب ایسے مظاہروں کے قائدین اکثر یہ کام کسی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کم ہی کرتے ہیں، اس لئے صحیح و سقیم کے درمیان فرق ناممکن ہو گیا ہے یہ صورت حال وہی اندھا فتنہ ہے جس کے بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اور فیصلہ مشکل ہے۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی صحیح راہ نمائی کی جائے ان کو اپنے اور حتی الامکان دوسروں

کے شر سے بچانے کی کوشش کی جائے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے، مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش قدم کامل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (نقش قدم فصل نمبر: ۱۰ ص: ۱۹۱)

دوسری حدیث:- حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس پر کہ نماز قائم کروں گا، زکوٰۃ دوں گا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا۔ چونکہ نماز عبادات بدنی کی اصل و بنیاد ہے اور زکوٰۃ مالی عبادات کی، اس لئے ان دو کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ اس بیعت پر قائم رہے جس کی آسان دلیل یہ ہے کہ صاحب تحفہ نے امام طبرائی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے غلام سے گھوڑا خریدنے کے لئے کہا تو اس نے تین سو کا خرید کر ان کی خدمت میں مالک یعنی بائع سمیت پیش کیا تا کہ پیسے وصول کر لے حضرت جریرؓ نے گھوڑا دیکھ کر فرمایا یہ تین سو سے زیادہ کا ہے بائع نے کہا چار سو میں لیں گے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ کا ہے اس نے کہا پانچ سو؟ حضرت جریرؓ نے فرمایا نہیں اس سے بھی زیادہ کا ہے غرض اس کو آٹھ سو کا خرید اور فرمایا ”انسی بایعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) علی النصح لكل مسلم“۔

باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:- المسلم اخو المسلم لا یخونہ ولا ینکذبہ ولا یخذلہ، کل المسلم علی المسلم حرام عرضہ ومالہ ودمہ التقویٰ ہنأنا بحسب امرء من الشران یحتقر آخاہ المسلم“۔ (حسن غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے نہ تو وہ اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس کو رسوا کرتا ہے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت لینا اور اس کا مال و خون حرام ہے تقویٰ یہاں (دل میں) ہوتا ہے آدمی کے بُرا ہونے کے لئے اتنی بات بھی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی توہین کرے۔

لغات:- بقولہ ”لا یخونہ“ خیانت سے ہے۔ بقولہ ”ولا یخذلہ“ خذلان سے ہے جُدا ہونے اور بے یار و مددگار چھوڑنے کو کہتے ہیں چونکہ مدد نہ کرنے سے وہ عموماً رسوا ہو جاتا ہے اس لئے ترجمہ لازم بالمعنی سے

کیا گیا۔ قولہ ”عرضہ“ بکسر العین وسکون الراء اس کے کئی معانی ہیں یہاں بمعنی عزت کے ہے۔ قولہ ”التقویٰ ہھنا“ مسلم شریف^۱ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے مبارک کی طرف اشارہ کیا یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ قولہ ”بحسب امرئی“ بازائدہ ہے یہ مبتدا ہے اور ”ان یحتقر“ الخ اس کی خبر ہے۔

تشریح:- اس حدیث پاک میں مسلمانوں کی باہمی معاشرت کا اصول بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں بھائیوں کی طرح رہنا چاہئے۔ لہذا ”لا یخونہ“ الخ خبر بمعنی انشاء ہے یعنی نفی بمعنی نفی کہ ان کو ایک دوسرے سے خیانت نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی دوسرے سے جھوٹ بولنا چاہئے اور اگر کسی مسلمان بھائی کو اس کی مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد کرنی چاہئے اسے بغیر مدد کے بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہئے، اس کی عزت اور مال و جان کو قابل حرمت بلکہ واجب الاحترام سمجھیں اس لئے کہ اس کی آبروریزی حرام ہے اور جان و مال کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اور چونکہ تقویٰ تو دل میں ہوتا ہے لہذا کسی کو ظاہری عمل کی وجہ سے حقیر و معمولی نہ سمجھا جائے کیا معلوم شاید اُس کا باطن اس کے باطن سے اچھا ہو یا اُس کا خاتمہ اس سے اچھا ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں تقویٰ ہو وہ ان اصولوں پر چلے گا وہ اپنے مسلمان بھائی سے خیانت والا معاملہ نہیں کرے گا خواہ اس کی ذات سے متعلق ہو یا اس کے مال اور اہل و عیال وغیرہ سے، خاص کر رشتہ دار اور پڑوسی سے، پھر خیانت عام ہے باتوں کی خیانت بھی مال میں ملاوٹ کی طرح اور حق تلفی کی مانند ہے، اسی طرح متقی آدمی مسلمان بھائی کی ہر طرح ممکن جائز مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے وہ اپنے اسلامی بھائی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا ہے اور نہ ہی اس کی تحقیر و توہین کرتا ہے اور جو شخص ایسا کرے گا تو یہ اس کی بُرائی کے لئے کافی ہے یعنی اگر وہ اس کے علاوہ دوسری بُرائیاں نہ بھی کرے تو مذکورہ بُرائی اس کی ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ بظاہر بہت نیک ہو اور اعمال صالحہ پر کار بند ہو مگر مذکورہ بالا خامیوں کی وجہ سے وہ آدمی بُرا ہی ہے وہ شریعت کی نظر میں اچھا نہیں ہے۔

اس حدیث شریف کا مضمون انتہائی اہم و دل پر مشتمل ہے اس کے اپنانے سے آدمی کامرانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جبکہ اس کو نظر انداز کرنے سے آدمی خسران کی وادی میں ہلاکت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ آج ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں کہ نفلی عبادات کے تو سخت پابند ہوتے ہیں اور اپنے طور سے تقویٰ کا ایک معیار

مقرر کر کے اس پر سختی سے عمل کرتے رہتے ہیں لیکن وہ امام المتقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اصول ضروری نہیں سمجھتے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کے معیار کے طور پر بیان فرمایا ہے ایسے خود ساختہ تقویٰ پر چلنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے وضع کردہ تقویٰ پر چلنے سے کچھ بھی اخروی کامیابی حاصل نہ ہوگی اگر آخرت کی کامیابی چاہئے تو امام المتقین صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ تقویٰ کو ہی اپنانا پڑے گا۔

دیکھئے امام ترمذی نے اس حدیث سے کس طرح بہترین عنوان اخذ کیا ہے ”شفقة المسلم علی المسلم“ آپ مسلمانوں پر شفقت کیجئے اللہ آپ پر شفقت فرمائیں گے۔

دوسری حدیث:- ”عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

المؤمن للمؤمن کالبیان یشد بعضہ ببعضاً“۔ (صحیح)

یعنی جس طرح عمارت کی پختگی کے لئے ایک دوسرے کا بہارا لازمی ہے کہ جب ایک بلاک کا کچھ حصہ ایک بلاک پر آجائے اور کچھ دوسرے پر اس طرح کی دیوار مضبوط ہوتی ہے بمقابلہ اس دیوار کے جس کے بلاک الگ الگ کھڑے کر دیئے گئے ہوں کیونکہ ایسی دیوار کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح ایک دیوار کو جب دوسری سے ملایا جاتا ہے تو دونوں مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہیں، ہو بہو اسی طرح حال مسلمانوں کا ہے اگر وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ دشمن کا فریب ان کو کمزور بنادے کیونکہ ان کی طاقت اتنی مستحکم ہوگی جو معمولی دار سے بلکہ طاقت ور دار سے بھی کمزور نہیں ہو سکے گی۔

تیسری حدیث:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بے شک تم میں سے ایک اپنے بھائی کے لئے آئینہ (کی مانند) ہے پس اگر اس میں کوئی عیب نظر آئے تو اسے ہٹا دے۔ یہ حدیث ضعیف ہے مگر مضمون اس کا صحیح ہے۔

لغات:- قولہ ”میرا“ بکنسرا لمیم وداہزہ آئینے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”آذی“ آذیہ سے بمعنی گند کے آتا ہے اور ایذا سے بمعنی تکلیف کے۔ اگر یہاں پہلا معنی لیا جائے تو پھر مطلب عیب ہے۔ قولہ ”فلیمطہ“ اطمات بمعنی ازالہ کے ہے یعنی اسے زائل کر دے۔

مختصر تشریح:- اس حدیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ چونکہ آدمی کو عموماً اپنے عیوب نظر نہیں آتے ہیں اس لئے آدمی اپنا علاج خود نہیں کر سکتا کیونکہ علاج تو تشخیص کے بعد ہی ہوتا ہے لہذا جس طرح آدمی کو اپنے چہرے کے داغ دھبے وغیرہ کسی آئینہ میں ہی نظر آتے ہیں اس لئے ہر مسلمان دوسرے کے لئے آئینے کا کام

دے، لہذا دوسرا شخص اس کو آگاہ کرے کہ تیرے اندر یہ عیب ہے اور چونکہ آئینہ چہرے کا عیب پکار کر نہیں بتلاتا بلکہ صرف دکھاتا ہے لہذا کسی کو عیب بتلانا ہو تو آئینے کی طرح چپکے سے بتلا دے، پھر معیوب انسان اپنا عیب آئینے میں دیکھ کر آئینہ نہیں توڑتا بلکہ اپنی اصلاح کرتا ہے تو اسی طرح اس کو عیب بتانے والے کے پیچھے نہیں لگنا چاہئے بلکہ اپنی صفائی ستھرائی میں لگنا چاہئے۔

آج کل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو اس کا عیب بتایا جائے تو وہ دشمنی پر اتر آتا ہے اس لئے بتلانے میں کمال ہوشیاری سے کام لینا چاہئے خاص کر جبکہ یہ حدیث ضعیف بھی ہے، اس لئے بتلانے کو رو برو ضروری نہ سمجھا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف یہ تھا کہ اگر کسی میں عیب دیکھتے تو عام ارشاد فرماتے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں مثلاً جس سے وہ آدمی خود بخود سمجھ جاتا۔ پھر علماء نے نصیحت کے آداب میں سے یہ بھی لکھا ہے کہ داعظ جمیع متکلم کا صیغہ استعمال کرے مثلاً آج کل ہم لوگ بہت کمزور ہو گئے ہیں ہمارے اندر تقویٰ کا عالم یہ ہے کہ ایک آدمی راستہ میں بیٹھ کر پیشاب کرتا ہے اور ہم اس کو معیوب بھی نہیں سمجھتے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا مطلب اس حدیث کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی کو دوسرے کے اندر عیب نظر آجائے تو اس سے اپنی حالت کو ملاحظہ کرے کہ کہیں میرے اندر تو یہ خامی نہیں تو اگر اس کے اندر ہوگی اور دوسرے کے اندر اسے وہ خامی بُری محسوس ہوئی تھی تو وہ اپنے سے اس کا ازالہ کرے گا جیسے آئینہ میں اپنے عکس پر داغ دھبہ نظر آجائیں تو آدمی آئینہ نہیں دھوتا بلکہ اپنا منہ دھوتا ہے۔ یہ دونوں توجیہات محشی نے بیان کئے ہیں اور اول کو ظاہر قرار دیا ہے۔

باب ماجاء فی الستر علی المسلمین

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من نفس عن مسلم کربةً من کرب الدنیا نفس اللہ عنہ کربة من کرب یوم القیمة ومن یستر علی معسر فی الدنیا یستر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرة ومن ستر علی مسلم فی الدنیا ستر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرة واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا کے مصائب میں سے کوئی معمولی سی مصیبت بھی کسی مسلمان سے دور کر دے تو اللہ قیامت کے دن مصائب میں سے

بڑی مصیبت اس سے دور فرمائیں گے، اور جو شخص کسی تنگ دست کو دنیا میں سہولت دے تو اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کے لئے آسانی فرمائیں گے، اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے، اور اللہ بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

لغات:- قوله ”تَفَسَّسَ“ تنفیس سے بمعنی دور کرنے اور زائل کرنے کے ہیں۔ قوله ”مَكْرَبَةً“ بضم الکاف واسکان الراء جبکہ ”کرب“ بضم الکاف وفتح الراء ہے پہلا لفظ مفرد ہے اور دوسرا جمع کربۃ یہاں دوسرے استعمال ہوا ہے۔ اول میں تنوین تنکیر و تحقیر کے لئے ہے جبکہ دوم میں تعظیم کے لئے۔ علیٰ ہذا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی کوئی بھی مصیبت و پریشانی دور کرے یا چھوٹی سی مصیبت دور کرے تو اللہ قیامت کے دن اس کی بڑی مصیبت دور فرمائیں گے۔ کربۃ ہر پریشانی و رنج کو کہتے ہیں۔ قوله ”ستر“ پردہ ڈالنا یہاں مراد عیب چھپانے کے معنی میں ہے۔ بعض نے کپڑے دینے کا مطلب بھی لیا ہے۔

تشریح:- یہ حدیث ابواب الحدود میں بھی گذری ہے وہاں امام ترمذی نے اس طرح باب قائم فرمایا ہے ”باب ماجاء فی الستر علی المسلم“ یہاں اگرچہ ایک نسخہ کے مطابق جمع کا صیغہ ہے مگر ایک نسخہ ”مسلم“ بصیغہ مفرد بھی مروی ہے جمع کا نسخہ زیادہ رائج ہے تاکہ تکرار نہ آئے۔

چونکہ جزا مثل عمل ہوتی ہے اس لئے آسانی کے بدلے آسانی اور پردہ پوشی کے بدلے پردہ پوشی کی جزا ملے گی، تاہم انسان جو بھی عمل کرتا ہے اس کی جزا اس عمل کے عوض سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جس کی اقل مقدار دس گنا ہے اور اللہ جس کے انعام میں مزید جتنا اضافہ کرنا چاہے تو یہ اس شخص اور اللہ کے درمیان خصوصی معاملہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو شخص عادی مجرم نہ ہو بلکہ کسی عارض کی بنا پر اس سے قصور ہو جائے تو اس کی ایسی حرکت جس پر سزا مقرر ہو خواہ حد ہو یا تعزیر کو نظر انداز کرنا یعنی گواہی سے گریز کرنا مستحب ہے بشرطیکہ اس سے کسی بندے کا حق متعلق نہ ہو حقوق العباد کی صورت میں ایسی گواہی دینی چاہئے کہ حد بھی نہ لگے اور صاحب حق کو اس کا حق بھی مل جائے مثلاً چوری کئے ہوئے مال کے بارے میں ”سرق“ کا لفظ استعمال نہ کرے بلکہ ”أَخَذَ“ کا لفظ بولے، جبکہ پیشہ ور چور اور عادی مجرم کا حکم پردہ پوشی نہیں ہے، کیونکہ اس سے معاشرہ بگڑ جاتا ہے اس لئے ایسے پیشہ ور مجرم کے بارے میں ہیئت اصلاح معاشرہ اطلاع دینا ہی افضل ہے۔

یہ تو حقوق کے بارے میں ہے جہاں تک ذاتی عمل کا تعلق ہے تو اگر کسی میں عیب نظر آجائے خواہ اس کا تعلق فعل سے ہو یا اخلاق سے تو اس کا حکم سابقہ باب میں بیان ہوا ہے۔

قولہ ”واللہ فی عون العبد“ الخ اس سے معلوم ہوا کہ رفاہی کاموں پر جزا صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی ملتی ہے چنانچہ اس کا فائدہ نقد بھی ملتا ہے خصوصاً اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کا فائدہ تو بہت ہی نمایاں ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الذب عن المسلم

”عن ابی الدرداء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من ردَّ عن عرض اخیه ردَّ اللہ عن وجهہ الناریوم القيمة“۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا دفاع کرے اللہ قیامت کے روز اس کے چہرے سے جہنم کی آگ دور فرمائیں گے۔

لغات:- ”الذب“ زور سے ہٹانے اور دور کرنے کو کہتے ہیں یہ لفظ گویا ذباب سے ہے جس کے معنی مکھی کے ہے گویا مکھی ہٹانے کو کہتے ہیں گو کہ یہاں مطلق دفاع مراد ہے اور عموماً اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ قولہ ”عرض“ بکسرہ عین عزت و آبرو کو کہتے ہیں۔

تشریح:- چونکہ غیبت کرنے اور عیب جوئی کرنے والے شخص کی مثال مکھی کی طرح ہوتی ہے کہ جس طرح مکھی جسم کی اس جگہ پر بیٹھتی ہے جہاں زخم اور گندگی موجود ہو، صاف جگہ پر نہیں بیٹھتی اسی طرح غیبت کرنے والا شخص بھی دوسروں کے عیوب تلاش کر کے ان کو کریدتا رہتا ہے اور اس کی پیپ کو بدلتا رہتا ہے اس لئے جو شخص اس کا دفاع کرتا ہے وہ گویا اپنے بھائی کے زخموں سے کھیاں اڑاتا ہے اور اس کے زخموں کو پھیلنے اور بدبودار ہونے نہیں دیتا۔

چونکہ عیب جوئی سے آدمی کی آبرو متاثر ہو جاتی ہے اور انسان کے جسم میں سب سے زیادہ آبرو والی جگہ اس کا چہرہ ہوتا ہے، اس لئے اس دفاع کے بدلے میں اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن اس کے چہرے یعنی ذات کی، آگ سے حفاظت فرمائیں گے کہ اس نے اپنے بھائی کے چہرے کو محفوظ رکھا تھا، پھر یہ دفاع غائبانہ زیادہ افضل ہے نسبت موجودگی کے پھر یہ حکم بہتان اور غیبت سب کو شامل ہے۔ اگر غیبت کرنے والا کوئی

چونکہ انسان کے مزاج میں عام جانداروں کی طرح غضب و غصہ ودیعت کیا گیا ہے اس لئے طبعی طور پر ہر انسان کو ناگوار شے پر غصہ آتا ہے اور پھر کچھ دیر تک باقی رہتا ہے لیکن آدمی کو چاہئے کہ غصہ جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے الایہ کہ کسی جگہ غصہ مطلوب و ممدوح ہو جیسے جہاد میں دشمنوں کے خلاف لڑنا مطلوب شرعی ہے لیکن جہاں غصہ مذموم ہو وہاں غصے کو طول دینا حیوانی گناہ کے دائرے سے تجاوز کر کے شیطانی گناہ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

علی ہذا اگر کسی کو اپنے بھائی پر غصہ آجائے تو شریعت نے اس کی رعایت کے طور پر زیادہ سے زیادہ تین دن تک اس کو قطع کلامی کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ کی ہرگز اجازت نہیں، بلکہ زیادہ کی صورت میں ایسے لوگوں کے اعمال بھی قبول نہیں ہوتے جب تک کہ وہ تعلقات کو بحال نہ کریں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مذکورہ حکم ذاتی مفادات اور دنیوی تعلقات کے بارے میں ہے اگر کوئی شخص دین کی خاطر یا کسی دینی مصلحت کے پیش نظر کسی سے قطع کلامی کرتا ہے تو وہ صورتیں مذکورہ وعیدات سے مستثنیٰ ہوں گی، مثلاً شوہر اپنی بیوی یا باپ اپنے بیٹے سے تادیبات چیت بند کرتے ہیں تو وہ ممنوع نہیں۔ اس طرح روایات میں کسی قسم کا تعارض نہیں رہتا کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کا اپنے صاحبزادے سے کلام بند کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہینے تک ازواج مطہرات سے قطع کلامی کرنا، غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کرامؓ سے پچاس دنوں تک متارکت اور حضرت عائشہؓ کی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے قطع کلامی یہ تمام صورتیں تادیب اور غیرت ایمانی پر محمول ہیں۔ علی ہذا آج اگر ایک آدمی ایسا ہو جو علماء کے متعلق یا دین کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہو اور اسے روکنا مشکل ہو تو اس سے قطع کلامی جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو اس کے ساتھ مل بیٹھنے میں ایمان بھی خطرے سے دو چار ہو جاتا ہے، ہاں ہمدردی اور شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش جاری رکھی جائے اور کسی طرح اسے راہ راست لے آئے۔

پھر ان دو آدمیوں میں سے جو بھی اس جوہد کو توڑ کر بات چیت میں پہل کرے گا اور غفور و درگزر کرے گا وہ بلاشبہ اچھا ہے جس کی اقل مقدار ابتداء بالسلام ہے۔ حدیث باب کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سلام کرے گا، وہ اس وعید سے محفوظ رہے گا، اور جب دوسرا سلام کا جواب دے گا تو وہ بھی گناہ و جہان سے بچ جائے گا گو کہ اس کا درجہ پہلے والے شخص سے کمتر ہو گا یعنی اسی بات چیت کے بارے میں۔ اسی طرح جو شخص ان میں سے منہ موڑے گا اور سلام بھی نہیں کرتا یا جواب بھی نہیں دیتا تو وہ گویا شیطان کی مٹھی میں ہے اس کا باطن قابل

رحم ہے اس کو اپنی اصلاح کی ضرورت معلوم ہونی چاہئے۔

باب ماجاء فی مواساة الأخ

”عن انس قال لما قدم عبدالرحمن بن عوف المدينة اخي رسول الله صلى الله عليه وسلم بينه وبين سعد بن الربيع، فقال له: قُلْ أَقَا سَمَكٍ مَالِي نَصْفَيْنِ وَلِي امْرَأَتَانِ فَاُطْلِقْ إِحْدَاهُمَا فَإِذَا انْقَضَتْ عِدَّتُهُمَا تَزَوَّجْهُمَا، فَقَالَ: بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ دُلُونِي عَلَى السُّوقِ فَدَلَّوْهُ عَلَى السُّوقِ فَمَارَجَعَ يَوْمَئِذٍ الْاَوْمَعُ شَيْئًا مِنْ أَقْطِ وَسَمْنٍ قَدْ اسْتَفْضَلَهُ، فَفَرَّاهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذَلِكَ وَعَلَيْهِ وَضُرُ صُفْرَةٍ فَقَالَ: مَهْيَمٌ؟ فَقَالَ تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ: فَمَا أَصَدَّقْتَهَا؟ قَالَ ”نَوَاة“ قَالَ حميد: اَوْ قَالَ وَزَنَ نَوَاةً مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ: اَوَّلِمَ وَلَوْ بِشَاةٍ“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ جب عبدالرحمن بن عوف ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی بندی فرمائی تو سعد نے فرمایا: آؤ میں اپنے مال کو آپ کے ساتھ آدھا آدھا تقسیم کر لیتا ہوں، اور یہ کہ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے (آپ کی پسندیدہ) ایک کو طلاق دیدوں گا پس جب اس کی عدت گزر جائے گی آپ اس سے شادی کر لیں گے، حضرت عبدالرحمن بن عوف نے فرمایا کہ اللہ آپ کے بال بچوں اور مال میں برکت دے مجھے بازار کا پتہ بتلا دیں چنانچہ انہوں نے بازار کا راستہ بتلا دیا پس نہیں لوئے وہ اس دن مگر در ان حالیکہ ان کے پاس کچھ پیڑ اور گھی تھا جو کما کر لائے تھے، چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا کہ ان پر زردی کا اثر تھا (یعنی بیوی کے کپڑوں سے لگے ہوئے رنگ کا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہر میں کیا دیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ایک گھٹلی کے برابر سونا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعوتِ ولیمہ کرو گو ایک ہی بکری سے ہو۔

لغات:- قولہ ”مواساة“ اسی پواسی مواساة ہمدردی اور غم خواری کو کہتے ہیں چاہے مال سے ہو یا بغیر مال کے۔ قولہ ”اخی“ یہ بھی مواساة کی طرح ہے یعنی مواخاة سے بمعنی بھائی چار اور بھائی بندی و دوستی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ہلم“ اس میں ہاء تنبیہ کے لئے ہے اور اصل لفظ اَلَمْ ہے اَلَمْ اشیٰ نزدیک ہوئے کو کہتے ہیں پھر ہمزہ کو ساقط کر کے ہائے تنبیہ کو شامل کر کے ہلم بنا بمعنی تعال ”آؤ“۔ قولہ ”وَضُرُ صُفْرَةٍ“ فتح الواو والضاد

بمعنی اثر کے ہے۔ جبکہ صفرۃ بضم الصاد و سکون الفاء وہ زردی جو کس خوشبو کی ہو۔ ایک روایت میں ”اثر صفرۃ“ کے الفاظ ہیں۔

قولہ ”مہیم؟“ ایک روایت میں ہے ”ماہذا“ جیسا کہ ترمذی باب ماجاء فی الولیمة کی روایت میں گزرا ہے۔ لہذا مہیم بمعنی استفہام کے ہے اس میں میم ثانی کو مجزوم پڑھا جائے گا۔ اگر رنگ کا اثر زیادہ تھا تو پھر یہ استفہام انکاری ہے کیونکہ مردوں کے لئے رنگین خوشبو لگانا ممنوع ہے، پھر جواب کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ میں نے نہیں لگائی ہے بلکہ بیوی کے کپڑوں پر سے لگی ہے۔ اور اگر رنگ قلیل تھا تو پھر مہیم نفس استفہام کے لئے ہے جو بمعنی استعلام ہوگا۔ حاشیہ میں ہے کہ یہ یمانی کلمہ ہے بمعنی ما امرک و ما شاک؟۔

تشریح:- اس حدیث کی پوری تشریح (تشریحات ترمذی ج ۴ ص ۴۳۹) پر گزری ہے دیکھئے باب ماجاء فی الولیمة، الباب النکاح۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے فراغت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار صحابہؓ کے درمیان مواخاۃ فرمائی جن کی تعداد نو تھی۔ آدھے مہاجر اور آدھے انصار تھے۔ یہ صحابہ ایک دوسرے سے میراث لینے کے بھی مستحق ہوتے تھے لیہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ”وَأُولَٰئِیَ الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ“ پھر یہ حکم منسوخ ہوا گویا جنگ بدر تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس مواخاۃ کے مطابق حضرت سعد بن الربیع جو غزوہ احد میں شہید ہوئے ہیں نے اپنے اسلامی بھائی حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو مذکورہ پیش کش کی کہ مدینہ میں میرا مال سب سے زیادہ ہے آؤ میرا مال آدھا تم لے لو اور میری بیویوں میں جو تمہیں پسند آئے میں اسے آزاد کر لوں تم اسے اپنے نکاح میں رکھ لو، مگر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ چونکہ تجارت کا ذوق رکھنے والے صحابی تھے دوسری طرف حضرت سعدؓ کی یہ پیشکش کوئی معمولی آفر بھی نہ تھی بلکہ بہت بڑی قربانی تھی جسے انہوں نے شکر یہ کے ساتھ واپس کرتے ہوئے تجارت کی لائن گزربسر کے لئے اختیار فرمائی، جس میں اللہ نے بہت برکت دی یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ امیر صحابہ میں شمار ہونے لگے گویا خلوص نیت کے ساتھ دوسروں کے حق میں وعائٹس ہو کر داعی کے حق میں بھی قبول ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی مواصاة الاخ

۱۔ راجع للتفصیل البدایة والنهاية لابن كثير الممشقى ص: ۲۳۷ تا ۲۴۰ ج: ۳، ۴ ”فصل فی مواخاة النبی ﷺ بین المهاجرین والانصار“ دار الکتب العلمیة بیروت۔ ۲۔ سورة الاحزاب آیت: ۶۔ ۳۔ کذا فی صحیح البخاری ص: ۵۳۳ ج: ۱ کتاب المناقب۔ حفیظ الرحمن الحنفی

باب کی حدیث سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان گہرے مراسم خوش گوار تعلقات اور انتہائی ایثار و ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے جو اسلامی معاشرہ کا مثالی نمونہ ہے۔ یہ حدیث ان کے باہمی مضبوط تعلقات اور مستحکم معاشرتی مواساتہ کی ایک جھلک ہے۔ ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات پر مرسوم و مرقوم ہیں جن کی مثالیں تاریخ میں اور کہیں بھی نہیں ملتیں۔ یہ اسلامی رشتے کا اثر تھا۔

آج کل مسلمان عموماً ایک دوسرے سے نالاں رہتے ہیں شاید کسی کے ذہن میں یہ آئے کہ یہ اسلام کی وجہ سے ہے کلاً و حاشا ایسا ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اولین مسلمان بھی ایک دوسرے سے متنفر ہوتے۔ مگر جب آج کے مسلمانوں نے صدق دل سے اسلام کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی بلکہ صرف ظاہری لیبل مسلمان ہونے کا اپنے اوپر لگا لیا تو یہ تاثر ابھرنے اور جنم لینے لگا کہ گویا مسلمان نفرتیں پھیلاتے ہیں، بالفاظ دیگر جس طرح بادلوں سے بارش برتی ہے اور کسی کڑوے درخت میں اس کا پانی جمع ہو جاتا ہے تو وہ پانی جب ٹپکنے لگتا ہے تو کڑوا معلوم ہوتا ہے یہ آسمان سے کڑوا نہیں آیا تھا بلکہ درخت کی تلخی نے اسے تلخ اور کڑوا بنایا۔ اسی طرح خبیث انفس آدمی میں جب اسلام یا علم سرایت کرتا ہے تو اس کے اثرات بُرے محسوس ہوتے ہیں۔ حدیث کی باقی شرح خصوصاً دعوتِ ولیمہ اور باقی دعوتوں کی اقسام و احکام (تشریحات ترمذی ج ۴ ص ۴۴۰ تا ۴۴۶) پر ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فی الغیبة

”عن ابی ہریرۃ قال: قیل یرسل اللہ مال الغیبة؟ قال: ذکرک احاک بما یکرہ، قال: آرایت ان کان فیہ ما قول؟ قال: ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بہتہ“۔^۱ ہذا حدیث حسن صحیح۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول غیبت کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا اپنے کسی بھائی کا ایسا تذکرہ جو اسے

باب ماجاء فی الغیبة

۱۔ الحدیث اخرجه مسلم و ابو داؤد والنسائی، وقد روی هذا الحديث من طرق كثيرة وعن جماعة من الصحابة.

ناپسند ہو اس شخص نے کہا بتائیں اگر وہ بات جو میں کہہ رہا ہوں اس میں موجود ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ بات اس میں پائی جاتی ہو جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں جو تم کہہ رہے ہو تو پھر تو تم نے اس پر تہمت لگائی۔

لغات :- قولہ ”غیبت“ امام قرطبیؒ نے غیبت کی تعریف یوں کی ہے ”ہی ذکر العیب بظہر الغیب“ یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے عیب بیان کرنا غیبت ہے۔ اور اگر کسی کا عیب اس کے روبرو بیان کرے تو اسے ”لَمْنَز“ کہتے ہیں چونکہ دوسرے پر طعنہ زنی درحقیقت اپنا ہی عیب بیان کرنا ہے اس لئے اللہ نے فرمایا ”وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ“^۱ یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ قولہ ”ارایت“ ای اخبرنی مجھے بتائیں۔ قولہ ”بَہْتٌ“ واحد مذکر مخاطب کا صیغہ، بہتان سے ہے ایک ایسی بات کسی طرف منسوب کرنا جس سے وہ بری اور پاک ہو بہتان کہلاتا ہے۔ بھٹا کے معنی چونک پڑنے کے ہیں کیونکہ مبہوت جب یہ خبر سنتا ہے تو ہکا بکارہ جاتا ہے۔

تشریح :- امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ”لا خلاف ان الغيبة من الكبائر“ یعنی غیبت کے کبیرہ گناہ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور قرآن میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے ”وَلَا يَغْتَابُ بَعْضُكُم بَعْضًا“^۲ کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ غیبت کرنے والے کی مثال کبھی کی مانند ہوتی ہے جس طرح کبھی جسم کی گندی جگہ پر بیٹھتی ہے اسی طرح غیبت کرنے والا مغتاب کے عیوب اُجاگر کرتا ہے جس سے معاشرت بگڑ جاتی ہے، کیونکہ ظنون و شکوک بلکہ غلط فہمیاں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں اس لئے شریعت نے اس پر سخت پابندی لگادی اور چونکہ یہ ایک شیطانی گناہ ہے اس لئے دوسری حدیث میں اسے زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ قرار دیا ہے اور اس لئے بھی کہ زنا سے تو آدمی توبہ تائب ہو کر بری الذمہ ہو سکتا ہے لیکن غیبت کرنے والا کہاں مغتاب کے پاس جانا گوارا کرتا ہے کہ میں نے تیری غیبت کی ہے مجھے معاف کر دو۔

تاہم اگر غیبت سرزد ہو جائے اور مغتاب کو معلوم نہ ہوا ہو تو اس کا ممکنہ کفارہ یہ ہے کہ مغتاب کے لئے مغفرت کی دعا کی جائے چنانچہ بیہقیؒ نے میں ہے ”ان من كفارة الغيبة ان يستغفر لمن اغتابه تقول اللهم اغفر لنا ولہ“ پھر یہ دعا جہر اُڑھنی چاہئے تاکہ سامعین کے سامنے اپنی ضمنی تکذیب بھی ہو جائے اور ان کو بھی احساس ہو جائے۔ البتہ اگر غیبت کسی دینی مصلحت پر مبنی ہو تو پھر جائز ہوگی جیسے راویوں پر جرح۔ اور آج کل کے

۱۔ سورة الحجرات آیت: ۱۱۔ ۲۔ سورة الحجرات آیت: ۱۲۔

۳۔ رواہ البيهقي في الدعوات الكبير وقال في هذا الاسناد ضعف مشكوة المصابيح ص: ۳۱۵ قديمي كتب خانہ۔

روشن خیال قسم کے لوگوں سے عوام کو آگاہ رکھنے کے لئے ان کے ناموں کی تصریح کرنا یا کسی رشتہ و مشورہ میں کسی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی کو موضوع بحث بنانا وغیرہ بشرطیکہ حد ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔ پھر غیبت ہر ایک کی حرام ہے خواہ کوئی بچہ یا غلام کیوں نہ ہو۔ اسی طرح غیبت کسی بھی ایسے طریقے سے حرام ہے جس سے کسی کا عیب ظاہر ہو جاتا ہو خواہ قول و عمل سے ہو یا نقل اتارنے اور اشارہ کرنے سے ہو۔ (مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش قدم کامل میں دیکھی جاسکتی ہے)

باب ماجاء فی الحسد

”عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقاطعوا ولا تدابروا ولا تباعدوا ولا تحاسدوا وكونوا عباد الله اخوانا ولا يحل للمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث“۔ (حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ مت موڑو، آپس میں بغض نہ رکھو، اور باہمی حسد نہ کرو بلکہ اللہ کے بندے اور باہم بھائی بن کر رہو اور جائز نہیں کسی مسلمان کے لئے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑ دے (یعنی بات چیت بند کر دے)۔

لغات:- قوله ”لا تقاطعوا الخ“ چاروں الفاظ باب مفاعله سے نہی کے صیغے ہیں جو جانبین سے فعل میں شراکت کو مقتضی ہے پس تقاطع، قطع سے ہے وصل کے مقابل آتا ہے ”تدابیر“ دُبر سے ہے بمعنی پیٹھ پھیرنے کے کنایہ ہے اعراض سے۔ ”تباعد“ بغض سے ہے نفرت و دشمنی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ”تحاسد“ حسد سے ہے کسی کی نعمت کے زوال اور اپنے لئے حصول کی تمنا کو کہتے ہیں۔

تشریح:- الحمد للہ راقم نے نقش قدم فصل نمبر ۱۰ میں ”حسد“ پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، حسد کا بنیادی سبب تو کینہ اور بغض ہے تاہم علاوہ ازیں کچھ اسباب اور بھی حسد کے بیان ہوئے ہیں جن کی تعداد سات ہیں (۱) عداوت کہ جب دشمن سے انتقام لینا مشکل ہو جائے تو حسد جنم لیتا ہے (۲) تعزز یعنی اپنے ہم پلہ آدمی کی عزت کا ناگوار ہونا (۳) تکبر کہ جب حاسد کی نظر ایسے شخص کی نعمت پر پڑ جائے جو اس کی نظر میں کمتر ہو تو وہ برابری یا محسود کی ترقی و برتری کے خوف سے حسد کرنے لگتا ہے (۴) تعجب یعنی جب اپنی نظر

میں اپنے سے کمتر پر نعمت دیکھے تو تعجب کرتا ہے اور اسے ہٹانے کی تمنا کرنے لگتا ہے (۵) جب اپنے مقصد کے حصول میں کسی کو شریک یا رکاوٹ دیکھے تو راستہ صاف کرنے کی غرض سے حسد کرتا ہے (۶) کُت جاہ و ریاست جس میں مزاحم بننے والے پر حسد ہوتا ہے (۷) خباثت نفس و باطن۔

علیٰ ہذا سب سے زیادہ حسدان لوگوں میں ہوگا جہاں یہ سارے اسباب بیک وقت پائے جاتے ہوں اور جہاں یہ اسباب جتنے کم ہوں گے اسی تناسب سے حسد میں کمی ہوگی اور جہاں بالکل کوئی سبب نہ پایا جائے وہاں کوئی حسد نہ ہوگا۔

بہر حال حسد ایک گندی بیماری ہے جو رذائل اخلاق میں غیر معمولی طور پر مہلک سمجھے جانے والی شیطانی خصلت ہے۔ ابلیس حسد نہ کرتا تو ملعون نہ بنتا۔ قابیل قاتل نہ بنتا۔ یہود گمراہ نہ ہوتے۔ اور ابو جہل عدو اللہ نہ بنتا۔ حسد نیکیوں کو ایسا کھاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو۔ رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ۔^۱

بہر حال اگر کسی کو حسد کا عارضہ لاحق ہو تو اس سے نکلنے کی کوشش لازمی ہے جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے کہ کیوں تجھے مسلمان کی نعمت پر تنگ دلی محسوس اور زوال کی تمنا ہو رہی ہے پھر حسد کے مقتضائے خلاف چلتے ہوئے محسود کے لئے دعا کرتا رہے اور کسی سے حسد کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی حسد کے مطابق کوئی عمل کرے۔ ممکن ہے کہ اللہ اس کا دل صاف کر کے اس پر رحم فرما دے۔ یہ حکم حسد کی اس نوع کا ہے جس میں دوسرے کی نعمت کے زوال اور اپنے لئے حصول کی تمنا ہو لیکن اگر اس کے زوال کی تمنا نہ ہو بلکہ آدمی چاہے کہ میں اس جیسا بن جاؤں تو یہ چیز قسم اول کی طرح حرام و ناجائز نہیں بلکہ اگر ایسی تمنا اور کوشش کسی دینی کام میں ہو تو یہ محمود ہے اور مطلوب بھی ہے جیسا کہ اگلی حدیث میں ہے حسد کی اس قسم کو غبطہ کہا جاتا ہے اور اگر کسی لہر مباح میں یہ کیفیت آجائے مثلاً کسی کے پاس بہت سارا مال ہے یا اور طرح کی کوئی دنیوی نعمت ہے اور دوسرا اس کی تمنا کرتا ہے تو یہ اگرچہ حرام تو نہیں مگر اس سے بچنا افضل اور درجہ کمال ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو کسی نعمت میں دیکھا کہ وہ اس نعمت کی وجہ سے بگڑتا جا رہا ہے جیسے مالدار آدمی تو اس نیت سے اس کے زوال کی تمنا کرنا کہ وہ فاسق نہ بن جائے بھی جائز ہے۔ عارضہ میں ہے:

باب ماجاء فی الحسد

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۳۲۳ ج: ۲ "باب الحسد" کتاب الادب، سنن ابن ماجہ ص: ۳۱۰ "باب فی الحسد" ابواب

الزهد، ایضاً رواہ البیہقی وغیرہما بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۲۷ ج: ۳.

”قال علماءنا: الا ان تكون تلك النعمة يستعين بها على المعصية فاذا احب زوالها لذلك عنه كان جائزاً“۔

حدیث کے باقی تین الفاظ کی تشریح مقابل الفاظ کے تناظر میں سمجھنا آسان تر ہے جیسا کہ لغات کے بیان میں گذرا ہے۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ مقاطعہ باہمی حقوق واجبہ کے ترک کو کہتے ہیں۔ جبکہ تدابر یعنی اعراض محسوس اور معقول دونوں کو شامل ہے۔ محسوس کی صورت جیسے ایک دوسرے سے منہ موڑنا اور راستہ تبدیل کرنا اور معقول جیسے عقائد و آراء اور اقوال میں اختلاف کرنا۔ جبکہ بغض محبت کے مقابلے میں آتا ہے یعنی ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے کی کوشش نہ کرو۔ محشی نے لمعات سے نقل کیا ہے کہ دین میں اختلاف مت کرو کیونکہ بدعات کے ارتکاب سے نفرتیں اور عداوتیں جنم لیتی ہیں۔

دوسری حدیث:- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حسد اچھا نہیں مگر دو خوبیوں میں۔ ایک خصلت اور خوبی اس شخص کی جس کو اللہ نے مال دیا ہو پس وہ اس میں سے رات اور دن کی ساعات میں خرچ کرتا رہتا ہے۔ دوسری خوبی اس شخص کی جس کو اللہ نے قرآن (کا علم) دیا ہو پس وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس کے مطابق رہتا ہے۔

لغات:- ”اثنین“ اس روایت میں اثنین سے مراد خصلتیں ہیں۔ قولہ ”رجل“ اور رجل مرفوع ہے جو قائم مقام مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے ”خصلۃ رجل“۔ اور اگر ”اثنین“ کا لفظ ہو یعنی بغیر تائید کے تو پھر رجل مجرور ہے بنا بر بدلیت اور حذف کی ضرورت نہیں۔ قولہ ”آناء“ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”انی“ ہے جیسے ”امعاء و معاء“ ہے مراد ساعات ہیں۔ قولہ ”لقوم بہ“ سے مراد عمل ہے جو تلاوت اور دیگر تمام متعلقہ امور جیسے تعلیم، قضا، فتویٰ اور اس کے احکام کے مطابق خود عمل کرنے وغیرہ سب کو شامل ہے۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ کے مطلب میں شارحین کی آراء مختلف ہیں۔ باب کی سابقہ روایت میں آپ نے پڑھ لیا کہ حسد کی وہ قسم جو کسی دینی امر سے متعلق ہو اور اس میں دوسرے کی دینی نعمت کے زوال کی تمنا نہ ہو بلکہ اپنے لئے حصول کی خواہش اور کوشش ہو تو یہ جائز ہے اس کو غبطہ کہا جاتا ہے۔ ابن العربی نے عارضہ میں یہی مطلب متعین کیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات اس کو مبالغہ فی التحریص پر محمول کرتے ہیں یعنی اگر حسد جائز ہوتا تو پھر انہی دو خصلتوں میں جائز ہوتا جیسا کہ حاشیہ پر ہے یعنی اس سے حسد کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دو خصلتوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے، یہ ایسا ہے جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ اگر میں کسی کو یہ اجازت دیتا کہ وہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو اپنے شوہر کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا، ^۱ تو جس طرح اس حدیث میں سجدے کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ عورت پر شوہر کی اطاعت لازم کرنا مراد ہے۔ اس مبالغے کے لئے مذکورہ تعبیر اختیار فرمائی اسی طرح باب کی حدیث میں بھی ہے۔

باب ماجاء فی التباض

”عن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الشيطان قد ايس ان يعبد المصلون ولكن في التحريش بينهم“۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے شک شیطان اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان اس کی عبادت کریں، لیکن ان کی باہم لڑانے کے بارے میں مایوس نہیں ہوا۔

لغات:- تباض کا مطلب سابقہ باب میں گزرا ہے۔ قولہ ”ايس“ مفتح الہزہ و کسر الیاء ماضی کا صیغہ ہے ایسا مصدر ہے مایوسی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”التحريش“ حَرَّشَ بین القوم ایک دوسرے کے خلاف لڑانے اور بھڑکانے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں ”شیطان“ سے مراد ابلیس علیہ اللعنة ہے اور ”مصلون“ سے مسلمان مراد ہیں۔ جبکہ مسلم شریف ^۱ کی روایت میں اس پر ”فی جزيرة العرب“ کا اضافہ ہے۔ مگر عبادت شیطان سے مراد کیا ہے تو اس میں متعدد اقوال ہیں۔

پہلا قول:- یہ ہے کہ اس سے بتوں کی عبادت مراد ہے پس مطلب یہ ہوا کہ شیطان کو یقین ہوا چلا ہے کہ جزيرة العرب میں لوگ پھر کبھی بھی شرک اور بتوں کی پوجا پاٹ کی جانب نہیں لوٹیں گے جیسا کہ ساڑھے چودہ سو سال سے مشاہدہ اور تاریخی حقیقت ہے اس لئے امام نووی نے اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے اور جہاں تک مسئلہ کذاب کے فتنے کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بعض لوگوں

۱۔ الحدیث اخرجه الترمذی کتاب النکاح باب: ۱۰، ایضاً ابن ماجہ کتاب النکاح باب: ۴، ایضاً ابو داؤد کتاب النکاح باب: ۴۰، ایضاً رواہ الحاكم فی المستدرک والبیزار واحمد والنسائی، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۵ ج: ۳۔

باب ماجاء فی التباض

۱۔ صحیح مسلم ص: ۳۷۶ ج: ۲ ”باب تخريش الشيطان وبغنه الخ“ کتاب صفة المنافقين۔

کا مرتد ہونا ثابت ہے لیکن انہوں بتوں کی عبادت نہیں کی تھی۔ البتہ شیطان اپنا کام ان کی باہمی نفرتوں سے نکالتا ہے جن کی بنا پر لوگ آپس میں اختلافات اور جھگڑوں بلکہ قتال کا شکار ہو جاتے ہیں جیسا کہ آج کل مشاہدہ عام ہے۔

دوسرا قول:- یہ ہے کہ عبادت سے مراد ارتداد ہے اور مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی امت کے گمراہ ہونے اور مرتد ہونے سے شیطان مایوس ہو چکا ہے، گو اکاذ کا واقعات ارتداد کے ہوں گے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ پوری امت والعیاذ باللہ صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے۔ یہ قول علامہ تورپشٹی کا ہے۔

تیسرا قول:- ملا علی قاریؒ کا ہے کہ شیطان اس سے مایوس ہو گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح یہ لوگ بھی توحید کے ساتھ شرک کو ملا دیں گے۔ اس توجیہ کے مطابق پہلی توجیہ کی طرح جزیرۃ العرب کی قید لازمی ہوگی۔ جبکہ دوسری توجیہ میں حکم عام مسلمانوں کو شامل ہے خواہ وہ جزیرۃ العرب سے باہر رہنے والے کیوں نہ ہوں۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی احادیث کا حکم ابدالابد کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ قیامت کے قریب تک کے لئے ہوتا ہے۔ لہذا اس حدیث میں اور اس حدیث میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے کہ جب تک روئے زمین پر اللہ، اللہ کہنے والا ہوگا اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی، اور یہ کہ قیامت ضرار الناس پر قائم ہوگی وغیر ذالک من الاحادیث۔^۲

سوال:- اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ امت کے آپس میں جھگڑے اور اختلافات ہوں گے تو پھر ایسے یقینیات سے دامن پچانا کیونکر ممکن ہے؟ اور انسان ایسے میں کیونکر مکلف بن سکتا ہے؟

جواب:- اس قسم کی احادیث یا جیسے ”لتبعن سنن من قبلکم“ الخ^۳ سے بلاشبہ یہ سب کچھ رونما ہونا معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی یہود وغیرہ کی مشابہت اور باہمی جھگڑے ممنوع ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرامین کا مقصد یہ ہے کہ امت کی غالب اکثریت ان چیزوں میں مبتلا ہوگی مگر ایک طائفہ منصورہ ایسا بھی ہونا چاہئے جو قیامت تک اپنا دامن بچائے رکھے۔ تذکرۃ شکر

۲۔ راجع للاحادیث مشکوٰۃ المصابیح ص: ۳۸۱ مکتبۃ الحسن لاہور۔

۳۔ رواہ البخاری ص: ۱۰۸۸ ج: ۲ ”کتاب الاعتصام“ ایضاً أخرجه فی الانبیاء مسلم ص: ۳۳۹ ج: ۲ کتاب العلم

ابن ماجہ ص: ۲۸۷ ابواب الفتن۔

باب ماجاء فی اصلاح ذات البین

”عن اسماء بنت یزید قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحل الکذب إلا فی ثلاث: یُحدّث الرجل امرأته لیرضیہا، والکذب فی الحرب، والکذب لیصلح بین الناس وقال محمود فی حدیثہ: لا یصلح الکذب الا فی ثلاث۔“

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جھوٹ بولنا جائز نہیں مگر تین مواقع پر (جائز ہے) کوئی شخص اپنی بیوی سے جھوٹی بات کرے تاکہ اسے راضی کر دے، اور جنگ (جہاد) میں جھوٹ بولنا اور اس لئے جھوٹ بولنا تاکہ لوگوں کے درمیان صلح کرادے۔ یہ الفاظ امام ترمذی کے ایک شیخ محمد بن بشار کے ہیں جبکہ ان کے دوسرے شیخ محمود بن غیلان نے ”لا یحل“ کے بجائے ”لا یصلح الکذب“ نقل کیا ہے مطلب دونوں کا ایک ہے۔

باب کی پہلی حدیث شہر بن حوشب راوی کی وجہ سے اور اس سال کے شبہ کی بناء پر درجہ صحت سے کم ہے مگر باب کی دوسری حدیث صحیح ہے جو حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ وہ شخص جھوٹا (غلط جھوٹا) نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے (اور اس کے لئے) اس نے بھلی بات کہی یا اچھی بات پہنچائی۔

لغات:- قوله ”ذات البین“ ذات کا لفظ کسی شے کی حقیقت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم کبھی اس سے مراد صفات بھی ہوتی ہیں یہاں یہی مراد ہے جبکہ ”بین“ کا لفظ اصالتہً ظروف کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کا اطلاق دو چیزوں کے درمیان حالت پر بھی ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ علیٰ ہذا لفظ ذات یا تو زائد ماننا پڑے گا یا پھر ”بین“ معنی ظرفی پر محمول کرنا ہوگا پس معنی یہ ہوگا یہ باب لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات کی اصلاح کے بارے میں ہے۔

قوله ”لیس بالکاذب“ ای بالکاذب المذموم۔ قوله ”او نماعیراً“ لفظ ”او“ شک من الراوی کے لئے ہے۔ ”نما“ جب میم کی تخفیف کے ساتھ ہو تو اچھی بات پہنچانے کو کہتے ہیں اور جب میم کی تشدید کے ساتھ ہو تو بمعنی چغلی کے آتا ہے جبکہ ”أما“ میں دونوں قول ہیں۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ کی آسان تشریح ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس میں تینوں کذبات کو حقیقی

جھوٹ پر محمول کیا جائے اور ان کو کذب مذموم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے محکم حدیث باب جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ جبکہ دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ ان کذبات کو اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جو نسبت کذبات ثلاثہ کی گئی ان کو معاریض اور تور یہ پر محمول کیا جائے جس کا مطلب ہے لفظ کے معنی متبادر کو چھوڑ کر غیر متبادر لیا جائے تو نسبت الی الخطاب اگرچہ یہ جھوٹ سا ہوگا لیکن عند المحکم یہ سچ ہی ہوگا۔ چنانچہ ابن العربی نے اس مسئلے پر ”باب ماجاء فی النصیحة“ میں بحث فرمائی ہے پھر اس کی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مثاله ان يقول لاهله: ابتعت لك هذا الثوب بخمسة دنانير وهو يريد درهم“۔

چونکہ دنانیر کا اطلاق دراهم پر ہوتا ہے مگر علی القلیل اس لئے غیر متبادر ہوا تو عورت اس سے مراد دنانیر سمجھے گی جبکہ وہ دراهم ہیں۔

”و كقوله للرجل سمعت من تكره يدعوك ويدكرك بخير، يريد بذلك عند دعائه

للمسلمين فانه داخل فيهم“۔

یعنی ایک شخص سے کہا جائے کہ تم جس آدمی کو اپنا دشمن و مخالف سمجھتے ہو وہ تو تیرے حق میں دعائیں مانگتا ہے تو یہ جھوٹ بھی نہ ہوگا کہ اس کی مراد عام مسلمانوں کے لئے دعا ہے جس میں مخاطب بھی آگیا ہے جبکہ وہ مخاطب اس کو خصوصی طور پر اپنے حق میں سمجھے گا۔

”وفى الحرب مثل ان يقول لِّلعدُوّ: قد جاءك ما لا طاقة لك به يعنى بالدين

والاسلام ونحو ذلك“۔

یعنی یہ کہنے سے کہ تمہارے پاس ایسی چیز آئی ہے جس کا مقابلہ تم نہیں کر سکتے ہو، دشمن اس کو فوج پر محمول کرے گا مگر آپ کی مراد اس سے دین اسلام ہوگی تو یہ سب صورتیں معاریض کی ہوں گی۔ لہذا حدیث کو احتیاطاً اسی صورت پر محمول کرنا چاہئے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقوال کو بھی معاریض کہیں گے۔

تحقیقی تشریح:۔ مذکورہ اختلاف درحقیقت ایک فرعی اختلاف ہے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ آیا صدق اور کذب کا حسن اور قبح عقلی و ذاتی ہیں یا شرعی؟ تو مسلم الثبوت میں المقالة الثانیۃ کے تحت اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اتنی سی بات تو اجماعی ہے کہ افعال کا حسن و قبح اس اعتبار سے کہ کونسی چیز کمال ہے

اور کوئی نقصان ہے اور کوئی چیز دنیوی غرض سے موافق ہے اور کوئی نقصان وہ ہے عقل سے معلوم کی جاسکتی ہے کیونکہ ساری دنیا والے اشیاء میں ایسی اچھائی اور برائی کی تمیز بغیر شریعت کے جانتے ہیں مثلاً علم کا حسن ہونا اور جہل کا قبیح ہونا، البتہ حسن اور قبیح بمعنی عند اللہ مدح اور ذم کا استحقاق بھی عقلی ہے یا محض شرعی ہے؟؟؟
تو اشاعرہ کہتے ہیں کہ شرعی ہیں لہذا شریعت جس چیز کا حکم دے تو وہ حسن اور جس سے روکے تو وہ قبیح ہوگی حتیٰ کہ اگر شریعت اس حکم کو منسوخ کر کے مامور بہ اور منہی عنہ کو مامور بہ قرار دیدے تو حکم بھی بدل جائے گا حسن قبیح بن جائے گا اور قبیح حسن۔

جبکہ اکثر حنفیہ (ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک حسن اور قبیح مطلقاً عقلی ہیں یعنی ذاتی ہیں یا ایسی صفت کی بناء پر ہیں جو لازم الذات ہو، تاہم ہمارے حنفیہ کے نزدیک اس کے عقلی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حکم شرع کے بغیر بھی وہ مشروع ہو بلکہ یہ نزول شرع پر موقوف ہے حتیٰ کہ اگر اس فعل کے بارے میں شرع وارد نہ ہو تو وہاں کوئی حکم شرعی نہ ہوگا۔

تاہم محققین حنفیہ جیسے امام ابو منصور الماتریدی وغیرہ کے نزدیک بعض اشیاء کا حسن و قبیح تو عقلی ہیں لیکن سب کا نہیں۔

”ثم من الحنفية من قال ان العقل قديم مستقل في ادراك بعض احكامه تعالى فواجب الايمان وحرم الكفر وكل ما لا يليق بحنايته تعالى حتى على الصبي العاقل وروى عن ابي حنيفة رحمه الله تعالى: لا عذر لاحد في الجهل بخالفه لما يرى من الدلائل الخ۔“

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان کا حسن اور کفر کا قبیح عقلی ہیں حتیٰ کہ اگر ایک بچہ کسی جنگل میں تنہا بالغ ہو جائے تو اس پر از روئے عقل لازم اور واجب ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک پر ایمان لائے اور جو صفات اللہ کے شایان ہیں ان پر بھی ایمان لائے جبکہ صفات نقصان سے اللہ کی تنزیہ بھی اس پر واجب ہے تاہم نماز روزہ وغیرہ اس پر بغیر اخبار شارح کے واجب نہ ہوں گے کہ ایمانیات عقلی ہیں اور فرعیات نقلی ہیں۔

علیٰ ہذا حدیث باب کا مطلب اشاعرہ کے نزدیک تو بالکل آسان ہے کہ جب شارع نے کذب کی مندرجہ بالا صورتیں جائز قرار دیں تو یہ حسن بن گئیں لہذا اب ان میں کسی طرح کا کوئی قبیح باقی نہ رہا لہذا ان کے نزدیک حدیث کو ظاہر معنی اور کذب حقیقی پر محمول کرنے میں کوئی اصولی پیچیدگی نہیں۔

لیکن ہمارے حنفیہ اور معتزلہ کے نزدیک اس کو کذب حقیقی پر محمول کرنے سے یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اگر صدق و کذب کا حسن و قبح عقلی ہیں تو پھر ایک قبیح چیز کیسے جائز ہو سکتی ہے جبکہ شارع اور حکیم قبیح کا حکم نہیں دیتا؟

بلاشبہ یہ ایک وزنی اعتراض ہے مگر اس کا حل یہ ہے کہ اولاً تو ہمارے نزدیک ان کذبات سے مراد معاریض ہیں علیٰ ہذا یہاں کسی قبیح کو جائز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیاً علامہ بہاری رحمہ اللہ نے مسلم الثبوت میں فرمایا ہے: ”والحق عندنا الاطلاق الاعم فلا یرد النسخ علینا“ یعنی ہمارے نزدیک حق بات اور صحیح موقف یہ ہے کہ حسن اور قبح عام ہیں کبھی فعل کی ذات میں ہوتے ہیں، کبھی صفات لازمہ و حقیقیہ کی وجہ سے اور کبھی کسی عارض کی وجہ سے۔ لہذا جس طرح ایک حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے تو ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ قبل النسخ اس کا حسن عارض کی وجہ سے تھا جواب ختم ہوا تو اسی طرح کذب میں بھی قبیح عارضی ہو سکتا ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی باب ما جاء فی النصیحة میں بھی یہی بات کہی ہے:

”حقیقة: الکذب حرام لایلذاته کما تقولہ المبتدعة (المعتزلة) وانما هو لمافیہ من المضرۃ ولذلك یجب لدفع المضرۃ کستر المسلم المظلوم علی الظالم۔“

(عارضہ ص: ۸۷ ج: ۷)

ثالثاً ہم کہتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ صدق اور کذب کا حسن و قبح عقلی ہیں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امور عارضہ کبھی کبھار اتنے زیادہ اور طاقت ور ہوتے ہیں جن کی بنا پر ذاتی تقاضا مغلوب ہو جاتا ہے، اس کو علم بلاغت والے مقتضائے حال سے بھی تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ علامہ تفتازانیؒ نے مطول میں ”الحمد للہ“ کی شرح میں کہا ہے کہ لفظ الحمد کو اسم ذات پر کیوں مقدم کیا حالانکہ اسم ذات مقدم ہونا چاہئے تھا۔ غرض کبھی شرع کا ایک حکم کسی شرعیہ کے وجود پر موقوف ہوتا ہے مگر حکیم خیر کثیر کا حکم شرعیہ کی وجہ سے ترک نہیں کرتا پس جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ ان کذبات میں جو فوائد ہیں وہ ان کے قبائح ذاتیہ سے کہیں زیادہ ہیں لہذا قبیح ذاتی حسن عارضی کے ساتھ منافی نہیں۔

یہاں مسلم الثبوت کی عبارت قارئین کی افادہ کی غرض سے نقل کی جاتی ہے:

”وقالوا (ای الاشاعره) اولالو کان ذاتیالم یختلف وقد یختلف فان الکذب

مثلاً یحب لعصمة نبی و انقاذ بری عن سفاک و الجواب ان هناك ارتکاب اقل
القیححتین لان الکذب صار حسنًا قلیل یرد علیه ان هذا الکذب ههنا واجب
فیدخل فی الحسن اقول الحسن لغيره لاینافی القبح لذاته و هذا معنی قولهم
الضرورات تبیح المحذورات... الی ان قال... قال الشیخ فی الاشارات: الشر
داخل فی القدر بالعرض -

اس پر محشی لکھتے ہیں:

”فان التقدير الإلهی انما يتعلق اولاً وبالذات بالخير لكنه قد يكون متوقفاً على
وجود الشر القليل وليس من شأن الحكيم ان يترك الخير الكثير لاجل
الشر القليل“ الخ -

یہ بحث انتہائی دلچسپ ہے مگر خوفِ تطویل سے بچنے کے لئے اسی قدر پر اکتفاء کرتا ہوں کیونکہ آج کل
اساتذہ و طلبہ کا مزاج بن گیا ہے کہ مشکل اور طویل اباحت سے اپنا دامن اس طرح بچائے رکھنے کی کوشش کرتے
ہیں جیسے قیام و صیام کا پابند شخص گندگی سے اپنے دامن کی حفاظت کرتا ہے۔ بہر حال انحطاطِ علم پر رونے سے زیادہ
توقعات وابستہ کرنا خیالِ محال ہے، یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ کوئی محصل ہمارے آنسوؤں کو خشک کرنے
اور رونے کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کے لئے آگے بڑھے گا اور محققِ عالم بننے کا ہمارا خواب شرمندہ تعبیر کرے
گا۔ الا ماشاء اللہ و ما ذا لك على الله عز و جل

بہر حال اگر کسی کو یہ نفیس بحث دیکھنی ہو تو مسلم الثبوت کا مقالہ ثانیہ مع الحواشی اور ابن قیم کی مفتاح
دار السعادة وغیرہ کتب سے مراجعت فرمائے۔

باب ماجاء فی الخيانة والغش

”عن ابی صرمة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من ضارّ ضارّ اللہ به ومن شاق

شاق اللہ علیہ“ (حسن غریب)۔

حضرت ابو صرّمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کو نقصان
پہنچائے اللہ اس کو نقصان پہنچائے گا اور جو شخص کسی کو مشقت میں ڈالے (یا کسی سے پہلو تہی کرے) تو اللہ تعالیٰ

اس کو مشقت میں ڈالے گا (یا اللہ اس سے اعراض کرے گا)۔

دوسری حدیث:- باب کی دوسری حدیث حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ملعون (رحمت سے دور) ہے جس نے کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا، یا اس کے ساتھ دھوکہ اور دغا کیا۔ (حدیث غریب)

لغات:- قولہ ”الخیانۃ“ یہ لفظ امانت کے مقابل آتا ہے۔ خیانت کی تفصیل ”باب ماجاء فی شقۃ المسلم علی المسلم“ میں ”لا یخونہ“ کے تحت گذری ہے۔ قولہ ”الغش“ بکسر الغین یہ دونوں الفاظ گویا نصیحت و خیر خواہی کے مد مقابل آتے ہیں اس لئے غش کا اطلاق دھوکے، ملاوٹ اور کینہ وغیرہ سب پر ہوتا ہے۔ قولہ ”من ضار“ راء کی تشدید کے ساتھ ضرر اور مضرت سے ہے۔ قولہ ”ضار اللہ بہ“ یعنی اللہ اس کو ضرر میں مبتلا فرمائیں گے۔ قولہ ”ومن شاق“ بتثید القاف، مشقت سے بھی ہو سکتا ہے اور شق بمعنی پہلو تہی سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جس آدمی سے اختلاف ہوتا ہے تو وہ ایک شق یعنی کنارے پر ہوتا ہے اور یہ دوسرے پر ہوتا ہے اوپر ترجمہ میں بن القوسین اس معنی کو بیان کیا گیا ہے۔

تشریح:- حضرت ابو صرہؓ بکسر الصاد کی یہ روایت مسند احمد، سنن ابی داؤد و نسائی اور ابن ماجہؓ میں بھی ہے۔ خیانت اور دھوکہ دونوں شیطانی صفات ہیں جس طرح شیطان آدمی کو جھوٹی تسلیاں دیتا ہے اور فریب دے کر اسے صحیح راستے سے ہٹاتا ہے اور جھوٹ کو مزین کر کے اس کی نظر میں حسین بناتا ہے، اسی طرح گناہ کے جملہ امور سے اس کا دل بہلاتا ہے جبکہ وہ درحقیقت دھوکہ ہے، اسی طرح جو شخص یہ کام اپنے کسی بھائی کے ساتھ کرے گا گویا وہ شیطان کا بھائی ہے، اس لئے دوسری حدیث میں اسے ملعون یعنی اللہ عز و جل کی رحمت سے بعید قرار دیا، اعاذنا اللہ من غضبہ وعذابہ۔

باب ماجاء فی الخیانة والغش

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۵۶ ج: ۲ ”باب فی القضاء“ کتاب القضاء، سنن ابن ماجہ ص: ۱۶۹ ”باب من بنی فی حقہ ما یضر بجارہ“ ابواب الاحکام، مسند احمد ص: ۴۸۷ ج: ۴ حدیث: ۱۵۳۲۸، عن ابی صرہ عن رسول اللہ ﷺ: من ضار احضرہ اللہ ومن شاق شقہ اللہ علیہ۔ الحنفی عفی عنہ

باب ماجاء فی حق الجوار

”عن مجاهد بن عبد اللہ بن عمرو دُبَحْتُ لَهُ شَاةٌ فِي أَهْلِهِ فَلَمَّا جَاءَ قَالَ أَهَدَيْتُمْ لِحَارِنَا الْيَهُودِي؟ أَهَدَيْتُمْ لِحَارِنَا الْيَهُودِي؟ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَا زَالَ جِبْرِئِيلُ يُوصِينِي بِالْحَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُورِّثُهُ“۔^۱

حضرت مجاہد سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو کے لئے ان کے گھر میں بکری ذبح کی گئی تھی جب وہ تشریف لائے تو (گھروالوں سے) پوچھا کہ کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی (گوشت کا) ہدیہ دیا ہے، (دوسرے فرمایا پھر حدیث بیان کرنے لگے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر تاکید فرماتے کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید اسے وارث قرار دیں گے۔

تشریح:۔ قولہ ”الجوار“ اصح و افصح بکسر الجیم ہے جبکہ ضمہ بھی جائز ہے۔ قولہ ”آہدیتم“ یہاں ایک ہمزہ مقدر ہے جو برائے استفہام ہے یعنی ”آہدیتم“ اهداء سے ہے بمعنی ہدیہ دینا۔ قولہ ”سیورثہ“ وراثت باب تفعیل سے میراث دینے کو کہتے ہیں۔ جبکہ مجرد سے میراث لینے کے معنی میں آتا ہے، پھر سیورثہ کی ضمیر اللہ کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور جبرئیل کی طرف بھی، اس صورت میں نسبت مجازی ہوگی۔

تشریح:۔ اس حدیث سے ہمسایہ کے حق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنا مؤکد ہے ایک طرف حضرت عبد اللہ بن عمرو کا کلام ذوالہرام اور دوسری جانب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بارہا تاکید اور وصیت، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو وارث بنا دیا جائے گا۔

پھر اس تواریث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تاکید صرف نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کوئی مادی و مالی میراث نہیں ہوتی ہے گو کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گمان اپنے پڑوسی کے بارے میں اپنی میراث کے بارے میں بھی ہو اور یہ اس وقت کی بات ہو جب آپ صلی

باب ماجاء فی حق الجوار

۱۔ أخرجه أيضاً أبو داود ص: ۳۵۴ ج: ۲ ”باب فی حق الجوار“ کتاب الادب، وقال الحافظ وقد روی هذا المتن من طرق

كثيرة وعن جماعة من الصحابة رضى الله عنهم الترغيب والترهيب ص: ۲۴۶ ج: ۳۔

اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں دیا گیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام نہ میراث لیتے ہیں اور نہ ہی دیتے ہیں۔^۱ لیکن بے غبار بات یہ ہے کہ یہ حکم امت کے بارے میں ہے لہذا عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ ”یوصینی جبرئیل بان امر الامة برعاية حقوق الجار حتی ظننت ان يحکم بتوریت احد الحارین الآخر“۔ کمائی الحاشیہ

بہر حال ہر ایک جانتا ہے کہ اس کلام میں بہت تاکید اور مبالغے سے ہمسایہ کے حقوق اُجاگر کئے گئے ہیں، علاوہ ازیں قرآن سمیت بہت سی احادیث مبارکہ میں پڑوسی کا حق بیان مؤکد کے ساتھ مروی ہے مثلاً باب کی دونوں حدیث اور بخاری شریف کی حدیث ”من كان یومن بالله والیوم الآخر فلیکرم جاره“ اور (ص: ۸۸۹ ج: ۲) کی ایک روایت میں ہے ”فلا یؤذی جاره“ اور بخاری کے اسی صفحہ پر ہے ”والله لا یومن، والله لا یومن، والله لا یومن یقیل ومن یارسل الله؟ قال: الذی لا یأمن جاره بوائقه“ (شرارتوں سے) اس کے علاوہ بھی بہت احادیث ہیں مگر اختصار کے پیش انہیں ذکر نہیں کیا جا سکا۔

قصہ مختصر پڑوس کے حقوق تو ہیں مگر کیا ہیں تو اس پر اتفاق ہے کہ حسن سلوک کے تمام شعبے مراد ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس سلوک میں سارے جیران و ہمسایہ داخل ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو اس میں کافر و مسلمان نیک و فاسق اور امیر و فقیر سب شامل ہیں البتہ جس پڑوسی سے حقوق کے اسباب جتنے زیادہ ہوں گے، وہ اس حسن سلوک مثلاً ہدیہ وغیرہ کا نسبت زیادہ مستحق ہوگا مثلاً ایک پڑوسی رشتہ دار بھی ہے اور مسلمان بھی اور استاذ بھی تو اس کا حق غیر استاذ سے زیادہ ہے پھر مسلمان اور رشتہ دار کا علیٰ ہذا القیاس اسی طرح جو پڑوسی جتنا قریب ہوگا وہ زیادہ مستحق ہوگا نسبت دور والے کے اگرچہ دور والے کا بھی حق ہے اور چاہئے یہ کہ آدمی تمام اہل محلہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے مگر قریب والے پڑوسیوں کے حقوق بطور خاص قابل لحاظ بلکہ واجب الرعیۃ ہیں۔

اس پر بھی اتفاق ہے کہ نفس پڑوس کی بناء پر کوئی آدمی پڑوسی کا وارث نہیں بنتا جیسا کہ حدیث باب سے ظاہر ہے البتہ حق شفعہ میں اختلاف ہے:- ہمارے نزدیک حق جوار میں شفعہ بھی داخل ہے جبکہ شوافع وغیرہ کے نزدیک یہ حقوق الجوار میں شامل نہیں۔ کمائین فی محلہ

۱۔ کما ورد فی الحدیث ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ودرهماً الخ رواہ ابو داؤد کتاب العلم باب الحدیث علی طلب العلم، وابن ماجہ والترمذی واحمد وابن حبان وغیرہم وسندہ حسن، سنن دارمی ص: ۱۱۰ ج: ۱، وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا معشر الانبیاء، رواہ البخاری ومسلم وابو داؤد والترمذی والنسائی ومالك فی الموطأ واحمد، المعجم المفهرس ص: ۱۸۴ ج: ۷۔

ہمسایگی کے چند اہم حقوق:- (معارف الحدیث ج ۶ ص ۳۰۹) پر مجسم کبیر للطبرانی کے حوالے سے "ننت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی گئی ہے فرماتے ہیں:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: حق الجاران مرض عُدَّتْهُ وان مات شَبَعَتْهُ وان استقرضَكَ اقرضته وان اعور سترته وان اصابه خیر هَنَأْتَهُ وان اصابته مصيبة عزبته ولا ترفع بناءك فوق بناءه فتسُدَّ عليه الريح ولا تؤذيه بريح قدرك إلا ان تغرف له منها"۔^۳

یعنی پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو اور اگر انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (یعنی تدفین میں تعاون کرو) اور اگر وہ قرض مانگے تو اس کو قرض دو اور اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہو بند ہو جائے، وراپنی ہانڈی کی مہک سے اس کو ایذا مت پہنچاؤ والا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا اس کے گھر بھی بھیج دو۔

اور ارشاد ہوا:

"وان اشتریت فاکهة فاهدله فان لم تفعل فادخلها سراً ولا يخرج بها ولدك ليغيظ بها ولده"۔

اور اگر تم کوئی پھل خرید کر لاؤ تو اس میں سے پڑوسی کے ہاں بھی ہدیہ بھیجو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اس کو چھپا کے لاؤ اور پھر تمہارا کوئی بچہ وہ پھل لے کر باہر نہ نکلے کہ پڑوسی کے بچے کے دل میں اسے دیکھ کر جلن پیدا ہو۔ (ایضاً حوالہ بالاس: ج ۳۱۰: ۶ بحوالہ کنز العمال)

غرض پڑوسی کے ساتھ انتہائی اچھا برتاؤ کرنا اسلامی تعلیمات کے اخلاقی اور معاشرتی اصول کا زین اصول ہے اس سے دونوں کی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے، جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا قوی سبب ہے۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش اخلاق (نقش قدم کامل) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

^۳ اخرجه الطبرانی في الكبير ۴۱۹/۱۹ بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۱۳ ج: ۸ حدیث: ۱۳۵۴۵ کتاب البر والصلة،

ایضاً رواه ابن حبان عن معاذ بن جبل الترغیب والترہیب ص: ۲۴۳ ج: ۳۔

آخری حدیث :- باب کی آخری حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتھیوں میں سب سے اچھا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھی سے اچھا برتاؤ کرتا ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو اپنے ہمسایہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہو۔ اللہ عزوجل کا فرمان ہے ”والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب“ ^۱ نیک کر، ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ ”والصاحب بالجنب“ کی تفسیر میں ابوسعودؓ لکھتے ہیں:

”ای الرفیق فی امر حسن کتعلم وتصرف وصناعة وسفر فانه صحبتك وحصل بحانبك ومنهم ممن قعد بحنبك فی مسجد او مجلس او غیر ذلک من ادنیٰ صحبة التأمّت بینک و بینہ وقیل ہی المرأة“۔

باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اخوانکم جعلہم اللہ فیتۃ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ من طعامہ وللبیسة من لباسہ ولا یكلفہ ما یغلبہ فان کلفہ ما یغلبہ فلیعینہ۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (یہ غلام) تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے زیر دست غلام بنایا ہے، پس جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو تو اس کو اپنے کھانے میں سے کھلائے اور اپنے لباس سے اس کو پہنائے اور اسے کسی ایسے کام کا پابند نہ بنائے جو اس کے بس کا نہ ہوتا ہم اگر اسے کسی بھاری کام پر لگائے تو خود اس کی مدد کرے۔

لغات :- قولہ ”احسان“ اس کے صلے میں جب الی آجائے تو بمعنی نیک سلوک کے آتا ہے جیسا یہاں آیا ہے جبکہ بغیر ”الی“ کے اخلاص کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ حدیث جبرئیل میں ہے ”ما الاحسان؟“ ہے۔ قولہ ”اخوانکم“ ایک روایت میں ہے ”ہم اخوانکم“ جبکہ بخاری شریف کتاب الایمان کی روایت

میں ”اخوانکم خولکم“ کے الفاظ آئے خول الخاء والواو خادم۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ ”واصل (خ، و، ل) الاصلاح“ چونکہ خادم بھی آدمی کے امور کی اصلاح کرتا ہے اس لئے اسے خول کہتے ہیں۔

قولہ ”فتیۃ“ بکسر الفاء فتی کی جمع ہے غلام کو کہتے ہیں چنانچہ بعض حضرات نے اسی معنی لغوی کو دیکھتے ہوئے موقف اپنایا ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے کہ اللہ نے فرمایا:

”واذقال لفتناه“^۱ وقال فی آية اخرى ”وقال لفتيانہ اجعلو بضاعتم فی

رحالهم“۔ (سورۃ یوسف آیت: ۶۲)

قولہ ”تحت یدہ“ یعنی تحت قدرتہ۔ (العارضۃ)

تشریح:۔ غلام اگرچہ اصلۃً آزاد پیدا ہوتا ہے مگر جب وہ کفر اختیار کرتا ہے تو اللہ نے اس کو غلامی کی ذلت آموز سزا میں مبتلا فرمایا لیکن مع ہذا احرار کو اس کے ساتھ نرمی کرنے کا حکم دیا کہ وہ اللہ کا مجرم ہے لوگوں کا نہیں۔ پس اگر وہ توبہ تائب ہو جائے تو اس کی نسل آزاد ہوگی ورنہ وہ بھی ماں باپ کی سزا کے طور پر غلامی کے مستحق ہوگی کیونکہ آباء کے اعمال کا اچھا اثر اولاد پر ہونا لازمی ہے۔

چونکہ یہ اسلام کی آمد سے پہلے کی ایک عام رسم تھی جو جنگی قیدیوں کے بجائے قتل یا قیدی بنانے کے متبادل کے طور پر دنیا میں رائج تھی تو شریعت نے اس کو ختم تو نہ کیا مگر غلاموں کو آزاد کرنے اور ان کے ساتھ نرمی کرنے کو نیکی کا بہت بڑا باب قرار دیا، تاکہ لوگ غلاموں کو آزاد کرتے رہیں یا پھر ان کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کریں چنانچہ حدیث کا پہلا لفظ ”اخوانکم“ اس پر ناطق ہے، لہذا آدمی کو آقا کا تاثر دینے کے بجائے بھائی بندی کا تاثر قائم کرنا چاہئے اس حدیث شریف کا یہ حکم استحباب پر محمول ہے لہذا افضل یہ ہے کہ آدمی خود جیسا کھاتا ہے اور جو لباس زیب تن کرتا ہے غلام کو بھی اسی طرح دے مگر یہ واجب نہیں، لہذا اسے کم درجے کی چیز دینا بھی جائز ہے البتہ راوی حدیث حضرت ابو زر رضی اللہ عنہ اس استحبابی حکم کا اس طرح اہتمام فرماتے جیسے امر و جوہی کا ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اسے ظاہر پر حمل کرتے تھے۔

دوسری حدیث:۔ ”لا یدخل الجنة مَنیء المملکة“^۲ یعنی اپنے غلاموں کے ساتھ ناروا سلوک

باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم

۱۔ صحیح بخاری ص: ۹۰ ج: ۱ ”باب المعاصی من امر الجاهلیۃ النخ“ کتاب الایمان۔ ۲۔ سورۃ الکہف آیت: ۶۱۔

۳۔ الحدیث أخرجه احمد و ابو یعلیٰ باسناد حسن و بعضه عند الترمذی و غیره، الترغیب والترہیب ص: ۷۰ ج: ۳۔

کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

لغات :- ”سنیہ“ ”سواء یسوء (س، و، ۴) مادہ میں عیب اور برائی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ”ملکہ“ ملک سے ہے یعنی جو ملوک کے ساتھ بُرا برتاؤ کرے اور وہ ملکہ بھی محتمل ہے جو مقابل حال آتا ہے یعنی جو حالت اور وصف پختہ عادت بن جائے۔

تشریح :- علیٰ ہذا مطلب یہ ہوگا کہ جس آدمی کی یہ بُری عادت ہو جو ہمیشہ اپنے غلاموں اور خادموں سے سختی سے پیش آتا ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا، کیونکہ جنت رحمت باری کا اثر ہے لہذا اس میں وہ لوگ جائیں گے جو اللہ کی مخلوق پر شفقت کرتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جو سخت مزاج ہوں ان کے لئے تو دوزخ ہے کہ لوہا آگ سے نرم ہوتا ہے اور پتھر گرم ہونے سے پگھلتا ہے۔ پہلے بار ہا گذرا ہے کہ اس قسم کی احادیث کو خاصیت المفرد پر حمل کرنا چاہئے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دخول اولیٰ کی نفی مراد ہو یعنی ایسے لوگ جو حماء نہیں وہ اپنی سختیوں کی سزا بھگتتے کے بعد جنت میں جا سکیں گے۔

آج کل تو غلام نہیں ہیں لیکن نوکر تو ہوتے ہیں لہذا ان کے ساتھ نیک برتاؤ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا غلاموں کے ساتھ ہے کہ اگرچہ بُرا سلوک کرنے کی صورت میں وہ نوکری چھوڑ سکتے ہیں اور خود کو ذلت سے آزاد کر سکتے ہیں، مگر ان میں سے اکثریت کی بعض ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں جو نوکری چھوڑنے سے مانع ہوتی ہیں لہذا ان کی مجبوری سے غلط استفادہ اتنا ہی گناہ ہے جتنا غلام کے ساتھ ناروا سلوک کا ہے۔ ہاں اگر کوئی نوکر اور ملازم صحیح ڈیوٹی نہیں کر رہا یا خائن ہے یا کوئی اور عیب اس میں ہو تو اسے نوکری سے فارغ کیا جاسکتا ہے لیکن احسن طریقے سے کہ اسے بروقت بتلایا جائے جو اس کا حق بنتا ہے وہ پورا دے اور اچھے الفاظ میں معذرت کر لی جائے۔



باب النهی عن ضرب الخدام وشتمهم

”عن ابی ہریرۃ قال قال ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نبی التوبۃ من قذف مملوکہ بریفاً مما قال لہ، اقام اللہ علیہ الحدیوم القیمۃ الا ان یكون کما قال۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی توبہ ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مملوک کو تہمت لگائے در اس حالیکہ وہ اس الزام سے پاک ہو تو اللہ اس کو قیامت کے دن حد لگائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا ہی ہو جیسا اس نے کہا ہے۔

لغات:- ”شتم“ گالی دینے اور برا بھلا کہنے کو کہا جاتا ہے۔ قولہ ”نبی التوبۃ“ ابو القاسم سے بدل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت استغفار فرماتے۔ قولہ ”قذف“ لغت میں پھینکنے کو کہتے ہیں مگر اصطلاح میں پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کو کہا جاتا ہے یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

تشریح:- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظلم کا بدلہ اگر دنیا میں نہ ملے تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سزا ختم ہوگئی کیونکہ مظلوم کے لئے اللہ قیامت کے دن ظالم سے انتقام لیں گے اعاذنا اللہ منہ۔ چونکہ باندی اور غلام اپنے آقا سے گالیوں اور بہتان کا بدلہ تو لے نہیں سکتے، اور شبہ کی وجہ سے حد قذف بھی جاری نہ ہوتی اس لئے یہ سزا آخرت میں بھگتنا ہوگی۔

”قولہ ”الا ان یكون“ الخ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ استثنا مشکل ہے کیونکہ ”بریفاً“ اس استثنا کی نفی کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ ”بریفاً“ کا تعلق نفس الامر سے نہیں بلکہ آقا کے خیال سے ہے یعنی وہ باندی یا غلام نفس الامر میں تو زانی ہے لیکن قاذف کے ظن و اعتقاد میں پاک ہے۔ علیٰ ہذا مطلب یہ ہوگا ”من قذف مملوکہ وہو بریء فی ظنہ واعتقاده“ الخ یعنی اگر وہ ایک بری اور پاک غلام یا باندی پر جسے وہ خود بھی پاک سمجھتا ہے الزام و تہمت لگائے تو اسے قیامت کے دن حد لگے گی الا یہ کہ وہ واقعی زانی ہو تو پھر حد نہیں ہوگی۔

دوسری حدیث:- حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا کہ اتنے میں اپنے پیچھے کسی کہنے والے کو سنا جو کہہ رہا تھا غور سے سنو! ابو مسعود! غور سے سنو! ابو مسعود!

جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تجھ پر زیادہ قادر ہے نسبت تیری قدرت کے اس غلام پر چنانچہ ابو مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد اپنے کسی غلام کو نہیں مارا ہے۔

تشریح:- اس ارشاد پاک سے معلوم ہوا کہ کمزور اور ضعیف کو مارتے وقت یہ تصور کرنا چاہئے کہ اللہ کی ناٹھی بے آواز ہوتی ہے اور جب چلتی ہے تو پھر اس کے آگے کوئی طاقت مزاحمت کی تاب نہیں لاسکتی لہذا غلام و خادم ہوں یا بیوی بچے اور شاگرد وغیرہ سب کا حکم یہی ہے۔ بعض بڑے بڑے سردار اور زمیندار اپنے مزدوروں کو بے دردی سے مارتے ہیں ان کو بھی اللہ کا خوف کرنا چاہئے، تاہم جن لوگوں کی سرپرستی کسی کو حاصل ہو تو تادیب شرعی کی نیت سے ان کا مارنا جائز ہے جس کے لئے امام ترمذیؒ نے اگلا باب قائم کیا ہے۔

باب ماجاء فی ادب الخادم

”عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا ضرب احدکم خادمه فذكر الله فارفعوا ايديكم“۔ الحديث اخرجه البيهقي في شعب الايمان لكن ابوهارون خارجي وشيعي متهم بالكذب۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مار رہا ہو اور وہ اللہ کا نام لے لے تو اپنے ہاتھ (اس سے) اٹھا لو (یعنی مزید مارنا بند کرو)۔

تشریح:- سابقہ باب سے خادم کے مارنے کی نفی معلوم ہوتی تھی تو اس سے یہ شبہہ ہو سکتا تھا کہ خادم کو کسی بھی صورت میں مارنا جائز نہ ہوگا، تو امام ترمذیؒ نے اس باب میں اس توہم کا ازالہ کیا اور ترجمۃ الباب کے ساتھ حدیث کی مناسبت اس طرح ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ باب کا مسئلہ اس حدیث سے اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس ارشاد میں مارنے کی نفی نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ مارنے کے دوران اگر غلام وغیرہ تمہیں اللہ کا واسطہ دے کہ مجھے معاف کر دو تو آپ اسے معاف ہی کر دیں جس سے ضرب کا جواز معلوم ہوا۔

پھر یہ روایت اگرچہ ابو ہارون کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، چنانچہ ادب سکھانے کی

خاطر بیوی کا مارنا تو قرآن سے ثابت ہے^۱ اور تادیب شرعاً امر مطلوب ہے جس میں کبھی بکھار بیٹے اور شاگرد کو مارنے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور یہی مطلب ہے اس فرمان^۲ کا ”وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ أَدَبًا“ (مشکوٰۃ ص: ۱۸) تاہم مارنے کی اپنی حد ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے خلاصہ یہ ہے کہ مارنے میں سراور چہرے کو بچا کر تین ڈنڈے یا تھپڑ مارنا جائز ہے، بشرطیکہ زخمی کرنے والے نہ ہوں۔ ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ اگر پڑوسی غلام کی شکایت کرے تو اس کی شکایت پر بھی مارا جائے اور مارتے وقت اس غلطی کا تذکرہ بھی کرے تاکہ ڈنٹ ڈپٹ اور مارنے کا فائدہ بھی حاصل ہو علیٰ ہذا یہ حکم بچے کا بھی ہوگا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

”عن عبد اللہ بن عمر قال جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله كم أعفو عن الخادم؟ فصمت عنه النبي صلى الله عليه وسلم ثم قال يا رسول الله كم أعفو عن الخادم؟ قال: كل يوم سبعين مرة۔“ (حسن غریب)^۱

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! اپنے خادم کو کتنی بار معاف کر لیا کروں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، اس نے پھر پوچھا اے اللہ کے رسول! میں کتنی مرتبہ اپنے غلام کو معاف کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ۔

تشریح:- حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سائل کے سوال پر خاموشی اختیار کرنا وحی کے انتظار کی بنا پر بھی ممکن ہے اور سوال کو نا پسند کرنے کی وجہ سے بھی ممکن ہے کیونکہ معافی ایک ایسی نیکی ہے جس کو محدود کرنے سے وہ محدود ہو جاتی ہے جبکہ نیکی اور خصوصاً دائی نیکی کو کسی عدد کے ساتھ منحصر نہیں کرنا چاہئے بلکہ زندگی بھر اس پر عمل

باب ماجاء فی ادب الخادم

۱۔ كما قال الله عز وجل لا هجره في المضاجع واضربوهن الخ سورة النساء آيت: ۳۴۔

۲۔ رواه احمد ص: ۳۱۶ ج: ۶ حديث: ۲۱۵۷۰۔ حفيظ الرحمن الحنفی

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

۱۔ الحديث أخرجه ابو داود ص: ۳۵۵ ج: ۲ باب فی حق المملوك كتاب الادب، ايضاً سنن كبرى للبيهقي ص: ۵۱۷ ج: ۱۱ حديث: ۱۶۲۲۶۔

کرنا چاہئے۔

اعتراف:۔ اگر معافی کو عدد سے منسلک کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو پھر خود ستر کا عدد کیوں متعین فرمایا؟

جواب:۔ اگر یہ خاموشی وحی کے انتظار میں مانی جائے پھر تو کوئی اشکال نہیں لیکن اگر دوسری توجیہ کی بناء پر ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سبعین کا عدد انحصار کے لئے نہیں ہے بلکہ کثرت سے کنایہ ہے جیسے اس آیت میں ہے ”ان تستغفرلہم سبعین مرۃ“ الا یہ لے یا پھر مطلب یہ ہے کہ ستر مرتبہ معافی کے بعد جرم کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

اس روایت میں امام ترمذی نے ”حسن غریب“ کہا ہے مگر ملا علی قاریؒ مرقات میں نقل کرتے ہیں کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں اسے ”حسن صحیح“ کہا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس روایت پر ابوداؤد سکوت کریں اور منذری تصحیح کریں تو وہ صحیح ہوتی ہے اس روایت کو منذری نے جید الاسناد کہا ہے۔

باب ماجاء فی آداب الولد

”عن جابر بن سمرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لَانْ یُوَدَّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَیْرَ مَنْ اِنْ یَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ“۔ (حدیث غریب) لان ناصح بن علاء الکوفی لیس بالقوی فهو حدیث ضعیف۔

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ آدمی کا اپنے بیٹے کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ دینے سے افضل ہے۔

لغات:۔ قولہ ”لَانْ یُوَدَّبَ“ لام برائے تاکید بمعنی القسم آتا ہے جبکہ ان مصدریہ فعل مضارع کو بمعنی مصدر بنانا ہے۔ حاصل کلام اس طرح ہے ”واللہ نادیب الرجل ولده“ الخ ادب لغت میں اصالت دعوت دینے کو کہتے ہیں مگر خصال حمیدہ اور شائستگی کو بھی ادب اس لئے کہتے ہیں کہ یہ خیر و بھلائی کی طرف بلا تے ہیں۔ یہاں مراد تہذیب، سلیقہ اور اچھے طور و طریقہ کی تعلیم ہے۔

تشریح:۔ چونکہ انسانی زندگی بغیر آداب کے خوشگوار نہیں بن سکتی اس لئے شریعت نے آداب زندگی

کی اہمیت کو بارہا اُجاگر کیا ہے اور آداب کا دامن بہت وسیع ہے اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ بیٹے کو مکمل مہذب بنانا ایک صاع کے صدقہ سے افضل ہے بلکہ وہ تو کئی نیکیاں ہیں لہذا یہاں ایک ہی ادب مراد ہے مثلاً بیت الخلاء میں داخل ہوئے وقت پہلے بایاں پاؤں داخل کرنا ایک ادب ہے اور نکلتے وقت دایاں پہلے نکالنا دوسرا ادب ہے علیٰ ہذا القیاس پھر اس کی افضلیت ایک صاع کے صدقہ سے اس بنا پر ہے کہ ادب سکھانے کے بعد جب اس پر عمل درآمد ہوگا تو یہ ایک جاری دساری صدقہ ہوگا جبکہ صاع تو جلد ہی ختم ہو جاتا ہے گو کہ وہ بھی بڑھتا رہتا ہے لیکن وہ اضافہ اخروی ہے جبکہ ادب تو دنیا میں بھی بڑھتا چلا جاتا ہے تو آخرت میں بطریق اولیٰ بڑھے گا۔ (تدبر)

نیز ادب سکھانا ایک علمی افادہ ہے جبکہ صدقہ مالی تعاون ہے۔ ثالث اس لئے کہ ولد کی تادیب یقیناً اپنے محل میں واقع ہوتی ہے جبکہ صدقہ میں بے محل وقوع کا بھی احتمال ہے۔ رابعاً تادیب درجہ لزوم میں ہے جبکہ صدقہ درجہ نفل ہے اور واجب کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ خامساً بیجا جب متکادب بنے گا تو دوسروں کو بھی وہ آداب سکھائے گا۔ لہذا یہ ایک متعدی نیکی ہے جبکہ صاع تو کھانے سے ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث:- باب کی دوسری حدیث ”ایوب بن موسیٰ عن ابیہ عن جدہ“ ہے اس سند میں ابیہ کی ضمیر تو ایوب کی طرف لوٹتی ہے جس کا مصداق موسیٰ بن عمرو ہیں لیکن ”عن جدہ“ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں (۱) اگر یہ ایوب کی طرف راجع ہو تو ایوب کے دادا عمرو بن سعید ہیں جو تابعی ہیں زمانہ پیدائش دور خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہے لہذا روایت مرسل ہوگی۔ (۲) اور اگر ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹتی ہو تو پھر مصداق سعید بن العاص ہیں یہ اگرچہ عہد پاک میں حین حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے لیکن سماع میں شک ہے اس لئے امام ترمذی نے اس حدیث کو بنا بر ہر صورت مرسل قرار دیا ہے۔

بہر حال اس سند کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی باپ بیٹے کو حسن ادب سے زیادہ بہتر تحفہ نہ دے سکا۔ نحلاً بضم النون اور نحلۃ بکسرۃ نون عطیہ، ہبہ اور تحفے کو کہتے ہیں۔ اس تفصیل کی وجہ بدیہی ہے کیونکہ انسان کی سعادت و کمالات کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے ایک حکمتِ نظریہ اور دوم حکمتِ عملیہ علم پر موقوف ہے اور علم تادیب و تعلم پر، جب باپ اپنے بیٹے کو مہذب بناتا ہے تو وہ علم و عمل دونوں اعتباروں سے کامل بن جاتا ہے اور مملوک کے درجہ سے ملوک کے مقام تک پہنچ جاتا ہے، پھر حسن ادب کا مطلب وہی ہے جو عندا الشرع معتبر ہے جیسے حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو بطور نصیحت آداب کے چند کلمات ارشاد فرمائے تھے

جن کو قرآن نے بھی نقل کیا ہے اس سے اچھی تہذیب و تربیت کا عالی مقام بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے ورنہ تو قرآن اس کو بطور مدح نقل نہ کرتا۔

باب ماجاء فی قبول الهدیة والمکافاة علیہا

”عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل الهدیة ویثیب علیہا“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے اور اس کا بدلہ عطا فرماتے۔

لغات:- قولہ ”الهدیة“ معقیدت و محبت کی بنا پر کسی کو ایسا تحفہ دینا جس کا کوئی عوض پہلے نہ ملا ہو گو کہ بعد میں عوض مل جائے۔ قولہ ”مکافاة“ مجازات اور بدلہ کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ویثیب علیہا“ اثابة سے بمعنی بدلہ دینے کے اس لئے نیکی کو ثواب کا کام کہتے ہیں کہ ثواب بمعنی جزا اور بدلہ کے ہے۔

تشریح:- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے مگر صدقہ قبول نہ فرماتے اس کی وجہ ابواب الزکوٰۃ ”باب ماجاء فی کراهیة الصدقة للنبی صلی اللہ علیہ وسلم“ الخ میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۱۱۹ جلد سوم) پھر اخلاق کریمانہ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ میں قدر و قیمت کی رعایت نہیں فرماتے بلکہ ہدیہ پیش کرنے والے کی دلداری کے پیش نظر معمولی قسم کا تحفہ بھی قبول فرماتے چنانچہ ارشاد ہے ”لو اهدی لی کراع لقبلت ولو دعت علیہ لآجبت“ اگر مجھے بکری کا ایک پیر بھی ہدیہ کر لیا جائے تو میں ضرور قبول کروں گا اور اگر اس کی دعوت دی جائے تو میں ضرور جاؤں گا۔ (شمائل ترمذی) ۱

چونکہ اکرام مسلم واجب ہے اور ہدیہ اکرام کا بہترین طریقہ ہے لہذا ہدایا کا تبادلہ اس مقصد کے حصول میں بڑا معاون ثابت ہو جاتا ہے لہذا اگر ہدیہ قبول کرنے سے کوئی شرعی مانع نہ ہو تو اسے رد نہیں کرنا چاہئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری عادت شریفہ یہ تھی کہ ہدیہ قبول کرنے کے بعد اس کا بدلہ بطور نعم البدل عنایت فرماتے کیونکہ جب ہدایا کا تبادلہ طرفین سے ہو تو محبت اور تعلق میں کمال اور پختگی آتی ہے بلکہ اس کو ترقی نصیب ہوتی ہے اور اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم بھی دی ہے فرمایا ”من أعطی عطاءً فوجد فلیحز به

باب ماجاء فی قبول الهدایا الخ

۱۔ شمائل ترمذی ص: ۲۴ ”باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ“ فاروقی کتب خانہ لاہور۔

ومن لم يجد فليمن فان من آتني فقد شكروا من كتم فقد كفر“۔ (ابوداؤد و ترمذی) ۱

علیٰ ہذا اگر آدمی مالی بدلہ نہ دے سکے تو کم از کم اس آدمی کے لئے خیر کے چند کلمات کہے یا دعا دے تو بھی بدلہ ادا ہو جائے گا چنانچہ ترمذی کی ایک روایت میں ہے ”من صنّع الیہ معروف فقال لفاعله جزاک اللہ خیراً فقد ابلغ فی الشاء“ ۲ کیونکہ جب اس کا بدلہ اللہ پر چھوڑے گا تو اس سے بہتر کیا بدلہ ہو سکتا ہے۔ احادیث ۳ کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خطیرہ ساتھ ہے تو اس کا بدلہ حسی چیز سے دینا چاہئے اور اگر حقیر سی چیز ہے تو اگرچہ اسے حقیر نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس کا تاثر دینا چاہئے تاہم زبانی دعا اور شکر و ثناء سے بھی بدلہ ہو جائے گا، اس کی کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

حدیث الباب سے استدلال کر کے مالکیہ کہتے ہیں کہ ہدیہ کا بدلہ واجب ہے کیونکہ ”کان“ کا لفظ مواظبت پر دلالت کرتا ہے جو موجب وجوب ہے اور یہی امام شافعیؒ کا بھی قدیم قول ہے مگر حنفیہ کے نزدیک مکافاة یعنی ہدیہ کا عوض اور بدلہ دینا مستحب یا زیادہ سے زیادہ مسنون ہے واجب نہیں بلکہ بدلے کی نیت سے ہدیہ دینا تو بیع ضمنی محمول ہے جو صحیح نہیں، گو کہ جب بدلہ ملے گا تو انتہاء وہ بیع کہلائے گی اور اس لئے عوض ملنے کے بعد ہدیہ سے رجوع نہیں ہو سکتا لیکن ابتداء میں تو ہبہ تبرع ہی ہے۔ رہا مالکیہ کا استدلال تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ”کان“ احادیث میں استمرار کے لئے نہیں آتا کما تر غیر مرۃ۔ ثانیاً مواظبت سے اس وقت تک وجوب ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ ترک پر وعید نہ آئی ہو جیسے نماز میں تکبیرات انتقالات اور وضوء میں مضمضہ و استنشاق وغیرہا۔

(ہبہ سے رجوع کے متعلق مسئلہ ”باب ما جاء فی کراہیۃ الرجوع من الهبۃ“ میں گذری ہے، دیکھئے

تشریحات ص ۲۲۱ ج ۵)

۱ سنن ابی داؤد ص: ۳۱۵ ”باب فی شکر المعروف“ کتاب الادب.

۲ ایضاً رواہ الطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸.

۳ راجع للاحادیث مجمع الزوائد ص: ۲۳۲ تا ۲۳۶ ج: ۸.

باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ۔“ (حدیث صحیح)^۱

باب کی اگلی روایت حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں لفظ ”لا“ کے بجائے ”لم“ آیا ہے۔ یعنی جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔

تشریح:- عارضہ الاحوذی میں ہے کہ اس حدیث میں ناس اور لفظ اللہ کے اعراب کے اعتبار سے چار روایات ہیں (۱) دونوں منصوب (۲) دونوں مرفوع (۳) پہلا مرفوع دوسرا منصوب اور نمبر (۴) اس کے برعکس۔

اوپر ترجمہ میں پہلے اعراب کو ملحوظ رکھا گیا اور مطلب یہ ہے کہ جو آدمی لوگوں کے احسان کا شکر یہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا کیونکہ اس کی طبیعت میں ناشکری سرایت کر چکی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے کہ لوگوں کے احسانات کا شکر یہ ادا کر دگر وہ اس حکم کی تعمیل نہیں کر رہا جس سے اللہ کے حکم عدولی کا ارتکاب لازم آتا ہے جو ناشکری ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے احسانات ظاہری اسباب پر مبنی ہیں تو جب وہ اسباب ظاہری کو نہیں سمجھتا اور ان کی قدر نہیں کرتا تو اللہ کی نعمتیں تو مخفی اسباب پر مبنی ہوتی ہیں یہ شخص اس درجے تک کیسے پہنچ پائے گا؟

اگر دونوں مرفوع ہیں تو پھر صلہ یعنی ”من“ کے لئے ضمیر کو مستتر ماننا پڑے گا اور تقدیر یہ ہوگی ”من لا یشکرہ الناس لا یشکرہ اللہ“ یعنی جس شخص کا شکر یہ لوگ ادا نہ کریں اللہ بھی اس کے عمل کی قدر نہیں کرتا کیونکہ لوگ تو زمین پر اللہ کے گواہ ہیں اور ظاہر ہے کہ لوگ تو اس کا شکر یہ نیک سلوک اور احسان پر ادا کریں گے، تو لوگوں کا شکر یہ ادا نہ کرنا اس آدمی کے نیک سلوک کی نفی سے کنایہ ہے یعنی انتقائے لازم سے انتقائے مطلق مراد ہے پس ایسا شخص جو لوگوں کو شکر یہ کا موقعہ نہیں دیتا یعنی کسی کے ساتھ کچھ بھی مواسات و ہمدردی نہیں کرتا تو اس کا عمل عند اللہ مشکور نہیں ہوگا کیونکہ ”وکان معہ مشکوراً“^۲۔ تو نیک سلوک کرنے والوں

باب ماجاء فی الشکر من احسن الیک

۱۔ رواہ ابو داؤد، ص: ۳۱۴ ج: ۲ کتاب الادب، مستدرک احمد، ص: ۵۰۸ ج: ۲ حدیث: ۷۴۵۲۔ ۲۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۱۹۔

کے لئے ہے۔

جبکہ تیسرے احتمال یعنی ناس کے رفع اور لفظ اللہ کے نصب کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کا شکر گزار نہ ہو لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے، کیونکہ اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو صحیح مصرف میں لگائے اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ بدکار ہوتا ہے لوگ اس کی تعریف کیسے کریں گے؟ چوتھی صورت میں تقدیر اس طرح ہوگی ”مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُهُ اللَّهُ“، یعنی جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس آدمی کا شکر ادا نہیں کرتا یعنی وہ اس کو دی ہوئی نعمتوں کا فائدہ نہیں دیتا مثلاً قلب ہوگا مگر اس میں ملکوئی فکر نہ ہوگی، آنکھیں ہوں گی مگر ان میں عبرت کی نگاہ نہ ہوگی علیٰ ہذا القیاس۔

باب ماجاء فی صنائع المعروف

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ اخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ وَامْرُكُ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَإِرشَادُكَ الرَّجُلَ فِي أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ وَبَصْرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدَى الْبَصْرُ لَكَ صَدَقَةٌ وَأَمَّا طَعْنُكَ الْحَجَرَ وَالشُّوكَ وَالْعِظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلُوكَ فِي دَلْوِ اخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ۔ (حسن غریب)۔^۱

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی کے زوہر و تیری مسکراہٹ تیرے لئے صدقہ ہے اور تیرا حکم کرنا اچھی بات کا اور زوہر و کنائمی بات سے صدقہ ہے، اور تیرا رہنمائی کرنا (پریشان حال) آدمی کی نا آشنا جگہ میں تیرے لئے صدقہ ہے اور نا پینا آدمی کی دنگیری و رہنمائی کرنا تیرے لئے صدقہ ہے اور راستے سے تیرا پتھر ہٹانا اور کاٹنا اور ہڈی ہٹانا تیرے لئے صدقہ ہے، اور تیرا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا تیرے لئے صدقہ ہے۔

لغات:- ”الصنائع“ صنیع و صنیعہ کی جمع ہے بمعنی احسان کرنے کے۔ قولہ ”تَبَسُّمُكَ تَبَسُّمُكَ“ بمعنی مسکراہٹ کے ہیں۔ قولہ ”ارض الضلال“ ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں راستہ معلوم کرنے کی علامات نہ ہوں۔ قولہ ”الردی البصر“ نابینا بصر مفتوحین بروزن شجر دیکھنے کی قوت اور نگاہ کو کہتے ہیں ردی البصر وہ شخص کہلاتا ہے

باب ماجاء فی صنائع المعروف

۱۔ ایضاً رواہ بمثلہ ابن حبان فی صحیحہ والبیہقی مختصراً عن ابی ذر، الترغیب والترہیب ص: ۳۷۷ ج: ۳۔

جو قوتِ باصرہ سے محروم ہو یعنی اندھا ہو البتہ یہاں پہلا نص بمعنی تبصیر ہے۔ قولہ ”اماطة“ ازالہ اور ہٹانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”افراغك“ بہانے اور ڈالنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”دلو“ ڈول کو کہتے ہیں۔

تشریح:- عام طور پر جہاں نیک سلوک کے حوالے سے لفظ ”اخیک“ آجائے تو اس سے مراد اسلامی اخوة ہوتی ہے، ان اعمال کو صدقات سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے صدقہ پر ثواب ملتا ہے کہ وہ ایک مسلمان یا کسی انسان کی خوشی کا سبب ہے تو اسی طرح ان اعمال کی وجہ سے جو مسلمان بھائی کی راحت کے اسباب ہیں بھی صدقہ کا ثواب ملتا ہے کہ دونوں کی علت ایک ہی ہے۔

باب ماجاء فی المنحة

”عن البراء بن عازب يقول سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: من مَنَحَ منيحةً لبن او ورقٍ او هدى زُفَاقاً كان له مثل عتق رَقَبَةٍ“۔ (حسن صحيح)^۱

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی کو دودھ والے جانور کا (بقدر ضرورت) عطیہ دیدے یا چاندی کا (بطور قرض) عطیہ دے یا کسی راستہ بھولے ہوئے کی رہنمائی کرے تو اس کو ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔

لغات:- قولہ ”المنحة“ اسی طرح منیۃ دونوں کے معنی عطیہ کے بھی آتے ہیں بایں معنی کہ موہوب لہ کو اس کا مالک بنا دیا جائے اور عاریہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، کہ کسی کو دودھ والا جانور جیسے بکری، گائے، بھینس یا اونٹنی دے کہ جب تک تمہیں ضرورت ہو اس کا دودھ استعمال کرتے رہو جب میں چاہوں گا یا تیری ضرورت ختم ہو جائے تو واپس لے لوں گا سواری کے لئے گاڑی دینا یا کوئی اور چیز استعمال منافع کے لئے دینا بھی منیۃ کہلاتا ہے۔ قولہ ”ورق“ بکسر الراء و سکونھا چاندی کو کہتے ہیں امام ترمذی نے آگے اس کی تفسیر فرمائی ہے کہ یعنی کسی کو دراہم بطور قرض دیدے۔

قولہ ”او هدى زفقا“ بضم الزاء اصل میں راستے کو کہتے ہیں یہاں مراد وہ شخص ہے جو راستے کا پتہ

باب ماجاء فی المنحة

^۱ الحدیث أخرجه مسلم في كتاب الزكاة ومسند احمد ص: ۳۲۱ ج: ۵ حدیث: ۱۷۹۳۶، ایضاً ص: ۳۶۱ ج: ۵

حدیث: ۱۸۰۳۵، ایضاً حدیث: ۱۸۰۶۰

نہیں جانتا کہ یا تو اندھا ہے یا پھر راستہ بھول گیا ہے پس مطلب ”ہدی زقاقاً“ کا یہ ہوا کہ اسے راستہ بتلائے مگر ایک روایت^۱ میں ”ہَدًی“ دال کی تشدید کے ساتھ آیا ہے تو یہ یا تو مبالغے کا صیغہ ہے یا پھر ہدیہ کے معنی میں ہے پس اس صورت میں زقاق سے مراد کھجوروں کے درختوں کی قطار ہوگی یعنی کسی کو اپنے باغ میں سے چند درخت کھجوروں کے دے، کہ وہ اس کا پھل خود حاصل کر لیں چونکہ باغ کے درخت عموماً قطار میں ہوتے ہیں اس لئے ان کو زقاق یعنی صف اور قطار سے تعبیر کیا، مگر اول راجح ہے کما فرہ المصنف۔

تشریح:- جس طرح غلام اپنی غلامی کی وجہ سے پریشان حال ہوتا ہے مگر اپنی بے بسی کی وجہ سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا تو جو شخص اسے آزاد کرتا ہے وہ غلام کے ہر عضو کے بدلے اپنے اعضاء جہنم کی آگ سے آزاد کر لیتا ہے کہ نیکی اور عمل کی جزاء نیکی کے مطابق ہوتی ہے، اسی طرح ایک آدمی ضرورت مند ہے اس کے گھر میں دودھ کا انتظام نہیں یا راستے کی وجہ سے اپنی منزل تک نہیں پہنچ پارہا ایسے میں کوئی آدمی اس کی مدد نہ کورہ صورتوں میں کر لیتا ہے اور اسے پریشانی کی قید سے اور ضرورت کی مشقت سے آزاد کر لیتا ہے تو گویا یہ نیکی، غلامی سے آزادی دلانے کے مترادف ہے اس لئے دونوں کا ثواب مماثل ہوا گو کہ درجات میں تفاوت ممکن ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی إماطة الأذى عن الطريق

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بینما رجل یمشی فی الطريق اذ وجد عُصْنَ شَوْكٍ فَأَخْرَجَهُ فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهُ فغفرَ لَهُ۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس دوران کہ ایک شخص راستے میں جا رہا تھا تو اس نے ایک کانٹے دار ٹہنی پائی تو اسے ہٹا دیا اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر فرمائی اور اس کی بخشش فرمائی۔ (حدیث حسن صحیح)

لغات:- ”اماطة“ بمعنی ازالہ اور ہٹانے کے۔ قولہ ”الأذى“ تکلیف اور ناگواری کا سبب بننے والی چیز جیسے پتھر، پانی، کانٹے اور دیگر موذی اشیاء جو راستے میں پڑی ہوں۔ قولہ ”عصن“ شاخ یا ٹہنی۔ قولہ ”شوك“ کانٹے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فاخره“ تاخیر بمعنی ابعاد اور ہٹانے کے ہیں۔

قولہ ”فشكر الله له“ اسی جزاء یعنی اللہ کو یہ عمل پسند آیا اور اس پر اس شخص کی مغفرت فرمائی۔

تشریح:- صحیحین^۱ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے:

”الایمان بضع وسبعون شعبة فافصلها قول لا اله الا الله وادناها امطة الاذى عن

الطريق والحياة شعبة من الايمان“۔

امام ترمذی نے شاید ترجمۃ الباب کو اسی حدیث سے اخذ کیا ہے، اس میں ”اَدْوٰی“ بمعنی موذی کے ہے یعنی تکلیف وہ چیز خواہ وہ کچھ بھی ہو غرض ایمان میں اعلیٰ مقاصد سے لیکر ادنیٰ مفاسد کے ازالے جیسے مقاصد تک اور حقوق اللہ سے لیکر حقوق العباد بلکہ حقوق الخلق تک تمام امور شامل ہیں، حسب مراتب اعلیٰ پر عالی درجات اور ادنیٰ پر نچلے درجات ملنے کا وعدہ ہے، مگر یہاں یہ اشکال وارد ہو سکتا ہے کہ کیا جیسے موذی اشیاء کو ہٹانا جب اعمال صالحہ کا ادنیٰ درجہ ہے تو اس پر مغفرت کیسے مرتب ہوئی؟ اس کا جواب ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ دیا ہے کہ یا تو اس سے دل میں نرمی اور رحم کا جذبہ پیدا ہوا اور پھر اس کی بدولت توبہ واستغفار کی توفیق نصیب ہوئی یا اس شخص کی نیکیاں اور برائیاں دونوں مساوی و برابر تھیں جب یہ ادنیٰ نیکی اس کے نیکیوں والے پلے میں ڈالی گئی تو وہ بھاری ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے کیا معلوم یہی نجات کا ذریعہ بن جائے خواہ پہلی وجہ کے مطابق ہو کہ اس سے ہمارے دلوں میں انشراح پیدا ہو یا پھر اس سے نیکیوں کی شرح بڑھ جائے اور بجائے پچاس فیصد کے اکاون فیصد ہو جائے۔

باب ماجاء ان المجالس بالامانة

”عن جابر بن عبد الله عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا حدث الرجل الحديث ثم

التفت ففهي امانة“۔ (حدیث حسن)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے تو یہ بات امانت ہے۔

باب ماجاء فی امطة الاذى عن الطريق

۱۔ اخرجه البخارى فى الهبة باب: ۳۵ والمظالم باب: ۲۳ والعقبة باب: ۲ والبر باب: ۳۸ ومسلم فى الايمان، وابوداؤد

فى الادب باب: ۱۶ وابن ماجه فى المقلعة باب: ۹، الترغيب والترهيب ص: ۳۷۶ ج: ۳.

تشریح :- ترجمۃ الباب کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی بھی مجلس کی بات بیان کرنا اور غیروں سے ظاہر کرنا جائز نہیں کیونکہ وعظ و نصیحت اور تعلیم وغیرہ عام مجالس کی باتوں کا افشاء بالاتفاق جائز بلکہ مطلوب ہے پس مراد وہ مجالس ہیں، جو دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان ہوں اور ان میں کی جانے والی باتوں کا اخفا مقصود ہو یعنی راز کی باتوں کا اظہار جائز نہیں علیٰ ہذا ترجمۃ الباب میں ”الجلّاس“ کا الف لام عہد کے لئے ہے اور ”بالامانة“ میں حرف جر مقدر کے ساتھ متعلق ہے تقدیر اس طرح ہے ”حق المجالس التي يراد إخفاءها بالامانة“۔

کلام کا مقصد جس طرح صریح کلام سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے اسی طرح عرف اور دلالت سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے پس جس مجلس کی باتیں راز سے تعلق رکھتی ہوں ان کا اظہار جائز نہیں خواہ کہنے والا اس کی امانت کی تصریح کرے یا نہ کرے لیکن کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہ باتیں عام بتانا نہیں چاہتا ہے مثلاً وہ کسی کو مجمع سے الگ لے جا کر بات کرے، یا کہے کہ میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کہنا چاہتا ہوں، یا باتوں باتوں میں ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی قریب سے تو نہیں گزر رہا، یا مجلس کے اختتام پر ادھر ادھر دیکھے کہ کسی نے ہماری یہ باتیں تو نہیں سنی ہوں گی، یہ تمام صورتیں اخفاء اور رازداری پر دلالت کرتی ہیں لہذا اس مجلس کی باتیں امانت ہوں گی الا یہ کہ وہ ایسی بات ہو جس کے چھپانے میں کسی دوسرے شخص کا ضرر متوقع ہو خواہ جانی ہو یا مالی ہو یا عفت و عزت سے متعلق ہو ایسے میں متعلقہ شخص کو آگاہ کرنا لازمی ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کرے چنانچہ ابوداؤد میں اس حدیث پر یہ اضافہ موجود ہے ”الاثلاثۃ مجالس سفک دم حرام او فرج حرام او اقطاع مال بغير حق“۔^۱

باب ماجاء فی السخاء

”عن اسماء بنت ابی بکر قالت قلت یا رسول اللہ انہ لیس لی من شئی الا ما أدخل علیّ الزبیر، أفأعطی؟ قال نعم، لا توکی فیوکی علیک، یقول لا تحصی فیحصی علیک“۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میری ذاتی

باب ماجاء ان المجالس بالامانة

^۱ سنن ابی داؤد ص: ۳۲۰ ج: ۲ ”باب فی نکل الحدیث“ کتاب الادب. حفیظ الرحمن الحنفی ندوة العلم کراچی

ملک میں کوئی چیز نہیں ہے سوائے اس کے جو زیر لاکر مجھے دیتے ہیں (یعنی گھر میں لاتے ہیں) تو کیا میں وہ دے سکتی ہوں؟ (یعنی اس میں سے مجھے صدقہ دینے کا اختیار ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں“ تم بندھن مت لگانا ورنہ تجھ پر بندھن لگا دیا جائے گا (یعنی ڈوری مت کسو ورنہ تیری رزق دانی کی ڈوری کس کر تنگ کر دی جائے گی) (راوی کہتا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کن کن کر مت رکھو ورنہ تیرے ساتھ بھی گنتی اور حساب کا معاملہ ہوگا۔

لغات :- سخاوت فضائل اعمال اور اخلاق کریمانہ میں عمدہ وصف ہے چونکہ ہر فضیلت دو روزیتوں کے درمیان ہوتی ہے اس لئے سخاوت بخل اور اسراف کے مابین معتدل درجے کا نام ہے، جو ضرورت اور مروت کے مطابق طیب خاطر سے مالی حقوق کی ادائیگی سے عبارت ہے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔

قولہ ”لانو کسی“ ایکاء سے ہے وکاء وہ ڈوری کہلاتی ہے جس سے مشکیزے یا تھیلے کو باندھا جاتا ہے کنایہ ہے عدم بخل سے کیونکہ پہلے زمانے میں لوگ راشن کی چیزیں آٹا وغیرہ خشک مشکیزے میں رکھتے تھے۔ قولہ ”لانو حصی“ یہ راوی کی تفسیر ہے احصاء دراصل کنکریوں کے ساتھ گننے کو کہتے ہیں جس میں غلطی کا امکان تقریباً معدوم ہوتا ہے۔ احصاء کے دوسرے معنی پورے پورے استعمال کے بھی آتے ہیں مفسرین نے ”وَإِنْ تَعْلَمُوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا“ میں دونوں مطلب بیان کئے ہیں علیٰ ہذا مطلب یہ ہوگا کہ کھانے کی چیزیں گن گن کر اس نیت سے نہ رکھنا کہ سب خود ہی گھر میں کھائیں گے اور کسی کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیں گے۔ قولہ ”فیو کسی وفی حصی“ دونوں صیغے مجہول کے ہیں یعنی تیرے ساتھ بھی اللہ کی طرف سے پھر ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

تشریح :- حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا جو حضرت زبیر بن العوام کی بیوی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی ہیں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتی ہیں، کہ میرا ذاتی ملکیت میں تو کوئی مال نہیں ہے دوسری جانب بنت الصدیق ہونے کے ناطے بغیر صدقہ کے بھی نہیں رہ سکتی تو کیا میں اپنے شوہر کے کمائے ہوئے مال سے صدقہ دینے کی مجاز ہوں؟ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب مرحمت فرما کر خرچ کرنے اور صدقہ دینے کی رغبت دلائی۔

اس حدیث میں دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ عورت شوہر کے مال میں کس حد تک خرچ کرنے اور صدقہ دینے کا حق رکھتی ہے، دوسری یہ صدقہ کرنا اور سخاوت مال بڑھانے کا سبب ہے اس کے برعکس بخل مال کی برکت کی قلت یا انعدام کا موجب ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل ”باب ما جاء في نفقة المرأة من بيت زوجها“ ابواب الزکوٰۃ میں گزری ہے (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد سوم ص ۱۵۷) خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت شوہر کے مال میں سے صدقہ نہیں دے سکتی تاہم اذن عام ہے خواہ صراحاً ہو یا عرفاً ودلالة، اس میں ہر علاقے اور قوم کا عرف ملحوظ رکھنا لازمی ہے بلکہ ہر آدمی کے مزاج کا خیال بھی ملحوظ رکھا جائے گا خصوصاً آج کل چونکہ بخل کا دور دورہ ہے لوگوں کی اکثریت دینوی جمع کو اخروی جمع پر ترجیح دیتی ہے اس لئے آج صدقے کی اہمیت کافی گھٹ گئی ہے بخلاف اسلاف اور متقدمین کے اور خصوصاً عرب اور خاص الخاص زیر بن العوام رضی اللہ عنہ صدقہ سے خوشی محسوس فرماتے لہذا اس قسم کی احادیث کو عربوں اور خصوصاً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عرف و مزاج کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

دوسری بات تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو محققین کے نزدیک مسلم ہے بلکہ مجرب ہے اور قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت سے اور خصوصاً اقارب کے ساتھ نیک سلوک سے مال بڑھ جاتا ہے، چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے شرح البخاری ”فضل الباری“ میں اس آیت ”وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ“ (الطلاق آیت نمبر ۷) اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اسی میں سے خرچ کرے، کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

”ایک نابینا طالب علم نے اپنے وہم و تخیل کی بنا پر مجھے مجبور کیا کہ مجھ کو بھی دست غیب کا عمل سکھا دو، میں نے اس کو اس آیت کے مدلول پر عمل کرنے کو کہہ دیا گو اس آیت کا شان نزول اور کچھ ہے مگر اشارہ عام مضمون کی طرف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ وعدہ ایزدی ہے اس کا خلاف ناممکن ہے اور امت میں سے بہت سے لوگوں کا یہی تجربہ ہے۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کی روزی میں وسعت ہوگی۔ (فضل الباری ص ۳۰۹ ج ۱)“

باب کی حدیث اس مضمون پر صریح ہے اور حدیث صحیح ہے شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔^۱

دوسری حدیث :- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ سخی شخص اللہ سے قریب رہتا ہے، جنت کے قریب ہوتا اور لوگوں سے بھی قریب ہوتا اور دوزخ سے دور رہتا ہے جبکہ بخیل اللہ (کے رحم) سے دور ہوتا ہے جنت سے بھی بعید ہوتا اور لوگوں سے بھی دور رہتا ہے اور جہنم کے نزدیک رہتا ہے، اور جاہل سخی خدا کے نزدیک بخیل عبادت گزار کی بنسبت زیادہ محبوب ہے۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور بلکہ منقطع ہے اور امام ترمذی کے کلام میں مرسل سے منقطع مراد ہے تاہم اس کے طرق متعدد ہیں۔ (اخر جہا البیہقی فی شعب الایمان والطبرانی فی الاوسط) لہذا اس کا صحیح مطلب جاننا اور بعض الفاظ کی توجیہ لازمی ہے۔ پس اللہ کے قریب ہونے سے مراد باعتبار مسافت نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل مکان و جہت سے منزہ ہے بلکہ یہاں اس کی رحمت کا قریب ہونا اور زیادہ ثواب ملنا مراد ہے، جبکہ جنت سے قرب باعتبار مکان بھی ہو سکتا ہے اور لوگوں کے قریب ہونے سے مراد محبت کرنا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرب مکانی مراد ہو کیونکہ سخی آدمی کے پاس مہمان زیادہ آتے ہیں اور دوست بکثرت ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر اس کے آس پاس بیٹھے رہتے ہیں۔

”والجاہل السخی“ الخ اس عبارت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جاہل سے مراد وہ شخص ہو جس کے پاس فرض کے بقدر علم تو ہوتا ہے لیکن وہ بتحر عالم نہیں ہوتا ہے، ایسے شخص کو عرف میں جاہل کہا جاتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ایک آدمی ضروری علم کے ساتھ سخاوت کرتا ہے اور نوافل کا اہتمام نہیں کرتا تو یہ شخص اس عبادت گزار سے افضل ہے، جو اگرچہ ضروری علم کے ساتھ نوافل کا اہتمام کرتا ہے مگر سخاوت نہیں کرتا، یہ اس فلسفہ پڑی ہے کہ پہلا شخص دنیا سے بے زار ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو مال میرے پاس ہے یہ رہ جانے والا ہے لہذا اس کو آگے بھیجا جائے جبکہ دوسرے کا دل دنیا میں لگا ہوا ہے، اس لئے وہ مال جمع کرتا رہتا ہے، دیکھئے یہ میٹکوں کے ملازمین کس خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے ہیں مگر حرام کی کمائی بڑی احتیاط

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۲۲۵ ج: ۱ ”باب فی الشح“ کتاب الزکوۃ، سنن نسائی ص: ۳۵۵ ج: ۱ ”الإحصاء فی الصدقة“

کتاب الزکوۃ، ایضاً مسند احمد ص: ۳۸۲ ج: ۷ حدیث: ۲۶۳۷۲۔

۲۔ اخرجہ الطبرانی فی الاوسط حدیث: ۲۳۶۱ والعقلمانی فی الضعفاء الکبیر ۲/۱۱۷ وابن عدی فی الکامل ۲/۲۳۸

والبیہقی فی شعب الایمان ۷/۳۲۸، ۳۲۹ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۳۸ ج: ۳ کتاب الزکوۃ۔ الحنفی

سے جمع کرتے رہتے ہیں البتہ ایسا عالم جو بکھر ہو اور دوسروں کو بھی علمی فائدہ پہنچاتا ہو تو وہ نخی جاہل سے افضل ہے۔ قالہ فی العارضة

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سخاوت اور بخل کا تعلق حقوق واجبہ سے جوڑا جائے تو جو آدمی زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ اور لازمی حقوق ادا کرتا ہے وہ اگرچہ نوافل بکثرت نہیں پڑھتا مگر پھر بھی وہ اس عبادت گزار سے افضل ہے، کہ نوافل تو بہت پڑھتا ہے مگر واجبی حقوق کی ادائیگی نہیں کرتا، وجہ ظاہر ہے کہ اول فرائض پر عمل پیرا ہے جبکہ دوسرا فقط نوافل میں لگا ہوا ہے اور فرائض سے تغافل برت رہا ہے بلاشبہ فرائض کا درجہ نوافل سے اعلیٰ ہے۔ (سخاوت کی مزید تفصیل اور فضائل دیکھنے ہوں تو نقش قدم فصل نمبر ۵ ملاحظہ ہو) غرض دنیا کی محبت ہر بُرائی کی جڑ ہے اور زہادت ہر نیکی کی بنیاد ہے۔

باب ماجاء فی البخل

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: حصلتان لا تحتمعان فی مؤمن البخل وسوء الخلق“۔ حدیث غریب اخرجه ایضاً أحمد و ابو داؤد و الحاكم۔^۱ قال ابن العربی فی العارضة: هذا الحدیث وان كان غریباً فانه تعضده احادیث و تعارضه أخر۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو عادتیں یعنی بخل اور بد خلقی کسی مؤمن میں (بطور ملکہ کے) جمع نہیں ہو سکتیں۔

ترکیب:- بعض حضرات نے نکارت مبتداء سے بچنے کی غرض سے ”لا تحتمعان“ کو ”حصلتان“ کے لئے صفت مخصوصہ بنایا ہے اور ”البخل وسوء الخلق“ کو ”خبر“ جبکہ بعض نے ”البخل وسوء الخلق“ کو مبتداء اور ”حصلتان“ موصوف صفت کو ”خبر مقدم“ بنایا ہے۔ لیکن ان دونوں ترکیبوں سے حدیث کا مطلب صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکتا جیسا کہ ادنیٰ تا مل سے ظاہر ہوتا ہے، اس لئے صحیح ترکیب یہ ہے کہ ”حصلتان“ مبتداء ہے اور ”لا تحتمعان“ خبر ہے اور جہاں تک نکارت مبتداء کا مسئلہ ہے تو یا تو کہا جائے گا کہ ”البخل وسوء الخلق“

باب ماجاء فی البخل

۱۔ رواہ ابو داؤد فی الادب باب: ۱۰۰، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۵۸ ج: ۳ رواہ الترمذی وغیرہ، وفی اعلاء السنن اخرجه الترمذی وفی سندہ ضعف ص: ۴۵۶ ج: ۱۸، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی۔

الخلق“ بناء بر بدلیت از مبتدا تخصیص کے لئے کافی ہیں۔

مگر اس سے بھی زیادہ آسان جواب یہ ہے کہ نکارت مبتداء کی ممانعت کوئی منصوص علیہا چیز نہیں ہے جس میں رائے کو دخل نہ ہو بلکہ یہ ایک مفید رائے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جس کلام میں مبتدا نکرہ ہو تو چونکہ وہ کلام فائدے سے عموماً خالی ہوتا ہے اس لئے ایسا کلام ممنوع ہے، مگر جہاں یہ وجہ نہ ہو تو وہاں یہ پابندی کیوں لاگو ہوگی؟ اس لئے کہا جائے گا کہ کلام کا دار و مدار فائدے پر ہے پس اگر نکارت مبتداء کے باوجود کلام مفید ہو سکتا ہے تو بلاشبہ وہ ترکیب صحیح ہی ہوگی، چنانچہ اس قسم کی ایک اور حدیث میں جب علامہ طیبیؒ نے ایسا تکلف کیا تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے رضی سے یہی بات نقل کر کے اسے رد کر دیا اور رضی تو نحو کا ابام ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے: ”حصلتان معلقتان فی اعناق المؤذنین للمسلمین صیامهم وصلاتهم“۔ (رواہ ابن ماجہ، ۲ مشکوٰۃ ص: ۶۷) اس میں طیبیؒ نے ”للمسلمین“ کو خبر بنایا ہے ”حصلتان“ کی مگر اس سے مطلب یکسر تبدیل ہو جاتا ہے اس پر شیخ کھتے ہیں:

”ولاشك ان المتبادران قوله معلقتان خبرونكارة المبتداء قد تكلما فيه مبراران

المدار على الافادة كما ذكره الرضى الخ۔ (مشکوٰۃ ص ۶۷ حاشیہ نمبر ۹)

اس لئے اوپر ترجمہ میں ”حصلتان“ کو مبتداء اور ”لا تجمعان“ کو خبر بنایا گیا ہے تاکہ حدیث کا مطلب تبدیل یا مسخ نہ ہو۔

تشریح:- سابقہ باب میں سماء کی تعریف سے بخل کی تعریف خود بخود معلوم ہوتی ہے کہ ”انما الاشياء تعرف باضدادها“ لہذا کہا جائے گا کہ شرع جہاں مال خرچ کرنے کا حکم دے یا مروت اس کا تقاضا کرے وہاں خرچ نہ کرنا بخل ہے خواہ حقوق اللہ کی مد میں ہو یا حقوق العباد۔

گوکہ خلاف شرع اور خلاف مروت دونوں اوصاف مذموم اور قبیح ہیں تاہم وہ بخل جو محلفیت شریعت کے زمرے میں آتا ہے زیادہ شنیع ہے اس سے جو خلاف مردت کہلاتا ہے۔

اس حدیث کا مطلب شارحین کے لئے کافی مشکل رہا ہے وجہ اشکال یہ ہے کہ اس ارشاد پاک کے مطابق بخل اور بد اخلاقی ایمان کے منافی ہیں حالانکہ مؤمن میں ان دونوں کا مشاہدہ تو کیا جاسکتا ہے جس سے ان کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے۔

پھر اس اشکال سے بچنے کے لئے متعدد توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً مومن سے مراد کامل ہے لہذا مطلب یہ ہوگا کہ کامل مومن میں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں اور جن مومنین میں مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ گویا کاملین نہیں ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں خامیاں بطور ملکہ اور عادت راسخہ کے جمع نہیں ہو سکتی ہیں گو کبھی کبھار ہو سکتی ہیں۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہ دونوں خصلتیں بھرپور انداز میں جمع نہیں ہو سکتی ہیں اگرچہ مقدارِ قلیل ممکن ہے۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ اگر اخلاق کی تعریف اور حقیقت سمجھ میں آجائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان تینوں توجیہات کا مطلب اور مآل ایک ہی ہے صرف تعبیرات کا فرق ہے۔ الحمد للہ راقم نے اخلاق کے موضوع پر کتاب لکھی ہے اس میں اخلاق کی تعریف تفصیل سے دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاق دراصل ان ملکات اور راسخ کیفیات نفسانیہ کا نام ہے جو اللہ عز و جل پیدائش کے وقت کسی آدمی میں ودیعت فرماتا ہے، یہ وہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو ان کے مطابق افعال کا صدور باسانی ہوتا ہے مثلاً ایک دن کا نومولود بچہ ہے مگر اس کے اندر شجاعت، عفت اور حکمت پائی جاتی ہیں تو اگرچہ فی الوقت ان کے آثار نظر نہیں آتے مگر جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اگر کسی عارض سے وہ اس کی مخالفت کرے تو اس سے اخلاق پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں پڑتا مثلاً ایک آدمی کے اندر خوج کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے تو یہ شخص خنی کہلائے گا لیکن اگر بعارض وہ کسی وقت خوج کے موقع پر خوج نہ کرے تو یہ بدستور خنی ہی کہلانے کا مستحق ہے تا آنکہ کنجوسی اس کا مزاج ثانی نہ بن جائے، پھر اخلاق کے بڑے بڑے ستون تین ہیں، شجاعت، عفت اور حکمت ان کے اجتماع سے عدالت جنم لیتی ہے۔ تفصیل نقش قدم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علیٰ ہذا چونکہ مومن تو وہی ہوتا ہے جس کا باطن صاف ہو یا کم از کم رذائل اخلاق سے بچنے کی کوشش کرتا ہو لہذا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ بحیثیت مومن وہ بخل کر کے مالی حقوق کو پامال کرے اور بد اخلاقی و بد تمیزی کر کے معاشرتی حقوق کو روندے خاص کر تسلسل سے تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا، اگر اس کے باوجود کوئی ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے اپنے خاتمے کے لئے فکر مند رہنا چاہئے کیونکہ ایسی خرابیاں عاقبت کو خراب کر سکتی ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ غرض یہاں از روئے ایمان اور بحیثیت ایمان کی بات ہو رہی ہے۔

”قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ان العبد لیعمل عمل اهل النار وانه من اهل الجنة“

ويعمل عمل اهل الجنة وانه من اهل النار وانما الاعمال بالخواتيم“۔ (شفق علیہ ۳)

یعنی بد باطن کی وجہ سے آدمی بالآخر دوزخیوں کی راہ لیتا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ لہذا ہر مؤمن کو چاہئے کہ اپنے باطن کو صاف و شفاف بنالے تاکہ اسلام کے احکام کے حوالے سے انشراح قلب میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا رہے، یہاں تک کہ جب موت آجائے تو انشراح نور علی نور بن جائے۔

باب کی دوسری حدیث:- ”لا يدخل الجنة حب ولا بخل ولا منان“۔ ۴

دغا باز، کنجوس اور احسان جتانے والا جنت میں نہیں جائیں گے۔

لغات:- قولہ ”حب“ بکسر الخاء وتشديد الباء جبکہ فتح بھی جائز ہے مکار، فریب کار اور دھوکہ باز کو کہتے ہیں جو کہتا کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے عارضہ میں ابن العربی لکھتے ہیں: ”الخب هو الماكر الذي يظهري للناس من الخير خلاف مايسره فيمايعود اليهم“۔ قولہ ”منان“ منّ سے ہے بفتح الميم وتشديد النون اس کے صلہ میں جب ”علی“ آجائے تو بمعنی احسان کرنے اور احسان جتانے کے آتا ہے اور بغیر صلہ ”علی“ کے بمعنی قطع کے آتا ہے جیسے منّ الحبل رسی کاٹ دی۔ اس حدیث میں دونوں احتمال ہیں کہ یا تو معنی یہ ہو کہ احسان جتانے والا جنت میں نہیں جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

تشریح:- اس حدیث کے مطلب میں بھی متعدد اقوال ہیں ایک یہ کہ حب سے مراد کافر ہے جیسا کہ اگلی روایت میں مؤمن کے ساتھ تقابل سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد دخول اولیٰ کی نفی ہے کیونکہ جنت صاف ستھری جگہ ہے وہاں گندے اعمال اور نازیبا اخلاق کے حامل لوگ نہیں جاسکتے یہاں تک کہ صاف ہو جائیں یا اللہ کے معاف کرنے سے یا جہنم کی آگ سے، ہاں جو گندگی ایسی ہے جو ختم نہیں ہو سکتی تو دوزخ میں جلنے کے باوجود بھی وہ پاک نہیں ہوں گے جیسے مشرکین اور دیگر کفار۔

ایک مطلب وہی ہے جو اوپر والی حدیث کی شرح میں گذر گیا کہ ایسے عیوب عموماً خاتمہ بالخیر سے مانع بنتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ اور عام فہم مطلب وہ ہے جو بارہا گذرا ہے کہ یہ خاصیات المفرد ہیں یعنی ان افعال کی تاثیر یہ ہے کہ جنت سے روکتے ہیں تاہم قیامت کے دن فیصلہ مفردات کے بجائے مرکب اعمال پر ہوگا تدبیر۔ ابن العربی لکھتے ہیں کہ احسان جتانے والا گویا اللہ کی مشابہت اختیار کرتا ہے کیونکہ انعامات دے

۳ صحیح بخاری ص: ۹۷۸ ج: ۲ کتاب القدر، ایضاً ص: ۹۷۱ ج: ۲ ”باب فی الاعمال بالخواتیم“ کتاب الرقاق،

ایضاً رواہ احمد فی مسنده ص: ۳۵۸ ج: ۶ حدیث: ۲۲۳۲۸۔ ۴ ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۵۸ ج: ۳۔

کراחסانات جتنا اور تکبر تو اللہ کا وصف ہے، بندے کو تو عاجزی اور تواضع اختیار کر لینی چاہئے یعنی اپنا کام کر لینا چاہئے خدا کا کام اور اس کی صفات خاصہ میں شرکت و مداخلت نہیں کرنی چاہئے، خاص کر جب آدمی کو اپنے خاتمے کا علم بھی نہ ہو اور اگر بالفرض علم بھی ہو جائے تو پھر انبیاء علیہم السلام کی سنت، تواضع کو اپنانا چاہئے۔

قال: "و كذلك لا بدخل الجنة منان وهو الذي يفخر بنعمته على المنعم عليه فان ذلك انما هو لله سبحانه و لرسوله اذا الكبرياء لله في السموات والارض والتكبر مضموم في حق العبد لرؤيته نفسه فوق غيره وهو لا يعلم خاتمة امره وان علم فمن حقه ان يتواضع كما فعلت الرسل الكرام التي تحققت خواتيمها وتواضعت لامر ربها"۔

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

باب کی تیسری حدیث:- "المؤمن غر کریم والفاخر حجب لنیم"۔^۵

مومن سادہ لوح اور جلد دھوکہ میں آ جانے والا اور شریف النفس ہوتا ہے جبکہ فاجر دھوکہ باز اور کمینہ ہوتا ہے۔

لغات:- "غر" بکسر الفین وتشدید الراء بمعنی سادہ لوح، سیدھا سادہ اور جلد دھوکہ میں آ جانے والا کے قولہ "کریم" بلیم کی ضد ہے بمعنی شریف الطبع، نجی، عالی ظرف اور صاحب عزت کے قولہ "لنیم" بردزن کریم۔ یہ لفظ لوٹا سے مشتق ہے بفتح اللام و سکون الهمزة "لوم فلان" کم ذات ہونا، نچلے اور گھٹیا درجہ کا ہونا، خیس، کم ظرف اور بخیل ہونا وغیرہ اس کے مفہوم میں شامل ہیں، چونکہ کریم میں سخاوت کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے لنیم میں اس کی ضد یعنی بخل کے معنی کو ملحوظ رکھنا بھی مناسب ہے۔

تشریح:- حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن جاہل ہوتا ہے اس لئے دھوکہ کھا جاتا ہے بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ "المرا یقیس علی نفسه" کے اصول کی بنا پر مومن دوسرے کو بھی سچا سمجھتا ہے خاص کر جب

دوسرا دھوکہ باز ہو تو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور بڑے بڑے دعوے کرتا ہے چونکہ مؤمن کا دل صاف ہوتا ہے اس لئے فاجر کی باتیں اس خالی لوح پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، دیکھئے ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام سے جھوٹ بولا اور قسم کھائی کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں چنانچہ اس کی قسم جھوٹی تھی مگر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اللہ کے نام سننے کے بعد کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا۔ اور بخاری شریف کتاب الانبیاء میں روایت ہے:

”رأى عيسى رجلاً يسرق فقال له اسرقت قال كلا والذي لا اله الا هو فقال

عيسى امنن بالله وكذبت عيني“۔ (بخاری ص: ۴۹۰ جلد ۱، باب قول اللہ عز وجل واذا كرني

الكتاب مريم الخ)

غرض مؤمن حسن ظن اور دنیوی امور میں عدم دلچسپی اور درگزر و تسامح کی بنا پر دھوکہ کھا جاتا ہے جبکہ فاجر بدگمانی کی وجہ سے اچھی اور سچی بات کو شک کے تناظر میں دیکھتا ہے کہ اس کا کام یہی ہوتا ہے، اس کی آسان مثال یہ ہے کہ اکثر سیاسی لوگ ہمارے علماء کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں اور علماء ان کے وعدوں پر بھروسہ کر کے نقصان اٹھاتے ہیں۔

لیکن یہاں شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں ایک اعتراض کر کے پھر اس کا جواب دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحیحین کی روایت کے مطابق ایک آدمی کو بدر میں گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بہت زیادہ اعذار اور حیلے بہانے کر کے رہائی حاصل کر لی مگر جب گھر پہنچا تو کہنے لگا کہ میں نے محمد کو دھوکہ دیا، پھر وہ شخص دوبارہ گرفتار ہوا اور حسب سابق پھر معذرت کرنے لگا ”فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا یلدغ المؤمن من جحرٍ واحدمرتین“ الخ۔ اس لئے نبی علیہ السلام نے اسے نہیں چھوڑا تو بظاہر باب کی حدیث اور صحیحین کی حدیث میں تعارض ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن حیلہ ساز اور غیار نہیں ہوتا جو کسی معاملے کی پہلے سے حیلہ سازی کرتا رہے جبکہ صحیحین کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن جب کسی مرحلے سے گزر جائے اور اس میں ایک بار دھوکہ کھائے تو دوبارہ اس معاملے میں پھر دھوکے میں نہیں آتا، لہذا کوئی تعارض نہ رہا۔

اس حدیث کو سراج الدین قزوینی نے موضوعات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس کا راوی بشر بن رافع امام احمدؒ کے نزدیک ضعیف ہے مگر صلاح الدین علابی نے ابن معین سے نقل کیا ہے: ”لیس به بأس“ کما فی حاشیة القوت و فیہا التفصیل۔ نیز اس کے متابع بھی موجود ہیں، صاحب تحفہ لکھتے ہیں: أخرجه احمد و ابو داود و الحاكم۔ ابن العربی نے عارضہ میں بھی اس پر اعتراض نہیں کیا ہے لہذا یہ کم از کم درجہ حسن تک پہنچ سکتی ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

باب ماجاء فی النفقة علی الاہل

”عن ابی مسعود الانصاری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: نفقة الرجل علی اہله صدقة“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کا خرچ کرنا اپنے اہل خانہ پر صدقہ ہے۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ کی صحت اور ثواب کا دار و مدار صرف اس پر نہیں ہے کہ غیروں اور فقراء کو کچھ دیا جائے بلکہ اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے سے بھی صدقہ کا ثواب مل جاتا ہے خواہ اہل خانہ سے مراد بیوی لی جائے یا دیگر افراد خانہ لئے جائیں، اسی طرح وہ نان نفقہ واجبی ہو جیسے بیوی اور نابالغ بچوں پر یا غیر واجبی ہو جیسے ان کے علاوہ دوسرے افراد خانہ پر۔ البتہ بظاہر یہ ثواب اس وقت ملے گا جب وہ اس اتفاق میں ثواب کی نیت کرے چنانچہ صحیحین کی روایت اس طرح ہے ”اذا انفق المسلم نفقة علی اہله و هو یحتسبها“۔^۱ ہاں البتہ صدقات سارے مساوی اور برابر نہیں ہیں بلکہ نفس ثواب میں شرکت کے باوجود ان میں تفاوت پایا جاتا ہے، بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہم اپنے معاملات اور مباح اعمال یا وہ اعمال جو ہمارے ذمے کمی کے حق کے طور پر واجب ہیں۔ ان کو بھی بیت ثواب عبادت بنا سکتے ہیں۔

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۳۱۲ ج: ۲ کتاب الادب، ومسند احمد ص: ۱۰۳ ج: ۳۔

باب ماجاء فی النفقة علی الاہل

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۰۵ ج: ۲ ”باب فضل النفقة علی الاہل“ کتاب النفقات، ایضاً مسند احمد ص: ۳۶۷ ج: ۶ حدیث: ۲۱۸۴۲، وأخرجه مسلم فی الزکوة ص: ۳۲۳ ج: ۱ حدیث: ۴۸، والنسائی فی الزکوة باب: ۶۰ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۴۲ ج: ۳۔

دوسری حدیث :- حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہتر دینار وہ دینار ہے جسے آدمی اپنے عیال (گھر والوں) پر خرچ کرے اور (پھر) وہ دینار ہے جس کو آدمی اللہ کی راہ میں اپنی سواری پر خرچ کرے اور (پھر) وہ دینار ہے جس کو آدمی اللہ کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرے۔ ابو قلابہ (راوی) فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیال سے ابتدا فرمائی، پھر فرمایا (ابو قلابہ نے) کہ کس شخص کا ثواب اس آدمی سے زیادہ ہو سکتا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو سوال سے محفوظ رکھتا ہے اور اسی انفاق کی وجہ سے اللہ ان کو مستغنی کر دیتا ہے۔^۱ (ہذا حدیث حسن صحیح)

تشریح :- اگرچہ ”واو“ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی مگر راوی ابو قلابہ نے ترتیب ذکر کی کو دیکھتے ہوئے اولاد پر خرچ کرنے کا ثواب باقی دو قسموں سے زیادہ قرار دیا کہ اگرچہ یہ تینوں اخراجات بڑے اجر و ثواب کے باعث ہیں مگر اہل و عیال کا درجہ زیادہ اعلیٰ ہے، پھر نبی سبیل اللہ شریعت کی اصطلاح میں جہاد کے لئے استعمال ہوتی ہے لہذا اس کا اصل مصداق تو مجاہدین ہیں مگر مع ہذا طلب علم اور دین کے کسی بھی کام کی غرض سے گھر سے نکلنے پر بھی سبیل اللہ کا اطلاق بعض احادیث سے ثابت ہیں لہذا اس حدیث کو عموم پر رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی الضیافۃ وغایۃ الضیافۃ کم ہو؟

”عن ابی شریح العدوی انہ قال: أَبْصَرْتُ عَيْنَايَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَمِعْتُهُ أَذْنَايَ حِينَ تَكَلَّمَ بِهِ قَالَ: مَنْ كَانَ يَوْمًا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَكْرَمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ قَالُوا: وَمَا جَائِزَتُهُ؟ قَالَ يَوْمٌ وَلَيْلَةٌ قَالَ: وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ وَمَا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ وَمَنْ كَانَ يَوْمًا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقِلْ خَيْرًا أَوْ لَيْسَ سَكْتَ“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو شریح العدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ ارشاد فرما رہے تھے تو اس وقت میری آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، اور میرے کان سُن رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے تو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اس کے امتیازی کھانے کا خیال رکھے، صحابہ کرامؓ نے پوچھا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا ایک شب و روز (خصوصی)

مہمانی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان نوازی تین دن تک ہے اس کے بعد جو کھلایا جائے گا وہ (محض) صدقہ ہوگا اور جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے تو وہ بھلی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔

لغات:- قولہ ”جائزہ“ اس لفظ کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ مہمان جب جانے لگے تو اسے رخصت کرتے وقت اتنا کھانا دے دیں جو اس کے ایک شب و روز کے لئے کفایت کرے۔ یہ مطلب صحرائی اور جنگلوں کے سفر کے ساتھ مناسب ہے۔ دوسرا یہ کہ نفس مہمان نوازی تو تین شب و روز ہے مگر پہلا دن بطور خاص اہتمام والا ہونا چاہئے جس میں اپنے معمول سے زیادہ عمدہ کھانا امتیازی طور سے تیار کیا جائے۔ اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے جس میں جائزہ کو عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ”الضيافة ثلاثة ايام وجائزته يوم وليلة“۔^۱

ترمذی کی روایت کے مطابق ”جائزہ“ منصوب ہے کہ یہ ”فلیکرم“ کا مفعول ثانی ہے کیونکہ ”فلیکرم“ بمعنی اعطاء کے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب بزرع الخافض ہو ”ای فلیکرم ضیفہ بحائزہ“۔

تشریح:- اسلام کی آمد سے پہلے بھی عربوں کی بعض عادات و رسومات ایسی تھیں جو سنت ابراہیمی کی بنیادوں پر قائم تھیں یا پھر انسانیت سے ہم آہنگ تھیں۔ اسلام نے ایسی رسومات کو جوں کا توں اپنی حالت پر برقرار رکھا ہے۔ ازاں جملہ ایک ضیافت کی روایت تھی جو عربوں میں رائج تھی، اس روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مزید تاکید نقل فرمائی ہے جو اپنی عادت کے مطابق فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کے دوران میری آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، اور کان یہ ارشاد سن رہے تھے۔ ترمذی ہی میں ابواب الحج کی پہلی حدیث بھی انہی سے مروی ہے، اس میں بھی انہوں نے یہی انداز گفتار اپنایا ہے، کسی راوی کے یہ انداز تعبیر اختیار کرنے کا مقصد حدیث کے کمال حفظ سے کنا یہ ہوتا ہے، یا محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے اپنے قلب کو محفوظ و منور کرنا ہوتا ہے کہ تذکرہ حبیب سے جو لطف ملتا ہے اس کا اندازہ محبت ہی کر سکتا ہے۔ اس ارشاد پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ اسلام نے صحیح رسومات و روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کی تائید اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بھی فرمائی لہذا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ضیافت کا حکم اب پہلے سے زیادہ

مؤكد ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان عقیدہ کا لازمی جزء ہے۔ راقم نے اپنے کانوں سے بعض پروفیسروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اہل مغرب یعنی یہود و نصاریٰ کو کافر نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ اس سے منافرت پھیلتی ہے اور دہشت گردی کو تقویت ملتی ہے۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شور با، ان کا زعم یہ ہے کہ ایمان بالرسول لازمی نہیں اور اللہ و آخرت کو تو وہ لوگ مانتے ہیں پھر وہ کیوں کافر ہوئے؟؟؟

یہ لوگ ان نصوص سے استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن پر ایمان کا ذکر نہیں ہے مثلاً سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۳ اور ۱۱۴ میں ہے:

”لَيْسُوا سَوَاءً“ من اهل الكتاب امة قائمة يتلون ايات الله اثناء الليل وهم
يسجدون يومنون بالله واليوم الآخر ويامرون بالمعروف واولئك من
الصالحين۔“

اسی طرح باب کی حدیث میں بھی ایمان بالرسول والکتاب کا ذکر نہیں ہے۔

جواب:- ویسے تو اہل زلف کا اصول یہی ہے کہ وہ ان نصوص سے استدلال کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جن میں اجمال یا اختصار ہوتا ہے مگر آج کل کے روشن خیال طبقے نے اس طرز استدلال کو اپنا مشن بنایا ہے چونکہ ان لوگوں کا مقصد دین اسلام سے لوگوں کو ہٹانا ہے اس لئے ان کی تحریروں اور تقریروں میں یہ عنصر نمایاں ہے یہ لوگ اپنا ایک معیار مقرر کر لیتے ہیں جس میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اہل مغرب کے فضاء کے مطابق ہو بلکہ بسا اوقات یہ مشن ان کو سونپا جاتا ہے پھر یہ لوگ سفطانیہ طرز استدلال سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور صریح درجنوں نصوص کو نظر انداز بلکہ ان کا انکار کر لیتے ہیں۔ راقم نے اپنی کتاب ”تجدد پسندوں کے افکار کا جائزہ“ میں اس پر نسبتاً تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ لوگ صرف ایک لکیر پر چلتے ہیں اور باقی علوم کے جتنے اصول ہیں ان سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ صرف نظر کرتے ہیں حالانکہ بلاغت کا سلسلہ اصول ہیں، کہ بعض مخاطب کے سامنے یا بعض اوقات ایک بات مجمل بیان کی جاتی ہے جبکہ وہی بات دوسرے موقع پر تفصیلی بیان کی جاتی ہے یا اس لئے اجمال ہوتا ہے کہ وہ بات دوسری جگہ تفصیلاً آچکی ہوتی ہے فقہاء و بلغاء کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں کہ ایک بات ایک جگہ مقید ہوتی ہے مگر دوسری جگہ اس میں وہ قید ذکر نہیں کی جاتی ہے حالانکہ وہ ملحوظ بلکہ ضروری ہوتی ہے،

جیسا کہ علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم مفتی میں بوضاحت بیان کیا ہے، مفسرین نے اس نکتے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“۔

لہذا ہم کہتے ہیں کہ سورۃ آل عمران کی یہ آیت جس حالت میں نازل ہوئی ہے اس کا مقتضایہ یہی تھا کہ اس میں فقط اتنا ہی بیان ہو جبکہ دوسری درجنوں آیات میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول والقرآن کی بارہا تصریح کی گئی ہے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم بطور نمونہ یہاں معدودے چند ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) ”قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکفرین“۔ (آل عمران آیت

(۳۲)

(۲) ”یا اهل الکتاب لم تکفرون باللہ وانتم تشهدون“۔ (آل عمران آیت نمبر ۷۰

(۷۸۳)

(۳) ”ویقولون علی اللہ الکذب وهم یعلمون“۔

(۴) ”ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخسیرین“۔

(۵) ”کیف یهدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانہم وشهدوا ان الرسول حق وجاءہم البینت“

واللہ لا یهدی القوم الظالمین اولئک جزاء ہم ان علیہم لعنة اللہ والملائکة والناس اجمعین۔ خالدین فیہا لا یخفف عنهم العذاب ولا هم ینظرون“۔ (آل عمران آیت ۸۸)

(۶) وقوله تعالیٰ ”ولا تكونوا کالذین تفرقوا واخلتفوا من بعد ما جاءہم البینت واولئک

لہم عذاب عظیم“۔ (آل عمران آیت ۱۰۵)

(۷) وقوله تعالیٰ ”واما محمد الا رسول“۔ (آل عمران آیت ۱۴۴)

(۸) وقوله تعالیٰ ”لانفرق بین احد من رسلہ“۔ (سورۃ بقرہ آیت ۲۸۵)

(۹) وقوله تعالیٰ ”لا تحسبن الذین یمفرحون بما آتوا و یُجِبُونَ ان یُحْمَدُوا بما لم

یفعلوا فلا تحسبنہم بمفازۃ من العذاب ولہم عذاب الیم“۔ (آل عمران آیت ۱۸۸)

(۱۰) وقوله تعالیٰ ”ان الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین فی نار جہنم یخلدین

فیہا واولئک ہم شر البریۃ“۔ (سورۃ البینہ آیت ۶)

(۱۱) وقوله تعالیٰ ”ان الذین یمکفرون باللہ ورسولہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسولہ و

يقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض ويريدون ان يتخذوا بين ذالك سبيلاً اولئك هم الكفرون حقاً واعتدنا للكافرين عذاباً مهيناً“۔ (سورۃ النساء آیت ۱۵)

اگر طول کا خطرہ نہ ہوتا تو مزید آیات پیش کی جاتیں مگر طالب حق کے لئے تو اشارہ بھی کافی ہونا چاہئے یہ تو کافی تعداد میں آیات ہیں۔

لہذا اہل تہجد کے اس قسم کے نظریات کے پرچار کا مقصد صرف اور صرف گمراہی کو فروغ دینا ہے۔ رہی باب کی حدیث تو سمجھ لینا چاہئے کہ بعض اصطلاحات اسماء اعلام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں جیسے ”من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة“ؑ اور ”مفاتیح الجنة شهادة ان لا الہ الا اللہ“ؑ۔ (مشکوٰۃ ص ۱۵) لہذا کہا جائے گا کہ باب کی حدیث میں اللہ اور آخرت پر ایمان مبدا اور معاد یعنی پورے اسلام کا اسم علم ہے یعنی بحیثیت مسلمان آدمی کو اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہئے۔

اکرام ضیف:۔ اکرام ضیف یہ ہے کہ اس سے خندہ پیشانی سے ملے، ملاطفت اور نرمی سے بات کرے اسے مناسب جگہ پر بٹھادیا جائے، اور یہ تاثر دے کہ آپ کی آمد سے بڑی خوشی محسوس ہوئی، اس سے کھانے کے بارے میں پوچھے بغیر کھانا حاضر کیا جائے ہاں اگر کھانے کا وقت گزر گیا ہو تو پھر پوچھنے میں کوئی حرج نہیں، ممکن ہے کہ اس نے کھایا ہو، ایسے میں مہمان کو از خود کہنا چاہئے کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔

کھانے سے پہلے کسی اور چیز سے اس کی تواضع کی جائے تو زیادہ اولیٰ ہے تاکہ فوری طور پر کچھ اکرام ہو جائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جلد ہی مہمانوں کی خدمت میں محل سمین پیش فرمایا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق عمدہ سے عمدہ کھانا ان کی خدمت میں پیش کیا جائے خصوصاً ابتداء ضیافت میں۔ ”ان کے کھانے سے سرور ہونا چاہئے، کھانے کے دوران مہمان سے گاہے گاہے کہا جائے کہ آپ کیوں نہیں کھا رہے؟ بچے یا ایسے افراد کو مہمانوں کے ساتھ کھانے پر نہیں بٹھانا چاہئے جن سے تکدر خاطر ہو۔

قولہ ”قالوا ما جائزہ“؟ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا سوال مدت کے بارے میں تھا کہ جائزے کی مدت کتنی ہے کیونکہ نفس جائزہ وہ جانتے تھے۔

ضیافت کا حکم:۔ بعض صحیح روایات سے بظاہر مہمان نوازی کا وجوب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے

ع روی بمعناہ مسلم ص: ۴۱ ج: ۱ کتاب الایمان عن عثمان قال قال رسول اللہ ﷺ من مات وهو يعلم انہ لا الہ الا اللہ

دخل الجنة۔ رواہ احمد فی مسنده ص: ۳۲۱ ج: ۶ حدیث: ۲۱۵۹۷۔

متعلق بعض احادیث کے الفاظ یوں ہیں ”لیلة الضیف حق واجب“۔^۱ بعض میں ہے کہ اگر مہمان کو کھانا نہیں کھلایا گیا اور اس نے خالی پیٹ رات گزاری تو اس کا حق میزبان پر ذین ہے۔ (کمارواہ ابوداؤد^۲) اور بعض میں ہے کہ اس کا حق لینا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اگر وہ لوگ تمہیں نہ کھلائیں تو ان سے مہمانی کا حق زبردستی لے لو^۳ وغیر ذالک من الروایات۔^۴ باب کی حدیث سے بھی لزوم معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض اہل ظاہر نے تو وجوب کی تصریح کر دی جبکہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل بادیہ پر واجب ہے جبکہ شہری لوگوں پر واجب نہیں، کیونکہ شہر میں ہوٹل ہوتے ہیں مگر باقی ائمہ ثلاثہ^۵ فرماتے ہیں کہ مہمان نوازی زیادہ سے زیادہ سنت ہے جو مکارم اخلاق کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤکد فرمائی ہے۔

مذکورہ احادیث سے جمہور نے متعدد جوابات دیئے ہیں مثلاً شروع میں جب مسلمانوں کی آبادی کم تھی اور وسائل بھی قلیل تھے تو ضیافت واجب تھی مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا، یا پھر وجوب پہلے بھی نہ تھا البتہ استحباب زیادہ مؤکد تھا جبکہ بعد میں زیادہ تاکید منسوخ کر دی گئی یہ دونوں جوابات اسی طرز پر دیئے گئے جیسے جمعے کے غسل کے بارے میں جمہور نے تاکید کی روایات سے دیئے ہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ضیافت کو واجب حق قرار دینا عام نہ تھا بلکہ یہ عالمین کے لئے مخصوص تھا کہ اہل ذرع والی ضرع پر عالمین کی ضیافت واجب ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ مضطر کے لئے ہے یا پھر یہ لزوم حکومت کی طرف سے اہل ذمہ پر عائد کیا گیا تھا۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ نسبتاً زیادہ اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ یہ وجوب از روئے مکارم اخلاق و حسن معاشرت ہے وجوب تشریحی نہیں لہذا اگرچہ ضیافت واجب تو ہے مگر ضیافت نہ کرنے کی صورت میں آدمی بے مروت کہلائے گا، کہ اس نے وہ حکم پامال کر دیا جو بامروت شخص پر مروت کے طور پر واجب ہوتا ہے اور اس کا ضمیر مہمان کو محروم و مایوس کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے لہذا ایسا شخص بے ضمیر اور بے مروت کہلانے کا مستحق تو ہوگا، مگر شرعاً آخرت میں اس پر ان شاء اللہ سزا مرتب نہ ہوگی چنانچہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں ضیافت کے باب میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد ایک اور باب باندھا ہے ”باب فی فتح الضیف فی الاکل من مال غیرہ“^۶

۱۔ کلاسی سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۱ کتاب الادب ولفظہ لیلۃ الضیف واجبة، و ابوداؤد ص: ۱۷۰ ج: ۲ ”باب من الضیافة الخ“ کتاب الاطعمہ۔ ۲۔ سنن ابی داؤد حوالہ بالا۔

۳۔ صحیح بخاری ص: ۹۰۶ ج: ۲ ”باب اکرام الضیف وخدمته“ کتاب الادب۔

۴۔ راجع للتفصیل الترغیب والترہیب ص: ۲۵۰ و ۲۵۳ ج: ۴۔

۵۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب الاطعمہ۔

اور اس میں یہ آیت نقل کی ہے ”لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ“ الایۃ۔ لہذا سابقہ روایات مؤول ہیں۔
 مہمان کی ذمہ داری:- شریعت مطہرہ کا یہ عام اصول ہے کہ جہاں کوئی معاملہ دو یا دو سے زیادہ فریق
 کے درمیان مشترک ہو تو وہاں ہر فریق کے لئے مناسب حال حکم ہوتا ہے ہر فریق کو یہ تعلیم دینا شریعت کا زین
 ضابطہ ہے، کہ وہ دوسرے فریق کا بطور خاص خیال رکھے ازاں جملہ ایک ضیافت بھی ہے اس میں میزبان کو سختی
 سے اس کا پابند بنایا کہ وہ اپنے مہمان کو راضی رکھنے اور اس کی راحت کی ہر ممکن کوشش کرے۔

مگر چونکہ مہمان بہر حال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور
 اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لئے ضرورت تھی کہ مہمان کو بھی بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے دسترخوان
 سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ باب کی دونوں حدیثوں میں یہ تصریح کر دی گئی کہ مہمان کو کسی
 کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی، اگر وہ صاحب خانہ کی
 کرم نوازی سے غلط فائدہ اٹھانا چاہے گا اور تین دن کے بعد بھی جانے کا نام نہیں لے گا تو مزید کھانا صدقہ
 شمار ہوگا اب ایک غیور اور خوددار شخص خود سوچے کہ آیا وہ صدقہ کھانا پسند کرتا ہے یا اپنی عزت کی حفاظت
 پسند کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا ”وَلَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّشْوِيَ عِنْدَهٗ حَتّٰى يَحْرَجَهٗ“۔ امام ترمذی نے
 ”یثوی“ کا مطلب خود بیان فرمایا ہے ”یعنی الضیف لا یقیم عنده حتی یشدد علی صاحب المنزل
 والحر ج هو الضیف“۔ یعنی مہمان اتنا نہ ٹھہرے کہ جس سے صاحب خانہ تنگ آجائے، یثوی یثوی بروزن رمی
 یرمی بمعنی الاقامۃ۔^{۱۵}

ضیافت سے متعلق مزید تفصیل درکار ہو تو ملاحظہ ہو نقش قدم کامل حصہ دوم، نقش اخلاق فصل ہفتم مہمان
 کے حقوق اور آداب ضیافت و آداب برائے مہمان۔

۹ سورة البقرة آیت: ۱۸۸۔

۱۵ وقال الخطابی: معنی لا یثوی، لا یحل للضيف ان یقیم عنده بعد ثلاثة ايام من غیر استدعاء منه حتی یضیق صدره
 لیطل اجره انتهى، وقال الحافظ وللعلماء فی هذا الحديث ثلاثان: احدهما ان یعطیه ما یجوز به ویکفیه فی یوم وليلة اذا
 اجاز به وثلاثة ايام اذا قصده، والثانی یعطیه ما یکفیه یوماً وليلة یستقبلهما بعد طبالة، الترهیب والترهیب من: ۲۵۱ ج: ۳، حفیظ الرحمن الحنفی عفی عنہ

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

”عن صفوان بن سلیم یرفعہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللہ او کالذی یصوم النہار ویقوم اللیل“۔^۱

حضرت صفوان بن سلیم سے روایت ہے جسے وہ مرفوع بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیوہ اور مسکین (کی مدد) کی کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں مجاہد کی مانند ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو نماز پڑھتا ہے۔

لغات:- قولہ ”الساعی“ معنی سے ہے لیکن یہاں دوڑنے کے معنی میں نہیں بلکہ محنت و مشقت اور کسب کے معنی میں ہے چونکہ محنت کرنے والا عموماً تیز ہوتا ہے اس لئے اسے ساعی کہتے ہیں۔ قولہ ”الارملة“ بفتح الهمزة والمیم وبینہما راء ساکنۃ۔ ارمال سے مشتق ہے فقر و مسکنت کو کہتے ہیں جو عورت بغیر شوہر کے ہو وہ عموماً غریب و محتاج ہوتی ہے اس لئے اسے ارملة کہتے ہیں۔ قولہ ”المسکین“ من لاشئ لہ، بعض حضرات نے یہ معنی فقیر کے بیان کئے ہیں اور مسکین اس کو کہا ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ہو مگر وہ نا کافی ہو۔ بعض نے یہ حکم فقیر کا بتلایا ہے۔ بہر حال مراد اس سے محتاج اور غریب ہے۔

تشریح:- حضرت صفوان تابعی ہیں مگر روایت مرفوع نقل کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مرسل ہے تاہم دوسری سند میں موصولاً مروی ہے اس لئے شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے،^۲ امام ترمذی نے ترجمۃ الباب میں لفظ یتیم کا ذکر کیا ہے جبکہ حدیث میں مسکین کا لفظ وارد ہوا ہے یہ تعمیم کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جتنا ثواب مجاہد یا صیام و قیام کے پابند کو ملتا ہے اتنا ہی ثواب اس عامل کو یا اس شخص کو بھی ملتا ہے جو بیوہ اور محتاج کی فکر میں مشغول اور ان کی مدد کے لئے کوشاں ہوتا ہے چونکہ مجاہد کی محنت سے بیت المال میں غنیمت جمع ہو جاتی ہے، جس سے بیواؤں اور بے کنوں کو فائدہ ہوتا ہے اسی طرح

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً البخاری فی النفقات باب: ۱، ومسلم فی الزهد حدیث: ۴۱ وابن ماجہ فی التجارات باب: ۱، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۸ ج: ۳۔

۲۔ صحیح بخاری ص: ۸۰۵ ج: ۲ عن ابی ہریرۃ، کتاب النفقات، صحیح مسلم ص: ۴۱۱ ج: ۲ ”باب فضل الاحسان الی الارملة والمسکین والیتیم کتاب الزهد“۔

اس شخص کی کمائی سے بھی ان کی مدد ہوتی ہے اس لئے دونوں گویا مساوی ہیں یا جس طرح مجاہد بیت المال میں حصے کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح عامل بھی ہوتا ہے، بہر حال یہاں تشبیہ ثواب میں مراد ہے چونکہ مجاہد اور روزہ دار اور نمازی کے ثواب کا ایک معیار معلوم ہے اس لئے عام طور سے ان کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، جس سے شریعت کے احسان عظیم کا پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے اعمال کو تو وسیع دے کر بڑے مشقت والے اعمال کے برابر ثواب دیا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی طلاقۃ الوجه و حسن البشر

”عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کل معروف صدقة وان من المعروف ان تلقی اخاک بوجه طلق وان تفرغ من دلوک فی اناء اخیک“۔^۱

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی کے کاموں میں سے یہ بھی ہے کہ تم اپنے (اسلامی) بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو اور یہ کہ تم اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالو۔

لغات: - قولہ ”طلاق طلق“ دونوں مصدر ہیں پھر طلق میں لام کا کسرہ بھی جائز ہے اور سکون بھی، بمعنی ہنس کھ، خندہ روا اور کھلا ہوا ہشاش چہرہ۔

قولہ ”البشر“ بکسر الباء بمعنی خندہ روئی و خوشی کے ہے۔ قولہ ”المعروف“ وہ کام جس کی اچھائی اور خوبی از روئے عقل و عقل دونوں ثابت ہو جیسے راستے کا صاف کرنا وغیرہ، یہ لفظ ”مکر“ کے مقابلے میں آتا ہے جو نا آشا ہوتا ہے۔

تشریح:۔ حدیث کی تشریح ”باب ماجاء فی منافع المعروف“ میں عنقریب گذری ہے اعادہ کی ضرورت نہیں صرف اتنی بات عرض ہے کہ جب آدمی اپنے بھائی سے خوشی خوشی ملتا ہے اور مسکرا کر ملاقات کرتا ہے تو اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے اور قلب کا میلان اور صفائی معلوم کر لیتا ہے، کیونکہ ہر آدمی کا چہرہ اس کے دل و دماغ کی

باب ماجاء فی طلاقۃ الوجه و حسن البشر

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً أحمد فی مسنده ص: ۳۰۵ ج: ۴ حدیث: ۱۳۲۹۹، ابناً ص: ۲۳۲ ج: ۴ حدیث: ۱۳۲۶۳،

ابن العریب و العریب ص: ۲۸۲ ج: ۳،

اسکرین کا کام دیتا ہے لہذا جب ملاقات خندہ پیشانی سے ہوتی ہے تو اس سے ایک اچھا تاثر ابھرتا ہے جس کی اچھائی پر عقل اور نقل دونوں متفق ہیں اور جب اس کے بھائی کو ملنے سے خوشی ہوگی تو اس پر صدقے کا ثواب ملے گا کیونکہ صدقے سے بھی خوشی ملتی ہے تو جس طرح صدقے کی خوشی باعث اجر و ثواب ہے اسی طرح اچھے انداز سے ملاقات بھی خوش افزا ہونے کی وجہ سے باعث ثواب ہے۔ تدبر

باب ماجاء فی الصدق والكذب

”عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علیکم بالصدق فان الصدق یہدی الی البرّ وان البرّ یہدی الی الحنة وما یرال الرجل یرصدق ویتحرى الصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقاً واثماً کم والكذب فان الکذب یہدی الی الفجور وان الفجور یہدی الی السار وما یرال العبد یکتب عند اللہ کذاباً“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سچائی کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ سچ بھلائی کا راستہ بتلاتا ہے اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور آدمی مسلسل سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں انتہائی سچا لکھا جاتا ہے، اور تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ کیونکہ جھوٹ آدمی کو صریح خرابی تک پہنچاتا ہے اور خرابی جہنم تک پہنچاتی ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ بناتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں وہ انتہائی جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ (یعنی قرار پاتا ہے)

لغات:- صدق اور کذب کی تعریفیں تو مشہور ہیں کہ جو حکایت اپنے محکم کے مطابق ہو وہ صدق ہے اور جو موافق نہ ہو وہ کذب ہے تاہم کذب میں کاف کافہ اور ذال کا کسرہ زیادہ فصیح ہے نسبت کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے اس لئے قرآن مجید میں ذال کے سکون کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ قولہ ”صدیق“ مبالغے کا صیغہ ہے اسی طرح کذاب بھی ہے۔

باب ماجاء فی الصدق والكذب

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی الادب باب: ۶۹ ومسلم فی البر حدیث: ۱۰۳ وابوداؤد فی الادب باب: ۸۰ وابن ماجہ

فی المقدمة باب: ۷ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۶۶ ج: ۳.

تشریح:- صدق اور کذب کے حسن اور قبح سے متعلق بحث ”باب ماجاء فی اصلاح ذات البین“ میں تحقیقی تشریح کے عنوان کے ضمن میں گزری ہے۔ فلیراجع، باب کی حدیث میں صدق کے التزام اور جھوٹ سے اجتناب کا تاکید حکم ہے اور اس کے ساتھ دونوں کا نفع و نقصان بھی بیان فرمایا گیا ہے، تاہم اگر صدق سے کسی کو غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو تو وہاں خاموشی اختیار کر لینی چاہئے اسی طرح کبھی جھوٹ کہنے سے ایک بے گناہ کی جان محفوظ ہو سکتی ہے جیسے ظالم بادشاہ کسی نیک آدمی اور حق کو عالم کی گرفتاری کے لئے پولیس بھیجتا ہے تو اس کا پڑوسی اگر اس کو اپنے گھر میں پناہ دے کر پولیس کو تلاشی میں ناکام بنادے اور جب وہ اس کے متعلق پوچھے تو یہ لاعلمی ظاہر کر دے تو اس کا عظیم فائدہ ان شاء اللہ جھوٹ کے نقصان پر غالب رہے گا، گو کہ اس صورت میں بھی اس کو توریہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزرا ہے، لہذا کہا جائے گا کہ ناگزیر وجوہات باب کی حدیث سے مستثنیٰ ہیں۔

اس حدیث میں ایک اہم ضابطہ بیان ہوا ہے کہ نیکی، نیکی کے لئے جالب ہے جبکہ بدی، بدی کے لئے جاذب ہے لہذا ایک نیکی کرنے سے دوسری نیکی کی توفیق ملتی ہے خصوصاً وہ نیکی جو پہلی کی نوع سے ہو مثلاً ایک صدقہ سے دوسرا صدقہ آسان ہو جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس اسی طرح ایک گناہ سے دوسرے کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے خصوصاً جب اسی نوع کا ہو مثلاً ایک بار چوری کرنے سے دوسری آسان تر معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ آدمی چور بن جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس۔ غرض نیکیوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں اور گناہوں کے بھی شجرے ہوتے ہیں نیکی، نیکی سے مانوس ہوتی ہے اور بدی، بدی سے۔

دوسری حدیث:- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل اس سے دور چلا جاتا ہے۔^۱

لغات:- قوله ”نتن“ بفتح النون الاول وسكون التاء بدبو کو کہتے ہیں۔ قوله ”ما جاء به“ مراد اس سے وہ جھوٹی بات ہے جو اس نے کہی ہے۔

تشریح:- اس سے معلوم ہوا کہ جہاں اقوال کی دیگر تاثیرات ہیں اسی طرح ان میں خوشبو اور بدبو بھی ہوا کرتی ہے اچھی بات خوشبودار ہوا کرتی ہے اور غلط بات غلیظ اور متعفن و بدبودار ہوتی ہے، ابن العربی نے عارضہ میں سوال اٹھایا ہے کہ ”بات کیسے بدبودار ہو سکتی ہے جبکہ یو تو اجسام کاوصف ہے پھر اس کا جواب دیا ہے کہ

اجسام میں ہو کی تخلیق ذاتی و طبعی نہیں ہے بلکہ عادی ہے لہذا اللہ جب چاہے اقوال و اعراض میں بھی بود و غیرہ اوصاف پیدا کر سکتا ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ یہ مسئلہ بھی ”باب ماجاء فی اصلاح ذات البین“ میں تحقیقی تشریح کے ضمن میں گزرا ہے کہ آیا اشیا کا حسن و قبح ذاتی ہیں یا عادی یہ مسئلہ بھی اسی طرح ہے کہ آیا تاثیرات ذاتی ہیں یا عادی، فلیراجع۔

نیز آج کل کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوال و اعراض نہیں بلکہ جواہر کے ضمن میں معرض وجود میں آتے ہیں، یہ بحث پیچیدہ ہے یہاں اس پر تسلی بخش بحث مشکل ہے اگر تحقیق درکار ہو تو راقم کی کتاب ”شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت“ سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، نیز جتہ اللہ البالغہ میں عالم مثال کی بحث سے اس میں مدد بلکہ تشفی ملتی ہے۔

چونکہ اس حدیث کی سند میں یحییٰ بن موسیٰ نے اپنے شیخ سے استفسار کیا تھا ”حدیثکم عبدالعزیز؟ الخ“ یہاں ہمزہ استفہام مقدر ہے ”ای احادیثکم؟“ اس لئے انہوں نے جواب میں ”نعم“ سے یعنی اثبات میں جواب دیا۔

باب ماجاء فی الفحش

”عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما کان الفحش فی شیء الا شأنہ وما کان الحیاء فی شیء الا زانہ۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدگوئی شامل نہیں ہوتی کسی معاملے میں مگر اسے معیوب بنادیتی ہے اور حیا کسی چیز میں شامل نہیں ہوتی مگر اسے زینت بخشتی ہے۔

دوسری حدیث:- ”خیارکم احاسنکم اخلاقاً ولم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشاً ولا متفحشاً۔“

تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ غیر ارادی طور پر بدگوئی کرتے اور نہ ہی ارادۃً فرماتے۔

لغات:- قولہ ”الفحش“ ضم الفاء سخت اور نازیبا جواب اور قول کو کہتے ہیں۔ قال ابن العربیؒ:

”الفحش هو الکلام بما یکره سماعه مما یعلق بالبدین“ یعنی دینی اعتبار سے غلط بات۔ ”قال وهو من اعظم ذنوب اللسان“۔ (عارضہ) بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کا دامن افعال تک پھیلا ہوا ہے، چنانچہ زنا پر فاحشہ کا اطلاق معروف و مشہور بلکہ ماثور ہے۔ قولہ ”الاشانہ“ ”شین“ یفتح اشین عیب کو کہتے ہیں۔

قولہ ”الازانہ“ شانہ کے مقابل ہے زین یفتح الزاء زینت اور خوب صورتی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فاحشاً“ جس کی طبیعت میں بدگوئی کی خصلت ہو۔ قولہ ”متفحشاً“ جو بدگوئی میں تکلف کرتا ہو اور اہتمام کے ساتھ بالا ارادہ قبیح بات منہ سے نکالتا ہو۔ پس مطلب یہ ہوا کہ فحش بات کرنا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت تھی اور نہ ہی کسی تھی۔

تشریح:۔ خلق بالفتح ظاہری بناوٹ اور شکل و صورت کو کہتے ہیں جبکہ خلق بالضم باطنی ملکات کو کہتے ہیں خواہ وہ ملکات اصلہ ہوں یا فاضلہ، جن کو ہم اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ پہلی قسم میں یعنی خلق بالفتح میں تو انسان عام جانداروں کی طرح ایک جاندار ہے مگر اس کا امتیازی مقام اخلاق کی بنا پر ہے۔ آج کل ہمارے یہاں اخلاق کی حیثیت بالکل مٹا دی گئی ہے حتیٰ کہ جب شخص میں داخلے کے لئے طلبہ آتے ہیں تو ان کو عجب، کبر، حسد اور حقہ وغیرہ کی تعریفیں بھی نہیں آتی ہیں اور ان اشیاء میں فرق بھی نہیں جانتے ہیں حالانکہ یہ تو کبار ہیں ان سے اجتناب فرض میں ہے جو ان کی معرفت کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ الحمد للہ راقم نے اس موضوع پر مستقل کتاب ”نقش قدم کامل“ لکھی ہے۔

اس حدیث میں فحش بات کو نہایت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جبکہ بھلی بات اور حیا کی تحسین کی گئی ہے جس سے ان دونوں کی شرعی حیثیت اور مقام کا صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے، نیز اس میں اچھے اخلاق کے حامل لوگوں کو بہترین افراد قرار دیا گیا ہے، جس سے اخلاق کا اونچا مقام بھی معلوم ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گوئی سے پاک تھے نہ تو کبھی سہواً ان کی زبان پر بڑی بات آئی ہے اور نہ ہی ارادۃً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی غلط بات کی ہے، یہی حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا بھی تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر و باطنی قولاً و عملاً پاکیزگی معلوم ہوتی ہے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے اعلیٰ انسانیت کا نمونہ تھے اور ہمیں اس نمونے کے مطابق چلنے کا حکم ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے افعال، اخلاق اور اقوال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور بنائے ہوئے معیار کے مطابق بنائیں تب ہم کامل اور کامیاب انسان کہلائیں گے۔

باب ماجاء فی اللعنة

”عن سمرة بن جندب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تلعنوا بلعنة الله ولا بغضبه ولا بالنار“۔^۱

حضرت سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم ایک دوسرے کو اللہ کی لعنت سے مخاطب نہ کرو (یعنی یوں نہ کہو کہ: تم پر اللہ کی لعنت ہو) اور نہ اس کے غضب سے اور نہ ہی دوزخ سے۔ (جیسے تم پر اللہ کا غضب ہو، تم دوزخ میں جاؤ یا اے دوزخی وغیرہ مت کہو) دوسری حدیث:- ”لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذي“۔ ”مومن نہ طعنہ

دینے والا ہوتا ہے اور نہ لعنت کرنے والا اور نہ بے ہودہ ہوتا ہے اور نہ ہی بکواس کرنے والا ہوتا ہے۔

تیسری حدیث:- ”ان رجلاً لعن الريح عند النبي صلى الله عليه وسلم فقال لا تلعن الريح فانها مأمورة وانه من لعن شيئاً ليس له باهل رجعت اللعنة عليه“۔^۲

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا پر لعنت بھیجی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہوا پر لعنت ملامت نہ کرو کیونکہ یہ (اللہ کی طرف سے) پابند ہے اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجے جو اس کی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت پلٹ کر اس پر واپس جاتی ہے۔

لغات:- قولہ ”اللعنة“ اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا خواہ رحمت خاصہ سے ہو یا رحمت عامہ سے۔ قولہ ”طعان واللعان“ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں پہلا طعن سے ہے اور دوسرا لعن سے، طعن اصل میں نیزہ زنی کو کہتے ہیں مگر کڑوی بات چونکہ نیزہ مارنے کے مترادف ہوتی ہے اس لئے تہمت لگانے اور عیب جوئی کو طعن کہتے ہیں۔

جراحات السنان لها التيام

ولا يلتام ما جرح اللسان

باب ماجاء فی اللعنة

۱۔ الحدیث أخرجه ابو داؤد ص: ۳۲۳ ج: ۲ ”باب فی اللعن“ کتاب الادب۔ ۲۔ الحدیث أخرجه ايضاً ابو داؤد ص: ۳۲۳ ج: ۲۔

ج: ۲۔ کتاب الادب وابن حبان فی صحيحه، الترغيب والترهيب ص: ۳۱۵ ج: ۳۔

ابن العربیؒ فرماتے ہیں: ”وانما سماء طعنألان سهام الكلام معنى كسهام النصال حساً وجرح اللسان كجرح اليد“۔ قولہ ”الفاحش“ اس کا مطلب اگرچہ سابقہ باب میں گزرا ہے تاہم یہاں اس کو عام لینا زیادہ افضل ہے بایں طور کہ فاحش وہ ہے جو کلام اور افعال دونوں میں حد سے گذرتا ہو جبکہ ”الہذی“ وہ ہے جو باتوں میں بے ہودہ بکلتا ہو، پھر ہذی بتشدید الیاء بھی پڑھ سکتے ہیں اور تخفیف الیاء و بعدھا ہمزہ بھی جبکہ دونوں حالتوں میں باء مفتوح اور ذال مکسور ہے۔

تشریح:- امام ترمذیؒ نے اس باب میں تین احادیث ذکر فرمائی ہیں پہلی حدیث خاص ہے مخاطب کے ساتھ جبکہ دوسری عام ہے غائبین کو بھی شامل ہے۔ تیسری حدیث اس نہی کی علت ہے کہ لعن طعن اس لئے حرام ہے کہ جب لعنت زبان سے نکلتی ہے تو پھر ضائع نہیں جاتی بلکہ کہیں نہ کہیں واقع ہو جاتی ہے اگر وہ چیز جس پر لعنت بھیجی گئی ہے مستحق ہو تو اسی پر واقع ہو جائے گی ورنہ لعنت کرنے والے کی طرف واپس لوٹ کر پڑ جائیگی۔ ابن العربیؒ عارضہ میں اس تیسری حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ”والمعنى فيه ان ذالك يوجب وقوعها بمن قالها ان لم يكن المخاطب (الملعون) اهلاً لها... الى... حديث غريب ومعناه صحيح“۔ اسی طرح دوسری حدیث بھی باوجود غرابت کے صحیح ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اگر کسی شخص سے ناپسندیدہ کام صادر ہو جاتا تو اس کا نام ذکر کرنے کے بجائے عام تعبیر کرتے جیسے مہاجر ام قیس یا اس حدیث میں ”رجلاً“ وغیرہ۔ بعض روایات کے مطابق کمافی ابی داؤدؒ اس آدمی سے ہوانے چادر کھینچ لی تھی جس پر اس کو غصہ آیا اور ہوا پر لعنت بھیجی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس پر تنبیہ فرمائی اور واضح فرمایا کہ لعنت کا ضرر بہت زیادہ ہے اگر ایسی چیزوں پر لعنت بھیجی جائے جو امور نکوینیہ کی پابند ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے میں ان کا کوئی قصور نہیں تو لامحالہ اس کا نقصان لعنت کرنے والے کی طرف ہی لوٹے گا۔

بہر حال ان احادیث ثلاثہ سے لعنت اور فحش گوئی کی سخت مذمت و ممانعت معلوم ہوتی ہے، مسلم شریفؒ میں ہے کہ ایک عورت نے جو قافلے میں شامل تھی اونٹنی پر لعنت بھیجی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسی اونٹنی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتی جس پر لعنت بھیجی گئی ہو چنانچہ اس کو آزاد چھوڑنے کا حکم دیا جس کی

تقیل کی گئی۔ مسلم ^۵ ہی کی ایک اور حدیث ہے ”لَا يَنْبَغِي لَصَدِيقٍ أَنْ يَكُونَ لِعَانًا“ چونکہ تھوڑی بہت لعنت اور خامی سے بچنا تو شاید انسانی بس سے باہر ہے ”الامن عصمه الله“ اس لئے اس حدیث میں اور اسی طرح باب کی دوسری حدیث میں طعان اور لعان، مبالغے کے صیغے لائے گئے۔ امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

”وَلَمْ يَقُلْ لَاعِنًا وَلَا عَنَانًا لِأَنَّ هَذَا الدَّمُ فِي الْحَدِيثِ إِنَّمَا هُوَ لِمَنْ كَثُرَتْ مِنْهُ اللَّعْنُ لِلْمَرَّةِ وَنَحْوُهَا وَلَئِنْ يَخْرُجُ مِنْهُ أَيْضًا اللَّعْنُ الْمُبَاحُ وَهُوَ الَّذِي وَرَدَ الشَّرْعُ بِهِ وَهُوَ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ، لَعْنَةُ اللَّهِ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى، لَعْنَةُ اللَّهِ الْوَاصِلَةَ وَالْوَاشِمَةَ وَشَارِبَ الْخَمْرِ وَآكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدِيهِ وَالْمَصُورِينَ... وَغَيْرَهُمْ مِمَّنْ هُوَ مَشْهُورٌ فِي الْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ“۔ (مسلم ص ۳۲۲ ج ۲)

یعنی لعنت کی ممانعت سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو اوصافِ رذیلہ سے یاد کر کے لعنت کرے یا جو منصوص ہیں کیونکہ ان دونوں اقسام پر لعنت بھیجتا جائز ہے اسی طرح جس کا خاتمہ بالکفر نص سے ثابت ہو وہ بھی ملعون ہے۔

یہ بحث رحمتِ خاصہ کے بارے میں تھی جو جنت سے دوری کی بددعا ہے جہاں تک رحمتِ عامہ یعنی دنیوی فوائد و منافع کا تعلق ہے تو اس میں نسبتاً گنجائش زیادہ ہے اگرچہ دونوں کا نصح و ہمدردی کے منافی ہیں اس لئے مطلق لعنت سے بچنا چاہئے۔ امام نوویؒ شرحِ مسلم میں لکھتے ہیں:

”لَا لَلْعَنَةِ فِي الدُّعَاءِ يَرَادُ بِهَا الْإِبْعَادُ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ تَعَالَى وَلَيْسَ الدُّعَاءُ بِهَذَا مِنْ اخْلَاقِ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ وَصَفَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى بِالرَّحْمَةِ بَيْنَهُمْ وَالتَّعَاوُنِ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَجَعَلَهُمْ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا وَكَالْحَسَدِ الْوَاحِدِ وَالْمُؤْمِنِ يَحِبُّ لِأَخِيهِ مَا يَحِبُّ لِنَفْسِهِ فَمَنْ دَعَا عَلَى أَخِيهِ الْمُسْلِمِ بِالْعَنَةِ وَهِيَ الْإِبْعَادُ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ فَهُوَ مِنْ نَهَايَةِ الْمَقَاطَعَةِ وَالتَّدَابُرِ وَهَذَا غَايَةُ مَا يُوَدُّهُ الْمُسْلِمُ لِلْكَافِرِ وَيَدْعُو عَلَيْهِ وَلِهَذَا جَاءَ فِي الْحَدِيثِ الصَّحِيحِ لَعْنُ الْمُؤْمِنِ كَقَتْلِهِ لِأَنَّ الْقَاتِلَ يَقْطَعُهُ عَنْ مَنَافِعِ الدُّنْيَا وَهَذَا يَقْطَعُهُ عَنْ نَعِيمِ الْآخِرَةِ وَرَحْمَةِ اللَّهِ تَعَالَى“۔ وقيل:

۵ حوالہ بالا ایضاً رواہ الحاکم وصححه ولفظه قال: لَا يَجْتَمِعُ أَنْ تَكُونَ نَوَالَيْنِ مَدْلِقِينَ بِحَوَالِهِ التَّرْغِيبِ وَالتَّرْهيبِ ص: ۳۱۲ ج: ۳۔

معنی لعن المؤمن کقتله فی الاثم وهذا اظهر۔ (نووی شرح مسلم ص ۳۲۲ ج ۲)
 اس کا مطلب یہ ہوا کہ لعنت بھیجنے والا نہ صرف ملعون کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ خود بھی غیر معمولی نقصان اٹھاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے: ”لَا يَكُونُ اللَّعَانُونَ شَفَعَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ“۔ (مسلم ص ۳۲۲ ج ۲) (مزید تفصیل شرح نووی بر مسلم میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

باب ماجاء فی تعلّم النسب

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: تعلّموا من انسابکم ما تصلون بہ ارحامکم فان صلة الرحم مَحَبَّةٌ فی الہل مَرَاتَةٌ فی المال مَنَسَاةٌ فی الاثر“۔^۱ (حدیث غریب تفرد بہ الترمذی من اصحاب السنۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے نسب سے جوئے لوگوں کے کم از کم اتنے نام یاد رکھو جن کے ذریعے آپس کی صلہ رحمی کر سکو کہ صلہ رحمی رشتہ داروں سے محبت کا ذریعہ ہے مال بڑھنے کا سبب ہے اور ذکرِ خیر تادیر کا ذریعہ ہے۔

لغات:- ”انساب“ نسب کی جمع ہے بفتح النون والسين پدري قرابت کو کہتے ہیں۔ ”ما تصلون بہ“ چونکہ تمام نسب حضرت آدم علیہ السلام تک یاد کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی زیادہ مفید ہے اس لئے صرف اس مقدار کو یاد رکھنے کا حکم آیا جن کو یاد رکھنے کا عملی فائدہ حاصل ہو، جو جید اعلیٰ اور اس کی شاخوں پر مشتمل ہے۔ قولہ ”مَراتۃ“ ثراء سے ہے ثروت دولت مندی و مال داری کو کہتے ہیں یہ لفظ فتح المیم و سکون الثاء پڑھا جائے گا۔ قولہ ”منساة“ یہ بھی بفتح المیم و سکون النون ہے نساء سے ہے جو بمعنی تاخیر کے ہے ”قال اللہ: ما ننسخ من اية او ننسها“۔^۲

تشریح:- اس حدیث سے نسبی رشتوں کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کی تاکید اور اس کی حکمت ثابت ہوتی ہے جہاں تک صلہ رحمی کے حکم کا تعلق ہے تو اس پر تفصیلی بحث گزری ہے، رہی اس کی حکمت تو اس ارشاد پاک میں

۱۔ ایضاً رواہ ابو داؤد ص: ۳۲۳ ج: ۲ کتاب الادب۔

باب ماجاء فی تعلّم النسب

۱۔ الحدیث اخرجه الطبرانی فی الکبیر ۹۸/۱۸ بحوالہ مجمع الروائد ص: ۱۹۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۲ کتاب البر والصلة۔ ۲۔ سورة البقرة آیت: ۱۰۶۔

اس کے تین فوائد بیان ہوئے ہیں ایک یہ کہ صلہ رحمی آپس میں محبت کا ذریعہ ہے اور یہ بات بالکل واضح اور مشاہدے کے مطابق ہے۔ دوم یہ کہ اس سے مال میں اضافہ ہوتا ہے اس کی قدرے تفصیل بھی پہلے گزری ہے کہ مال، خرچ کرنے سے اور خصوصاً اہل قرابت کے ساتھ سلوک کرنے سے مال بڑھتا رہتا ہے اور یہ بھی مجرب ہے۔ رہی تیسری بات تو اس کے تین مطلب بیان ہوئے ہیں:۔ ایک یہ کہ منساق فی الاثر سے ماہر عمر میں اضافہ ہے گویا اثر سے مراد اجل ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ صلہ رحمی اجل کی تاخیر کا ذریعہ ہے، یعنی جو لوگ صلہ رحمی کرتے ہیں اللہ ان کی عمر بڑھاتا ہے بایں صورت کہ اللہ نے زیادہ عمر والوں کے لئے صلہ رحمی کو آسان بنا دیا ہے اور مقدر فرمایا ہے کہ جو لوگ صلہ رحمی کریں گے ان کی موت کو مؤخر کروں گا اور یہ معنی تقدیر مبرم کے منافی نہیں کیونکہ اللہ نے ان کے لئے تقدیر میں صلہ رحمی کو آسان کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے اور پھر اسی پر عمر کا اضافہ بھی مقدر فرمایا ہے۔ تدبیر

یا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی عمر میں برکت دی جاتی ہے جن کو ضیاع وقت سے محفوظ رکھ کر مسلسل اور زیادہ عمل کی توفیق دیتا رہتا ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ وقت کا ایک طول ہوتا ہے اور دوسرا عرض ہوتا ہے وقت میں برکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے عرض کو کشادہ کیا جاتا ہے، چنانچہ کبھی آدمی ایک ہی دن میں پوری کتاب لکھ لیتا ہے حالانکہ دن تو وہی بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے مگر چوڑائی بڑھادی جاتی ہے۔

دوسرا مطلب اس آخری جملے کا یہ ہے کہ ایسے آدمی کا ذکر جمیل لوگوں میں عرصہ دراز تک باقی رکھا جاتا ہے جس سے اس کو اخروی فائدہ ہوتا ہے اوپر ترجمہ میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی کو نیک صالح اولاد دی جاتی ہے جس سے اس کی یادگار بطور ذکر خیر اور عمل صالح کے باقی رہتی ہے خواہ یہ ذریعہ صلیبی ہو یا روحانی ہو، چنانچہ آج ایسے علماء کی روحانی اولاد بکثرت پائی جاتی ہے جو ان کا نام لے کر ”رحمہ اللہ“ اور ”رضی اللہ عنہ“ وغیرہ دعاؤں سے ان کو یاد رکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں یہ حدیث.... صرف امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے علاوہ ازیں امام احمد و حاکم وغیرہ نے بھی تخریج کی ہے۔^۳

نوٹ:۔ نسب اگرچہ باپ کی جانب سے اقرباء کو کہتے ہیں تاہم اس حدیث میں ذوالارحام یعنی مادری رشتے بھی مراد ہیں کیونکہ جس طرح پھوپھی کے ساتھ حسن سلوک ان تین فوائد کا موجب ہے اسی طرح

۳۔ مستدرک حاکم ص: ۸۷، ج: ۵، حدیث: ۷۴۲۲ کتاب البر والصلة، هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۱۹۵، ج: ۸، جمع الفوائد ص: ۳۳۱، ج: ۲، دار الکتب العلمیہ بیروت.

خالہ کے ساتھ نیک برتاؤ بھی ان منافع کا سبب ہے۔ اسی طرح دور کے اعزہ و اقارب سے بھی اچھا تعلق ہونا چاہئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب قریش کے ساتھ رشتہ داری کی بنیاد پر نیک سلوک فرماتے۔

باب ماجاء فی دعوة الاخ لاخته بظہر الغیب

”عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مادعوة اسرع اجابة من دعوة غائب لغائب“۔ (غریب والافریقی یضعف الخ)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غائب کی دعاء غائب کے حق میں قبول ہونے میں کوئی دعا اس سے زیادہ جلد قبول ہونے والی نہیں۔

لغات:- ”بظہر الغیب“ پیٹھ پیچھے، ظہر کا لفظ زائد برائے تاکید ہے۔

تشریح:- چونکہ مدعو لہ کی موجودگی میں ریاہ اور لالچ و طمع کی آمیزش دعاء کی قبولیت کو متاثر یا ختم کر سکتی ہے اس لئے غائبانہ کی تخصیص فرمادی پھر غائب سے مراد دور نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کے حق میں دعا مراد ہے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شخص میرے لئے دعائیں مانگ رہا ہے لہذا اگر وہ دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوں مگر دل میں ایک دوسرے کے لئے دعائیں مانگیں تو بھی وہ غائبانہ کہلائے گی اس کی قبولیت کی وجہ اخلاص نیت اور نصیح و خیر خواہی ہے۔

باب ماجاء فی الشتم

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المُستَبان ماقلا فاعلی البادی منہما مالم یعتد المظلوم“۔^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گالم گلوچ کرنے والے دونوں جو کچھ کہتے ہیں وہ پہل کرنے والے پر وبال ہے جب تک کہ مظلوم (جس کو گالی پہلے دی گئی ہے) انتقام میں زیادتی نہ کرے۔

لغات:- قولہ ”المستبان“ بتشدید الباء مُسْتَبَّ کا تشبیہ ہے جو باب افتعال کا اسم فاعل ہے یعنی اِسْتَبَّ کا باب افتعال بھی باب تفاعل کی طرح کبھی جانین سے مشارکت فعل کے لئے آتا ہے لہذا اِسْتَبَّ کے معنی باہم گالی گلوچ کرنے کے ہیں۔ قولہ ”فعلی البادی الخ“ المستبان کی خبر ہے ”ای اثم قولہما علی البادی“۔ چونکہ ”ما“ موصولہ معنی شرط کو متضمن ہے اس لئے خبر پر ”فا“ داخل کر دیا پھر ”البادی“ کے اخیر میں ہمزہ ہے کیونکہ یہ بدء سے اسم فاعل ہے۔

تشریح:- باب کی تیسری روایت میں شتم اور سب کو فسوق کہا ہے اس طرح ایک روایت میں گالیاں بکنے والوں کو شیطان کہا ہے جیسا کہ مسند احمد ^۱ اور الادب المفرد للبخاری میں ہے ”المستبان شیطانان“ الخ جس سے گالیوں کی شاعت معلوم ہوتی ہے تاہم اگر کوئی شخص کسی کو گالی دیدے تو دوسرا جواب دینے اور انتقام لینے کا حق شرعاً محفوظ رکھتا ہے اگر وہ چاہے تو خاموش ہو جائے جو عزیمت کا درجہ اور صبر کا مقام ہے لیکن اگر وہ جواب دینا چاہے تو اسے اجازت ہے تاہم امام غزالی احياء العلوم میں لکھتے ہیں کہ خلاف واقعہ جواب دینے کی اجازت برگزیدہ سوگی لہذا اسے ایسا جواب دینا چاہئے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو اور بات بھی حقیقت پر مبنی ہو مثلاً جواب میں احمق اور بے وقوف کہنا چونکہ کوئی آدمی آج کل حماقت سے معر نہیں ہو سکتا اس لئے جواب درست ہوگا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جواب میں گالی دینے والے کے الفاظ پر اکتفاء کرے ایسے میں اس بُرائی کا سارا گناہ اس آدمی پر آئے گا جس نے پہل کی ہے لیکن اگر دوسرے نے غصے میں یا جواب میں تجاوز کیا تو یہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہوگا۔ ابن العریلی لکھتے ہیں: ”المعنی انه اذا سبہ فرد علیہ کان کفافاً فان زاد بالغضب والتعصب لنفسه کان ظالماً وکان کل واحد منهما فاسقاً“۔

دوسری حدیث:- فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مردوں کو بُرا بھلا مت کہو کیونکہ اس سے تم زندوں کو تکلیف پہنچاؤ گے۔ ^۲

۱۔ مسند احمد ص: ۱۶۱ ج: ۵ حدیث: ۱۷۰۲۹ عن عیاض قال قلت یارسول اللہ رجل من قومی یشتنی وهو دنی علی باس ان انتصر منه؟ قال: المستبان شیطانان یتهاذیان یتکاذبان، ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۱۱ ج: ۳۔ حفیظ الرحمن الحنفی

۲۔ الحدیث أخرجه احمد فی مسنده ص: ۳۰۸ ج: ۵ حدیث: ۱۷۷۴۳، ۱۷۷۴۵ وابن عدی فی الکامل ۱۵۶۸/۳، والنزیدی فی التحاف السادة المتقين ۴/۲۹، والعراقی فی المغنی عن حمل الاسفار ۳/۷۷، ۱۲۲، مجمع الزوائد ص: ۹۳ ج: ۵ حدیث: ۱۳۰۳۱۔

تشریح:- چونکہ مُردوں کو گالی دینے کا رخ ان کے پس ماندگان کی جانب ہوتا ہے اس لئے مُردوں کو گالی گلوچ دینا ممنوع قرار دیا کہ اس سے درحقیقت زندوں کی ایذا رسانی ہوتی ہے پس اگر وہ نیک و صالح لوگ ہوں گے تو ان کے مردے جیسے بھی ہوں ان کو گالیاں نہیں دینی چاہئے گو وہ کافر کیوں نہ ہوں، نیز ان کے گناہوں کی سزا ان کو مل چکی ہے اور اگر وہ قابلِ عفو ہوں جیسے مسلمان مُردے تو پھر ایسے لوگوں کو جو عند اللہ مقبول ٹھہرے ہیں بُرائی نہیں کہنا چاہئے۔

تیسری حدیث:- فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ (حسن صحیح ۴)

لغات:- قولہ ”سب سراسر اسین“ گالی اور بُرا بھلا کہنا۔ قولہ ”فسق“ کے معنی خروج کے ہیں اصطلاح میں شرع کی اطاعت سے خروج یعنی گناہ کو کہتے ہیں۔

تشریح:- خوارج اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہتے ہیں کہ مسلمان کو قتل کرنا کفر ہے اور قاتل کافر ہے۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ پھر فاسق بھی کافر ہونا چاہئے کیونکہ کسی کو بحیثیت مسلمان قتل کرنا جیسے کفر ہے اسی طرح گالی دینا بھی کفر ہے، لہذا حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ گالم گلوچ اور قاتل اگرچہ دونوں کبار ہیں تاہم گالیوں کا درجہ اخف ہے کہ بعض لوگ اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے بخلاف قاتل کے کہ یہ تو صرف اختلاف دین کی وجہ سے ہونا چاہئے، لہذا جو آدمی کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے وہ گویا اپنا دین الگ سمجھتا ہے۔ غرض گالی گناہ ہے مگر عمل کفر نہیں جبکہ قاتل گناہ کے ساتھ عمل کفر بھی ہے اور عمل کفر سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا یعنی نفس فعل سے اور حدیث میں یہی فرق ظاہر کرنا مراد ہے۔ تدبر ولا تعجل

باب ماجاء فی قول المعروف

”عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان فی الحنة غُرفاً تُری ظہورہا من بعضہا وبطنہا من ظہورہا، فقام اعرابی فقال: لیمن ہی یا رسول اللہ؟ فقال: لمن آطاب الکلام واطعم الطعام وادام الصیام وصلی باللیل والناس نيام“۔ (حدیث غریب وَاخرجه احمد بن حبان

یح الحدیث اخرجه البخاری فی الایمان باب: ۳۶ والادب باب: ۴۴ والفتن باب: ۸، ومسلم فی الایمان حدیث: ۱۱۶.

والنسائی فی التحريم باب: ۲۷ وابن ماجه فی المقدمة باب: ۷، ۹، الترغیب والترہیب ص: ۳۱۱ ج: ۳.

فی صحیحہ وغیرہ (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک جنت میں ایسے بالا خانے ہیں جن کا بیرونی منظر اندر سے دکھائی دیتا ہے اور اندر کا باہر سے نظر آتا ہے، پس ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ کس کے لئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کے لئے ہیں جو بیٹھی بیٹھی گفتگو کرے اور کھانا کھلائے اور کثرت سے روزے رکھے اور رات کو نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں۔

لغات:- قوله "عُرْفًا" بضم الاول وفتح الثانی عُرْفَةً کی جمع ہے وہ کمرہ اور عمارت جو بلندی پر بنی ہو خواہ زمین پر ہی ہو جیسے ٹیلہ نما جگہ پر جہاں سے چاروں اطراف دور تک نظر آتے ہیں۔

تشریح:- جو آدمی صاف گو اور حق گو ہو تو چونکہ اس کا ظاہر باطن کا آئینہ ہوتا ہے اور باطن بھی ظاہر کے مطابق ہوتا ہے اسی طرح دوسری نیکیوں کا حامل جن کا تذکرہ اس حدیث میں ہوا ہے دوسری جانب یہ طے ہے کہ جزاء مثل عمل ہوتی ہے لہذا اس کے اس شفاف روئی اور صاف ستھرے طرزِ کلام اور بے غبار عمل کی وجہ سے اللہ نے ایسے محلات عطا فرمائے جو شیشے کی طرح بالکل صاف اور شفاف ہیں۔ آج کل جیسے بڑے بڑے شیشے لگائے جاتے ہیں جس سے اس حدیث کے سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

چونکہ ایسے گھر ایک عمدہ نعمتیں ہیں اس لئے ایک اعرابی نے یہ سُن کر بوجہ اشتیاق پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَمَنْ اطاب الکلام" طیب کے معنی عمدہ کے آتے ہیں بعض طرق میں اَطَابَ کے بجائے "الآن" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی نرم کے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ جس کے اخلاق اچھے ہوں کیونکہ عمدہ اخلاق کا مالک جب بات کرتا ہے تو جی سننے سے نہیں تھکتا بلکہ دل و دماغ مسرور ہوتے ہیں۔

قوله "وإدام الصيام" ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد معروف روزے ہیں یعنی

باب ماجاء فی قول المعروف

۱۔ رواہ احمد فی مسنده ۳۴۳/۵ واورده المصنف فی زوائد المسند حدیث: ۵۱۱۲، والخلیف البغدادی فی تاریخ بغداد ۲۰۳/۸، والسیوطی فی الدر المنثور ۱۸۲/۱، ۸۱/۵ مجمع الزوائد ص ۵۶۰ ج ۱۰، ایضاً رواہ ابن حبان فی

صحیحہ، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۹ ج: ۱

رمضان اور باقی فضیلت والے ایام کے جس کی تفصیل ابواب الصوم میں گزری ہے، لہذا اس سے مراد صوم الدہر اور تسلسل سے روزے رکھنا نہیں ہے۔ بعض صوفیا فرماتے ہیں کہ یہاں صیام سے مراد ہر مکروہ سے پرہیز و امساک ہے چنانچہ دل خراب اعتقادات اور تصورات سے اور زبان غلط باتوں اور جسم بے ہودہ کاموں سے محفوظ رکھنا مراد ہے۔

قولہ ”وصلی باللیل الخ“ عارضہ میں ہے کہ تہجد کی فضیلت کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ اللہ نے اس کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا وسیلہ بنایا چنانچہ ارشاد ہے ”ومن اللیل فتحہ جددہ نافلۃ لک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً“ الایۃ^۱۔ دیگر فضائل ابواب الصلوٰۃ میں گزرے ہیں۔

باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح

”عس ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: نعم مالا ٰحدھم ان یطیع ربہ ویؤدی حق سیدہ یعنی المملوک وقال کعب: صدق اللہ ورسولہ“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہت اچھی بات ہے ان میں سے ایک کے لئے کہ وہ اپنے رب کی بھی اطاعت کرے اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کرتا رہے (راوی کہتا ہے) ”یعنی غلام“۔ حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے سچ ہی کہا ہے۔

لغات:- ”نعم ما“ لفظ ”ما“ نکرہ ہے بمعنی شیئاً اس کا پہلے میم میں ادغام بھی جائز ہے چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ”نِعْمًا المملوک“^۱ کے الفاظ ہیں ادغام کی صورت میں عین پر کسرہ پڑھا جائے گا جبکہ نون پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں جبکہ بغیر ادغام کے جیسے ترمذی کی روایت میں ہے نون مکسور اور عین کو ساکن پڑھا جائے گا۔

تشریح:- چونکہ غلام کے لئے بیک وقت مالک حقیقی اور مالک مجازی دونوں کو خوش رکھنا بایں صورت کہ دونوں کی پوری اطاعت کی جائے ایک مشکل کام ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مدح فرمائی

۲۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۷۹۔

بلکہ بعض روایات میں اس کو ذیلِ ثواب کی خوشخبری دی ہے کہ عمل بھی ذہرا ہے۔^۱

قولہ ”وقال کعب صدق اللہ ورسولہ“ چونکہ حضرت کعب الاحبار کتبِ سادویہ کے ماہر تھے اس لئے انہوں نے سابقہ کتب میں بھی یہی پڑھا ہوگا اس لئے اس کی تصدیق فرمائی کیونکہ کتبِ سادویہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

حضرت کعب الاحبار سے کافی ساری روایات مروی ہیں اگرچہ بخاری شریف میں ان سے روایت نہیں ہے مگر مسلم شریف میں ان سے روایت ہے۔

حافظ نے تقریب وغیرہ میں لکھا ہے کہ ان کا نام کعب بن ماتع الحمیری تھا، کنیت ابو اسحاق اور المعروف بہ کعب الاحبار تھے، ثقہ راوی ہیں، مخضرمین میں سے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حینِ حیات موجود تھے مگر ملاقات نہ ہو سکی تھی کیونکہ یہ یمن میں ہوتے تھے بعد میں شام منتقل ہو گئے تھے اور عرسو برس سے متجاوز تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انتقال فرما گئے۔

حدیث آخر:- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین اشخاص مُشک کے ٹیلوں پر ہوں گے (راوی کہتا ہے) میں سمجھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن وہ غلام جس نے اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی۔ اور وہ شخص جس نے کسی قوم کی امامت کی (خواہ صغریٰ ہو یا کبریٰ) اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ اور وہ شخص جو پانچوں نمازوں کے لئے ہر دن رات اذان دیتا رہا ہو۔

لغات:- قولہ ”کعبان المسک“ کعبان، بروزن عثمان بضم الکا ف کعب کی جمع ہے اونچے ٹیلے کو کہتے ہیں اور مسک بکسر المیم مُشک کو کہا جاتا ہے۔ قولہ ”أراه“ ای اظنہ، اس لفظ میں ضابطہ یہ ہے کہ جب بضم الہمزہ آتا ہے تو بمعنی ظن کے آتا ہے جیسے یہاں ہے اور جب بفتح الہمزہ آتا ہے تو روایت بصری اور یقین کے معنی میں آتا ہے۔

تشریح:- چونکہ مشقت والے اعمال اور پاکیزہ کاموں سے آدمی ترقی کرتا ہے اور اسے نیک شہرت ملتی ہے بشرطیکہ اُن میں ریاء اور دکھاوانہ ہو اس لئے اللہ نے ان تینوں کو قیامت کے دن ان اعمال کے مطابق شہرت کے اونچے مقام تک پہنچایا، بخلاف ریاکار کے کہ وہ اپنے جن اعمال کی وجہ سے حُبِ جاہ میں مبتلا ہے تو دنیا میں

اگرچہ وہ شہرت حاصل کر لیتا ہے لیکن قیامت میں بدنام و گنہگار بنادیا جاتا ہے یا شہرت تو ہوگی مگر بدنامی والی۔
 رہا یہ مسئلہ کہ اگر امام سے لوگ راضی نہ ہوں اور وہ زبردستی کرسی پر یا مسجد کے منبر و محراب پر قابض رہے
 تو اس کا حکم ابواب الصلوٰۃ میں گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی، باب ماجاء من اثم قوما وھم لہ کارھون ص: ۲۰۲ ج: ۲)
 جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام میں خامی ہو اور لوگ اس کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے ہوں تو امام کو لازم
 ہے کہ یا اس خامی کا ازالہ کرے یا پھر مستغنی ہو جائے بصورت دیگر حوالہ بالا کی حدیث کے مطابق یہ ان تین
 آدمیوں میں سے ہوگا جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ والعیاذ باللہ

باب ماجاء فی معاشرۃ الناس

”عن ابی ذر قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اتق اللہ حیث ما کنْتَ و اتبع
 السیئة الحسنۃ تمحھا و تحالی فی الناس بمخلق حسن۔“ (ہذا حدیث حسن صحیح)
 حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:
 اللہ سے ڈرتے رہنا خواہ جہاں بھی ہو، اور نیکی کو بُرائی کے درپے کر لیا کرو تا کہ اسے مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ
 خوش اخلاقی سے ملو۔

لغات:۔ قولہ ”معاشرۃ“ عشرت سے ہے باب مفاعلہ کی خاصیت کے مطابق باہم رہن رہن اور مل
 جل کر رہنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”اتق اللہ“ تقویٰ کے معنی پرہیز اور بچنے کے ہیں، جس کے متعدد درجے ہیں جیسا
 کہ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے ”وہو فی عرف الشرع اسم لمن بقی نفسہ عما یضرہ فی الآخرة ولہ
 ثلاث مراتب“: (۱) شرک اور عذاب دائم سے بچنا۔ (۲) ہر گناہ سے بچنا حتیٰ کہ صغائر سے بچنا بھی بعض کے
 نزدیک تقویٰ کے اس درجے میں شامل ہے۔ (۳) اپنے دل و دماغ کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھنا جو راہ حق میں
 رکاوٹ بنے ”وہو التقویٰ الحقیقی المطلوب بقولہ تعالیٰ: اتقوا اللہ حق تقاتہ۔“^۱ (بیضاوی)
 قولہ ”حیث ما کنْتَ“ یعنی خلوت اور جلوت دونوں میں۔ قولہ ”تمحھا“ اسناد مجازی ہے کیونکہ
 مٹانے والا اللہ ہی ہے یعنی اللہ اس کے ذریعے گناہ کو مٹا دیتا ہے۔

تشریح:- تقویٰ کا حکم تو سب مسلمانوں کے لئے ہے مگر اس حدیث میں چونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو خصوصی طور سے نصیحت کی جا رہی ہے، گو باقی لوگوں کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہاں تقویٰ کا آخری تیسرا درجہ لیا جائے علیٰ ہذا گناہ اگرچہ توبہ سے معاف ہوتا ہے مگر یہاں چونکہ بات تقویٰ کی ہو رہی ہے، اور وہ بھی اعلیٰ درجے کے تقویٰ کی جو دل کی روحانی کیفیات کو ہمہ وقت برقرار رکھنے اور برسرِ یعنی قلب کو ماسوا اللہ سے پاک رکھنے کا نام ہے تو جب کبھی گناہ صادر ہو جائے تو وہاں دل میں سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ کیوں نہ ہو اس لئے فوراً نیکی کا کام کرنا چاہئے تاکہ دل کی جلا بحال ہو اور دھبہ مٹ جائے یعنی نامہ اعمال کے مٹنے کے ساتھ ساتھ لوحِ قلب سے بھی اس کا موزی اور مخوس اثر ختم ہو جائے۔

چونکہ تقویٰ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ راضی نہ ہو لہذا حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی ذکر فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ میل جول میں وہ برتاؤ کرو جس سے اللہ راضی ہو یعنی اخلاقِ حسنہ، حسنِ ظن اور حسنِ معاملہ۔

باب ماجاء فی ظن السوء

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ایاکم والظن، فان الظن اکذبُ

الحدیث“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ بدگمانی جھوٹ سے زیادہ غلیظ ہے۔

لغات:- قولہ ”ظن السوء“ ظن کے معنی گمان کے ہیں یہ وہی معنی ہیں جو مناطقہ کے یہاں معتبر ہے جو تصدیق کا ادنیٰ درجہ ہے یعنی اعتقادِ جازم، جبکہ السوء کے معنی برائی و بدکاری وغیرہ کے آتے ہیں مجموعی ترجمہ بدگمانی ہے۔

تشریح:- سابقہ باب میں آخری جملے سے اخلاقی حسنہ پر عمل کرنے کا حکم تھا جس میں حسنِ ظن بھی داخل ہے اس لئے اصل یہ ہے کہ مسلمانوں اور خاص کر نیک صالح لوگوں کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا چاہئے جبکہ بدگمانی اس کی ضد ہے اس لئے اس باب میں بدگمانی کی نفی اور نہی فرمادی، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں حسنِ ظن مطلوب اور سوءِ ظن مردود و مذموم ہے ہاں البتہ عقائد میں ظن قطعاً قابلِ قبول نہیں، قال

اللہ تعالیٰ: ”وَمَا يَتَّبِعْ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا“^۱ یہ مسئلہ متفق علیہا ہے سوائے ابن ہمام رحمہ اللہ کے جو بعض عقائد کو ظن سے ثابت مانتے ہیں مگر یہ ان کا تفرد ہے جیسا کہ (تشریحات ترمذی جلد چہارم ”باب ماجاء فی عذاب القبر“ ص ۴۰۱) پر گزرا ہے۔ ہاں اعمال و احکام فرعیہ میں خبر واحد قابل قبول ہے جو کثرت و سائنط کی وجہ سے مفید للظن ہے اسی طرح دیگر معاملات و معاشرت میں بھی، مگر یہ الگ مسئلہ ہے اور باب کا مسئلہ بدگمانی سے متعلق ہے، لہذا یہاں اسی سے متعلق بحث مناسب ہے، پس اس حدیث کا مطلب کیا ہے؟

(۱) تو امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس بارے میں امام سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بدگمانی اکذب الحدیث کی وعید میں آتی ہے جس کے بارے میں زبان سے اظہار کیا جائے بغیر اظہار کے گناہ میں نہیں آتی، لیکن ابن العربی نے عارضہ میں اس توجیہ کو رد کیا ہے کیونکہ ایک دفعہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کے دنوں میں رات کے وقت مسجد کے دروازے کے پاس حضرت صفیہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو گھر جانے کے لئے رخصت کر رہے تھے ابھی ان کے ساتھ کھڑے ہی تھے کہ وہاں سے دو آدمی گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”انھا صفیہ“ قالایارسول اللہ سبحان اللہ قال: ان الشیطان یحری من ابن آدم

محرم الدم ہوانی خشیت ان یقذف فی قلوبکمما شیفاً تہلکاً۔^۲

چنانچہ یہاں بغیر نطق کے ظن کو بھی مہلک قرار دیا ہے اگرچہ غیر نبی کے بارے میں بدگمانی ہلاکت خیز تو نہیں مگر معصیت تو ہے۔

(۲) امام نووی نے شرح مسلم میں امام خطابؓ سے نقل کیا ہے کہ مراد وہ ظن ہے جو نفس میں قرار پکڑے یعنی چنگلی پائے۔ رہا وہ ظن جو آئے اور ختم ہو جائے وہ معاف ہے کہ غیر اختیاری و سو سے انسانی بس سے باہر ہے۔

(۳) ابن العربی نے جس کو صحیح کہا ہے وہ یہ ہے ”وقیل: ذالک یختلف بحال المظنون وهو الصحیح عندی“ یعنی اگر ایک آدمی مشتبہ کام کرتا ہے مثلاً جب اس کا پڑوسی گھر میں نہیں ہوتا ہے تو وہ چھپکے

سے اس کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ اس کا معمول ہے اور پڑوسی کی بیوی بھی کوئی نیک سیرت خاتون نہیں ہے تو ایسے میں حسن ظن کہاں سے آئے گا؟ یا ایک راوی متهم بالکذب ہے وغیرہ وغیرہ تو ایسی بدگمانی گناہ میں نہیں آتی بلکہ اس کا ذمہ دار مظنون خود ہے لیکن جو شخص نیک صالح کردار کا حامل ہے تو اس پر بلا وجہ بدگمانی کرنا غلیظ جھوٹ اور تہمت ہے۔

”لان من الناس من تطرق اليه التهمة، ومنهم من لا تطرق، فكل من تعرض

التهم فلا يلوم من أساء به الظن والصيانة“ ترفع ذالك عن الصائن فان ظن به

احد ذالك اثم“۔ عارضہ

المستعرض عرض کرتا ہے کہ اس آخری اور تیسرے مطلب سے بہت سے اشکالات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا۔ تدر

قولہ ”فان الظن اكذب الحديث“ یعنی پاک لوگوں کے بارے میں بدگمانی غلیظ قسم کا شیطانی وسوسہ ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ظن السوء جھوٹ بولنے کا سبب بنتا ہے۔ کیا ایسی بدگمانیاں کرنے اور پھیلانے کی یہ بُرائی اور قباحت، خرابی کے لئے کافی نہیں جو آج کل اہل تجدّد نے اسلاف کے بارے میں اپنا شیوہ اور مشغلہ بنایا ہے سالہا سالوں سے کئی گروپ منظم سازش کے تحت فقہاء و محدثین جیسے نیک سیرت لوگوں کے بارے میں یہ تاثر دے رہے ہیں اور تحریک چلا رہے ہیں کہ ان فقہاء و محدثین نے فلاں جگہ غلط بیانی کی ہے اور فلاں جگہ غلط استنباط کیا ہے اور مقصد ان پر سے اعتماد اٹھانا اور انکار حدیث و انکار فقہ کی راہ ہموار کرنا ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کیا اس سے بڑی غلیظ بات ہو سکتی ہے؟

باب ماجاء في المزاح

”عن انس قال إن كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليخالفنا حتى إن كان ليقول لآخ

لى صغير: يا أبا عُمير ما فعل النُغير؟“ (هذا حديث حسن صحيح^١)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے

میل جول فرماتے حتیٰ کہ بلاشبہ میرے چھوٹے بھائی سے کہتے، اے ابوعمیر تغیر کا کیا بنا؟۔

لغات:- قولہ ”الیزاح“ بکسر المیم اور ضمہ بھی صحیح ہے خوش طبعی کی گفتگو کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ان کان وحشی ان کان“ دونوں جگہوں میں ”ان“ مخفف من المقلہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان ہے یعنی ”انہ“۔ قولہ ”لیعالمنا“ مخالطت غزلت و تنہائی کی ضد ہے گل مل کر رہنے کو کہتے ہیں جو کنایہ ہے عدم تکلف اور عدم تکبر سے۔ قولہ ”تغیر“ بصیغہ تصغیر یعنی ضمیم الاول و فتح الثانی سرخ چونچ والا چھوٹا سا پرندہ ہے جس کو اہل مدینہ بلبل کہتے تھے۔

تشریح:- دنیا داروں اور بالخصوص ملوک و سلاطین کے اخلاق کچھ اس طرح ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ابنائے جنس اور ابنائے نوع سے ممتاز و بہتر سمجھتے ہیں وہ ہر وقت اپنے رعب جمانے کی کوشش میں ہوتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی برتری ظاہر کرتے رہتے ہیں جس کے کئی طریقے ہیں: وہ نہ تو اپنے سے کمتر لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنی شان کے منافی کہتے ہیں۔ وہ عام لوگوں سے مل جل کر رہنے کو عیب سمجھتے ہیں کہ عام لوگ ان کی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ایک ہی مجلس میں بیٹھنا، کھانا کھانا، باتیں کرنا اور چھوٹے بچوں کے ساتھ سرکوں اور گلیوں میں کھڑے ہو کر خوش مزاجی کی باتیں معیوب سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بغیر ان کا رعب قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے ملوک فارس جب بیٹھتے تو دربار والے ان کے گرد کھڑے رہتے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جن کمالات اور اخلاق سے نوازا تھا ان میں ان تکلفات کی نہ گنجائش تھی اور نہ ہی ان کو ضرورت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب بقدر ایک ماہ کی مسافت کے دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل اور عروج پر پہنچانا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے بادشاہوں سے بالکل منفرد و ممتاز عالی شان بادشاہ تھے۔ اس حدیث میں ان کے کریمانہ اخلاق کی ایک جھلک بیان ہوئی ہے چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ مخالطت فرماتے، اس مخالطت اور بے تکلفی کا عالم یہ تھا کہ میرے چھوٹے بھائی سے یہ کہہ کر مزاح فرماتے کہ تیری بلبل کہاں ہے؟ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ چھوٹا بھائی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا صاحب زادہ ہے لہذا یہ ان کا ماں شریک بھائی ہے یعنی دونوں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں۔ ابوعمیر کے نام میں دو قول ہیں: ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھی میں ”حفص“ ذکر کیا ہے جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ

نے ”عبداللہ“ نام کو ترجیح دی ہے۔ ان کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ہوئی تھی۔

بعض نے اس حدیث کے حوالے سے محدثین عظام پر ایک اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں فضول قسم کی بے فائدہ احادیث بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ابن القاضی الشافعیؒ نے فرمایا کہ ان کو پتہ نہیں حالانکہ اس حدیث میں ساٹھ فوائد ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کچھ اور مزید فوائد کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث ”باب ماجاء فی الصلوٰۃ علی البُط“ میں بھی گزری ہے وہاں بھی ہم نے چار فوائد کا ذکر کیا تھا کہ اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدنی کا حکم حرم مکی سے مختلف ہے کہ مدینہ میں شکار کھیلنا جائز ہے۔ بچہ اگر پرندے سے کھیلے اور اسے تکلیف نہ دیتا ہو تو یہ بھی جائز ہے، اور یہ کہ بے اولاد شخص کو کنیت سے پکارنا جائز ہے اور یہ کہ بچوں کے ساتھ ایسی بے تکلفی جس میں خلاف واقع بات کا ارتکاب نہ ہوتا ہو جائز ہے۔

لیکن یہاں یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کی مناسبت سے ذکر کی گئی ہے، اس کے علاوہ بھی امام ترمذیؒ نے اس باب میں تین ایسی احادیث ذکر فرمائی ہیں جو اس بات پر ناظر ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے خوش طبعی اور بے تکلفی کی باتیں فرماتے، جس کا مقصد ان کو خوش کرنا، اپنے رعب کو کم کرنا تھا تاکہ اگر وہ کوئی مسئلہ پوچھنا چاہیں تو غیر معمولی رعب رکاوٹ نہ بنے اور ان کو باہم رہن سہن کے اطوار و طریقے بتلانا تھا کہ وہ آپس میں بھی ہشاش بشاش رہیں، گھٹن کا ماحول پیدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ، تاہم اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی شریعت کے ادنیٰ آداب کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ مزاح دین کے بارے میں یا کثرت سے ہوتا کیونکہ یہ دونوں سخت ممنوع ہیں چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: ”ان اللہ یا امرکم ان تذبحوا بقرة قالوا انتخذنا هزوا قال اعوذ بالله ان اکون من الجاهلین“ یعنی میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ دین کے معاملے میں مذاق کروں۔ تفسیر مدارک میں ہے کہ ایسے موقع پر مذاق جہالت میں سے ہے ”لان الهزء فی مثل هذا من باب الجهل والسفه“۔ اسی طرح کثرت مذاق بھی ممنوع ہے کہ آدمی لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے ہر وقت مذاق کرتا رہے اور خود کو سخرہ بنائے کیونکہ اس کی ممانعت صحیح نصوص سے ثابت ہے اور یہ کہ اس سے کثرت خُحک اور قساوت قلب بلکہ غفلت عن الآخرة لازم آتی ہے جس کی قباحت و ہلاکت بدیہی ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولكن لا ينبغي ان يكون الرجل مزاحاً ولا تلعاباً، ولا يستعمل ذلك في احكام

الدين فانه جهل”۔(عارضہ)

ایسی ہی بات امام نوویؒ وغیرہ نے بھی لکھی ہے لہذا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اس صورت میں ہرگز نہ تھا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں کوئی خلاف واقعہ بات بھی نہیں ہوتی جیسا کہ باب کی اگلی روایت میں اس کی تصریح ہے، نیز کسی کے اوپر طنز یا کسی کی تحقیر یا لوگوں کی تعجیک اور خود زور سے ہنسے کے مزاح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح میں دوسروں کی حوصلہ افزائی قدر و عزت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبسم و مسکراہٹ فرماتے۔

الحمد للہ راقم نے ”نقش قدم“ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور خوش طبعی کے کچھ واقعات ذکر کئے ہیں۔ (دیکھئے نقش قدم فصل ۳ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ“ باب اول) گیارہ صفحوں سے زائد اس مضمون کا آخری حصہ آپ بھی پڑھ لیں ”ایک دفعہ ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا شوہر بیمار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے پاس) تشریف لانے کی درخواست کرتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تیرا خاوند ہی ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے؟ وہ (خاموشی سے) واپس آئی اور اپنے خاوند کی آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی، اس نے پوچھا تو کیا کر رہی ہے؟ کہنے لگی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیری آنکھوں میں سفیدی ہے اس نے (ہنس کر) کہا کہ کون سا انسان ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی نہیں ہے؟۔

اسی طرح ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (میرے لئے) اللہ سے دعا فرمائے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے فلاں کی ماں کوئی بوڑھی جنت میں داخل نہیں ہوگی وہ عورت روتی ہوئی واپس چلی آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے پاس بیٹھنے والوں سے) فرمایا کہ اس کو جا کے بتا دو کہ جب یہ جنت میں داخل ہوگی تو بوڑھی نہیں ہوگی (بلکہ بالکل نو عمر ہوگی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی ”اِنَّا اَنْشَاْنَا هٰنِ اَنْشَاءً“ فَجَعَلْنَاهُنْ اِبْكَارًا اَعْرُبًا اَتْرَابًا“^۳ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی بلند اخلاق اور محاسن افعال کا مجموعہ بنا کر مبعوث فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے پاک ہو کر پیدا ہوئے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم جیسا چاہتے ایسا ہی پیدا ہوئے۔

خُلِقْتَ مُبْرَأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ

كَانَكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار لوگوں سے مزاح بھی فرما لیتے مگر کبھی بھی سچ کے علاوہ کوئی لفظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا نہیں ہوا۔^۱

دوسری حدیث: ”عن ابی ہریرۃ قال قالوا یا رسول اللہ انک تداعبنا قال: انی لا اقول الا

حقاً“۔ (و معنی قوله انک تداعبنا انما یعنون انک تمازحنا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں صحیح بات کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہتا ہوں۔

لغات: - دَعَبَ، دَعَبًا وَدَعَابًا دونوں مصدر ہیں تاہم دُعَابَۃ میں دال کا فتح وضمہ دونوں جائز ہیں خوش طبعی کرنے اور ہنسی مذاق کو کہتے ہیں۔ قولہ ”تداعبنا“ مداعبہ سے ہے مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے مذاق میں حصہ لیتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی وجہ تعجب وہی رسم تھی جس کا تذکرہ شروع باب میں کیا جا چکا ہے کہ عموماً بڑے لوگ اور خصوصاً سلاطین ایسا نہیں کرتے کہ ہر شخص سے بے تکلفی کریں، جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ میرا مذاق کرنا حد اعتدال کے اندر رہتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق تمسخر اور لوگوں کو ہنسنے پر آمادہ کرنا نہیں ہوتا تھا جس کے لئے جھوٹ بولنا یا طنز کرنا پڑتا ہے بلکہ صحابہ کرامؓ کے ذہن سے اپنے غیر معمولی رعب کو کم کرنا وغیرہ محمود مقاصد ہوا کرتے تھے اور یہ کام صحیح باتوں سے باسانی حاصل کیا جاسکتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح ہے اس لئے بعض شارحین نے ”الاحا“ بمعنی مفید آیا ہے یعنی میرا مزاح آپ کے فائدے کے لئے ہے۔

تیسری حدیث: - حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (انس) سے فرمایا ”اے دوکانوں والے“ اس کا مقصد بھی راوی کے مطابق مزاح کرنا تھا، گو کہ بعض شارحین نے

۱۔ کماورد فی الحدیث عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ انی لا مزح ولا قول الا حقاً اخرجه الطبرانی فی الصغیر

اس کو تنبیہ علی الاستماع پر بھی حمل کیا ہے کہ جب کان دو ہیں تو بات کو اچھی طرح سُننا اور سمجھ لینا چاہئے مگر ترمذی نے اپنے شیخ سے جو مطلب نقل کیا ہے وہ زیادہ ظاہر ہے۔

اس حدیث میں بھی مزاح کے رنگ میں ایک چچی اور درست بات کی گئی ہے۔

چوتھی حدیث:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا، تو اس شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں اونٹنی کے بچے سے کیا کروں گا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹ کو تو اونٹنی ہی جنتی ہے۔

لغات:۔ قولہ ”استحمل“ باب استعمال طلب کے لئے ہے یعنی سواری طلب کر لی خواہ بطور ہدیہ و صدقہ کے ہو یا عاریۃ ہو۔ قولہ ”وہل تلد الابل الا النوق“ اس میں ”نوق“ قاعِل اور ”الابل“ مفعول بہ ہے۔ نوق بضم النون ناقۃ کی جمع ہے اونٹنی کو کہتے ہیں جبکہ ”الابل“ میں الف لام جنس کے لئے ہے یعنی جنس اونٹ خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کو اونٹنی جنتی ہے۔ چونکہ سائل نے ولد الناقۃ سے متبادر معنی لئے اس لئے تعجب کا اظہار کیا کہ بچہ تو سواری کے قابل نہیں ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ اس کلام میں غور کرتے تو مطلب سمجھ میں آ جاتا، دیکھئے یہاں مزاح بھی ہوا اور سائل کے سوال کو قبول کرنے اور اونٹ دینے کی بات بھی ہوئی۔

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مراتب متفاوت تھے بعض کلام کے رموز کو بہت جلد سمجھ جاتے جبکہ بعض حضرات کو اس میں تاثر اور زیادہ تدبر کی ضرورت پیش آتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مذاق سب کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کے فہم کے مطابق ہونا چاہئے، ذکی کے ساتھ بلیغانہ انداز میں اور دوسرے درجوں والوں کے ساتھ حسبِ صلاحیت۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی المراء

”عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ترک الکذب وهو باطل بُنیٰ له فی رِیض الحنة ومن ترک المراء وهو مُحِقُّ بُنیٰ له فی وسطها، ومن حَسَنَ خُلُقَه بُنیٰ له فی اعلاها“۔ (حسن) ^۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جھوٹ کو چھوڑا اور اس حالیکہ وہ غلط ہو تو اس کے لئے جنت کے نشیبی حصے میں گھر بنایا جائے گا اور جس نے جھگڑا کرنے کو چھوڑا حالانکہ وہ حق بجانب ہو تو اس کے لئے جنت کے درمیانی حصے میں گھر بنادیا جاتا ہے اور جس شخص نے اپنے اخلاق کو عمدہ بنایا تو اس کے لئے جنت کے بلند مقام پر گھر بنایا جائے گا۔

لغات:- ”مراء“ بکسر المیم جنگ و جدال اور بحث و تکرار کو کہتے ہیں۔ قولہ ”وہو باطل“ یہ جملہ معترضہ ہے جو شرط اور جزاء کے درمیان آیا ہے جو یا تو تاکید کے لئے ہے یا پھر اس کذب سے احتراز کے لئے ہے، جس کی گنجائش بصورت شدید ضرورت یا بطور تعریض و توریہ کے ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے اور یہ احترازی کی صحت اس پر مبنی ہے کہ یہ جملہ حال ہے اور حال قید ہوتا ہے پھر حال ہونے میں دو احتمال ہیں یا مفعول یعنی ”کذب“ سے حال ہے اسی کو ترجمہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یا پھر فاعل سے حال ہے یعنی وہ شخص جو جھوٹ سے اجتناب کرتا ہے باطل اور غلطی پر ہو تو جب ایسے شخص کو جھوٹ چھوڑنے پر اتنا ثواب ملتا ہے تو جو حق پر ہو اور جھوٹ سے اجتناب کرے اس کے لئے تو بطریق اولیٰ بڑا مرتبہ ہوگا۔ قولہ ”بنیٰ له“ بضم بے بھول ہے۔ قولہ ”فی رِیض الحنة“ رِیض بفتح الباء گھر کے آس پاس کی جگہ اور ماحول کو کہتے ہیں، مگر ہم نے ترجمہ میں نشیب کا ترجمہ اس لئے کیا ہے کہ ایک تو اس حدیث میں تشبیہ دی گئی ہے، دوم رِیض کا تقابل وسط اور اعلیٰ سے کیا گیا ہے جس سے یہی مطلب نکلتا ہے، نیز جنت سے خارج اور باہر کا ترجمہ مناسب بھی نہیں ہے کما هو الظاہر۔ لہذا حاشیہ میں جو خارجاً عنہا کہا گیا ہے اس سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے، پس یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے ایک ٹیلا نما جگہ پر قلعہ ہوتا ہے اور اس کے دامن میں کچھ چوکیاں اور مکانات ہوتے ہیں چونکہ ایسی جگہ میں سب سے زیادہ خوب

باب ماجاء فی المراء

^۱ الحدیث روی بمعناه ابو داؤد ص: ۳۱۳ ج: ۲ ”باب فی حسن الخلق“ کتاب الادب، ایضاً رواہ النسائی فی الجہاد.

صورتی اور اہمیت کا حامل گھروہی ہوتا ہے جو سب سے اوپر چوٹی پر بنا ہوا ہو پھر وہ جو دامن کوہ اور قلّہ کوہ کے درمیان میں ہوتا ہے اور سب سے ادنیٰ وہ ہوتا ہے جو نیچے دامن یا نشیب میں واقع ہو ایسا ہی حال جنت کے مکانات اور مقامات کا ہے۔

تشریح:- اس حدیث شریف میں حسب تفاوتِ حسنات متفاوت مقامات میں گھروں کا وعدہ کیا گیا ہے بایں طور کہ پہلی نیکی کا درجہ نسبتاً کم ہے کہ یہ آسان ہے تو اس پر ادنیٰ گھر کا وعدہ کیا گیا جبکہ تیسرے نمبر کی نیکی بڑی مشکل اور عظیم ہے اس لئے اس کی جزاء بلند فضاء اور ہر کشش بناء مقرر کی گئی اور دوم درمیانہ ہونے کی وجہ سے درمیانہ درجے کے گھر کی بنیاد بنادی گئی۔

اس حدیث کے پہلے جملے میں جھوٹ چھوڑنے سے مراد جنگ و لڑائی کے وقت ترک ہے کیونکہ ایسے میں جبکہ جھوٹ بولنا مفید اور حجت میں کامیابی کا ذریعہ ممکنہ طور پر بن سکتا ہے مگر صرف گناہ سے بچنے کی غرض سے چھوڑنا نفس کو قابو میں رکھنے کی واضح دلیل اور بہترین موقع ہے اس لئے اس کے عوض جنت میں گھر دیا جاتا ہے تاہم نفس لڑائی کی نحوست سے نہ بچنے کی وجہ سے وہ گھر زیادہ اعلیٰ مقام پر نہ ہوگا۔ جبکہ دوسرے جملہ میں جس نیکی کا ذکر ہے یہ پہلی سے اعلیٰ ہے کہ اس میں نفس جھگڑے سے اجتناب کیا گیا اور وہ بھی حق بجانب ہوتے ہوئے تو بمقتضائے حدیث ”من تواضع لله رفعه الله“ اس کا گھر نشیبی مقام سے بلندی پر چلا گیا اگرچہ سب سے اعلیٰ گھر اس کا ہوگا جس کے تمام اخلاق تواضع سمیت اعلیٰ ہوں۔

دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كفى بك إثمًا أن لاتزال مخاصمًا“۔ (حدیث غریب) قال المناوی اسنادہ ضعیف۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیرے گناہ گار ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ تو ہمیشہ جھگڑا اور ہے۔

تشریح:- اس حدیث کا مطلب بالکل واضح ہے (گوکہ حدیث ضعیف ہے) کیونکہ جھگڑا ایک منحوس عمل ہے اس کا آدمی کے دین پر انتہائی بُرا اثر پڑتا ہے، اس سے اخلاق بھی تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ جھگڑا کرنا ہی

عرواہ البیہقی فی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ ص: ۳۳۳ ”باب الغضب والكبر“ ایضاً رواہ احمد ص: ۷۹ ج: ۳ حدیث: ۸۷۸۲ ولفظہ: و ماتواضع احد لله الا رفعه الله عزوجل، ایضاً ص: ۳۹۱ ج: ۳ ولفظہ: من تواضع لله درجة رفعه الله درجة، ایضاً رواہ ابن ماجہ وابن حبان بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۵۱ ج: ۳۔

بداخلاقی کی دلیل ہے پھر جو آدمی بار بار لڑتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باطن درندگی کی صفات سے لبریز ہے تو جس طرح اچھے اخلاق کا مالک مسلسل روزہ رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا جتنا ثواب کماتا رہتا ہے ٹھیک اس کے برعکس جھگڑا آدمی مسلسل گناہوں کا بار بڑھاتا رہتا ہے۔

تیسری حدیث:- ”لاتمارا حاک ولا تمازحه ولا تعدہ موعدا فتخلفه“ (حدیث غریب) اپنے بھائی سے جدال و تکرار مت کرو اور نہ اس سے نازیبا مذاق کرو اور نہ ہی ایسا وعدہ کرو جس کی تم خلاف ورزی کرو۔

لغات:- قولہ ”لاتمار“ مرء سے ہے اور ”لاتمازحه“ مزاح سے ہے دونوں کے معنی گزرے ہیں۔ قولہ ”ولا تعدہ“ وَعَدَ يَعِدُ بمعنی وعدہ کرنے کے اور موعدا مصدر میسی بمعنی وعدا کے ہے۔ قولہ ”فتخلفه“ اخلاف سے ہے اخلف وعدہ و بوعده، وعدہ خلائی کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں تین باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ (۱) مرء جس کا حکم گزر گیا تاہم مرء یعنی بحث و تکرار اگر قرآن میں کسی شک و شبہ ڈالنے کی غرض سے ہو تو یہ کفر ہے اور اگر ازالہ شک کے لئے ہو تو یہ جائز ہے۔

(۲) مزاح کی ایک صورت وہ ہے جو سابقہ باب میں گذر گئی وہ ہرگز مذموم نہیں۔ دوسری صورت وہ ہے جس میں وہ شرائط نہ ہوں جو سابقہ باب میں بیان ہوئی ہیں بلکہ کسی کی تحقیر اور طنز کے طور پر ہو تو یہ ناجائز ہے اور یہاں یہی قسم مراد ہے اور امام ترمذی کا مقصد بھی یہی ہے کہ مزاح کی دونوں صورتوں کو ناجائز فرمائے چنانچہ سابقہ باب میں جائز حالت بتلا دی اور اس باب میں ناجائز کو ذکر کیا۔

(۳) وعدہ خلائی: اس بارے میں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے جیسا کہ محشی نے طبعی سے نقل کیا ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا جائے اور وہ خلاف شرع نہ ہو تو اسے پورا کرنا پڑے گا مگر اس کی حیثیت میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک ایفا مستحب ہے اور بعض کے نزدیک جن میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ بھی ہیں واجب ہے بعض نے تفصیل بیان کی ہے، لہذا پہلے فریق کے نزدیک وعدہ خلائی مکروہ ہے جبکہ فریق ثانی کے نزدیک موجب گناہ ہے یہ اس وقت ہے جب وعدہ کرتے وقت ارادہ پورا کرنے کا ہو لیکن اگر شروع ہی سے خلاف ورزی کی نیت ہو تو یہ منافقت کی شاخ ہے:

”قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: آية المنافق ثلاث: إذا حدثك كذبَ وإذا وعد

احلف واذاؤ تمن خان۔“

البتہ شروع سے ارادہ ایفاء کا تھا مگر پھر کچھ عذر پیش آیا تو ایفاء لازمی نہیں، اس لئے وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا چاہئے تاکہ دوسرا فریق مکمل اعتماد کر کے نہ بیٹھے۔

یہ تو نفس مسئلہ ہوا مگر یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اخلاقی طور سے ایفاء عہد حتی الامکان لازمی ہے خاص کر جب وعدہ خلافی سے دوسرے کو نقصان ہوتا ہو بلکہ بسا اوقات وہ نقصان ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدرسہ کسی مدرس کے ساتھ رابطہ کر کے اس کو ترغیب دے کر اپنے مدرسہ میں استاذ مقرر کرنے کا وعدہ کر کے اسے لالچ بھی دلاتا ہے چنانچہ وہ بے چارہ اپنے مدرسہ سے استعفاء دیتا ہے اور جب یہاں آتا ہے تو مہتمم صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں آپ ناراض نہ ہوں، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک صاحب نے سرکاری نوکری سے استعفاء دے دیا اور پھر مدرسہ سے بھی نہیں رکھا، یہ بد اخلاقی کی بدترین مثال ہو سکتی ہے عام علماء یہ سمجھتے ہیں کہ عذر پیش آنے سے وعدہ خلافی جائز ہو جاتی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ عذر کس درجے کا ہو تو میخ ہے اور یہ کہ دوسرے کا جو غیر معمولی نقصان اور علمی قتل ہوا اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

ایسے لوگوں سے ہماری درخواست ہے کہ ایسے معاملات میں وعدہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے نہ کہ بعد میں، اگر کسی مدرس کے بارے میں تحقیق کرنی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تسلی کر کے پھر اس سے رابطہ کر لیا جائے یہ طریقہ غلط ہے کہ پہلے وعدہ کر لیا اس سے استعفاء دلویا اور اب تحقیقات کرنے لگ گئے۔ آخر اخلاقی فرائض بھی تو اسلام کا حصہ ہیں مدرسہ چلانا زیادہ سے زیادہ ایک مستحب امر ہے اگر اس میں ایسے قبائح اور اخلاقی خامیاں سراپت کر لیں تو استحباب کہاں رہے گا؟ یہ تو کاروبار بن جائے گا۔

ٹھیک ہے کاروبار بھی ایک مباح امر ہے مگر صدقات و خیرات اور دین کے نام پر نہیں بلکہ اپنے بازوؤں کی طاقت پر، یہ نہیں ہونا چاہئے کہ دین کے نام پر پیسے جمع کریں اور دین کے تقاضوں کو پامال کیا جائے اس سلسلہ میں اخلاقی نبوی کی ایک جھلک آپ بھی پڑھ لیں: قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ”الشفاء بتعریف حقوق المصطفى صلى الله عليه وسلم“ میں ابوالحساء سے نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ح رواہ البخاری ص: ۱۰ ج: ۱ ”باب علامة المنافق“ کتاب الایمان، ایضاً رواہ فی الاستقراض باب: ۱۰ ومظالم باب: ۷۷ وفى الوصایا باب: ۸، وفى الجزية باب: ۷ وفى الشهادات باب: ۲۸ وفى الادب باب: ۶۹ وصحيح مسلم ص: ۵۶ ج: ۱ ”باب خصال المنافق“ کتاب الایمان، ایضاً رواہ ابو داؤد وفى کتاب الصلاة باب: ۱۴۹، والنسائی کتاب الایمان باب: ۲۰، ایضاً مسند احمد ص: ۴۰ ج: ۳ حدیث: ۸۴۷۰ و ص: ۳۵۵ ج: ۲ حدیث: ۱۰۵۴۲۔

وعدہ کیا کہ میں آپ کا بقیہ حق لے کر اسی جگہ آتا ہوں پھر میں بھول گیا پھر تین دن کے بعد مجھے یاد آیا تو جب وہاں آیا تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں پر تھے یہ قبل البعث کا واقعہ ہے:

”عن ابی الحمساء قال بايعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیع قبل ان یبعث وبقیت له بقیة فوعدته ان آتیة بهافی مکانه فنسیئت ثم ذکرث بعد ثلاث فجئت فاذا هو فی مکانه فقال یافنی لقد شققت علی انا ههنا منذ ثلاث انتظرک“۔

(ص: ۷۴ حصہ اول فصل واما خلقہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت ”واذکرن فی الکلب السلیع انہ کان صادق الوعد“ (سورہ مریم آیت: ۵۴) کے تحت امام طبریؒ کی روایت نقل کی ہے:

”ان اسماعیل النبی علیہ السلام وعد رجلاً مکاناً ان یأتیہ فیہ فجاء ونسی الرجل فظلل به اسماعیل وبات حتی جاء الرجل من الغد فقال: ما برحت من ههنا؟ قال ”لا“ قال انی نسیئت قال: لم اکن لا برح حتی تأتینی فلذلك (کان صادق الوعد) وقال سفیان الثوریؒ بلغنی انہ قام فی ذالک المکان ینتظرہ حولاً حتی جاءہ وقال ابن الشوزب بلغنی انہ اتخذ ذالک الموضع مسکناً وقد رواہ ابو داؤد فی سننہ الخ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ”ان اللہ لا یخلف المیعاد“ (ال عمران آیت ۹) اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اخلاق ربانی اور اخلاق نبوی سے متخلق ہونے کی قدر و توقیع عطا فرمائے۔ آمین

باب ماجاء فی المداراة

”عن عائشة قالت استأذن رجل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا عنده فقال یس ابن العشیرة او اخو العشیرة ثم اذن له فالآن له القول فلما خرج قلت له یا رسول اللہ اقلت له ما قلت ثم آلت له القول؟ قال یا عائشة إِنْ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْ تَرَكَ النَّاسَ او وَدَّعَهُ النَّاسُ اتِّقَاءَ فَحْشِهِ“۔ (حسن صحیح)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر

آنے کی اجازت چاہی جبکہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص اپنے خاندان کا بُرا آدمی ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دیدی (چنانچہ جب وہ آیا) تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نرم گفتگو فرمائی، جب وہ نکلا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے تو اس کے بارے میں وہ بات کی تھی جو آپ کر چکے ہیں اور پھر بھی آپ نے اس سے نرم انداز میں بات فرمائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ بے شک لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جس کو لوگ بدگوئی سے بچنے کی خاطر چھوڑ دے۔

لغات:- ”مدارات“ بذل الدین اللہ یعنی دینی غرض کے پیش نظر لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات اور رہن سہن میں نرمی کرنا اور بول چال میں ملائمت اختیار کرنا۔ قولہ ”بئس ابن العشیرۃ او اخو العشیرۃ“ بئس افعال ذم میں سے ہے اور لفظ ”او“ شک من الراوی کے لئے ہے، ترویج کے لئے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بخاری شریف کی ایک روایت میں لفظ ”او“ کے بغیر آیا ہے۔ ابن اور اخ کی نسبت جب عشیرہ بمعنی قبیلہ کی طرف ہو جائے تو مراد فرد من القبیلہ ہوتا ہے جیسے فلان ابن التین یعنی فلاں آدمی ساٹھ سال کا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص اس قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ قولہ ”فَالَا نَ لَهُ الْقَوْل“ لیں سے ہے بمعنی نرم و ملائم کے۔

تشریح:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آدمی کی بابت یہ ارشاد فرمایا اس کا نام ”عُثَیْبَةُ بْنُ حَصِينٍ“ تھا جو بظاہر تو ایمان لایا تھا مگر اس میں مخلص نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلیت پر تنبیہ کی غرض سے فرمایا کہ یہ اس خاندان کا بُرا آدمی ہے یعنی منافق ہے تاکہ اس کے ظاہری اسلام سے کسی کو دھوکہ نہ ہو اور کسی آدمی کے متعلق اس قسم کا اعتبار جائز بلکہ بعض دفعہ لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ فقہاء نے اس پر کئی تفریعات کی ہیں مثلاً ایک آدمی کسی سے رشتہ کرنا چاہتا ہے اور آپ سے مشورہ لے لے تو اس میں اگر ایسی خامی ہو جو دین یا دنیا کے اعتبار سے مضر ہو تو آپ کو بتلادینا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندہ پیشانی اور خندہ روئی سے کلام فرمایا جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکمت پوچھنی پڑی، جس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”ان من شر الناس الخ“ یعنی میں نہیں چاہتا ہوں کہ میں اُن لوگوں میں شمار ہو جاؤں جن کو لوگ ان کی سخت مزاجی اور سخت کلامی کی وجہ سے چھوڑ لیتے ہیں، تو چونکہ ان دونوں ارشادات اور رویوں کے مقتضیات الگ الگ ہیں اس لئے یہاں یہ اعتراض وارد نہ ہوا کہ اس طرح تو گویا ایک گونہ تضاد سا پیدا ہوا، جواب واضح ہے کہ دونوں صورتیں بطور تشریح کے ہیں۔ تدبر

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولم یکن ذالک من قسم النفاق وحاشاء، ثم حاشاء، ثم حاشاء، ولکن امرہ اللہ تعالیٰ ان یُسَنِّ لَامتہ سنۃ فی التعریف بحال الفاسق لِمَن جہلہ، وَاَلَا الن قول مخافة شرہ من غیر ان یكون فی القول معہ کذب ولا میراء۔“

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ہر صورت میں خوش خلقی سے ملنا چاہئے تاہم اس میں مداہنت نہیں ہونی چاہئے، مداہنت، مدارا کے مقابل کا نام ہے یعنی ایسا قول یا عمل جائز نہیں جس سے دین کی توہین یا مسلمان کی اہانت ہو جاتی ہو، اسی نکتے کے پیش نظر تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اپنے سے کم حیثیت والے کافر سے مد لینا جائز ہے جیسے غلام سے اور کتابیہ کے ساتھ نکاح کر کے۔ جبکہ بڑی حیثیت والے سے مد نہیں طلب کرنی چاہئے کہ اول میں ذلت نہیں جبکہ دوم میں تذلل ہے۔

کفار سے تعلقات کی نوعیت:۔ کافروں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات جائز اور کون سے ناجائز ہیں؟ تو باب کی حدیث سے مدارات کا جواز معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم کی آیتوں سے اگرچہ بعض تعلقات جیسے دوستی اور راز کی باتیں بتانے کی ممانعت آئی ہے تاہم ان سے ہر قسم کے تعلقات پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے چنانچہ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

”لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“۔ (آل عمران آیت: ۲۸)
اور سورۃ نساء آیت: ۹۰ میں ہے:

”إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ أَوْ جَاءَ وَكُمْ حَصْرَتٌ صُدُورُهُمْ أَنْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ... إِلَى... فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا“۔
جبکہ سورۃ مائدہ آیت: ۵ میں ہے:

”الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ، وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ“ الخ۔

وغیر ذالک من الآیات والا حدیث، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو سارے کفار سے ہر قسم کے تعلقات

جائز ہیں، اور نہ ہی سب ناجائز ہیں۔ اس لئے علماء نے مجموعی اعتبار سے لین دین کے علاوہ تین اقسام کا ذکر کیا ہے: (۱) موالات یعنی دوستانہ تعلقات (۲) مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی (۳) مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی۔

اوپر آل عمران کی جو آیت ذکر کی گئی اس میں پہلی دونوں قسموں کا حکم معلوم ہوا کہ دوستانہ تعلقات ناجائز ہیں اور مدارات جائز ہیں یعنی ان کے ضرر سے بچنے کی غرض سے یا ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی غرض سے ظاہری خوش خلقی میں کوئی حرج نہیں، چنانچہ تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”وفى الآية دليل على مشروعية التقية وعرف فوها بمحافضة النفس او العِرض او المال من شر الاعداء... وعَدَّ قوم من باب التقية مداراة الكفار والفسقة والظلمة والآفة الكلام لهم والتبسم فى وجوههم والانبساط معهم وإعطائهم لِكَفِّ اذاهم وقطع لسانهم (یعنی منہی پروپیگنڈے سے بچنے کے لئے) و صيانة العِرض منهم ولا يبعد ذلك من باب الموالات المنهى عنها بل هى سنة وامر مشروع“۔

پھر آگے مدارات کے ثبوت کے لئے متعدد احادیث کی تخریج فرمائی ہے تاہم یہ مدارات اہل ذمہ کے ساتھ مخصوص ہے، البتہ ان کے لئے مجلس میں اٹھنا جائز ہے یا نہیں تو ابن حجر رحمہ اللہ نے جائز کہا ہے جبکہ علامہ آلوسی اس کو موالات میں شمار کر کے ناجائز قرار دیتے ہیں، اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ عرف میں لوگ جس چیز کو تعظیم اور موالات سمجھتے ہیں وہ ناجائز ہے۔ (کذا فی تفسیر روح المعانی) خلاصہ یہ ہے کہ مدارات تین صورتوں میں جائز ہے (۱) ضرر سے بچنے کے لئے (۲) دینی اصلاح کی غرض سے (۳) اکرام ضیف کے طور پر۔

تیسری قسم مواسات ہے اس کا حکم یہ ہے کہ حربی کے ساتھ ناجائز ہے اور باقی کفار کے ساتھ جائز ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ”لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ“۔

(سورۃ ممتحنہ آیت: ۸)

رہا تجارتی معاملہ تو اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ ہر اس چیز کی تجارت جس سے مسلمانوں کو نقصان

ہوسکتا ہو تو وہ جائز نہیں، جیسے جنگ کے دنوں میں ان کو اسلحہ فروخت کرنا یا مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے خرید کر اسلحہ کرنے والے کو فروخت کرنا جائز نہیں۔ باقی معاملات اجارہ یعنی نوکری وغیرہ دنیوی معاملات میں کوئی حرج نہیں ان کو ملازم رکھنا بھی جائز ہے بشرطیکہ کوئی دوسری وجہ نہ ہو اور ان کی نوکری کرنا بھی جائز ہے گو اس سے بچنا چاہئے خصوصاً ان کے گھروں میں نوکری کرنے سے مسلمان کی تذلیل ہوتی ہے جبکہ کہنی وغیرہ میں یہ علت نہیں۔

صحت صالح ترا صالح کند
صحت طالح ترا طالح کند

باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض

”عن ابی ہریرۃ اُراه رفعہ قال احب حبیبک ہوناماعسی ان یکون بغیضک یوماماً، وأبغض بغیضک ہوناماعسی ان یکون حبیبک یوماماً“۔ (حدیث غریب والصحیح ہذا عن علیؑ موقوف) ۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مرفوع روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے دوست سے محبت کرو سنجیدہ طریقے سے ممکن ہے کہ وہ ایک دن تجھ سے نفرت کرنے والا بن جائے اور نفرت کرو اپنے دشمن سے سنجیدہ طریقے سے ممکن ہے کہ ایک دن وہ تیرا دوست بن جائے۔

لغات:- ”الاقتصاد“ اس کے متعدد معانی ہیں، میانہ روی، اعتدال، کفایت اور بچت کو کہتے ہیں، یہاں اعتدال و میانہ روی مراد ہے۔ ”احب اور ابغض“ دونوں باب افعال سے امر کے صیغے ہیں لہذا ان کو ”اکرم“ کے وزن پر پڑھا جائے گا بمعنی محبت کرو اور ابغض کرو۔ قولہ ”ہونا“ عارضہ میں ہے ”الہون السکینۃ والوقار“ دونوں جگہوں میں مراد میانہ روی ہے یعنی محبت ہو تو بھی افراط سے خالی ہونی چاہئے اور بغض بھی۔ حبیب اور بغیض دونوں بمعنی مفعول یعنی محبوب و مبغوض کے ہیں جیسے قتل بمعنی مقتول کے۔

باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض

۱۔ الحدیث اخرجه ایضاً الطبرانی فی الکبیر والاوسط، مجمع الزوائد ص: ۱۱۰ ج: ۸۔

تشریح: ترجمۃ الباب اور حدیث میں محبت اور نفرت ہر دو حالتوں میں اعتدال و میانہ روی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی وجہ بھی آسان لفظوں میں بتلا دی گئی ہے کہ محبت میں اتنا غلو نہیں ہونا چاہئے کہ دوست کے بغیر رہنا مشکل ہو جائے، یا اسے اپنے سارے راز بتلا دئے جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اچانک تعلقات خراب ہو جائیں تو کل بچھتاوا ہوگا، اسی طرح دشمنی اور مخالفت میں بھی اس حد تک نہیں جانا چاہئے کہ اگر کل تعلقات خوشگوار ہو جائیں تو آنکھیں ملانا مشکل ہو، جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں وہ کل بچھتاتے رہتے ہیں۔

باب ماجاء فی الکبر

”عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من عردل من کبر ولا یدخل النار من کان فی قلبه مثقال حبة من ایمان“۔ (حسن صحیح)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں بوزن رائی کے دانے جتنا کبر ہو اور وہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں (رائی کے) دانے کے برابر ایمان ہو۔

لغات: بقولہ ”مثقال ثقل سے ماخوذ ہے مراد یہاں رائی کے دانے کے برابر وزن ہے جو قلت سے کنایہ ہے۔ بقولہ ”حبة“ دانہ۔ بقولہ ”عردل“ رائی جو ایک قسم کی سرسوں ہے بعض نے حبة السوداء یعنی کلونجی پر بھی اطلاق کیا ہے۔ بقولہ ”من کبر“ بکسر الکاف و سکون الباء جبکہ باء کافۃ بھی جائز ہے بڑھائی کے معنی میں آتا ہے اصطلاح میں دوسروں پر اپنی برتری و بڑھائی جانے کو کہتے ہیں عارضۃ الاحوذی میں ہے:

”بناء کبر للکثرة والعظم، یقال کبر الرجل بکسر العین اذا تکاثرت سنوہ، و کبر بضم العین اذا تکاثرت حصاله والاسم من الاول الکبر بکسر الفاء وفتح العین، والکبر بکسر الفاء واسکان العین معظم الشئ وهو العظمة“ الخ۔

باب ماجاء فی الکبر

۱ الحدیث أخرجه مسلم ص: ۲۵ ج: ۱ ”باب تحريم الکبر و بیانه“ کتاب الایمان۔

تشریح:- کبر امراض قلب اور رذائل اخلاق میں سب سے بڑی مہلک بیماری ہے کہ اس سے بہت سی بیماریاں حتیٰ کہ کفر و نفاق جیسے مہلکات جنم لیتے ہیں اس۔ ساتھ فضائل اخلاق کا اجتماع نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کبر میں مبتلاء شخص گویا تمام خوبیوں سے محروم رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کو سخت ناپسند کیا ہے یہاں تک کہ حدیث الباب کے مطابق اس کو جنت سے محرومی کا سبب قوی قرار دیا ہے کیونکہ متکبر آدمی اللہ کے ساتھ اس کے وصف خاصہ ”تکبر“ میں منازعہ کرتا ہے حدیث شریف میں ہے ”قال اللہ الکبرياء ردائی والعظمة ازاری من نازعنی واحدا منهما قصمتہ“^۱ یعنی کبر یا میری چادر اور عظمت میرا ازار ہے جو بھی ان میں سے کسی ایک میں مجھ سے جھگڑتا ہے میں اسے نامراد لوٹا دوں گا۔ ابن العربی عارضہ میں فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے مطلب کے بارے میں علماء سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آدمی جو لباس زیب تن کرتا ہے تو اس کا استعمال یا بطور خرچ وابتذال کے ہوتا ہے اور یا بطور جمال کے ہوتا ہے، اول کی مثال جیسے جوتے اور دوم کی مثال جیسے چادر، چونکہ کبر یا اللہ کے لئے مخصوص ہیں اس لئے کسی بھی مخلوق کو اس کا دعویٰ جائز نہیں جو آدمی اس کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ نقصان ہی نقصان اٹھائے گا ہاں علم میں چونکہ فائدہ ہے اس لئے وہ حاصل کرنا ممنوع نہیں کہ تکبر ترقی سے مانع اور شانِ عہدیت کے منافی ہے جبکہ علم سے آدمی اپنا صحیح مقام پہچانتا ہے اس لئے ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔

کبر و تکبر اور اسباب:- جاننا چاہئے کہ کبر خلق باطنی کا نام ہے یعنی صفت قلب ہے اور جب اس کا اثر ظاہری اعضاء پر رونما ہونے لگے تو وہ تکبر کہلاتا ہے، کبر کے معنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنے کے ہیں محض اپنے مقام جاننے کا نام کبر نہیں ہے مثلاً ایک آدمی یہ جانتا ہے کہ میں فلاں مدرسے کا شیخ الحدیث ہوں تو یہ کبر نہیں ہے مگر اس کے ساتھ اگر وہ دوسرے اساتذہ کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگے تو بلاشبہ یہ کبر ہے اور جب وہ خود ان سے آگے چلنے اور امتیازی نشست پر بیٹھنے کو اپنا حق سمجھے تو یہ تکبر ہے۔ ہاں اگر اس کی جگہ متعین ہو یا اس لئے اعلیٰ سیٹ پر بیٹھتا ہے کہ دوسرے اساتذہ اس کو پھر وہاں بیٹھنے پر مجبور کریں گے تو یہ نہ کبر ہے اور نہ ہی تکبر۔

کبر و تکبر کا سبب عجب ہے، عجب کے معنی خود پسندی کے ہیں یعنی کسی خوبی پر نازاں ہونا اور اسے اللہ کی طرف سے محض نعمت کے بجائے اپنا کمال سمجھنا عجب کہلاتا ہے جس کے کئی اسباب ہیں کہ کبھی اپنے علم و عمل یا حسب و نسب اور کبھی جمال و کمال یا نوال وغیرہ کی وجہ سے آدمی متعجب بنتا ہے لہذا کہا جائے گا کہ کبر کا سبب

قریب عجب ہے جبکہ اسباب بعید و زیادہ ہیں۔

عجب اور کبر انتہائی موذی بیماریاں ہیں اس لئے ہر مؤمن کو ان کا علاج کرنا لازمی ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں طریقہ علاج اور عجب و تکبر کے موذی اثرات کو نقل نہیں کیا جاسکتا جس کو تفصیل اور اصلاح درکار ہو تو وہ راقم کی کتاب ”نقش قدم کامل“، فصل نمبر ۱۲، عجب خود پسندی اور فصل نمبر ۱۳، کبر و تکبر ص ۱۲۳ تا ص ۱۳۷ یا اخلاقیات کی دوسری کتب جیسے احیاء العلوم للامام غزالی وغیرہ ضرور مطالعہ کریں۔ اور چونکہ آج کل یہ امراض بہت عام ہو گئے ہیں اس لئے راقم کا مشورہ ہے کہ ان کے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ خلاصہ بہترین علاج خود کو دوسروں کی خدمت میں لگانا اور حب و کبر کی بُرائی کو ملحوظ رکھنا ہے۔

حدیث باب کا مطلب:- بظاہر یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حدیث کے پہلے جزء سے معلوم ہوتا ہے کہ متکبر جنت میں نہیں جائے گا جبکہ آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن دوزخ میں نہیں جائے گا پس اگر کسی مؤمن میں تکبر ہو تو اس کا کیا ہوگا؟

اس کا ایک جواب تو پہلے بار ہا گذرا ہے کہ یہ خاصیات المفردات ہیں یعنی تکبر کا اپنا تقاضا یہ ہے کہ وہ جنت میں داخلے سے مانع ہے اور ایمان کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخلے سے مانع ہے۔ تاہم قیامت کے دن فیصلہ مفردات اعمال پر نہیں ہوگا بلکہ مرکب اور مجموعی اعمال پر ہوگا۔

دوسرا جواب:- یہ ہے کہ متکبر جنت میں دخول اولیٰ کا مستحق نہیں وہ سابقین کے ساتھ نہیں جائے گا تا وقتیکہ اسے دوزخ کی آگ سے پاک نہ کر دیا جائے اور مؤمن دوزخ میں غلو و تحقیر کے لئے داخل نہ ہوگا۔

تیسرا جواب:- یہ ہے کہ اس حدیث میں ضابطے کی بات کی گئی ہے مگر جس پر اللہ کا فضل اور خصوصی رحم ہو وہ بلا عذاب پاک کر دیا جائے گا، اور صاف ستھرا بنا کر پاکیزہ جنت میں داخل کر دیا جائے گا جہاں اس کے ساتھ گناہ کی کسی قسم کی گندگی کا واسطہ نہیں رہے گا اس طرح وہ صاف ستھری جگہ کا اہل بنا دیا جائے گا۔ ”وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ“ اس طرح وہ ”الطَّيِّبَاتِ لِلطَّيِّبِينَ“ کے کا مصداق بن جائے گا۔

دوسری حدیث:- باب کی دوسری حدیث پر یہ اضافہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تو حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے کپڑے اچھے ہوں اور میرے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں آتا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ بھلائی

کو پسند فرماتا ہے مگر متکبر وہ ہے جس نے حق کو ٹھکرا دیا اور لوگوں کو حقیر سمجھا۔

لغات:- قولہ ”ذرة“ خاک کا ذرہ و ریزہ، ایٹم و جوہر فرد جو ناقابل تقسیم ہو، چھوٹی چیزیں، سورج کی شعاع میں نظر آنے والے ذرات۔

قولہ ”الحمال“ ایک روایت میں ہے ”ان الله جميل يحب الجمال“ ۵ جمال کا اطلاق ظاہری خوبصورتی پر بھی ہوتا ہے اور خوش خلقی یعنی باطنی حسن سیرت کو بھی کہتے ہیں، اس لئے اوپر ترجمہ بھلائی سے کیا گیا یعنی اللہ اچھے افعال اور کامل صفات سے خود بھی موصوف ہے اور دوسروں میں بھی اچھائی و خوبی کو پسند فرماتا ہے۔ قولہ ”لكن الكبر“ عبارت بحذف المضاف ہے ”ای لکن ذا الکبر“ اس لئے ترجمہ متکبر سے کیا گیا ہے۔ قولہ ”بطر الحق“ رد اور دفع یعنی بد مستی کی وجہ سے ٹھکرانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”و غمض الناس“ ایک روایت میں ہے ”الکبر بطر الحق و غمض الناس“ ۶ غمض اور غمط کے معنی حقیر اور معمولی سمجھنے کے ہیں۔

تشریح:- امام نوویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے والے صحابی کا نام مالک بن مرارہ الرہاوی ہے، مکہ سوال کا مقصد واضح ہے کہ اگر دوسروں پر اپنی برتری کے اظہار کے بغیر عمدہ لباس زیب تن کرنا کسی کو پسند ہو تو کیا یہ بھی ممنوع ہے، اور جواب کا مقصد بھی ظاہر ہے کہ فی نفسہ عمدہ لباس پہننا جس میں دوسروں پر فخر کرنا ملحوظ نہ ہو ہرگز تکبر کے زمرے میں شامل نہیں کیونکہ تکبر اس وقت متحقق ہوگا جب دوسروں کو اپنے آپ سے کمتر جانا جائے، اگر یہ ارادہ نہ ہو تو عمدہ لباس یا سواری اسی طرح گھر تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہاں جب آدمی ناز و نعمت اور خرمستیوں میں اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کے سامنے نہ دوسرے لوگوں کی کوئی حیثیت باقی رہے یا کم ہو جائے اور نہ حق قابل اتباع سمجھے تو وہ یقیناً متکبر ہے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں نقل کیا ہے: ”وفی صیام فتح القدير ان الحمال من الاخلاق الحسنة والزينة من اخلاق الشيطان“۔ اس لئے آدمی کو متوسط حالت اختیار کر لینا چاہئے تاکہ ذلت سے بھی بچے اور تکبر سے بچتا رہے۔

۵ رواہ مسلم فی الایمان ص: ۶۵ ج: ۱ وابن ماجہ فی ابواب الدعاء بحوالہ المعجم المفہرس ص: ۳۷۳ ج: ۱، ایضاً

مسند احمد ص: ۱۲۰ ج: ۵ حدیث: ۱۶۷۵۵، ص: ۱۳۹ ج: ۵ حدیث: ۱۶۹۱۸، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط

مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۸۶، حفیظ الرحمن الحنفی

۶ کذا فی روایۃ مسلم ص: ۶۵ ج: ۱ کتاب الایمان، الترغیب والترہیب ص: ۳۵۶ ج: ۳.

کے النووی علی مسلم حوالہ بالا.

غرض لباس ہو یا اپنا کوئی عمل اس میں اپنی صلاحیت کے مطابق چلنا منع نہیں، ممنوع فقط یہ ہے کہ آدمی اپنی خوبی اس طرح اُجاگر کرنے کی کوشش کرے کہ گویا وہ دوسروں سے برتر ہے اور دوسرے لوگ اس کی نظر میں حقیر لگیں اور اس رویے کی وجہ سے حق کی اہمیت بھی اس کی نظر سے گر جائے۔

تیسری حدیث:- ”لا یزال الرجل ینذهب بنفسه حتی یکتب فی الجبارین فیصیبه

ما اصابهم“۔ (حسن غریب)

آدمی اپنے آپ کو بڑھاتا چڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ مغرور اور سرکش لوگوں میں شامل کر دیا جاتا ہے پھر اس کو وہی سزا ملتی ہے جو ان متکبر لوگوں کو پہنچتی ہے۔

لغات و تشریح:- قولہ ”ینذهب بنفسه“ کلمہ باء تعدیت کے لئے ہے یعنی خود کو بلندی کی جانب لے جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے زعم میں اپنا مقام عام لوگوں سے بالاتر سمجھتا ہے اور یہی چیز تکبر ہے، پس وہ اپنے زعم کے مطابق اعلیٰ درجے کا مستحق ہے اس لئے کمتر لوگوں کے ساتھ اس کی نشست و برخاست اس کی شانِ عظیم کے منافی ہے۔ بعض حضرات نے باء کو مصاحبت کے لئے لیا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے نفس کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور چونکہ نفس تو سرکشی کی جانب میلان رکھتا ہے اس لئے یہ شخص اس راستے پر اس کا ہم سفر بن جاتا ہے اور چلتے چلتے جبارین جیسے فرعون، قارون اور ہامان وغیرہ کا تکبر میں مصاحب بن جاتا ہے پھر نہ نماز پڑھتا ہے اور نہ روزہ رکھتا ہے، بلکہ استکبار عن الحق اس کا مزاج بن جاتا ہے تو دنیا میں بھی حق سے دور ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی اہل ایمان کے بجائے قارون اور فرعون وغیرہ کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ

چوتھی حدیث:- ”عن ایبہ قال یقولون لی: ”فنی التیة“ وقد کبت الحمار ولبست الشملة وقد حلبت الشاة وقل قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من فعل هذا فلیس فیہ من الکبر شئ“۔ (هذا حدیث حسن غریب)

حضرت جحیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ لوگ میری بابت کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے حالانکہ میں گدھے پر سواری کرتا ہوں اور معمولی شال اوڑھتا ہوں اور بکری خود دوہ لیتا ہوں اور بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ کام کرے تو اس میں کچھ بھی تکبر نہیں۔

لغات:- قولہ ”التيه“ بکسر التاء بمعنی تکبر کے ”ای یقولون فی نفسی الکبر“۔ قولہ ”الشملة“ سوئی چادر کو کہتے ہیں۔ یہ کبھی ریشم کی ہوتی ہے اور کبھی اون کی۔ یہاں اوننی چادر مراد ہے کیونکہ یہ معمولی نوعیت

کی چادر ہوتی ہے۔

تشریح:- اس تعلیل کا مطلب واضح ہے کہ متکبرین ان امور سے دور رہتے ہیں کہ وہ ان میں عار محسوس کرتے ہیں اس لئے وہ ان کے قریب بھی نہیں جاتے جبکہ ایسا شخص جو ان امور کو اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتا ہو اور ان میں عار محسوس نہ کرتا ہو وہ تکبر سے کوسوں دور ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی حسن الخلق

”عن ابی الدرداء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ماشئنی انقل فی میزان المؤمن یوم القیمة من خلق حسن فان اللہ تعالیٰ یبغض الفاحش البذی“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن مؤمن کی ترازو میں اخلاق حسنہ سے بڑھ کر کوئی چیز زیادہ وزنی نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ بے ہودہ اور لغو کلام کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔

نوٹ:- ”فاحش اور بذی“ کے معنی ”باب ماجاء فی اللعینہ“ میں گذرے ہیں۔

تشریح:- باب کی اگلی حدیث میں اس پر یہ بھی اضافہ ہے کہ اچھے اخلاق والا اپنے اخلاق کی وجہ سے پابند صوم و صلوٰۃ کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ ابن العربی عارضہ میں اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں ”ہو معنی صحیح جداً وان لم یصححہ تعضدہ الاحادیث والاصول“، یعنی باب کی دوسری حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے قوی نہیں لیکن مضمون کے لحاظ سے قوی ہے۔ پھر اس حدیث کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص فحش گوئی اور بکواس سے اجتناب کرتا رہتا ہے تو یہ اس شخص کے برابر ہے جو نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے مگر بے ہودہ باتوں میں مشغول رہتا ہے۔

اخلاق کیا ہے؟ اور اس کا مقام کیا ہے؟ ان دونوں سوالوں کا قدرے اجمالی جواب گذشتہ ابواب میں گذر چکا ہے۔ الحمد للہ راقم نے ”نقش قدم اور نقش اخلاق“ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق حسنہ اللہ کو بہت پسند ہیں اور فحش گوئی اس کو نا پسند ہے

باب ماجاء فی حسن الخلق

^۱ الحدیث اخرجه ایضاً ابن حبان، والبخاری ورواه ابو داؤد مختصراً بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۷۱ ج: ۳.

اس لئے ترازوئے اعمال میں صاحبِ اخلاق حسنہ کے اخلاق و دیگر اعمال کا بہت زیادہ وزن ہوگا جبکہ بد اخلاق اس نعمت سے کلیہً یا جزوی طور پر محروم ہوگا۔ پھر دوسری حدیث کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کی وجہ سے آدمی نفلی روزوں اور نمازوں کے پابند شخص جتنا ثواب حاصل کر لیتا ہے یعنی ایک شخص کے اخلاق اچھے نہیں مگر وہ قیام و صیام کا بطور نفل زیادہ اہتمام بلکہ التزام کرتا ہے جبکہ یہ صاحبِ جو اچھے اخلاق کا مالک ہے بغیر اہتمام کے اس کے درجے کے برابر ہے۔

دوسری حدیث: ”عن ابی ہریرۃ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اکثر ما یدخل الناس الجنة قال تقوی اللہ وحسن الخلق وسئل عن اکثر ما یدخل الناس النار قال الفم والفرج“۔^۲ (حدیث صحیح غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اسباب کے بارے میں پوچھا گیا جو کثرت سے لوگوں کو جنت میں داخل کر دیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اللہ کا خوف اور حسن اخلاق ہیں پھر ان اسباب کے حوالے سے پوچھا گیا جو بکثرت لوگوں کو جہنم میں داخل کر دیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ منہ اور شرم گاہ ہیں۔

تشریح: تقوی کے تین درجوں کا تذکرہ ”باب ماجاء فی معاشرۃ الناس“ میں گزرا ہے۔ حدیث پاک میں دخول جنت کو دو چیزوں پر مرتب بلکہ موقوف فرمایا ہے ایک تقوی اور دوم حسن اخلاق۔ کیونکہ تقوی سے آدمی اور اس کے مولیٰ کے مابین تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں، اور اخلاق حسنہ سے لوگوں سے اس کا رویہ کریمانہ و شریفانہ رہتا ہے تو جب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں کوئی کوتاہی نہیں رہے گی تو آدمی بآسانی جنت میں داخل ہو جائے گا جبکہ اس کے برعکس اگر ان دونوں پہلوؤں سے آدمی کمزور و ناقص ہوگا اور منہ و شرم گاہ کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرتا رہے گا تو اس کی نحوست سے جنت سے محروم اور دوزخ کا مستحق ٹہرے گا۔

”منہ“ سے زبان اور حرام خوری دونوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بد گوئی اور حرام خوری دونوں مہلکات میں سے ہیں اسی طرح شرم گاہ کے غلط استعمال سے آدمی حد آدمیت سے نکل کر حد بہیمیت بلکہ بسا اوقات حد شیطانیت میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ بحث کافی لمبی اور موضوع بہت طویل ہے اشارۃً اتنا ہی کافی ہے اگر مزید تفصیل درکار ہو تو دیکھئے راقم

کی کتاب ”نقش اخلاق یا نقش قدم کامل“ حصہ دوم ”فصل اول زبان کی تباہ کاریوں میں“ اور فصل سوم ”نا جائز اور حرام شہوات رانی“۔

تیسری حدیث:۔ ”عن عبد اللہ بن المبارک انه وَصَفَ حسن الخلق فقال: هو بسط الوجه وبذل المعروف وكف الاذى“۔

حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ نے خوش اخلاقی کے بارے میں بتایا یعنی اخلاق حسنہ کیا ہیں؟ تو فرمایا چہرے کا کھل جانا اور نیکی و بھلائی کرنا اور تکلیف سے بچانا ہے۔

تشریح:۔ اخلاق کے متعلق روایات میں متعدد الفاظ منقول ہیں: کبھی غصہ نہ کرنے کو اخلاق کہا گیا ہے، کبھی سخاوت کو اور کبھی خندہ روئی وغیرہ کو۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اصل اخلاق نفسانی ملکات کا نام ہے جو کبھی ذاتی ہوتے ہیں جیسے شجاعت، عفت اور حکمت، اور کبھی کسی ہوتے ہیں جن کو ملکات فاضلہ بھی کہہ سکتے ہیں، یہ جو اعمال جوارح ہیں جیسے خرچ کرنا اور خندہ پیشانی سے پیش آنا وغیرہ یہ ان ملکات کے آثار ہیں مگر عوام الناس چونکہ باریکیوں کو نہیں جانتے اس لئے ان کی سہولت کے لئے تعریفات بالرسوم کی گئی ہیں۔

باب ماجاء فی الاحسان والعفو

”عن ابی الاحوص عن ابيه قال قلت: يا رسول الله الرجل امر به فلا يقربني ولا يضيئني فيمربي أفأجزيه؟ قال: ”لا، أقره“ قال: ورائي رت الثياب فقال هل لك من مال؟ قال قلت: من كل المال قدا عطاني الله من الابل والغنم قال فليُر عليك“۔

ابو الاحوص اپنے والد مالک بن عوف بن نضلہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! میرا گدرا ایک آدمی پر ہوتا ہے جو میری مہمان نوازی نہیں کرتا، پھر وہ میرے یہاں سے گذرتا ہے تو کیا میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں (یعنی میزبانی نہ کر کے) فرمایا نہیں تو اس کی مہمانی کر لیا کرو، حضرت مالک بن عوف فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میرے کپڑے بوسیدہ اور ہڑانے ہیں تو فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی مال ہے؟ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اللہ نے مجھے ہر قسم کا مال اونٹ اور بکریاں دی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کا اثر تجھ پر نظر آنا چاہئے۔

لغات:۔ فقوله ”الاحسان“ لغوی اعتبار سے خوب صورت بنانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں جب اس

کے صلہ میں ”الٰہی“ آجائے تو بمعنی سلوک کے اور بغیر ”الٰہی“ کے بمعنی نیکی و خلوص کے آتا ہے۔ قولہ ”العفو“ مٹانے اور درگزر کرنے اور معاف کرنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فلایقرینی ولا یضیفنی“ دوسرا جملہ پہلے کی تفسیر ہے۔ قولہ ”أفاحزیہ“ بفتح الهمزة وسكون الياء جزءا سے ہے بمعنی بدلہ کے۔ قولہ ”أقرہ“ بفتح الهمزة امر بمعنی أفضہ کے یعنی تم اس سے بے مروتی کا بدلہ مت لو بلکہ اس کی مہمان داری کرو۔ قولہ ”زٹ الثیاب“ زٹ بمعنی بوسیدہ اور ہرانے کے۔ قولہ ”من الابل والغنم“ مال کا بیان ہے۔

تشریح:- چونکہ انسانی طبیعت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی بھی کام کا رد عمل دوسرے کے رویے اور سلوک پر مبنی کر دیتی ہے اچھائی کا جواب اچھائی سے اور بُرائی کا بُرائی سے، لیکن اسلام کا اصول یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اصلاح کرے اور بُرائی کا بدلہ بھی بھلائی سے دیدے، گوا انتقام جائز ہے مگر عفو و درگزر کی بات ہی اور ہے اللہ نے صبر اور معافی پر جو انعامات مقرر کئے ہیں ان کا حصول بدلے کی صورت میں ممکن نہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن عوفؓ سے فرمایا کہ اگر کوئی شخص آپ کی مہمان داری نہیں کرتا لیکن جب وہ آپ کے یہاں سے گزر رہا ہو تو آپ ایسا نہ کریں بلکہ اس کا اکرام کر لیا کریں، غرض اگر کوئی شخص آپ کا حق ادا نہیں کرتا تو آپ اس کے حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں، ”فان المظلوم لا یظلم“۔

اس ارشاد پاک میں ان لوگوں کے لئے بھی بڑا سبق ہے جو عیادت، تعزیت اور ولیمہ وغیرہ تقریبات میں صرف ان لوگوں کا خیال رکھتے ہیں جو ان کو یاد کرتے ہیں اس طرز عمل کی اصلاح ضروری ہے۔

اس حدیث میں دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ آدمی کو اپنے لباس و پوشاک و خوراک میں میانہ روی اختیار کر لینی چاہئے جیسا کہ اسلام کی تعلیمات میں ہر چیز میں اعتدال کو پسند کیا گیا ہے۔ لباس کے متعلق قدرے تفصیل تو ”ابواب اللباس“ میں گزری ہے مگر یہاں اتنی بات عرض ہے کہ آدمی کو شہرت کے لباس سے اجتناب کرنا چاہئے جس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی بہت معمولی لباس پہنے۔ دوسری یہ کہ بہت اعلیٰ لباس زیب تن کر دے چونکہ دونوں میں آدمی ایک امتیازی رنگ اختیار کر لیتا ہے اس لئے شہرت اور ریا کا اندیشہ ہے اعلیٰ میں تو ظاہر ہے جبکہ ادنیٰ میں دکھاوے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کو زاہد اور پارسا سمجھتے ہیں اس لئے محققین فرماتے ہیں کہ اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کے مساوی لباس اختیار کر لینا چاہئے ہاں جمعہ و عیدین اور خوشیوں کے مواقع اور وفود سے ملتے وقت اعلیٰ کی بھی اجازت ہے۔

حدیث باب سے ادنیٰ کی ناپسندیدگی معلوم ہوئی جبکہ اعلیٰ کی کراہیت دوسری روایات سے معلوم ہوتی

ہے۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ ”ابواب الزہد“ میں آئے گی اور ”نقش قدم کامل“ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن حذیفہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تكونوا إمعة،

تقولون إن أحسن الناس أحسنًا وإن ظلموا ظلّمنا، ولكن وَطَنُوا أنفسكم إن أحسن الناس أن تحسنوا وإن أساؤا فلا تظلموا“۔ (حدیث حسن غریب)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم ضعیف الرائے (ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والے) مت بنو یعنی یوں مت بولو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ بُرا سلوک کریں گے تو ہم بھی ایسا کریں گے، بلکہ تم اپنے آپ کو اس بات کا خوگر بناؤ کہ اگر لوگ نیک سلوک کریں تو بھی تم اچھا سلوک کرو گے اور اگر وہ بدسلوکی کریں تو بھی تم ان پر ظلم نہ کرو گے۔

لغات:- قولہ ”إمعة“ بکسر الهمزة وتشديد الميم الایع اخیر میں تااء مبالغہ کے لئے ہے نہ کہ تائید کے لئے اس لئے اس کا اطلاق مؤنث پر نہیں ہوتا چنانچہ ”رحل امعة“ کہنا صحیح ہے مگر ”امراة إمعة“ نہیں کہا جاتا۔ امع وہ آدمی ہے جو ہر ایک سے کہتا ہو کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسا وہ شخص کرتا ہے جو ضعیف الرائے ہو، اس لئے یہ جس کی بات اور دلیل بھی سنتا ہے تو اس سے متاثر ہو جاتا ہے اس لئے وہ کسی رائے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ قولہ ”تقولون“ الخ یہ اس امعہ کی تفسیر ہے۔ قولہ ”وَطَنُوا“ تو طین یعنی باب تفعیل سے امر کا صیغہ ہے بمعنی مانوس کرنے اور آمادہ کرنے کے ہے۔ باب افعال سے بھی یہی معنی آتے ہیں، ”یقال اوطن نفسه علی کذا“ یا ”وَطَنَ نفسه علی کذا“ یعنی اپنے آپ کو کسی کام کا عادی و خوگر بنانا۔

تشریح:- اس حدیث کا مطلب تقریباً وہی ہے جو باب کی پہلی حدیث کا ہے کہ نیکی کو کسی آدمی کے عمل سے منسلک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نیکی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والے عمل کو کہتے ہیں لہذا اس میں لوگوں سے طمع و امید نہیں رکھنی چاہئے گو اس کے ثمرات دنیا میں بھی مل سکتے ہیں کہ ہر نیکی پر برکات کا ترتب ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس میں لوگوں سے معاوضہ کی توقع رکھے کہ اگر کچھ ملنے کی امید ہو یا کچھ ملا ہو تو بطور طمع یا بطور عوض نیکی کرے گا اور جو جگہ دنیوی فائدے سے خالی ہو تو وہاں نیکی و اچھائی نہیں کرے گا خاص کر جبکہ دوسری طرف سے بُرائی کا سلوک ہو جائے۔ غرض آدمی کو نیکی و احسان کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے خواہ کوئی کیسا بھی ہو، نیکی ہر جگہ مطلوب ہے چاہے وہ اچھی جگہ ہو یا بُری جگہ۔ تدبیر

باب ماجاء فی زیارة الاخوان

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من عاد مریضاً أو زار أخاً له فی اللہ ناداه مُنَادٍ أَنْ طَبْتُ وطاب ممشاكَ وَتَبَّأَتْ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا“۔^۱ ہذا حدیث غریب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی بیمار کی عیادت کی یا اپنے اسلامی بھائی کی زیارت کی تو ایک فرشتہ (منادی) اسے آواز دیتا ہے کہ خوش رہو اور تیرا چلنا بھی بہت خوب ہے اور تو نے (اس عمل سے) جنت میں گھر بنالیا۔

لغات:۔ قولہ ”الاخوان“ اُخ کی جمع ہے اگر بھائی بندی نسبی و خونی ہو تو اس کی جمع اِخْوۃ آتی ہے اور اگر دوستانہ تعلق کی بناء پر ہو تو اس کی جمع اخوان آتی ہے چنانچہ کہاوت مشہور ہے ”اخوان الوداد اقرب من اِخوة الولاد“ دوستی کے بھائی، نسبی بھائیوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

قولہ ”اخالہ فی اللہ“ اگر ”فی اللہ“ کا تعلق اُخا کے ساتھ ہو جیسا کہ اوپر ترجمہ اسی پر مبنی ہے تو اس کے ساتھ یہ قید ملحوظ رہے گی کہ یہ عیادت اور زیارت دونوں ثواب کی نیت سے ہوں کہ ”انما الاعمال بالنیات“۔^۲ تاہم اس پر یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ اُخا تو فعل یا شبہ فعل نہیں تو اس کے ساتھ جار کا تعلق کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ کیونکہ جار کے تعلق کے لئے فعل کی خوشبو اور شائبہ بھی کافی ہے جیسے ”وہم یدعلی من سواہم“ اس میں ید بمعنی قوۃ کے ہے لہذا یہاں بھی ”اُخ“ کے اندر اِخْوۃ کے معنی پائے جاتے ہیں جو تعلق کے لئے کافی ہیں اور اگر ”فی اللہ“ کا تعلق ”زار“ فعل کے ساتھ ہو تو پھر کوئی اشکال نہیں ہے۔ قولہ ”مناد“ اس منادی اور پکارنے والے سے مراد فرشتہ ہے۔ قولہ ”ممشاكَ“ مصدر میسی کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور ظرف زمان یا مکان کا بھی۔ یعنی تیرے

باب ماجاء فی زیارة الاخوان

۱۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۱۰۴ ”باب ماجاء فی ثواب من عاد مریضاً“ ابواب الجنائز، ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ الترغیب والترہیب ص: ۲۴۷ ج: ۳۔ ۲۔ رواہ البخاری ص: ۲ ج: ۱ ”باب کیف کان بدؤ الوحی الخ“، ایضاً کتاب الایمان باب: ۳۱، نکاح باب: ۵، طلاق باب: ۱۱، مناقب الانصار باب: ۴۵، عقیق باب: ۶، ایمان باب: ۲۳، حیل باب: ۱، و مسلم ص: ۱۳۰ ج: ۲ باب قولہ ﷺ انما الاعمال بالنیۃ الخ کتاب الامارۃ، و ابو داؤد ص: ۳۰۷ ج: ۲ کتاب الطلاق، ایضاً رواہ النسائی فی الطہارۃ، و ابن ماجہ ص: ۳۱۱ ”باب النیۃ“ ابواب الزہد، مسند احمد ص: ۴۳ ج: ۱ حدیث: ۱۶۹۔ حفیظ الرحمن الحنفی غفرلہ ولوالدیہ ولاساتنتہ

چلنے کا یہ وقت اور یہ راستہ بہت مبارک ہے کیونکہ یہ جنت کی طرف جاتا ہے۔ قوله ”وَقَبَّوْاْتُ مِنَ الْحَنَةِ مَنْزِلًا“ تَبَّوْاْ لِمَكَانٍ كَعْنَى جُكَّهٖ بَنَانِے اور لینے کے ہیں۔ مَنْ الْجَنَّةِ اِیْ مَنْ مَنَازِلِ الْجَنَّةِ جَبْكَهٖ مَنْزِلًا مِیْنِ تَنْوِیْنِ تَعْظِیْمِ كے لَیْے ہے یعنی تم نے اپنے اس عمل کی وجہ سے جنت کی منازل میں سے ایک عظیم گھر بنالیا۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ سے ان دونوں عملوں یعنی مریض کی عیادت اور دوستوں کی زیارت کی بڑی فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ ایسے اعمال ہیں کہ ان کی بدولت آدمی فرشتوں کی دعاء کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ اس شخص کی دنیاوی و اخروی فلاح و نجات اور کامیابی کے لئے دعا گورہتا ہے اور اس یقین سے کہتا ہے کہ بجائے انشاء کے اخبار کا صیغہ استعمال کرتا ہے کہ گویا یہ آدمی کامیاب ہو ہی گیا۔

تاہم ”فی اللہ“ کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت ان دوستانہ تعلقات والوں کو ملتی ہے جن کا تعلق اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسا تعلق نیک لوگوں سے ہی ہو سکتا ہے، چور اور ڈاکوؤں کے ناجائز تعلقات کو یہ فضیلت بظاہر حاصل نہیں ہے کیونکہ اگر چور اپنے چور ساتھی کی عیادت اس لئے کرتا ہے کہ معلوم ہو کہ وہ میرے ساتھ چوری کرنے کی غرض سے جانے کے لئے کب تیار ہو سکے گا تو یہ کوئی ثواب کی نیت یا کام نہیں ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

باب ماجاء فی الحیاء

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الحیاء من الایمان والایمان فی الحنۃ والبذاء من الحفاء والحفاء فی النار“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: حیاء ایمان کا جزء ہے اور ایمان جنت میں لے جانے والا ہے اور بے ہودگی سنگ دلی میں سے ہے اور بے رحمی (سنگ دلی) جہنم میں لے جانے والی (خصلت) ہے۔

لغات:- قوله ”الحیاء“ بالمد لفت میں وقار اور سنجیدگی کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میں ایک ایسی کیفیت اور ملکہ کا نام ہے جس کی بدولت انسان خیر اور بھلائی کی طرف اقدام کرتا ہے اور مذمت کے خوف سے شر و قبیح سے

اجتناب کرتا ہے یہ وقاحت (لا پرواہی اور غلط کام کی جرأت) اور تجل (ہر کام کرتے ہوئے شرمندہ ہونے) کے درمیان درجہ اوسط سے عبارت ہے۔ قولہ ”الحفاء“ تم اور بے مروتی کو کہتے ہیں جو وفاداری اور رحم کے مقابل آتا ہے۔

تشریح:- اس ارشاد پاک میں حیاء کو جزء ایمان قرار دیا گیا ہے اس طرح بعض دوسری احادیث بھی اس مضمون پر ناطق ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک ایمان مرکب ہے ان کے یہاں تو اس کی کسی تاویل کی ضرورت نہیں، مگر حنفیہ اور جمہور متکلمین کے ہاں چونکہ ایمان بسیط ہے اس کے اجزاء نہیں ہیں اس لئے وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حیاء ایمان کے ایسے مقتضیات میں سے ہے جیسے لازم اپنے ملزوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ دونوں میں نسبت تلازم کی ہے جو ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔

باب کی حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدمی حیاء کی بناء پر جنتی بن جاتا ہے اس کی وجہ بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتی ہے کہ ”الحیاء لایاتی إلا بخیر“^۱ یعنی حیاء خیر کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں دیتی تو ظاہر ہے کہ جب یہ خیر ہی خیر ہے تو اس کا انجام بھی جنت تک رسائی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس بذا یعنی بے حیائی کے کام اور باتیں حیاء کی نقیض ہیں تو ان کا انجام دوزخ میں دھکیلنا ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ جو حیاء مشروع و ممدوح ہے اس سے مراد وہ خلق ہے جو ان امور سے روکے جو شرعاً معیوب ہیں جیسے زنا، غنا اور دیگر اعمال بد۔ جہاں تک امور شرعیہ میں شرم کرنے کا تعلق ہے تو وہ شرعی حیاء نہیں بلکہ شرعاً وہ عیب ہے اگرچہ عرفادہ حیاء ہی کہلاتا ہے۔

باب ماجاء فی التَّائِبِ وَالْعَجَلَةِ

”عن عبد اللہ بن سرجس المزنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: السمْتُ الحَسَنُ والثَّوَدَةُ والاقتصاد جزء من اربعة وعشرين جزءاً من النبوة۔“

حضرت عبد اللہ بن سرجس مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھی عادت اور وقار اور میانہ روی نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

۱۔ صحیح بخاری ص: ۹۰۳ ج: ۲ ”باب فی الحیاء“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۴۸ ج: ۱ ”باب بیان عدد شعب الایمان وفضلها الخ“ کتاب الایمان۔

لغات:۔ قولہ ”التَّائِي“ بفتح الهمزة وتشديد النون جلدی کرنے کے مد مقابل آتا ہے۔ قولہ ”العَجَلَةُ“ عین، جیم اور لام تینوں مفتوح ہیں بمعنی جلدی و سرعت کے ہے گویا ترجمۃ الباب کے دونوں الفاظ ایک دوسرے کی نفی ہیں۔ قولہ ”السَّمْتُ“ اس کے معنی خصلت اور عادت کے ہیں لہذا سمت حسن کا مطلب اچھی عادت و خوبی ہے۔ قولہ ”والتَّوَدُّةُ“ بضم التاء وفتح الهمزة وفتح الدال الخففة یہ اسی تائی کے معنی میں ہے یعنی عجلت کے مقابلے میں آتا ہے جس کا مطلب وقار و سکون اور سلیقے سے کام کرنا ہے۔ قولہ ”الاقتصاد“ بمعنی اعتدال کے یعنی افراط و تفریط کے درمیان درجہ اوسط کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک میں اچھی عادت، آرام و سکون اور میانہ روی کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا گیا جس سے ان امور کا عمدہ ہونا نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسے نبوت کا چوبیسواں حصہ کس اعتبار سے کہا گیا ہے؟ جبکہ بعض روایات میں پچیسویں جزء ہونے کا بھی ذکر ہے۔^۱

اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت ایک وہی نعمت ہے اس کے حصول میں کسی طرح انسانی کسب و اكتساب دخل نہیں، تاہم نبوت ہر شخص کو بھی نہیں ملتی، یہ نعمت عظمیٰ اس انسان ہی کو مل سکتی ہے جو انسانی اعلیٰ کمالات اور خوبیوں کا مالک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی بعثت عموماً ان اقلیم و اراضی و خطوں میں بکثرت ہوئی ہے جہاں کی آب و ہوا معتدل ہے۔ وہ چوتھی اقلیم کا درمیانی حصہ ہے جو شام کے آس پاس ممالک پر مشتمل ہے۔ چونکہ آب و ہوا اور اعتدالِ موسم کا انسانی اخلاق پر ایک اچھا اثر ہوتا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں میں اعتدال پایا جاتا ہے اور اسی کی بدولت وہاں اولیاء و علماء اور اتقیا بکثرت پیدا ہوتے ہیں جیسے وہاں کازیتون لاثانی ہے ایسا ہی وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی انتہائی معتدل ہے، جب ان پر وحی نازل ہو جاتی ہے تو نور علی نور کا مصداق بن جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ دینِ فطرت ان علاقوں میں زیادہ جلد نافذ اور مقبول عام بن جاتا ہے جہاں اعتدالِ موسم پایا جاتا ہو جس کی تفصیل مقدمہ ابن خلدون میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال انبیاء کمالات اور انسانی خوبیوں اور ملکات کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں ان ملکات میں سے تین وہ بھی ہیں جن کا ذکر حدیث بالا میں آیا ہے۔ اگر کسی میں یہ اوصاف اعلیٰ پیمانے پر ہوں تو اس میں گویا

باب ماجاء فی التانی والعجلة

۱۔ ایک روایت میں پچیسویں جزء ہونے کا ذکر ہے کما فی ابی داؤد ص: ۳۱۱ ج: ۲ ”باب فی الحلم و اخلاق النبی ﷺ“ اول کتاب الادب، ایک روایت میں ۴۷ ویں اور ایک روایت میں ۷۰ ویں جزء ہونے کا ذکر ہے، کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۱۳ ج: ۸ حدیث: ۱۳۱۱۔

چوبیسواں حصہ آگیا اور جس میں نسبت کم درجے کے ہوں تو اس میں گویا نبوت کا پچیسواں حصہ پایا جاتا ہے، لیکن جزء کے تحقق سے کل کا تحقق لازم نہیں آتا، اس لئے ایسا شخص انبیاء کے راستہ پر گامزن تو ہے مگر وحی کا مستحق نہیں کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ تدبر، اس کی مزید تحقیق ابواب الروایا میں آئے گی۔

دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا شئ عبد القیس ان فیک حصلتین یحبہما اللہ الحلم والاناء“۔^۲

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حج عبد القیس سے فرمایا کہ بے شک تیرے اندر دو ایسی خوبیاں ہیں جن کو اللہ پسند فرماتا ہے، وہ بردباری اور اطمینان ہیں۔ لغات:- قولہ ”الحلم“ بردباری اور عقلمندی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الاناء“ بکسر الہمزۃ یہ وہی تائی اور تودۃ کے معنی میں ہے یعنی اطمینان و سکون سے کام سرانجام دینا۔ پھر الحلم والاناء کے اعراب میں دو احتمال ہیں۔ دونوں بنا بر بدلیت از خصلتین منصوب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور خبر المبتدأ المحذوف بھی ہو سکتے ہیں۔ ”ای ہما الحلم والاناء“۔

تشریح:- حج عبد القیس عبارت اضافت کے ساتھ ہے۔ حاشیہ میں ایک احتمال بدلیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا ”ای وافد عبد القیس“۔ ان کا نام منذر بن عائد بن المنذر العصری تھا۔ ان کا بڑا قبیلہ ربیعہ تھا مگر عبد القیس شاید ربیعہ کی شاخ ہے۔ حج کے معنی سر کے زخم کے ہیں۔ اور عصری قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

اس وفد کی آمد کا مختصر پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ:- ان کا ایک آدمی مقصد بن حیان تجارت کے لئے مدینہ طیبہ آتا رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حسب معمول مدینہ طیبہ میں آیا ہوا تھا اور اپنا سامان فروخت کر رہا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تشریف لائے تو یہ آپ کو ملا۔ آپ نے اس کا حال پوچھا اور اس قبیلہ کے بڑے بڑے اشراف کا نام لے کر احوال پوچھا تو اس سے مقصد کو بہت تعجب ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ فاتحہ اور سورۃ علق کا سبق لیا۔ اور وطن واپس آگیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرفاء قبیلہ کی طرف ایک خط بھی لکھوا دیا تھا۔ مقصد نے اپنے قبیلہ میں آکر ابتداء اپنے اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو مخفی رکھا۔ اور گھر میں نمازیں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی قبیلہ کے

سردار منذر بن عائد کی بیٹی تھی۔ بیٹی نے اپنے شوہر کی نماز کا تذکرہ اپنے والد منذر کے سامنے کیا کہ وہ جب سے مدینہ سے واپس آیا ہے۔ اس طرح منہ دھوتا ہے۔ اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی بیٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی ماتھا زمین پر ٹیک دیتا ہے۔ غرض یہ کہ بیعتِ صلوة کو نقل کیا۔ منذر نے اپنے داماد منذر سے پوچھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو؟ اس نے اپنے اسلام لانے کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ منذر کے دل میں اسلام کی محبت آگئی۔ اور خط بھی اس کو دکھلایا گیا۔ اس نے قبیلہ کے لوگوں کو حالات سنائے۔ اور خط پڑھ کر سنایا۔ سب اسلام لانے کے لئے تیار ہو گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد مدینہ طیبہ بھیجنا چاہئے۔ چنانچہ رئیس قبیلہ منذر (عبد القیس) کی قیادت میں ایک وفد تشکیل دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ وفد مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی تعلیمات حاصل کیں۔ ابن ماجہ (باب الحکم ص ۳۰۸) پروردگار عید غدیری رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد سے پہلے ہی اس کی پیشین گوئی فرمادی تھی۔ چنانچہ جب یہ لوگ آگئے تو بے تابانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فوراً حاضر ہوئے۔ جبکہ انش عَصْر (عبد القیس) پہلے اپنی منزل پر گئے۔ سواری بٹھادی۔ اور کپڑے تبدیل کر کے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”يا اشج ان فيك لخصلتين يحبهما الله الحلم والتؤدة“ قال يا رسول الله! اشئ
جُبلت عليه ام شئ حَدَّثَ لِي؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بل شئ
جُبلت عليه“۔

ایک روایت میں ”تؤدة“ کے بجائے ”حياء“ کا لفظ ہے۔ (ابن ماجہ ص ۳۰۹)

چونکہ حياءِ اثناء پر آمادہ کرتی ہے اس لئے یہ تعبیر بھی صحیح ہے۔

تیسری حدیث:- ”الآناء من الله والعجلة من الشيطان“۔ (حدیث غریب) ۳

تا مل اور سنجیدگی اللہ کی طرف سے ہے اور جلدی کرنا شیطان کی جانب سے ہے۔

تشریح:- جب آدمی کسی کام کو سوچ سمجھ کر تا مل کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اسے اس کے گرد و پیش اور عواقب میں غور کرنے کا موقع ملتا ہے جبکہ بلا تا مل اور بلا سوچے سمجھے کام کرنا باند انجامی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے اول مستحسن ہوا۔ اور دوم مذموم۔ اور ضابطہ ہے کہ اچھے کاموں کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے اور بُرے اور غلط کاموں کی نسبت شیطان کی جانب۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جن کا انجام بہر حال اچھا ہی ہو جیسے نماز اور دیگر امور شرعیہ جن کے کرنے کا حکم ہے لہذا ان میں جلدی کرنا معیوب نہیں کیونکہ اللہ نے خیر و بھلائی کی طرف مسارعت کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور ایسے لوگوں کو پسند بھی فرمایا ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عجلت اور سرعت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں عجلت قبل از وقت کام کرنے کو کہتے ہیں جبکہ سرعت اپنے وقت پر کام جلدی نمٹانے کو کہتے ہیں۔ اللہ نے سرعت کی مدح تو فرمائی ہے مگر عجلت کی نہیں لہذا استثنیٰ کی ضرورت باقی نہ رہی۔

باب ماجاء فی الرفق

”عن ابی الدرداء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من أُعْطِيَ حَظَّهُ من الرفق فقد أُعْطِيَ

حَظَّهُ من الخیر ومن حُرِمَ حَظُّهُ من الرفق فقد حُرِمَ حَظُّهُ من الخیر“۔ (حدیث حسن صحیح)
حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو نرمی میں سے اس کا نصیب ملا تو اسے خیر میں سے اس کا حصہ ملا۔ اور جس شخص کو نرمی میں سے اس کے نصیب سے محروم کر دیا گیا تو خیر میں سے اس کا حصہ ختم کر دیا گیا۔

لغات:- قولہ ”من أُعْطِيَ اور من حُرِمَ“ مجہول کے صیغے ہیں ان میں ضمیر مستتر ”من موصولہ“ کی طرف عائد نائب فاعل ہیں اور ”حَظُّهُ“ منصوب مفعول ثانی ہیں۔

تشریح:- ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ نرمی خیر کا حصہ ہے جس نیک بخت کو جتنی نرمی نصیب ہوگی اسی تناسب سے خیر و بھلائی اس کی متاع ہوگی۔ اور جس قدر نرم خوئی میں کمی ہوگی اسی تناسب سے خیر سے محرومی ہوگی۔ لہذا خیر و بھلائی کا دار و مدار نرم خوئی پر ہوا۔ اب جو شخص جتنا چاہے اپنے لئے خیر بڑھا سکتا ہے۔

اس مضمون کی متعدد احادیث اور بھی وارد ہوئی ہیں جس سے نرم خوئی کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے کہ عند الشارح اس کا کتاب بڑا مقام ہے۔^۱

باب ماجاء فی الرفق

۱۔ راجع للاحادیث مجمع الزوائد ص: ۱۲ ج: ۸، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۷۸ ج: ۲۸۲ ج: ۳۔

تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں سختی مطلوب ہو وہاں نرمی کرنا مدد و محو و نہیں ہے مثلاً جہاں حکومت کو قوت تنفیذ کی ضرورت ہو اور وہاں ایک اہل کار کسی مجرم کے ساتھ نرمی کرتا ہے تو اس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک طالب علم پڑھتا نہیں تو مدرسے کی انتظامیہ کے لئے اس کے ساتھ سختی کرنا ہی اس کے لئے مفید ہے۔ ایک اچھا باپ وہی ہوتا ہے جو اپنے بچوں کی پرورش میں موقع و محل کا بھرپور خیال رکھے کہ کس جگہ نرمی اچھی ہے اور کس وقت سختی۔ شوہر، واعظ، مفتی اور قاضی کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے۔ البتہ سختی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے ڈھنگی سختی کرے بلکہ جہاں سختی کا اظہار ضروری ہو تو اس میں نرمی و مہربانی کا عنصر ضرور شامل ہونا چاہئے اور وہ کام اس خوبی سے سرانجام دینا لازمی ہے کہ اس سختی کا فائدہ جلدی نمایاں ہو جائے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سختی درحقیقت مہربانی اور نرمی ہی تھی مگر صورتاً یہ سختی لگ رہی تھی۔ تدر

باب ماجاء فی دعوة المظلوم

”عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث معاذاً الى اليمن فقال: اتق دعوة المظلوم فانه ليس بيننا وبين الله حجاب“۔ (حسن صحيح) ^۱

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ ستم زدہ کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ (مانع) نہیں ہوتا ہے۔

تشریح:۔ مظلوم کی بددعا سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرنا چاہئے کیونکہ ظلم کر کے آدمی بددعا سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے یہاں لازم کی نفی سے ملزوم کی نفی مراد ہے۔ یہ حدیث ابواب الزکاة کے شروع میں بھی گزری ہے جو ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی، ج ۳ من ص ۴۰ الی ص ۴۷) یہاں حجاب سے مراد مانع ہے، یعنی اس بددعا کے اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ وہ

باب ماجاء فی دعوة المظلوم

۱۔ اخرجه البخاری فی الجہاد باب: ۱۸۰، وفی الزکاة باب: ۶۳، وفی مظالم باب: ۹، ومغازی باب: ۶۰، ومسلم فی الايمان حديث: ۳۹، ابو داؤد زکاة باب: ۵، ابن ماجہ ابواب الزکوة باب: ۱، سنن دارمی زکاة باب: ۱ ومسنن احمد ص: ۳ ج: ۱ حديث: ۱۲۰۷۲۔

ضرور پیش ہوتی ہے۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ مظلوم خواہ ایسا کیوں نہ ہو جس کی دعا قبول نہیں کی جاتی، مثلاً اس کا کھانا حرام ہو لیکن مظلومیت کی صورت میں اس کی بددعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ پھر مسند احمدؒ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ مظلوم کافر کیوں نہ ہو۔ تاہم حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر اور فاسق کی دعا قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وقتی مطلوب حاصل ہوگا، اصلی مقصود کا حصول مراد نہیں جو خالق کی طرف سے داعی کا اکرام اور رضا ہے۔

بہر حال حجاب سے مراد مانع ہے۔ اور یہ کنایہ ہے سرعت قبولیت سے۔ اس حجاب سے مراد پوشیدہ ہونا نہیں اور نہ ہی اس کا مفہوم مخالف معتبر ہے، کیونکہ اللہ عز وجل سے کوئی شے محجوب نہیں۔ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کسی شے کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان حجاب ہے تو مطلب منع اور حرمان ہوتا ہے کہ وہ محروم ہے۔

باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ

”عن انس قال خدمت رسول الله صلى الله عليه وسلم عشرين سنين فعاقل لي ”أَفَ“ قَطُّ وما قال لشيء صنعته لِمَ صنعته؟ ولا لشيء تركته لِمَ تركته؟ وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم من احسن الناس خلقاً وما مسست خِزاً قط ولا حريراً ولا شيئاً كان أَلينَ من كف رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا شَمَمْتُ مسكاً قط ولا عِطراً كان أطيب من عَرَق رسول الله صلى الله عليه وسلم“۔ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی مجھے اُف کا لفظ نہیں بولا ہے، اور نہ کسی کام کے بارے میں جو میں نے کیا ہو (اور وہ کرنا نہیں چاہئے تھا) فرمایا ہے ایسا کیوں کیا؟ اور نہ ہی فرمایا ہے کسی ایسے کام کے متعلق جو میں نے نہیں کیا ہو (اور وہ کرنا چاہئے تھا) ایسا کیوں نہیں کیا؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ میں نے کسی نرم کپڑے کو ہرگز نہیں چھوا اور نہ ریشم کو اور نہ ہی کسی اور چیز کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک سے زیادہ نرم ہو۔ اور میں نے نہیں سونگھا مشک کو کبھی۔ اور نہ ہی عطر کو

جورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پینے سے زیادہ خوشبودار ہو۔

لغات :- قوله ”أَفِي“ بضم الهمزة وكسر الفاء المشددة المنونة، اس میں دیگر لغات بھی ہیں۔ اصل میں ناخن کی میل کو کہتے ہیں، پھر ہر قابل نفرت چیز کے لئے استعمال ہونے لگا، اور اسی میں اب مشہور ہے۔ قوله ”خَزَأُ“ أولون اور ریشم ملا کر اس سے بنایا جاتا ہے جو بہت نرم کپڑا ہوتا ہے۔

تشریح :- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لائے تو کچھ عرصہ کے بعد جس کی مدت زیادہ سے زیادہ چند ماہ ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کو لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور کہنے لگیں اے اللہ کے رسول! انس سنجیدہ بچہ ہے یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا گویا ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مسلسل پوری حیات نبوی یعنی تقریباً دس سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حضر اور سفر میں سرانجام دی۔

باب کی حدیث میں جن امور کا ذکر ہے کہ جو کام کئے جانے کے تھے ان میں سے اگر کوئی کام رہ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں کیا۔ اور جو امور ایسے ہوتے ہیں جن کو نہیں کرنا چاہئے اگر ایسا کوئی کام مجھ سے سرزد ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا؟ تو ان سے آداب اور معاشرت کے وہ امور مراد ہیں جن کا تعلق ذاتی ضروریات یا گھریلو معاملات سے ہو امور شرعیہ مراد نہیں کیونکہ ان میں کمی بیشی اور کوتاہی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً تنبیہ فرماتے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت^۱ میں ہے کہ حرمت اللہ کی بے حرمتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غضب ناک کر دیتی۔ (چونکہ یہ غصہ بھی خالصتاً لوجہ اللہ ہوتا تھا اس لئے) اس غصہ کی کوئی بھی تاب نہ لاسکتا تھا۔

بہر حال حدیث باب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کس قدر درگزر اور عفو کے مالک تھے، ورنہ دس سال کے عرصے میں خادم سے اور خصوصاً کم عمر والے سے کوئی نہ کوئی کوتاہی ضرور ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذاتی سہولیات اور دنیوی امور میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ورنہ دلچسپی کے امور کے بگڑ جانے کی صورت میں یقیناً غصہ آتا ہے، اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لئے کسی طرح دباؤ کسی پر نہ ڈالتے اور نہ ذاتی معاملات میں کسی سے انتقام

لیتے۔ چنانچہ مسلم شریف^۱ کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے، اس میں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خادم یا کسی عورت (امہات المؤمنین میں سے کسی) کو نہیں مارا۔ ان میں سے کسی سے خطا و لغزش بھی ہوتی تو اس کا انتقام نہیں لیا، بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہو تو اس پر شرعی سزا جاری فرمائی۔

باب کی حدیث سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بھی بڑی منقبت معلوم ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ان پر ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ دوسری روایات سے ان کے لئے مال و اولاد اور عمر کی دعا ثابت ہے جو قبول بھی ہوئی۔^۲

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک ہر خوشبو سے زیادہ خوشبودار تھا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عطر اور مشک وغیرہ کی خوشبو کیوں استعمال فرماتے؟ اس کے جواب میں حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ نے الکوکب میں متعدد وجوہات پیش فرمائی ہیں: مثلاً خوشبو اللہ کی نعمت ہے اسے استعمال کی غرض سے لگانا یا سنن انبیاء ہونے کی وجہ سے ان کی متابعت و موافقت کرنا یا ان اوقات میں لگانا جن میں پسینہ نہیں آتا جیسے سردی کے موسم میں۔ مگر زیادہ مناسب وجہ یہ ہے کہ آدمی کو جس بُو سے مسلسل واسطہ رہے تو وہ آدمی کو محسوس نہیں ہوتی ہے جیسا کہ مشاہدہ و تجربہ ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوشبو استعمال کرنا کوئی تحصیل حاصل یا تحصیل ادنیٰ کے زمرے میں نہیں آتا۔ تدبیر

دوسری حدیث: ”عن ابی اسحق قال سمعت ابا عبد اللہ الجدلی یقول سالت عائشة عن خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقالت: لم یکن فاحشاً ولا متفحشاً ولا صخباً بافی الاسواق ولا یجزی بالسبیة السبیة ولكن یعفو ویصفح“۔ (حدیث حسن صحیح)

ابو اسحق فرماتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ جدلی سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ غیر ارادی طور پر بد گوئی کرتے اور نہ ہی ارادۃً فرماتے، اور نہ بازاروں میں چیخنے والے تھے اور آپ صلی

اللہ علیہ وسلم بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ دیتے بلکہ معاف فرماتے اور درگزر فرماتے تھے۔

لغات :- ”فاحش اور متحش“ کے معنی ”باب ماجاء فی النفس“ میں گزرے ہیں۔ جبکہ ”صحاب“ خاء کی تشدید کے ساتھ صیاخ اور چیخنے چلانے والے کو کہتے ہیں۔ بظاہر یہ صیغہ مبالغے کا معلوم ہوتا ہے اس طرح پھر زیادہ چیخنے کی نفی ہوگی، نہ کہ نفس چلانے کی۔ لیکن یاد رہے کہ ایسے بہت سے صیغے ہیں جن کا وزن بظاہر مبالغے پر دلالت کرتا ہے مگر وہاں مبالغہ مقصود یا مراد نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ فحال وزن کبھی نفس نسبت کے لئے بھی آتا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی مرقات میں ایسی ہی بات کہی ہے ”قال: وقيل المقصود من هذا الكلام مبالغة النفس لانفى المبالغة كما في قوله تعالى: وما انا بظلام للعبيد“۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں شور نہیں فرماتے تھے، حالانکہ وہاں عموماً شور کی ضرورت پیش آتی ہے تو دوسری جگہوں میں بطریق اولیٰ شور نہیں فرماتے تھے۔ قولہ ”يعفو“ اس کا تعلق باطن سے ہے۔ اور ”يصفح“ کا ظاہری درگزر سے ہے۔

تشریح :- ان دونوں حدیثوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق جیسے ظاہری عبارت سے معلوم ہوئے اسی طرح بطور التزام بھی معلوم ہوئے، کیونکہ پہلی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک کا نرم ہونا اور پسینے کا خوشبودار ہونا۔ اور دوسری حدیث میں زور سے نہ بولنا، یہ سب علامات بلکہ دلالات ہیں اعلیٰ نفاست پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی نفیس الطبع، پاکیزہ طبیعت اور نرم خوتھے۔ کیونکہ جب مزاج نرم اور نفیس و پاکیزہ ہوتا ہے تو اعضاء بھی نرم اور آثار بھی قابل رشک ہوتے ہیں۔ جبکہ بد مزاج شخص کا پسینہ انتہائی بدبودار، آواز غلیظ و بلند اور ہاتھ پاؤں سخت ہوتے ہیں۔ بال بھی سخت اور کھال بھی موٹی اور سخت ہوتی ہے۔

راقم نے ”نفس قدم“ لکھتے وقت ابوعلی سینا کی ”شفاء“ منگوائی تھی تاکہ وہ قیافے بھی کتاب میں شامل کر دیئے جائیں جن سے اخلاق پر استدلال ہو سکتا ہے، مگر بعد میں مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس طرح بعض لوگ ایک دوسرے کے عیوب پر استدلال کرنا شروع کر دیں گے اس لئے ایسی علامات کو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا۔

باب ماجاء فی حسن العهد

”عن عائشة قالت ما عُرِثَ على اِحد من ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما عُرِثَ على خدیجة وما بی ان اکون ادر کتھا وما ذاک اِلَّا لِکثرة ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لھا وان کان لیلذبح الشاة فَيَتَتَبُعُ بها صدائق خدیجة فیهذهیالھن“۔ (حسن صحیح غریب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر اتنی غیرت نہیں آئی جتنی خدیجہ پر آئی اور نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا اگر میں ان کو پالیتی، اور یہ غیرت صرف اس بناء پر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بکثرت یاد فرماتے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکری ذبح فرما لیتے تو خدیجہ کی سہیلیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو بکری (کا گوشت) ہدیہ فرماتے۔

لغات:- قوله ”حسن العهد“ عہد کے متعدد معانی آتے ہیں نگہداشت اور دور و زمانہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ علی ہذا حسن عہد کا مطلب یہ ہوا کہ اچھے دور کی یاد۔ قوله ”ما عُرِثَ“ بکسر الغین غَارِیْفًا، خَافٌ مَخَافٌ کی طرح ہے تاہم غَارِیْفًا یا ی ہے اور خَافٌ بِخَافٍ واوی ہے، غیرت کسی مرد کی بیوی کے دوسرے مرد کی طرف میلان یا کسی عورت کے شوہر کے دوسری عورت کی طرف جھکاؤ پر جوش، ناگواری اور غصے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں کسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق پر کبھی اتنا رشک نہیں آیا جتنا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتا، چونکہ ایک عورت میں یہ چیز فطری ہوتی ہے کہ جب شوہر ایک بیوی سے قرب حاصل کرتا ہے تو دوسری سو کن کو اس پر غصہ آتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اتنا خیال رکھنا کہ ان کو بکثرت یاد فرماتے اور جب کوئی بکری ذبح فرماتے تو اس کے گوشت میں سے ان کی سہیلیوں کے لئے بطور خاص حصہ مقرر فرماتے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کتنا پسند فرماتے اس لئے اگرچہ میں نے ان کو دیکھا تو نہیں تھا مگر اس یادداشت پر جب مجھے اتنا رشک آتا تو نہ معلوم کہ اگر وہ بقید حیات ہوتیں اور میری موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر محبت فرماتے تو میرا کیا حال ہوتا؟ یعنی میں ضرور رشک کرتی، مگر اللہ نے مجھے بچایا کہ میں ان کے زمانے میں موجود نہ تھی۔

عام شارحین نے ”مابی الخ“ میں ”ما“ کو نافیہ بنایا ہے یعنی یہ رشک اس وجہ سے نہ تھا کہ میں نے خدیجہ کا زمانہ پایا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے تھا، مگر اوپر ترجمہ اور مطلب میں راقم نے اپنے شیخ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ کے ترجمہ کو لیا ہے، کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے اسی طرح ترجمہ و مطلب بتایا تھا۔ واللہ اعلم۔ اگر یہ مطلب صحیح ہو تو حضرت شیخ کی فقہانہ کا نتیجہ ہے اور اگر غلط ہو تو پھر میری طرف سے ہے، اور میں یہی کہوں گا کہ میں نے سننے اور سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

مگر عبارت پر غور کرنے سے یہی لگتا ہے کہ ہمارا بیان کردہ مطلب زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر شارحین کا مطلب ہوتا تو پھر عبارت یوں ہونی چاہئے تھی ”ومابی ان اکون ادرکتھا الا لکثرة ذکر الخ“ یعنی ”وماذاک“ درمیان میں نہیں ہونا چاہئے تھا، تاکہ تعلیل صحیح ہو جبکہ ہمارے مطلب پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ”ومابی ان اکون ادرکتھا“ جملہ معترضہ ہے اور ”وماذاک الا لکثرة ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لھا“ ”غیرت“ کی علت ہے۔ تدبر۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

ربا یہ مسئلہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ اگر میں حضرت خدیجہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں بیک وقت مجتمع ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا یعنی غیرت سے کیسے بچتی؟ بلکہ اندیشہ اس میں واقع ہونے کا تھا، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو امہات المؤمنین کی شان کے منافی ہو، کیونکہ غیرت طبعی شے ہے اور امور طبعیہ پر گرفت یا پابندی نہیں ہوتی، ہاں البتہ امور طبعیہ جب بے قابو ہو جائیں تب وہ شرعاً مذموم ہوتے ہیں، قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ اور قوت عقلیہ تینوں کے لئے یہی ضابطہ ہے کہ وہ حد اعتدال میں فضائل ہیں جبکہ افراط و تفریط کی صورت میں رذائل بن جاتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ہر فضیلت دو رذیلوں کے درمیان ہوتی ہے۔ مزید تفصیل درکار ہو تو راقم کی کتاب ”نقش قدم“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

”عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان من احبکم الیّ و اقربکم منی مجلساً یوم القیمة احاسنکم اخلاقاً و ان من ابغضکم الیّ و ابعدکم منی یوم القیمة الثرثارون و المتشددون و المتفہقون، قالوا یا رسول اللہ قد علمنا الثرثارین و المتشدقین، فما المتفہقون؟“

قال: ”المتكبرون“^۱ قال الامام ابو عيسى الترمذی رحمه الله هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه، الثرثار هو كثير الكلام، والمتشدد هو الذي يتناول على الناس في الكلام ويبذو عليهم۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جو اچھے اخلاق والے ہیں۔ اور مجھے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور سب سے زیادہ مجھ سے دور ہوں گے وہ جو زیادہ باتونی، پُر زور انداز سے بولنے اور طنز کرنے والے اور تصنع کرنے والے متکبر ہوں گے۔

لغات:- قولہ ”معالي“ ”معلّاة“ کی جمع ہے قدر و منزلت اور بلندی اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ان من احبكم الي“ اس جملے کا تعلق اسی طرح ”وان من ابغضكم الي“ کا تعلق بعض شارحین نے دنیا کے ساتھ جوڑا ہے، جس کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ اچھے اخلاق کے دو ثمرے ہیں: ایک دنیا میں محبوبیت اور دوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب قیامت میں، اسی طرح بُرے اخلاق کے بھی دو تلخ نتائج ہیں: ایک دنیا میں مبغوضیت اور دوم آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری۔ جبکہ ترجمہ میں ہم نے یوم القیمة کا تعلق دونوں سے جوڑا ہے جس کے مطابق یہ دونوں نتائج آخرت میں ملیں گے گو کہ مآل دونوں تو جیہوں میں فرق نہیں ہے۔

قولہ ”الثرثارون“ ثرثار کی جمع ہے جس کا مطلب امام ترمذیؒ نے بتلایا ہے یعنی بہت زیادہ بولنے والا۔ قولہ ”المتشدقون“ متشدق کی جمع ہے اس کے معنی بھی مصنفؒ نے بتلائے ہیں یعنی جو باتوں میں لوگوں پر فخر کرے اور ان کے ساتھ بے ہودہ باتیں کرے، ثرثارون اور متشدقون کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ثرثار وہ ہے جو بتکلف باتیں بتائے اور دائرہ حق سے نکل کر بہت زیادہ بولے۔ اور متشدق وہ ہے جو تولے بغیر بولتا رہے اور بولنے میں احتیاط نہ کرے۔ بعض نے کہا کہ تشدق شدق سے مشتق ہے، شائقین باچھوں کو کہتے ہیں لہذا تشدق وہ ہے جو باتیں کرتے وقت باچھیں ہلائے تاکہ اپنے کلام کو حاضرین پر زیادہ مؤثر بنائے اور باچھوں کے اشاروں سے لوگوں پر طنز کرے۔ غرض زبان کو منہ میں پر تکلف انداز سے گھما گھما کر بولنے والا۔

قولہ ”المتفيهقون“ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ لفظ فق الوادی سے ماخوذ ہے جب وادی

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

۱۔ رواہ ایضاً احمد فی مسنده ص: ۲۱۵ ج: ۵ حدیث: ۱۷۲۸ رواہ الطبرانی فی الکبیر ۱۵۸/۲ مجمع الزوائد

ص: ۱۳ ج: ۸ حدیث: ۲۶۶۵ رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۷۷ ج: ۳

بھر جائے تو اس وقت وہ پہنچ گئی ہے لہذا متفیہق وہ شخص ہوا جو اپنی باتوں میں روانی، فصاحت اور لوگوں پر بڑھائی ظاہر کرنے والا ہو، چونکہ یہ کام تو کوئی کبر سے بھرا ہوا متکبر ہی کر سکتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”المتکبرون“۔

تشریح:- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے لئے جس چیز پر بہت زور دے کر اپنانے کی ترغیب دی ہے بلکہ حکم بھی دیا ہے وہ ہے اچھے اخلاق۔ باب کی حدیث کے علاوہ بہت ساری احادیث میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ اخلاق اچھے ہوں تو آدمی کامیاب ہے ورنہ اخلاق کی خرابی کی صورت میں آدمی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے، بالفاظ دیگر اچھے اخلاق آدمی کو مسلسل بلندی پر لے جاتے ہیں جبکہ بُرے اخلاق سے آدمی مسلسل پستی کی طرف گرتا رہتا ہے یہاں تک کہ پست ترین نقطے تک پہنچ جائے۔ والعیاذ باللہ

اخلاق اگرچہ ملکات کا نام ہے مگر ان ملکات کے اثرات آدمی کے ظاہر پر نمودار ہوتے ہیں، اس کی بول چال پر بھی اخلاق کا گہرا اثر ہوتا ہے چنانچہ جس آدمی کے اندر تکبر اور تعلی کا شوق ہوتا ہے وہ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے، وہ مجلس میں کوشش کرتا ہے کہ اپنے ہم نشینوں کو زیر کر دے اور بناوٹ سے بولتا ہے، زبان کو منہ میں گھماتا ہے، الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں اور منہ کی حرکات سے دوسروں کو مرعوب بنانے کی کوشش کرتا ہے، چونکہ یہ سب حرکتیں کبر کے آثار اور تکبر کے زمرے میں آتی ہیں، اس لئے ایسا شخص نہ تو دنیا میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب بن سکتا ہے، اور نہ ہی آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ اللہ سے دور ہے تو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کیسے ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر عاقل کو چاہئے کہ اللہ کی دی ہوئی استطاعت کے مطابق بولے اس سے زیادہ زور نہ لگائے اور نہ ہی لوگوں پر اپنی فوقیت و برتری ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

تاہم جس آدمی کو اللہ نے بولنے کا ملکہ دیا ہے یا زور قلم سے اس کو نوازا ہے اور وہ بلا تکلف مقفی و مسجع عبارات بناتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں وہ کبر کی علامت نہیں بلکہ فصاحت کا نتیجہ ہے، اور چونکہ یہ ممانعت تکبر کی بناء پر ہے لہذا اگر ایک خطیب یا مصنف خیر خواہی کی بناء پر کلام کو مؤثر بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ سن کر یا پڑھ کر عمل کریں تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ گو آج کل یہ نیت مشکل ہی لگتی ہے کہ آج کل عام کاموں میں حُب جاہ زیادہ ملحوظ رہتی ہے، و انما الاعمال بالنیات و انما لامرئی

باب ماجاء فی اللعن واللعن

”عن ابن عمر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا یكون المؤمن لعاناً“۔ وَرَوَى بعضهم ... قال لا ینبغی للمؤمن ان ینکون لعاناً“۔ (حسن غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔ دوسری روایت میں ”لا ینبغی“ کا لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لعنت کرنا کامل ایمان کے منافی ہے نہ کہ نفس ایمان کے۔

تشریح:۔ لعن اور طعن کی تفریح اور حکم تفصیل سے ”باب ماجاء فی اللعنة“ میں گذرا ہے وہیں ملاحظہ ہو۔ تاہم ابن العربیؒ نے اس باب کے ضمن میں لکھا ہے کہ جس صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ”لعن المؤمن کقتله“ؑ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل کرنے سے وہ مقتول کو دنیا سے محروم کر دیتا ہے اور لعنت سے ملعون کو جنت سے تولاً دور کر دیتا ہے اس لئے تشبیہ صحیح ہوئی۔ پھر یہ ممانعت اس وقت ہے جب کوئی شخص بلا وجہ کسی پر لعنت کرے۔ اگر کوئی وجہ ہو تو پھر اس کی عادت مکروہ ہوگی جیسے کسی نے راستہ میں گندگی پھیلائی ہے تو اگرچہ وہ لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے مگر لعنت کرنے والے کو بار بار لعنت کرنا مکروہ ہوگا۔

باب ماجاء فی کثرة الغضب

”عن ابی ہریرۃ قال جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: عَلِمْنی شیئاً ولا تكثر عَلَیَّ لَعَلِّیْ اَعِیْہ قال: ”لا تغضب“ فَرَدَّدَ ذَٰلِكَ مَرَّاراً، کُلَّ ذَٰلِكَ یَقُولُ: لا تغضب“۔ (هذا حدیث

ع قد مر تخریجہ فی ”باب ماجاء فی زیارة الاخوان“۔ حفیظ الرحمن عفی عنہ

باب ماجاء فی اللعن واللعن

۱۔ رواہ البخاری ص: ۸۹۳ ج: ۲ ”باب ما ینہی من السباب واللعن“ کتاب الادب، ایضاً ص: ۹۸۳ ج: ۲ ”باب من حلف بملۃ سوی الاسلام“ کتاب الایمان ورواہ مسلم فی الایمان حدیث: ۱۷۶ الترغیب والترہیب ص: ۳۱۳۔

باب ماجاء فی کثرة الغضب

۱۔ الحدیث اخرجہ البخاری ص: ۹۰۳ ج: ۲ ”باب الحذر من الغضب“ کتاب الادب۔

(حسن صحیح غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ مجھے کوئی مختصر ہدایت دیں اور مجھے ارشاد کی زیادہ باتیں نہ کیجئے شاید کہ (وہ مختصر نصیحت) میں یاد رکھ سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غصہ نہ کرو، اس شخص نے بار بار (تین بار) اپنا سوال دہرایا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مرتبہ یہی فرماتے کہ غصہ نہ کر۔

لغات :- قولہ ”عَلَمَنِ شَيْئًا“ شی سے مراد مختصر اور قلیل نصیحت ہے۔ اور کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے لئے بطور خاص کوئی مفید ترین بات ارشاد فرمائیے۔ قولہ ”وَلَا تَكْثُرْ“ اکثر سے ہے یعنی زیادہ اشیاء نہ بتلائیں کیونکہ ”لَعَلِّي أَعِيبُهُ“ ”ای احفظہ“ تاکہ وہ مختصر بات میں یاد رکھ سکوں جبکہ زیادہ باتیں یاد رکھنا مشکل ہوتی ہیں۔ قولہ ”فَرَدَّدَ ذَلِكَ مِرْرًا“ اس آدمی نے اپنا سوال دوبارہ و سہ بارہ دہرایا۔ شاید وہ اتنا مختصر بھی نہیں چاہتا تھا۔ یا مطلب یہ تھا کہ اس کے لئے غصہ سے بچنا مشکل تھا اس لئے متبادل کا مطالبہ کر رہا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ مفید تر کا مطالبہ کر رہا ہو۔

تشریح :- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے مناسب حال علاج کرتے اور سائلین کو ان کی ضرورت و حالت کے مطابق جواب عنایت فرماتے۔ تو جس طرح ایک طبیب مریض کی حالت دیکھ کر مناسب مرض دوا دیتا ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف سائلین کے ایک ہی سوال کے مختلف جوابات مروی ہیں۔

حدیث بالا میں سائل نے جو سوال پوچھا شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال سے یا بات کرنے کے انداز سے یا دیگر قرآن سے معلوم کیا ہو کہ اس کو غصہ جلد یا زیادہ آتا ہے۔ مثلاً ”وَلَا تَكْثُرْ عَلَيَّ“ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگا لیا ہو وغیرہ۔ چونکہ ہر فضیلت کی بنیاد میں ایک قوت و دیت کی گئی ہے جن کی تعداد اصول کے اعتبار سے تین ہے: قوت غصبیہ، قوت شہوانیہ اور قوت عاقلہ۔ تاہم ان قوتوں میں افراط و تفریط عیوب ہیں جبکہ درجہ اوسط عین کمال ہے اس لئے کہا جائے گا کہ ہر فضیلت دور ذلیتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس لئے حدیث کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسے غضب اور غصہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ یہ نہ تو ممکن ہے کیونکہ یہ امر طبعی و جبلی ہے اور نہ ہی مطلوب شرعی ہے جبکہ شریعت تکلیف بما لا یتقوا یا تکلیف لا یتقوا نہیں دیتی، اس لئے مطلب یہ ہے کہ غصہ زیادہ مت کرو یعنی غصہ کو قابو کرنے کی کوشش کرو! کیونکہ غصہ جب تک

عقل اور شریعت کے دائرے کے اندر ہوتا ہے تو یہ ممدوح و محمود ہے مگر اس دائرے سے نکلنے کے بعد اس کی بُرائی میں کوئی شک نہیں۔ زیادہ غصہ عموماً آدمی کو دائرہ عقل و نقل سے باہر کر دیتا ہے۔ پھر قباح کار کا ارتکاب تقریباً یقینی ہو جاتا ہے۔

غصے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے نقصانات کیا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ اگر ان سوالات کے جوابات درکار ہوں تو (دیکھئے راقم کی کتاب ”نقش قدم فصل ۸ غضب و غصہ، باب دوم رذائل کے بیان میں) یہاں زیادہ تفصیل مُمل ثابت ہو سکتی ہے۔

باب ماجاء فی کظم الغیظ

ہندی نسخوں میں یہاں باب کا عنوان نہیں ہے بلکہ یہ حدیث گذشتہ باب کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔
 ”عن سَهْل بن معاذ بن انس الجُهَنی عن ابيه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من کظم غیظاً و هو یستطیع ان یُنْفِذَهُ دعاهُ اللہُ یومَ القیَمۃِ علی رؤسِ الخلائقِ حتی یغیرَہ فی آتِی الحورِ شاء۔“ (حسن غریب) ^۱

حضرت معاذ بن انس جہنی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے غصہ ضبط کر لیا اور اس حالیکہ وہ اس کی تحفیز پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے بُلا کر (اعزاز سے اتنا نوازیں گے کہ) اسے اختیار دیں گے کہ وہ جس حور کو چاہے لے لے۔

لغات:- قولہ ”کظم الغیظ“ کظم اصل میں بھرے ہوئے مشکیزے کے مُنہ کے باندھنے کو کہتے ہیں جبکہ غیظ غصہ کو کہتے ہیں۔ تو کظم الغیظ کا مطلب غصے کو ضبط کرنا اور قابو کرنا ہوا۔ چونکہ آدمی غصے سے بھر جاتا ہے پھر جب خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو گویا اس نے بھرے ہوئے مشکیزے کی طرح سب کچھ اندر ہی اندر بند کر دیا۔
 قولہ ”ان ینفذه“ بتعہید الفاء باب تفعیل سے ہے۔ جبکہ باب افعال سے یعنی فاء کی تخفیف کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ”و هو یقدر علی انفاذہ“ آیا ہے (کمارواہ

باب ماجاء فی کظم الغیظ

^۱ رواہ ابو داؤد ایضاً ص: ۳۱۱ ج: ۲ ”باب من کظم غیظاً“ کتاب الادب و سنن ابن ماجہ ص: ۳۰۸ ”باب الحلم“ ابواب الزہد۔

ابن ابی الدنیا، کذا فی التلخیص^۱) یہ جملہ حالیہ ہے یعنی وہ اس حال میں غصے کو ضبط کر لے جبکہ وہ اس کے مطابق عمل کرنے پر قدرت رکھتا ہو مثلاً کسی کمزور نے غصہ دلایا ہو اور وہ اس سے انتقام لے سکتا ہو مگر نہ لے۔ قولہ ”دعاه اللہ“ الخ یہ جواب شرط ہے یعنی جس نے غصہ باوجود قدرت کے پی لیا تو اللہ عزوجل قیامت کے روز اسے سب لوگوں کے سامنے بلائیں گے۔

تشریح:- اس حدیث میں غصے کو ضبط کرنے اور پی جانے کی بہت بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ تاہم چونکہ غصہ آنے کی صورت میں آدمی کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ غصہ کسی طاقت ور پر آجائے ایسے میں تو غصہ نافذ نہیں ہو سکتا اور عموماً لوگ غصہ پی جاتے ہیں یعنی انتقام نہیں لیتے، مگر یہ کوئی شرعی کمال کی بات اور اتنی فضیلت نہیں کیونکہ یہ ایک مجبوری ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جو حدیث بالا میں بیان ہوئی کہ انتقام کی قدرت ہو مگر آدمی صبر کرے اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب غصہ اپنے سے کمزور پر آجائے۔ چونکہ عموماً لوگ ایسے میں مغضوب علیہ کی خوب خبر لیتے ہیں اور دل کی بھڑاس کو نکالتے ہیں لیکن ان ہی لوگوں میں سے اگر کوئی بندہ خدا اپنے نفس کی خواہش کے برعکس اللہ کے لئے انتقام کا جذبہ ترک کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کا کام اور للہیت کی دلیل ہے، اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب لوگوں جہاں انسانوں، فرشتوں اور جنات کا ناقابل تصور رش ہوگا سامنے لا کر اس کے کردار کو سراہا جائے گا پھر اسے حور عین میں انتخاب کرنے کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی حور عین لے کر جنت میں داخل ہو۔

ملا علی قاریؒ مرقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ فضیلت تو صرف غصہ ضبط کرنے پر ہے تو اگر وہ اس کے ساتھ معاف بھی کر دے اور مزید انعام بھی دے دے تو ایسے شخص کا کیا حال ہوگا؟

اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے: ”وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“۔ (آل عمران ۳)

لیکن یہاں پر بھی یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر فضیلت دو روزیتوں کے درمیان ہوتی ہے لہذا یہاں بھی درجہ اوسط محمود ہے یہ نہیں ہونا چاہئے کہ غصے کے مقتضی پر چلنے کا جہاں حکم ہے اور عقل جس کو مقتضی ہے وہاں بھی غصہ نہ آئے کیونکہ یہ کوئی فضیلت نہیں بلکہ روزیت اور بے غیرتی ہے جو شرعاً معیوب اور مذموم ہے۔ مزید تفصیل

۱۔ وفی رواية ابی داؤد وابن ماجہ وهو قادر علی ان ینفذہ الخ حوالہ بالا۔

۲۔ سورة آل عمران آیت: ۱۳۴۔

کے لئے (دیکھئے نقش قدم فصل: ۹ کظم غیظ، باب سوم فضائل کے بیان میں)

ابن العربیؒ نے بھی عارضۃ الاحوذی میں یہی بات کی ہے وہ لکھتے ہیں:

”فَإِذَا كَانَ الْغَضَبُ لِلَّهِ فَهُوَ مِنَ الدِّينِ وَقُوَّةِ النَّفْسِ فِي الْحَقِّ فَبِالْغَضَبِ قُبُولُ
الْكُفَّارِ وَاقِيَمَتِ الْحُدُودُ وَذَهَبَتِ الرَّحْمَةُ عَلَى أَهْلِ ذَلِكَ فِي الْقُلُوبِ وَهَذَا
يُوجِبُ أَنْ يَكُونَ الْقَلْبُ عَاقِلًا وَالْبَدَنُ عَامِلًا بِمَقْتَضَى الشَّرْعِ يَسْتَرْسِلَانِ إِذَا
أَرْسَلَهُمَا وَيَمْسُكَانِ إِذَا أَمَسَكَهُمَا“ الخ۔

باب ماجاء في إجلال الكبير

”عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما اكرم شاب شيخا ليس به
الإقيض الله له من يكرمه عند سيئه“۔ (هذا حديث غريب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
کوئی جوان کسی بوڑھے کی قدر اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے ایسے شخص کو مقرر کر دیتے
ہیں جو بڑھاپے میں اس کی قدر کرے گا۔

لغات:۔ بقولہ ”إجلال الكبير“ بزرگ و عمر رسیدہ کی قدر کرنا۔ بقولہ ”شاب“ ہشید یا الباء جوان۔
بقولہ ”لستہ“ ”ای لاجل سنہ“۔ بقولہ ”قبض“ ہشید یا الباء بمعنی سَلَطَ مسلط اور مقرر کرنا۔ بقولہ ”عند سيئه“ ”ای
عند کبر سنہ“ یعنی بڑھاپے میں۔

تشریح:۔ اس روایت میں ابوالرجال نامی راوی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ہشید یا الباء صحیح ہے اگرچہ
بتخفيف الجیم جیسا کہ اس سند میں ایک راوی ہے جو کہ ثقہ ہے مگر یہاں بالحاء ہی ہے جو ضعیف ہے۔ واللہ اعلم
محشی نے نقل کیا ہے کہ کسی بوڑھے کا اکرام جو اس فضیلت کا باعث ہے یہ محض بڑی عمر کی وجہ سے
مراد ہے حتیٰ کہ اگر کافر معمر شخص کی قدر محض اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کی تو بھی یہ فضیلت حاصل ہوگی، ظاہر ہے
کہ جب نفس بڑھاپے کی قدر دانی پر اتنا بڑا انعام ملتا ہے تو جب کسی مسلمان بزرگ کا اکرام کیا جائے تو اس
کا ثواب اور انعام تو بطریق اولیٰ ملے گا بھی اور زیادہ بھی ہوگا۔

اس کا مشاہدہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ بعض اہل علم کو کہ علمی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں مگر ان کو دیکھا گیا

ہے کہ ان کی خدمت پر اپنے شاگرد نمبر مقرر کر دیتے ہیں اور یہ کام بڑی خوشی سے کرتے ہیں کیونکہ اس مخدوم استاذ نے بھی اپنی طالب علمی کی عمر میں اپنے اساتذہ کی خدمت و قدر کی تھی۔

نیز اس حدیث میں یہ بھی خوشخبری ہے کہ بوڑھوں کا اکرام کرنے والا جوان بڑی عمر پائے گا کیونکہ بڑھاپے میں مخدوم ہونا بڑی عمر پر موقوف ہے۔

باب ماجاء فی المتہاجرین

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: تُفْتَحُ ابواب الحنۃ یوم الاثین والخمیس فِیَغْفِرُ فِیْہَا لِمَنْ لَا یَشْرُکُ بِاللّٰهِ اِلَّا الْمَتَّٰحِرِیْنَ یَقُولُ: زُودُوا هَذِیْنِ حَتّٰی یَصْطَلِحَا“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح) ^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھول دیئے جاتے ہیں، پس ان دونوں دنوں میں ہر اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا ہو مگر قطع تعلق کرنے والے دونوں کی نہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں (کے اعمال) کو لوٹا دو یہاں تک کہ صلح کر لیں۔

لغات:- قولہ ”المتہاجرین“ اس کی شرح امام ترمذیؒ نے خود فرمائی ہے، یعنی ”المستصارمین“، صرم نے بمعنی قطع کے ہے محشی لکھتے ہیں کہ اس تفسیر کا مطلب شاید یہ بتانا ہے کہ سفر وغیرہ کی وجہ سے جو جدائی ہوتی ہے وہ مذموم نہیں بلکہ تعلق ختم کرنا اور بات چیت اور ملاقات نہ کرنا مذموم ہے جو یہاں مراد ہے۔

تشریح:- کسی مسلمان بھائی سے قطع تعلق اور بات چیت بند کرنے کے متعلق ضروری تشریح ”باب ماجاء فی کراہیۃ الکفر للمسلم“ میں گزر چکی ہے وہیں پر ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں صرف اس حدیث باب سے متعلق شرح اور وضاحت پیش ہے۔ پیر اور جمعرات کے دنوں میں جنت کے دروازوں کے کھولے جانے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس میں شارحین حدیث کے متعدد اقوال ہیں

باب ماجاء فی المتہاجرین

۱۔ الحدیث اخرجه مسلم فی البر حدیث: ۳۳ و ۳۶ و مالک فی حسن الخلق حدیث: ۱۸۰۱، ایضاً روی ابو داؤد و ابن ماجہ بنحوہ، الترغیب والترہیب ص: ۳۰۶ ج: ۳، ایضاً راجع للتفصیل مجمع الزوائد ص: ۷۹ تا ۸۱ ج: ۸ کتاب الادب۔ حفیظ الرحمن الحنفی ندوة العلم

جن کو مجموعی طور پر دو قولوں کی طرف راجع کیا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ حدیث ظاہر پر محمول ہے اور جنت سے معنی حقیقی مراد ہے، چونکہ آدمی کے اعمال جنت میں جا کر جسم مثالی کے ساتھ متشکل ہو جاتے ہیں کوئی نہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کوئی محل کی، اور کوئی حور عین کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کوئی درخت کی وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اعمال آدمی سے پہلے ہی جنت میں پہنچ جاتے ہیں گو کہ نامہ اعمال میں بھی اس کا ریکارڈ رہتا ہے۔ تدبر

دوم یہ کہ اسے مجاز پر محمول کیا جائے یعنی مطلب یہ ہے کہ ان دو (۲) ایام میں مسلمانوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کے لئے پیش ہوتے ہیں، چونکہ وہاں قبول ہونے کے بعد ان پر جنت ملتا ہے اس لئے گویا ذکر لازم والمراد منہ المیزوم کے طور پر جنت کا اطلاق اس پر کیا گیا گو کہ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ بہر حال یہاں دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوں، ایک یہ کہ اعمال پیر اور جمعرات کو پیش ہوتے ہیں یعنی ہر تین دنوں کے بعد گو کہ یومیہ اعمال بھی پیش ہوتے رہتے ہیں مگر یہ خصوصی پیشی ہوتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یومیہ اعمال عالم بالا کی ایک مخصوص حد تک جاتے ہوں وہاں سے آگے پھر پیر اور جمعرات کو جاتے ہوں، بنا بر ہر تقدیر حدیث سے پیر اور جمعرات کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ قطع کلامی کی رخصت تین دن تک ہے زیادہ کی نہیں ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ بد باطنی یعنی رذائل اخلاق اور خصوصاً حسد کی منحوس تاثیر اتنی قوی ہے کہ اس سے اعمال مسترد کر دیئے جاتے ہیں گویا یہ اعمال کو جلا تا رہتا ہے۔ لہذا اگر کسی سے اختلافات آ بھی جائیں تو نہ ان کو طول دینا جائز ہے اور نہ ہی دل کو ان کے لئے مستقل ٹھکانہ بنانا جائز ہے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اولاً تو دل شیشے کی طرح صاف ہو، تاکہ ایمان کے انوارات منجلی ہوں۔ مگر بصورت مجبوری ان امراض کا جلد علاج کرنا اور کرنا از حد ضروری ہے کہ جب دل بگڑ جاتا ہے تو انسان ہلاک ہی ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی الصبر

”عن ابی سعیدان ناسأمن الانصار سألوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاعطاهم ثم سألوا فاعطاهم ثم قال ما یكون عندی من خیر فلن اذخره عنکم، ومن یستغن یغنه اللہ، ومن یتستعِف یُعِفْهُ اللہ، ومن یتَصَبَّر یُصَبِّرْهُ اللہ، وما أُعْطِی اَحَدٌ شِئاً هُوَ خیر وَاَوْسَع من الصبر“۔^۱

حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں (صحابہ) نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے (مال کا) سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دے دیا انہوں نے پھر مانگا آپ نے مزید عطا کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس کوئی بھلی چیز ہوگی تو وہ میں تم سے نہیں روکتا (مگر بات یہ ہے کہ) جو شخص اپنے آپ کو (لوگوں کے مال سے) بے نیاز بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو بے نیاز بناتا ہے، اور جو شخص خود کو پاک بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو پاک بناتا ہے، اور جو شخص خود کو صبر پر آمادہ کرتا ہے تو اللہ اس کو صبر نصیب کرتا ہے، اور کسی کو صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ وسیع چیز نہیں دی گئی ہے۔

یہاں روایات میں دو قسم کے الفاظ آئے تھے ایک ”فلن اذخره“ اور دوسرا ”فلم اذخره“ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا مطلب و معنی ایک ہی ہے۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں، کہ کہنے کا مقصد نفی اذخار مطلقاً ہے یعنی جیسے ماضی میں کوئی چیز میں نے ذخیرہ کر کے نہیں رکھی ہے اسی طرح مستقبل میں بھی نہیں کروں گا۔ لہذا ”فلم اور فلن“ دونوں اس مطلب میں برابر ہیں۔ (کذا فی الکوکب الدری)

لغات:- قولہ ”الصبر“ اگر صلہ میں ”علی“ آجائے جیسے ”صبر علی الامر“ تو معنی ”برداشت کرنے، ہمت سے کام لینے کے ہوتے ہیں“۔ اور اگر صلہ میں ”عن“ آجائے تو معنی ”روکنے اور باز رکھنے کے آتا ہے“۔ اور اگر ”بغیر صلہ“ کے آجائے جیسے ”صبر نفسہ“ تو اس کے معنی ”دل تھامنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے آتے

باب ماجاء فی الصبر

۱۔ الحدیث اخرجه البخاری ص: ۹۵۸ ج: ۲ ”باب الصبر عن محارم اللہ الخ“ کتاب الرقاق، ایضاً رواه فی الزکاة باب: ۵۰، ورواه مسلم فی الزکاة ص: ۳۳۷ ج: ۱ کتاب الزکوة، ابوداؤد ص: ۲۳۹ ج: ۱ ”باب فی الاستغفار“ کتاب الزکوة، سنن دارمی ص: ۲۷۴ ج: ۱ کتاب الزکوة باب: ۱۸، وموطا مالک ص: ۷۳۴ صدقہ باب: ۷، مسند احمد ص: ۳۸۵ ج: ۳ حدیث: ۱۰۷۰۷، ایضاً ص: ۵۲۰ ج: ۳ حدیث: ۱۱۳۸۰ والنسائی ص: ۳۶۲ ج: ۱ الاستغفار عن المسألة، کتاب الزکوة.

ہیں۔

قولہ ”من خیر“ کو کب میں ہے کہ یہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی خیر کو شامل ہے لہذا علم اور مال دونوں مراد ہوئے۔ قولہ ”ومن یستغن“ الخ ان صیغوں میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جو آدمی خود کو لوگوں سے مستغنی کرنے کی کوشش کرے گا، کہ ضرورت کے باوجود سوال نہ کرے اور خود کو سوال سے پاک بنانے کی کوشش کرے کہ باوجود ضرورت کے سوال کی گندگی سے دور رہے اور خود کو صبر پر مجبور اور آمادہ کرے یعنی باوجود رخصت سوال کے صبر کرے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس میں یہ صفات پیدا کر ہی دے گا بایں طور کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائیں گی۔

تشریح:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت استاذ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مسلسل تربیت فرماتے، کوئی موقع تعلیم دین اور تہذیب اخلاق سے خالی نہ گذرتا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی جب انہوں نے کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توجہ رخصت سے عزیمت کی طرف مبذول کرا دی کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو غیر اللہ کی طمع اور لالچ سے بالکل خالی کر دے، اگر اس کے اندر یہ صفت ذاتی نہیں تو بحکف فضائل اپنانے کی کوشش کی جائے، ایک وقت ایسا آجائے گا کہ جب یہ فضائل اس کے اخلاق بن جائیں گے۔ چنانچہ اگر ایک آدمی لوگوں کے مال اور دولت و عزت سے بے نیاز و مستغنی ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کی مشق کرے، اسی طرح پاک بازی اور صبر کو اپنانے کا طریقہ ہے۔

یاد رہے کہ انسان میں دو طرح کے ملکات ہوتے ہیں: (۱) ذاتیہ۔ (۲) فاضلہ۔ ذاتی ملکات: تو وہ ہیں جو انسان کی جبلت اور فطرت میں ودیعت کئے گئے ہوں۔ جبکہ ملکات فاضلہ کسب اور تحصیل سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ لہذا اگر ایک آدمی میں کوئی فضیلت و اخلاق بطور ودیعت کے نہیں پایا جاتا تو وہ اسے بحکف اپنانے کی کوشش کرتا رہے تو وہ صفت اس کی طبیعت بن جائے گی۔ اخلاق اگرچہ اصلاً وہ ہیں جو فطری ہوں مگر مجاہدوں سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب ”نقش قدم“ میں دیکھی جاسکتی ہے، (فصل نمبر ۱) اخلاق فطری چیز ہے، اور کیا اخلاق میں ذاتی سعی کا دخل ہے، اور اخلاق حسنہ اپنانے کا عملی طریقہ، عنوانات کے تحت ملاحظہ ہو۔ (باب اول)

امام ترمذیؒ نے یہ باب صبر کی فضیلت کے بیان میں قائم کیا ہے جس کے فضائل قرآن و سنت میں اتنے

زیادہ بیان ہوئے ہیں کہ اگر ان کا احاطہ ممکن بھی ہو تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

اجمالاً اتنی سی بات عرض ہے کہ صبر وہ بہترین خداداد نعمت ہے۔ کہ اس کا ثمرہ نہ صرف آخرت میں ملنے کا قوی امکان ہے بلکہ دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل کئے جاسکتے ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ جس آدمی نے بھی کسی مسئلہ میں صبر سے کام لیا ہے اس کو ناقابل تصور خوشی نصیب ہوئی ہے۔ جتنی برداشت زیادہ ہوگی اسی تناسب سے ثمرات بھی زیادہ ہوں گے۔ راقم کو اس کا بارہا تجربہ رہا ہے اور جب بھی صبر کے ثمرات آنا شروع ہوئے تو ایک حسرت سی بھی دل میں رہی کہ کاش برداشت میں تھوڑی بہت جو کوتاہی ہوئی ہے وہ بھی نہ ہو جاتی تو آج بھر پور ثمرات ملتے۔

صبر کے تین درجے ہیں: (۱) ”صبر علی الطاعة“ یعنی نیکیوں کی ادائیگی۔ (۲) ”صبر عن المعصية“ گناہوں سے بچنا اور (۳) ”صبر علی الاذى“ یعنی تکلیف کو برداشت کرنا۔ چونکہ ان تینوں حالتوں میں نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لئے گویا ان میں نفس کو روکنا پڑا اس لئے ان کو صبر کہا جاتا ہے، طاعت میں نفس سُست اور کابل ہو جاتا ہے جسے تیز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ گناہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے جسے لوٹانا پڑتا ہے اور تکلیف کے وقت حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی اصلاح کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر آسودہ حالی کے مقابلہ میں بد حالی پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ خوش حالی اور مال داری میں بالآخر آدمی مال اور خواہشات کا غلام بن ہی جاتا ہے الا ماشاء اللہ۔

عارضہ الاحوذی میں ہے:

”قال الصحابة في الحديث الصحيح: اُبتُلينا بالضراء فصبرنا، و اُبتُلينا بالسراء فلم

نصبر، وقد قال العلماء يصبر على البلاء كل مؤمن ولا يصبر على العافية

إلا صديق“۔

غرض مال آجائے تو آزمائش سخت ہو جاتی ہے اس لئے عاقل کو چاہئے کہ اس کی طرف زیادہ نہ جھکے۔ امام غزالی فرماتے ہیں: کہ دنیا سانپ کی مانند ہے اس سے وہی کھیل سکتا ہے جو اس کے زہر سے بچ سکتا ہو، آدمی سپیرا نہ ہو اور مال سے کھیلے گا تو ہلاک ہوگا۔

باب ماجاء فی ذی الوجھین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من شر الناس عند اللہ يوم

القیمة ذالوجھین“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے بُرا شخص اللہ کے نزدیک وہ ہوگا جو دو رُخ والا ہو۔ (یعنی دو رُخا اور منافق) لغات:- قولہ ”ذالوجھین“ لغوی اعتبار سے تو ذالوجھین کے معنی دو چہروں والا شخص ہے مگر عرف میں اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے دو روپ ہوں، جب سامنے آتا ہے تو دوستی کا روپ دھار لیتا ہے اور جب رخصت ہو کر چلا جاتا ہے تو روپ بدلتا ہے، اور یہی طریقہ اس کے مخالف کے ساتھ کرتا ہے گویا وہ دو مخالف آدمیوں کے درمیان مسلسل بھیس بدلتا رہتا ہے سامنے آئے تو دوست لگے جب پیٹھ پھیرے تو دشمن بنے۔ (کما عند البخاری) ”الذی یأتی ہولاً یأی ہولاً یو جہ و ہولاً یو جہ“ (۱)

تشریح:- دو رُخی ایسی بیماری ہے جو کئی امراض کا مجموعہ ہے اس لئے اس پر مندرجہ بالا سخت وعید آئی ہے۔ دو رُخی میں چونکہ ظاہر اور باطن میں تضاد ہوتا ہے اس لئے اس پہلو سے یہ منافقت ہے، جبکہ ایسا شخص ہر دو فریقین سے وہ بات کرتا ہے جس سے نفرت میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ اس کا چغلی والا پہلو ہے۔ پھر منافرت کے اضافے کی صورت میں نوبت عملی جھگڑوں تک جا پہنچتی ہے تو اس اعتبار سے یہ فساد فی الارض ہے اور خیر خواہی کا تاثر دے کر وہ دوسروں کے اسرار اور راز تک پہنچانا چاہتا ہے تو یہ خیانت بھی ہے، اس لئے ایسا شخص بدترین سلوک کا سزاوار ہوگا۔

چنانچہ ابوداؤد وغیرہ میں ہے: ”من کان لہ وجہان فی الدنیا کان لہ يوم القیمة لسانان من نار“۔ (ابوداؤد ص: ۳۱۲ ج: ۲، الادب المفرد ص: ۶۳۴) (۲)

عارضہ میں ہے کہ دین صرف ایک ہی حالت پر ہوتا ہے یعنی حق، جبکہ یہ شخص دین کے مزاج اور اصول

باب ماجاء فی ذی الوجھین

۱۔ رواہ البخاری ص: ۳۹۶ ج: ۱ ”باب المناقب“ کتاب المناقب، ایضاً أخرجه فی الادب باب: ۵۲، وفی الاحکام باب: ۲۷، وصحیح مسلم ص: ۳۲۵ ج: ۲ ”باب ذم ذی الوجھین الخ“ ابواب البر والصلة ومؤطا مالک ص: ۳۳۰

”باب ماجاء فی اضاعة المال وذی الوجھین“ کتاب الجامع.

۲۔ ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۷۱ ج: ۳.

کے خلاف چلتا ہے، ہاں اگر بطور تقیہ کے سخت مجبوری میں آدمی اپنے دل کا راز چھپا کر دوسری بات ظاہر کر دے جس سے مراد اپنی حفاظت ہو یا کسی دوسرے مسلمان کی حفاظت ملحوظ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح اصلاح ذات البین کا بھی حکم ہے جس کی تفصیل پہلے ”باب ماجاء فی اصلاح ذات البین“ میں گذری ہے۔

دورخی اور اصلاح ذات البین میں فرق واضح ہے کہ دور خا شخص کی کوشش اختلافات کو ہوا دینا ہوتی ہے اس لئے وہ ہر فریق کے موقف کو درست کہہ کر اس کو بھڑکاتا ہے، جبکہ اصلاح ذات البین کرنے والے کی نیت اس کے برعکس اختلافات کو کم کرنے یا ختم کرنے کی ہوتی ہے اس لئے وہ ہر فریق کو اپنی باتوں سے ٹھنڈا کرتا ہے، لہذا دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ”وانما الاعمال بالنیات“

جہاں تک تقیہ کا تعلق ہے تو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے تفسیر روح المعانی میں (سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸) ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کی تفسیر میں لکھا ہے: ”وفی الاية دليل على مشروعية التقیة وعرفوها بحفاظة النفس او العرض او المال من شر الاعداء“۔ پھر دشمن کی بھی دو قسمیں بنائی ہیں اور تقیہ کی بھی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اگر آدمی کے دین کو خطرہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر کے اپنا دین بچانا لازمی ہے۔ مگر ہجرت پر عدم قدرت کی صورت میں مخالفین کی ظاہری موافقت بقدر ضرورت جائز ہے بشرطیکہ وہ ہجرت کی کوششوں میں مصروف ہو، ہاں اظہار مذہب عزیمت ہے اگر وہ اس پر مارا جاتا ہے تو شہید ہوگا۔ تقیہ کے بارے میں خوارج اور شیعہ افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں، خوارج اس کے جواز کے منکر ہیں جبکہ شیعہ نے اس میں بہت تساہل سے کام لیا ہے جس کی تفصیل روح المعانی میں ہے۔

باب ماجاء فی النمام

”عن همام بن الحارث قال مرّ رجل علی حذيفة بن اليمان فقیل له: ان هذا یبکّغ الامراء الحديث عن الناس، فقال حذيفة: سمعتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ”لا یدخل الجنة قتات“^۱ قال سفیان: والقتات النمام“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء فی النمام

۱ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۹۵ ج: ۲ ”باب ما یکره من النمیمه“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۷۰ ج: ۱ کتاب الایمان، سنن ابی داؤد ص: ۳۲۰ ج: ۲ ”باب فی القتات“ کتاب الادب.

ہام بن الحارثؓ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ایک شخص گذرا، تو ان (حذیفہؓ) سے کہا گیا کہ یہ شخص لوگوں کی باتیں حکام تک پہنچاتا ہے تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قتات جنت میں داخل نہیں ہوگا، راوی حدیث امام سفیانؒ فرماتے ہیں کہ قتات کے معنی نام یعنی پھلخوڑ کے ہیں۔

لغات :- قوله "النمام" نسیمہ سے ہے جس کے معنی "نقل کلام الغیر لئلا یضر او لایفسد" کے ہیں، یعنی جو شخص کسی کی بات سن کر اسے دوسروں تک پہنچائے اور مقصد نقصان پہنچانا اور فساد برپا کرنا ہو۔ اور اگر مقصد نیک ہو جیسے اصلاح ذات البین تو وہ جائز ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ بات کو اچھی صورت ہی دے گا جبکہ چغلی میں وہ لگائی بجھائی کرے گا۔ قوله "قتات" اس کے معنی وہی ہیں جو راوی حدیث نے بیان کئے ہیں۔ تاہم قتات اور نمام میں لغوی اعتبار سے یہ فرق ہے کہ نمام لوگوں میں بیٹھ کر رُوِوسن کر بات کو نقل کرتا ہے جبکہ قتات چوری چھپے سناتا ہے اور پھر نقل کرتا ہے گویا تجسس کرتا ہے۔ مگر بعض حضرات اس فرق کے قائل نہیں ہیں۔^۱

تشریح :- پھلخوڑی گناہ کبیرہ ہے اور اصلاح ذات البین کے مقابل رذائل اخلاق میں سے ہے اس کی مذمت قرآن و سنت دونوں میں کی گئی ہے اس سلسلے میں ایک حدیث ترمذی جلد اول، ابواب الطہارت میں گذری ہے۔ اور بخاری شریف وغیرہ میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں کے بارے میں فرمایا کہ ان کو عذاب ہو رہا ہے... ان میں سے ایک پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی لئے پھرتا تھا۔^۲ (دیکھئے باب التمشید فی البول، تشریحات ص: ۲۳۷ ج: ۱)

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ زمین میں فساد کو ہرگز پسند نہیں فرماتا اس لئے جو شخص لوگوں کو باہم لڑاتا ہے وہ سخت ترین عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ چغلی سے دو خاندان بلکہ کبھی دو قبیلے فساد کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں اس لئے شریعت نے اس پر سخت پابندی عائد کی ہے۔

حدیث بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ پھلخوڑ جنت میں داخل نہیں ہوگا یہ ایسا ہی ہے جیسے تکبر کے بارے میں

۱ قال الحافظ: القنات والنمام بمعنى واحد وقيل النمام الذي يكون مع جماعة يتحدثون حديثاً فيم عليهم والقنات الذي يسمع عليهم وهم لا يعلمون ثم ينم، الترغيب والترہيب ص: ۳۲۳ ج: ۳.

۲ الحدیث أخرجه البخاری باب: ۵۵ و ۵۶ کتاب الوضوء، وفي الجنائز باب: ۸۹ وفي الادب باب: ۴۹، ورواه مسلم في الطهارة حديث: ۱۱۱، وابوداؤد في الطهارة باب: ۱۱، والنسائي في الطهارة باب: ۲۶، وابن ماجه في الطهارة

باب: ۲۶ بحواله الترغيب والترہيب ص: ۳۲۳ ج: ۳.

”باب ماجاء فی الکبر“ میں گزرا ہے۔ فلیراجع۔ چغلخوری کی مزید تفصیل ”نقش قدم کامل یا نقش اخلاق“ میں چغلخوری کے عنوان کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔ فصل اول، زبان کی تباہ کاریوں میں۔

مخبری اور جاسوسی :- حدیث باب میں جاسوسی کو چغلخوری کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ شخص حکومت وقت کی طرف سے اس کام پر مقرر نہ ہو بلکہ اپنی ذاتی شرارت کی وجہ سے لوگوں کے عیوب یا حکومت مخالف نظریات سے حکام کو آگاہ کرتا رہتا ہو، اگر یہ صورت تھی تو پھر تو بلاشبہ یہ چغلخوری اور مذموم ہے۔ لیکن اگر حکومت وقت کی طرف سے مقرر ہو تو اس میں دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ حکومت ظالمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو اور مخالفین کو کچلنے کے لئے جاسوس مقرر کرتی ہو اور پھر پتہ چلنے پر لوگوں کو ظلم کا نشانہ بناتی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا اور ظلم کے مخالفین جو عدل کا مطالبہ کرتے ہوں، ان کی مخبری کرنا ظلم اور عدوان میں تعاون ہے اس لئے یہ صریح حرام ہے چونکہ بنو امیہ کے بعض حکمران اپنے مخالفین کو ادنیٰ شبہ ہو جانے پر قتل کرتے تھے اس لئے یہ وہی صورت بن گئی کہ ان کے لئے جاسوسی کرنا ظلم میں مدد کرنا تھا۔

اگر حکومت اسلامی اصولوں پر کاربند ہو اور عدل و انصاف کی راہ پر گامزن ہو مگر وہاں بعض لوگ حکومت کو گرانے کے لئے غیر اسلامی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے مخالفت کرنے اور اس کے لئے لوگوں کی ذہن سازی کرنے میں مصروف ہوں یا غیر مسلم کے ساتھ ان کے روابط ہوں تو ایسے میں ان کے مذموم عزائم روکنے کے لئے تجسس کرنا اور ان کی سرگرمیوں سے حکومت کو آگاہ کرنا مذموم نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے۔

اسی طرح کافروں کے لشکر میں جا کر یا ان کے ملک میں جا کر اسلامی حکومت کو غیر مسلم سرگرمیوں سے آگاہ رکھنا بھی جائز ہے بلکہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی فضیلت کے لئے باب قائم کیا ہے:

”باب فضيلة الطليعة، عن جابر قال قال النبي صلى الله عليه وسلم: من يأتيني

بخبير القوم يوم الاحزاب فقال الزهرا“۔ الحديث، (بخاری ص: ۳۹۹ ج: ۱)

البتہ اگر جاسوس کفار کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی کرے اور پکڑا جائے تو اسے قتل بھی کیا جاسکتا

ہے چنانچہ امام بخاری (ص ۳۲۱ ج ۱) پر ایک باب قائم کرتے ہیں: ”باب الحاسوس والتجسس التبعث وقول الله تعالى: لا تتعلموا عدوتی وعلوکم اولیاء“۔ اس پر محشی نے فتح الباری سے نقل کیا ہے کہ

اگر ایسے جاسوس کے بارے میں بعض مسلمانوں کو پتہ چل جائے تو اس پر خاموشی اختیار نہ کریں بلکہ حکومت کو آگاہ کریں تاکہ وہ اس کا فیصلہ کرے۔ تاہم اس کو قتل کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے (بخاری ص ۴۲۲ ج ۱، حاشیہ نمبر ۱) پھر آگے اسی جلد کے ص ۴۲۸ پر امام بخاریؒ نے ایک اور باب قائم کیا ہے: ”باب الحرہی اذا دخل دار الاسلام بغیر امان“۔ اس میں حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین کا ایک جاسوس آگیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، وہ شخص صحابہ کرام کے پاس بیٹھا اور بات چیت کرتا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے تلاش کر کے قتل کر دو۔

آج کل یہ صورت پیش آتی ہے کہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ ہیں جو کافروں کے لئے جاسوسی کرتے ہیں، ان کا مقصد صرف پیسے کمانا ہے، ان کی جاسوسی سے مسلمانوں اور مسلم حکومتوں کو غیر معمولی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، ایسے لوگ چونکہ کلمہ گو ہوتے ہیں اس لئے ان کے قتل میں علمائے وقت کی دورائے ہیں: ایک رائے عدم قتل کی ہے، جو ان کے اسلام کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی ہے۔ دوسری ان کو قتل کرنے کی ہے، یہ ان کے کردار کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ بہت مشکل ہے اور کوئی حتمی فیصلہ کرنا آسان نہیں، تاہم بعض لوگ محض شبہ کی بناء پر جاسوسی کا الزام لگا کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں جبکہ وہ کلمہ اسلام پڑھتے رہتے ہیں یہ کام اتنا ہی خطرناک ہے جتنا ان جاسوسوں کا کام تباہ کن ہے۔ یہ وہی صورت بن جاتی ہے جس میں کسی مفتی کے لئے فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

راقم کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ آج کل اس بارے میں دونوں فریقین کی طرف سے بے اعتدالی اور زیادتی دیکھنے میں آتی ہے، اس لئے کرنے والے تو اپنا کام کر ہی لیتے ہیں مگر اس بارے میں قتل کے جواز کے فتویٰ سے بے گناہوں کے قتل کا راستہ بھی کھل جاتا ہے کہ لوگ اپنی ذاتی دشمنی کی بناء پر بھی الزام لگا دیتے ہیں اور ملزم پر غیر معمولی تشدد کر کے اس سے اپنے حق میں اقراراں گلا لیا جاتا ہے، اس لئے میں اس میں توقف ہی اولیٰ سمجھتا ہوں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی العیّ

”عن ابی امامة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الحیاء والعیّ شعبتان من الایمان، والبذاء والبیان شعبتان من النفاق“۔ (ہذا حدیث حسن غریب)۔... قال والعیّ قلة الکلام، والبذاء هو الفحش فی الکلام، والبیان هو کثرة الکلام مثل هؤلاء الخطباء الذین یخطبون فیتوسعون فی الکلام یتفصّحون فیہ من مدح الناس فیما لا یرضی اللہ“۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حیاء اور کم گوئی دونوں ایمان کے شعبے ہیں۔ اور بے ہودہ گوئی اور کثرت گوئی دونوں نفاق کے شعبے ہیں۔

لغات:۔ قولہ ”العیّ“ بکسر العین وتشدید الیاء اصل میں عدم قدرت علی الکلام کی وجہ سے عدم کلام کو کہتے ہیں۔ عارضہ میں ہے کہ ”وهو ترك القول او الفعل بالعجز عنهما“۔ تاہم یہاں عی بیان کے مد مقابل ہے یعنی کلام کے وبال سے بچنے کے لئے زیادہ بولنے سے پرہیز کرنا جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس کی طرف اشارہ اور ملا علی قاریؒ نے مرقات میں تصریح فرمائی ہے۔ (کذانی حواشی الترمذی، قوت وجمع) قولہ ”والبیان“ ”هو“ کما قال الترمذی کثرة الکلام، ”یعنی بوجہ کبر زیادہ بولنا مراد ہے۔“^۱

تشریح:۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کسی بات کو چھوڑنا یعنی نہ بولنا اور فعل کو ترک کرنا کبھی محمود ہوتے ہیں اور کبھی مذموم، وہ اس طرح کہ جس بات یا فعل کو ترک کیا جاتا ہے اگر وہ مذموم ہوں تو یہ ترک یعنی عی محمود ہے اور اگر وہ بات اور کام اچھے ہوں تو ان کا ترک کرنا اچھا نہیں، اسی طرح بیان کی بھی دو قسمیں ہیں اگر وہ اظہار حق میں مفید اور سچائی پر مبنی ہو تو یہ محمود سحر ہے اور اگر وہ ایسا نہ ہو بلکہ غلط ہو تو وہ سحر مذموم ہے۔ غرض خاموشی اور گویائی دونوں کی اچھائی اور بُرائی کا دار و مدار اپنے اپنے متعلقات اور نتائج پر ہے۔

اس تفصیل و تقسیم کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ حدیث بالا میں عی کا محمود پہلو اور بیان کا مذموم پہلو مراد ہے اور یہی تفصیل حیاء میں بھی ہے کہ اگر وہ اچھے کام سے مانع ہو تو وہ حیاء شرعاً محمود نہیں بلکہ

باب ماجاء فی العیّ

۱۔ وفي الترغيب والترهيب: والعی قلة الکلام والبذاء هو الفحش فی الکلام، والبیان هو کثرة الکلام مثل هؤلاء الخطباء الذین یخطبون فیتوسعون فی الکلام یتفصّحون فیہ من مدح الناس فیما لا یرضی اللہ ص: ۲۶۸ ج: ۳.

مشرع ہی نہیں ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے جبکہ بذاء یعنی فحش گوئی بہر حال مذموم ہے اس میں کوئی خیر کا پہلو نہیں ہے۔

عنی اور حیاء کو ایمان کے شعبے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان مؤمن کے قلب میں ایک ایسے جوہر اور ملکہ کا نام ہے جو بُرائی سے روکتا اور اچھائی پر آمادہ کر دیتا ہے گویا یہ اچھائی و بُرائی کی پہچان کا ایک معیار اور پیمانہ ہے۔ اچھی بات اور ارادے کو قبول کرتا ہے اور بُرے خیال اور عمل کو رد اور ناپسند کرتا ہے پس حیاء اور عی اس کے دو شعبے یعنی دونوں ایمان کے اثرات ہیں بالفاظ دیگر ایمان حیاء اور عی کا منشاء اور مصدر ہے کہ مؤمن ہر اس کام سے دور رہتا ہے جو مذموم ہے، جسے حیاء کہنا چاہئے اور ہر اس بات سے گھبراتا اور خاموش رہتا ہے جو معیوب ہو جسے عی کہتے ہیں۔

اس کے برعکس بذاء یعنی بے ہودہ بکواس اور بیان یعنی باتوں میں تعمق اور مصنوعی فصاحت اختیار کرنا جس سے مقصد حاضرین اور سامعین وقارئین پر اپنے اعلیٰ مقام اور برتری کا اظہار ہو تکبر و لا پرواہی کا اثر ہے جبکہ تکبر و لا پرواہی منافقت کی شاخیں ہیں کیونکہ مؤمن پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے وہ تکبر کہاں کر سکتا ہے، مؤمن اپنی باتوں کے انجام پر نظر رکھتا ہے کہ بات کس انداز سے کہنی چاہئے اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اس لئے وہ بولتے وقت سادگی اختیار کرتا ہے اور جو بات کہتا ہے اس کی بد انجامی سے ڈرتا ہے اس لئے یا تو بھلی بات منہ سے نکالتا ہے یا پھر خاموش رہتا ہے۔ پس جو آدمی ان دونوں باتوں کا خیال نہ رکھے وہ گویا منافق ہے کہ اثر بغیر مؤثر کے نہیں پایا جاتا، لہذا جب منافقت کی یہ دونوں علامتیں پائی جائیں گی تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ آدمی منافق (نی العمل) ہے یا اس کے اندر منافقت کے دو شعبے آگئے، لہذا اسے ڈرنا چاہئے کہ اگر ان شعبوں کی تعداد بڑھ گئی تو عین ممکن ہے کہ وہ عین منافق بن جائے۔ والعیاذ باللہ

واضح رہے کہ فطری ملکہ فصاحت یا کثرت مواعظ و تدلیس و تالیف سے حاصل ہونے والے ملکہ یانیک نیتی پڑتی اور خود بینی سے پاک فصیح کلام کرنا شرعاً معیوب نہیں، اس حدیث میں بیان کی مذموم قسم مراد ہے۔ کماتر

باب ماجاء ان من البيان سحراً

”عن ابن عمران رجلین قدامی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخطبا فعجب الناس من کلامهما فالتفت الینار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: ان من البیان سحراً وان بعض البیان سحر“۔ (حدیث حسن صحیح)^۱

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو آدمی آئے اور دونوں نے خطبے دیئے (یعنی تقریریں کیں) تو لوگ ان کے خطبوں پر حیران رہ گئے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ بعض تقریر جادوسی ہوتی ہے۔

لغات:- قولہ ”سحر“ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ یہ لفظ مضارِ شاذہ میں سے ہے اس کا ماضی اور مضارع دونوں مفتوح العین ہیں گویا باب فتح سے ہے۔ سحر وہ کرب اور عمل کہلاتا ہے جس کا سبب انتہائی مخفی اور باریک ہو۔ (انتہی) بعض لوگوں نے سحر کو خوارق میں شمار کیا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں جیسا کہ علامہ خیالی نے تصریح فرمائی ہے کیونکہ امر خارق سبب پڑتی نہیں ہوتا اس لئے اسے خارق للعادة کہتے ہیں جبکہ سحر تو سبب پڑتی ہوتا ہے اگرچہ وہ سبب باریک اور دقیق ہو۔ یہاں لفظ ”او“ شک راوی کے لئے ہے۔

تشریح:- یہ دونوں آدمی کون تھے جنہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اپنے خطبے پیش کئے تھے؟ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے تاہم جن دو خطیبوں کے نام معلوم ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ دو شخص وہی ہوں تو ان میں سے ایک کا نام حمین بن بدر بن امرء القیس ہے جس کا لقب زبرقان بکسر الزاء والراء والباء الساکنہ ہے جو چاند کے ناموں میں سے ایک ہے یہ لقب اسے خوب صورتی کی وجہ سے ملا تھا۔

دوسرے کا نام عمرو بن الہثم تھا، یہ دونوں تمیمی ہیں ان کی آمد ۹ھ میں ہوئی تھی۔ (کذا فی التحف عن

باب ماجاء ان من البیان سحراً

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۵۸ ج: ۲ ”باب من البیان السحر“ کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۸۶ ج: ۱ ”صلاة الجمعة“ سنن ابی داؤد ص: ۳۳۵ ج: ۲ ”باب ماجاء فی التشدیق فی الکلام“ کتاب الادب، سنن دارمی ص: ۴۲۰ ج: ۱ ”باب فی قصر الخطبة“ حدیث: ۱۵۵۶، ابضاً مؤطا لمالک فی الکلام باب: ۷، مسند احمد ص: ۳۹۸ ج: ۱ حدیث: ۲۷۵۶ و ۲۸۱ و ۲۸۵۶ و ۳۰۱۸۔

حاشیہ میں ہے کہ زبرقان نے اپنی مدح میں کلام پیش کیا جو فصیح کلمات پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے نے اس کی مذمت میں بلیغانہ کلام پیش کیا۔ پہلے نے دوسرے پر حسد کا الزام لگایا۔ دوسرے نے اور زیادہ بلیغ کلام سے جواب دیا۔

احیاء العلوم للغزالی ۷ میں ہے کہ عمرو نے ایک دن زبرقان کی مدح کی اور دوسرے دن ذم، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو عمرو نے کہا کہ میں نے پہلے میں بھی سچ ہی بولا تھا اور دوسرے میں بھی جھوٹ نہیں بولا ہے کل اس نے مجھے خوش کر لیا تھا تو میں نے اس کی ان خوبیوں سے مدح کی جو مجھے معلوم تھیں اور آج اس نے مجھے ناراض کر لیا تھا تو مجھے اس میں جو عیوب معلوم تھے ان کو بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان من البیان لسحراً“۔ اس میں ”من“، تبعیض کے لئے ہے یعنی بعض بیانات سحر اور جادو سا اثر رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سحر سے دوسروں پر اثر ہوتا ہے اسی طرح بعض بیانات سے بھی سامعین کے دل متغیر اور اپنی حالت سے محول ہو جاتے ہیں اگرچہ جادو کی طرح وہ بیان صحیح نہ ہو یا بعض بیانات سے جادو کی طرح گناہ ملتا ہے۔ دونوں تو جیبوں کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان خطبوں کا عیب بیان کرتا ہے اور یہی مطلب حدیث کا ظاہر لگتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدح ہو کہ بعض بیانات جادو کی طرح اثر رکھتے ہیں یعنی ان سے ناراض دلوں کو راضی اور سخت کو نرم و آسان بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (کذا فی الحاشیہ عن النہایہ)

باب ماجاء فی التواضع

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما نَقَضَتْ صدقة من مال، ولا زاد اللہ رجلاً بعفوٍ إلا عزاً، أو ما تواضع أحدٌ لللہ إلا رفعہ اللہ“۔^۱ (حسن صحیح)

۱ فتح الباری ص: ۲۹۰، ج: ۱۰، قدیمی کتب خانہ کراچی۔

۲ أخرجه البيهقي في الدلائل والطبرانی في معجمه بحواله فتح الباری ص: ۲۹۱، ج: ۱۰۔

باب ماجاء فی التواضع

۱ الحدیث أخرجه مسلم ص: ۳۲۱، ج: ۲، ”باب استحباب العفو والتواضع“ کتاب البر والصلة۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی صدقہ نہیں گھٹاتا مال کو، اور کسی کے معاف کرنے سے اللہ نے اس کی عزت ہی بڑھائی ہے اور کسی نے اللہ کے لئے تواضع نہیں کی مگر اللہ نے اسے اونچا فرمایا۔

لغات :- قولہ ”من مال“ اس ”من“ میں تین احتمالات ہیں: (۱) زائد ہونا۔ (۲) تبعیض کا ہونا اور (۳) بیانیہ ہونا اور ترجمہ میں بیانیہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ قولہ ”تواضع“ جو شخص اللہ کی معرفت کی بناء پر اللہ کی رضا کی خاطر یا مخلوق پر رحم کی خاطر اپنے اصل درجہ سے کم پر راضی ہو جائے یا خود کو پست کر دے تو اس فضیلت کا نام تواضع ہے اس سے نیچے درجہ کا نام ذلت ہے جو رذیلیت ہے یعنی اپنے حظ النفس اور ذاتی مفادات کے لئے اپنی رسوائی و اہانت پر راضی ہونا ذلت ہے، تواضع فضیلت ہے جبکہ ذلت عیب اور رذیلیت ہے۔

تشریح :- صدقہ دینے سے مال کم نہ ہونے کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں مال بڑھ جاتا ہے یا کم از کم بقدر صدقہ کے اس میں واپس آ جاتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگرچہ کمی محسوس ہوگی مگر آخرت میں وہ مال محفوظ بلکہ مضاعف ہو جاتا ہے اور یہ دونوں مطلب بیک وقت صحیح ہیں کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ مال خرچ کرتے ہیں ان کے ذرائع آمدن بڑھ جاتے ہیں اور آخرت میں ایک کھجور احد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔

اسی طرح مطلب دوسرے جملے کا یہ ہے کہ معاف کرنے سے، جبکہ انتقام کی قدرت حاصل ہو، آدمی لوگوں میں معالی اخلاق سے مشہور اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات سے معمور ہو جاتا ہے اور اس کے عیوب مستور ہو جاتے ہیں کیونکہ معافی محبت پیدا کرتی ہے اور انتقام نفرت۔

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے جس کے لئے امام ترمذی نے باب باندھا ہے تو اس کی فضیلت تو بہت ہی زیادہ ہے، تواضع کی وجہ سے آدمی بلند و بالا ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث باب میں اس کی تصریح کی گئی ہے، اس کی بناء پر آدمی ان تمام وعیدات و مہلکات سے محفوظ ہو جاتا ہے جو تکبر کی وجہ سے یقینی ہیں، اور یہ کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے اخلاق میں سے ہے، اس کی وجہ سے آدمی اللہ کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے اور یہ کہ یہ انسان کی اصل فطرت مٹی سے ہم آہنگ ہے جبکہ تکبر شیطان کی فطرت آگ سے ملتا ہے، اور یہ کہ تواضع میں کسی کو حسد نہیں ہوتا، اور یہ کہ تواضع عقلمندی کا اثر ہے جبکہ تکبر حماقت کا نتیجہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاہم تواضع کا جاننا ایک باریک امر ہے بعض لوگ تواضع کا دعویٰ کرنے اور تواضع کا عمل کرنے کے

باوجود متکبر ہوتے ہیں جبکہ بعض ذلت و رسوائی کو تو واضح سمجھتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو راقم کی کتاب ”نقش قدم“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی الظلم

”عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الظلم ظلمات یوم القيامة“۔^۱ (حسن

غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظلم قیامت کے دن بہت سے اندھیروں پر مشتمل ہوگا۔

لغات:۔ قولہ ”الظلم“ کسی چیز کو اپنے محل و موقع سے ہٹانے کو ظلم کہتے ہیں یعنی مکمل طور پر کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانا ہو یا کمی بیشی کی صورت میں تجاوز عن الحد ہو پھر یہ تجاوز وقت سے ہو یا مکان سے، اسی مناسبت سے اس کا اطلاق نا انصافی، غلط روئش اور ستم پر بھی ہوتا ہے۔ حدیث میں اس سے نا انصافی اور حق تلفی مراد ہے جو عدل کے مقابل ہے۔ پھر یہ حق تلفی خواہ حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں۔

تشریح:۔ چونکہ عدل اور دیگر نیک اعمال سے قیامت کے روز انوار پیدا ہوں گے جو آدمی کے ساتھ محشر میں اور پل صراط پر جنت کے داخلے تک رہیں گے، اور ظلم تو عدل کی ضد ہے لہذا اس سے اندھیرا جنم لیتا ہے جو قیامت میں آدمی پر چھایا رہے گا۔ والعیاذ باللہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل اور نیکیاں قلبی ہدایت اور نور ایمانی کے ثمرات ہیں جبکہ ظلم اور گناہ دل کا نور ہدایت سے خالی ہونے کے اثرات ہیں اور عالم آخرت میں اعمال کے اثرات اپنے دنیاوی بنیادوں پر مبنی اور ان کے مشابہ ہوتے ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ دنیا کے ایک ظلم سے آخرت میں کئی ظلمات کیسے بنیں گے تو اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ ظلم سے مراد جنس ہے جو کثرت کے مبنی نہیں، لہذا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے مظالم آخرت میں اندھیرے ہوں گے۔ دوسرا جواب: یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح نیکی کا صلہ بہت بڑا ہوتا ہے اور ایک کھجور بطور صدقہ خرچ کرنے

باب ماجاء فی الظلم

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ۳۳۱ ج: ۱ ”باب الظلم ظلمات یوم القيامة“ کتاب المظالم، ومسلم ص: ۳۲۰ ج: ۲ ”باب

تحريم الظلم“ کتاب البر والصلة.

سے وہ احد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے تو اس طرح ایک ظلم بھی اتنا بڑھ گئے کہ ہر طرف پھیلنے سے وہ کثیر محسوس ہوگا کیونکہ جب نور ہر طرف ہوگا تو اندھیرا بھی اس پر چاروں طرف سے محیط ہوگا۔

ابن جوزیؒ فرماتے ہیں ظلم دو گنا ہوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک نا انصافی جیسے کسی کمزور کا مال لیا۔ اور دوم قلبی اندھیرا کیونکہ اگر ظالم کے دل میں نور ہدایت ہو تو وہ ظلم نہ کرتا، اس لئے ظلم کا متعدد بن جانا کوئی نامعقول بات نہیں اور نہ ہی اصول کے خلاف ہے۔ بعض شارحین نے ظلمات سے تکلیفات اور عقوبات کے معنی لئے ہیں یعنی ظالم جس کو تکلیف پہنچاتا ہے اس کے انتقام میں ظالم پر قیامت کے روز کئی سختیاں مسلط کی جائیں گی۔

باب ماجاء فی ترک العیب للنعمۃ

”عن ابی ہریرۃ قال ماعاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طعاماً قط کان اذا اشتہاہ اکلہ والا ترکہ۔“ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کھانے میں عیب نہیں نکالا (یعنی عیب بیان نہیں فرمایا) اگر خواہش ہوتی تو کھالیتے ورنہ اسے چھوڑ دیتے۔

تشریح:- یہاں طعام سے مراد پکا ہوا کھانا ہے اور عیب سے مراد وہ خامی ہے جو پکانے والے سے رہ جاتی ہے جیسے نمک کا کم یا زیادہ ہونا، کھانا کچا یا جلا ہوا ہونا وغیرہ۔

اگرچہ گھر والوں کو تنبیہ کرنے کی غرض سے اور تا دیب کی نیت سے کھانے کے نقصان کے بارے میں بتانا جائز ہے تا کہ اس خامی کا ازالہ آئندہ کے لئے ہو سکے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کا اصول یہ تھا کہ کسی کے دل کو ذرہ بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہیں فرماتے اور ہر اس راستے سے بچتے جہاں کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہو، چونکہ عیب جوئی میں پکانے والے کا دل پریشان ہو جاتا ہے خاص کر عورتیں اس بارے میں بہت حساس ہوتی ہیں اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب ظاہر نہیں فرمایا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک کھانا مجلس میں کسی کو پسند ہوتا ہے اور کسی کو نہیں، تو عیب نکالنے سے دوسرے حاضر مجلس والوں پر جو ممکن ہے شوق سے کھاتے ہوں منفی اثر پڑتا ہے۔ نیز کھانے میں لذت تلاش کرنا دنیا کی چیزوں کی طرف جھکاؤ سا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کے بارے میں ناممکن ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کی زیادہ تعریفیں بھی ثابت نہیں، ہم لوگ جب کسی

مہنگے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں تو پھر عرصہ تک اسے یاد رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان نہ تھی۔

باب ماجاء فی تعظیم المؤمن

”عن ابن عمر قال صعد رسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر فنادى بصوت رفيع قال يا معشر من قد اسلم بلسانه ولم يفيض الايمان الى قبله، لا تؤذوا المسلمين ولا تعيروهم ولا تتبعوا عوراتهم فانه من تتبع عورة اخيه المسلم تتبع الله عورته ومن يتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله، قال ونظر ابن عمر يوماً الى البيت او الى الكعبة فقال: ما اعظمك واعظم حرمتك والمؤمن اعظم حرمة عند الله منك“۔^۱ (هذا حديث حسن غريب، واخرجه ابن حبان في صحيحه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے تو بلند آواز سے پکار کر فرمانے لگے: اے ان لوگوں کے گروہ! جو زبانی اسلام لائیں ہیں اور ان کے دلوں تک ایمان نہیں پہنچا ہے، مسلمانوں کو ایذا مت پہنچاؤ اور نہ ہی ان کو شرمندہ کرو اور ان کے رازوں کے درپے مت ہونا، کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے خفیہ رازوں کے پیچھے پڑتا ہے (یعنی اس کے عیوب ظاہر کرتا ہے) تو اللہ اس کے خفیہ عیوب کو ظاہر فرماتا ہے اور اللہ جس کی چھپی ہوئی بات کو ظاہر فرمادیتا ہے تو اس کو فضیحت یعنی رسوا کر دیتا ہے گو وہ اپنے گھر کے اندر کیوں نہ ہو۔ راوی کہتا ہے کہ ابن عمرؓ نے ایک دن بیت اللہ کی طرف دیکھا، یا (راوی کو شک ہے) کعبے کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ تو کس قدر عظیم ہے اور کس قدر بڑی حرمت والا ہے، تاہم مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے بڑھ کر ہے۔

لغات:- قولہ ”صَعِدَ“ بکسر العین صعود کے معنی چڑھنے کے ہیں جبکہ اصعاد کے معنی ہموار زمین میں چلنے کے آتے ہیں۔ قولہ ”وَلَمْ يَفِضْ“ انضاء سے بمعنی پہنچنے اور اُترنے کے آتے ہیں۔ قولہ ”لَا تُعِيرُوا“ تعییر سے بمعنی عار دلانے اور شرمندہ کرنے کے ہے۔ قولہ ”وَلَا تَتَّبِعُوا“ تتبع باب افعال بمعنی تجسس اور تلاش کے آتا ہے۔ قولہ ”عُورَاتِهِمْ“ عورت کی جمع ہے خفیہ حالت جس کا اظہار باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔ قولہ ”تَتَّبِعْ“

باب ماجاء فی تعظیم المؤمن

۱۔ وفي سنن ابن ماجه: والذى نفس محمد بيده لحرمة المؤمن اعظم عند الله حرمة منك ماله ودمه الخ ص ۲۸۲ ابواب الفتن، ايضاً رواه الدارمي في المناسك.

اللہ“ یہ اطلاق مشکلتہ ہے یہاں مراد کشف اور اظہار ہے۔ قولہ ”یفضحہ“ نفیحت شرمندگی اور بدنامی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”او الی الکعبۃ“ راوی کو شک ہے کہ اصل لفظ بیت کا ہے یا کعبہ کا، اس لئے دونوں احتیاطاً لایا تاکہ لفظ رہ نہ جائے جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ قولہ ”ما اعظمک واعظم حرمتک“ دونوں فعل تعجب کے صیغے ہیں۔ قولہ ”حرمة“ بضم الحاء اس کے کئی معنی ہیں: مثلاً بیوی جسے حریم بھی کہتے ہیں اور عزت، عظمت، ممانعت وغیرہ پر اطلاق ہوتا ہے مگر یہاں معنی مراد وہ حق ہے، جس کی رعایت واجب ہو اور پامال کرنا ممنوع ہو۔

تشریح: آنحضرت کا یہ خطبہ اونچی آواز میں دینا عام عادت شریفہ کے مطابق بھی ہو سکتا ہے کہ خطبے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سرخ اور آواز بلند ہو جاتی جیسے کوئی دشمن کے لشکر کی آمد سے ڈرانے والا ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے متعلق سنا ہو یا بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی ہو کہ وہ مسلمانوں اور کامل مخلصین کے خلاف زبان درازی کرتے اور ان کے عیوب تلاش کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ عام ارشاد معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب منافقین اور ضعیف الایمان سب لوگ ہوں جبکہ دوسری صورت میں بظاہر زبانی مسلمانوں سے منافقین مراد ہیں کیونکہ وہ کاملین کے خلاف منفی پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے۔

بہر حال اس ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دوسروں کے عیوب کی پردہ کشائی کرتا ہے تو اللہ اس کے عیوب کو لوگوں پر ظاہر فرماتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ غیبت کرنے والا شخص لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر ہوتا ہے۔

ترمذی کے ابواب ”صفة القیمة“ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے ”من غیر احاہ بذنب لم یعت حتی یعملہ“۔ اسی صفحہ پر ایک اور روایت ہے ”لا تظہر الشماتۃ لایحیک فیرحمہ اللہ ویتلیک“۔ اس کے اگلے باب میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ما أحب انی حکیت احداً وان لی کذا وکذا“۔ (انظر ص ۷۷ ج ۲، ایچ ایم سعید کراچی) اس صفحہ پر اور بھی احادیث ہیں۔

ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسروں کے عیوب کے درپے ہونے سے نہ صرف آدمی کے اپنے عیوب کھل جاتے ہیں بلکہ وہ جس کو عار دلاتا ہے وہ عیب بھی اس کے اندر آ جاتا ہے اور جو آدمی دوسروں کی تکلیف پر خوش ہوتا ہے یا خوشی کا اظہار کرتا ہے تو اللہ اس مصیبت زدہ پر رحم فرماتا ہے اور خوشی کرنے والے کو پکڑ لیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کسی کا عیب نقل کرنا پسند نہیں کرتا اگرچہ مجھے ساری دنیا دی جائے۔

چونکہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ جو عیب دوسرے میں نظر آجائے آدمی اپنے گریبان میں جھانکے اگر وہ اس کے اندر بھی ہے تو خود سے اور اپنے بھائی سے اس کا ازالہ کرے۔ اور اگر اس کے اندر نہیں تو اللہ کا شکر کرے اور بھائی کی فکر کرے اور کیا معلوم کہ جو عیب نظر آ رہا ہے وہ ظاہری ہی ہو اور اس کا باطن طاعن سے اچھا ہو اور کرامت کا دار و مدار تو تقویٰ پر ہے نہ کہ ظاہری شکل و ہیئت پر، پس جو آدمی ایسا نہیں کرتا وہ کامل مؤمن نہیں یا پھر خالص منافق ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول اس باب میں نقل کرنا بہت ہی معنی خیز استدلال ہے کہ لوگ کعبہ شریف کی توقدرو عزت کرتے ہیں لیکن بعض لوگ مؤمن کی قدر نہیں کرتے حالانکہ مؤمن کی حرمت عند اللہ کعبہ سے زیادہ ہے۔

اس کی وجہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ”المسک الذی“ میں یہ فرمائی ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کی تجلی کا محل ہے، کعبہ کرمہ میں ایک دو تجلی کا ظہور ہے جبکہ مؤمن تمام تجلیات ربانیہ کا مظہر ہے۔ تدبر۔ عیب اگر گناہ کا ہو تو اس سے توبہ کرنے کے بعد عار دلا نا مطلقاً ممنوع ہے اگر وہ شخص اس میں مبتلا ہو تو ستر علی المسلم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے بچاؤ کا ایسا راستہ نکالنا جائز ہے جس سے شرمندہ کرنا مراد نہ ہو بلکہ روکنا ہو خواہ تعزیر سے ہو یا تعمیر سے۔

باب ماجاء فی التجارب

”عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاحلیم الاذو عشرة ولا حکیم الاذو تجربه“۔^۱ (حدیث حسن غریب)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بُردبار کوئی نہیں مگر لغزش (پھسلن) کرنے والا اور حکیم کوئی نہیں ہوتا مگر تجربے والا۔

لغات:- قولہ ”عشرة“ بفتح العین پھسلنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد غلطی کرنا ہے کیونکہ غلطی سے بھی آدمی صحیح راستے سے ہٹ جاتا اور پھسل جاتا ہے۔ قولہ ”تجربة“ آزمائش کے معنی میں آتا ہے۔ اردو میں اس کی

جمع تجربات آتی ہے، مگر عربی میں تجارب، جیسے ترجمۃ الباب میں ہے۔

تشریح:- جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ ”لا“ کبھی نفی جنس کے لئے آتا ہے اور کبھی نفی کمال کے لئے۔ بظاہر یہاں نفی کمال کے لئے ہے کیونکہ کچھ نہ کچھ تحمل و برداشت اور حکمت تو بطور ملکات ذاتیہ اکثر لوگوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن بطور ملکات فاضلہ کے جو درجہ کمال تک پہنچے ہوں وہ بردبار کے لئے لغزش پر مبنی ہے اور دانا و عقلمند کے لئے تجربہ و آزمائش پر موقوف ہے۔ جب آدمی خود غلطی کرتا ہے تو اس کے انجام سے ڈرنے لگتا ہے پھر وہ معافی کا طلب گار ہوتا ہے جس سے معافی کی قدر معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کتنی عزیز اور محبوب چیز ہے، اس لئے وہ دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کو پسند کرتا ہے کیونکہ مؤمن دوسروں کے لئے وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

اسی طرح جو آدمی تجربہ کار ہو تو اس کی دانائی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ تجربہ سے اشیاء کے احوال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جہاں دیدہ آدمی زیادہ ہوشیار ہوتا ہے، عورتیں چونکہ گھروں تک محدود ہوتی ہیں اس لئے ان کی عقل کم ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اصلی عقل کی بات ہو رہی ہے، بلکہ یہ عقل تجربی کا ذکر ہے جہاں تک حیثی عقل ہے تو وہ انسانوں میں متفاوت ہوتی ہے گو تجربہ سے وہ بڑھتی بھی ہے، ”میبذی“ اور ”المستطرف فی کل فن مستطرف“ میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

حاشیہ قوت میں ہے کہ یہ حدیث ان میں سے ایک ہے جس کی بناء پر سراج الدین القزوينی نے صاحب مصابح پر تنقید کی ہے۔ اور موقف اختیار کیا ہے کہ یہ موضوعی ہے کیونکہ اس میں دراج عن ابی الہیثم کی روایت ہے جو صحیح نہیں۔ دوسری طرف بعض حضرات جیسے ابن حبان، امام حاکم کامیلان اس کی صحت کی طرف ہے، بلکہ مناوی نے تو شرح الجامع الصغیر میں اس کی صحت کی تصریح کی ہے۔ قوت میں ہے:

”فحاصل الامر ان هذا الحديث باول درجات الحسن او هو ضعيف ضعفاً

يحتمل واما الحكم بوضعه فلا“۔

باب ماجاء فی المتشبع بمالم یُعْطه

عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من أعطی عطاءً فوجد فلیجزہ ومن لم یجد فلیشن فان من اثنی فقد شکرو من کتم فقد کفرو من تحلی بمالم یعطه کان کلابس ثوبی زور“۔^۱ (حدیث حسن غریب، ومعنی قوله: ومن کتم فقد کفر یقول کفرتک النعمة)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو کوئی عطیہ دیا گیا اور اس کی (بدلہ دینے کی) گنجائش ہو تو اسے بدلہ دینا چاہئے، اور اگر گنجائش نہ ہو تو تعریف کرنی چاہئے (جیسے شکریہ یا دعاء وغیرہ) کیونکہ جس نے (دینے والے کی) تعریف کی تو اس نے شکریہ ادا کر لیا، اور جس نے نظر انداز کیا تو اس نے ناشکری کی، اور جس نے ایسی چیز سے خود کو مزین کیا جو اس کو دی نہیں گئی ہو تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے۔

لغات:- قوله ”المتشبع“ شیخ سے باب تفعل کا صیغہ ہے شبعان بھرے ہوئے پیٹ کو کہتے ہیں، چونکہ باب تفعل کی ایک خاصیت تکلف بھی ہے اس لئے متشبع سے مراد وہ شخص ہے جو شکم سیری کا اظہار کرے دراصل حالیکہ وہ بھوکا ہو۔ پھر یہ لفظ بناوٹی و مصنوعی دکھاوے کے لئے استعمال میں مشہور و مستعار ہوا ہے جو یہاں مراد ہے۔ قوله ”من اعطی“ مجہول کا صیغہ ہے۔ قوله ”عطاء“ بمعنی عطیہ کے ہے یا مفعول مطلق ہے، مفعول مطلق بنانے کی صورت میں مفعول بہ مقدر ماننا پڑے گا یعنی من اعطی عطیہ اور حذف میں تعیم کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی چیز دی گئی ہو جبکہ بعض روایات میں عطاء کے بعد شیئاً مذکور ہے پھر تقدیر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قوله ”فوجد“ یعنی مالی گنجائش موجود ہو۔

قوله ”فلیجز“ جزاء سے امر کا صیغہ ہے، اس میں جیم ساکن ہے یعنی بدلہ دیدے۔ قوله ”فلیشن“ بضم الیاء اس کی ثناء یعنی تعریف کرے۔ قوله ”ومن کتم“ کتمان کے معنی چھپانے کے ہیں یعنی اگر اس نے عطیہ کا بدلہ بھی نہیں دیا اور شکریہ وغیرہ بھی ادا نہیں کیا تو اس نے گویا وہ نعمت چھپالی اور کفران و ناشکری کے پردے میں

باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطه

۱ الحدیث أخرجه بمعناه البيهقي في السنن الكبرى ۱۹۹/۳ والحاكم في المستدرک ۶۳/۲ واحمد في مسنده ۹۰/۶، وأورده المصنف في زوائد المسند برقم: ۲۸۸۲ والمنقی الهندی فی کنز العمال برقم: ۱۶۵۶۶، بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۳۱۔

لیٹ لی۔ قولہ ”کفر“ کفران سے ہے بمعنی ناشکری کے۔ قولہ ”تَحَلَّى“ حلی سجاوٹ اور زینت کے سامان کو کہتے ہیں۔ یہ بھی تشبیح کی طرح باب تفعّل کی خصوصیت کی بناء پر بمعنی بناوٹی اظہار زینت کے ہے۔ قولہ ”کمان“ کلابس نوبی زور“ لابس اسم فاعل کا صیغہ ہے اور کاف تشبیہ کے لئے ہے۔ ثوبین کا نون اضافت کی وجہ سے ساقط ہوا ہے اور زور جھوٹ کو کہتے ہیں۔

تشریح:- بعض روایات کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں ایک عورت حاضر ہو کر کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میری ایک سوکن ہے تو کیا مجھ پر کوئی گناہ ہوگا کہ میں شکم سیری کا تاثر دوں جبکہ شوہر نے مجھے دیا نہ ہو (یعنی سوکن کو دکھانے کے لئے کہ میرا شوہر مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے اور بہت کھلاتا پلاتا ہے) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ (کذا فی التہذیب)

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی چیز سے محروم ہے اور وہ اس چیز کی موجودگی کا دعویٰ کر رہا ہے اور تاثر دیتا ہے کہ میں اس چیز سے مالا مال ہوں اور یہ تاثر دینے کے لئے وہ غلط راستہ اختیار کرتا ہے، اور مقصد بھی بُرا ہو مثلاً سوکن کو چھیڑنا مقصود ہو جس سے شوہر اور سوکن کے درمیان نفرت جنم لے گی یا کوئی شخص زاہدوں اور علماء کا روپ اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ اسے پارسا اور علامہ سمجھیں جبکہ وہ اس نعمت سے عاری ہو تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے فریب و مکاری کا روپ دھار لیا ہو، اس معنی کے اظہار کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا حوالہ دیا ہے جو بقول امام خطابی کے عربوں میں گزرا ہے وہ درحقیقت جھوٹا آدمی تھا مگر اس نے اپنے جھوٹ کو بے شکل سچ ظاہر کرنے کی غرض سے با اعتماد لوگوں کا لباس اختیار کر لیا تھا چنانچہ لوگ اس کی ہیئت کو دیکھ کر اسے سچا مانتے تھے۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ بعض شارحین نے یہاں پر مشبہ بہ میں تشبیہ کے صیغہ کو مشکل جانا ہے کہ اس عورت کی تشبیہ دو کپڑے پہننے والے کے ساتھ کیوں دی گئی، پھر عورت یعنی مشبہ کی جانب میں دو جھوٹ بنانے کی کوشش کی ہے، ایک یہ کہ شوہر اس سے زیادہ محبت کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کو زیادہ دیتا ہے، لیکن میرے خیال میں اس کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ اصل بات یہ ہیئت کی تشبیہ ہے ہیئت کے ساتھ چونکہ اپنی شکل و صورت با اعتماد لوگوں کی مانند بنانے کے لئے دو کپڑے پہننا پڑتے ہیں جیسے آج کل قمیص شلوار ہیں تو اس زمانے میں ازار اور چادر تھی کیونکہ یہ مقصد صرف ایک کپڑے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور تین کی ضرورت نہیں اس لئے کوئی

اشکال نہ رہا۔

غرض جو شخص اپنی اصلیت کو چھپا کر کسی غلط مقصد کے حصول کے لئے جو راستہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ لباس کا ہو یا اقوال کا یا اور کوئی حیلہ ہو جیسے کسی کی تحریر اپنی طرف منسوب کرنا اور کسی کا رنامے کو اپنے نام کرنا وغیرہ یہ سب فراڈ اور دھوکہ میں آتا ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

ہاں اگر مقصد نیک ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسے مسلمانوں کا جاسوس بھیس بدل کر کافروں میں بظاہر شامل ہو جاتا ہے تاہم اس بات کا تعین کرنا بھی ایک مشکل کام ہے کہ کون سا مقصد نیک ہے اور کون سا مذموم ہے، کیونکہ بعض اشیاء میں اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص جو مدرسہ چلانے کا اہل نہیں ہوتا ہے مگر وہ بڑے بڑے گرتے زیب تن کر کے وسیع علم اور تقویٰ کا اظہار کرتا ہے اور اس پر لوگوں سے چندہ وصول کرتا ہے جبکہ وہ بجائے صحیح علماء تیار کرنے کے یا تو سرے سے مدرسہ میں طلبہ رکھتا ہی نہیں یا پھر ان کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ نہیں جانتا، بلکہ اس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کے مدرسہ میں خدام دین تیار ہوں وہ زیادہ توجہ اپنے باروچی خانے اور آسائش و زیبائش کے سامان پر دیتا ہے، ان کو اپنی اصلیت چھپانا اس حدیث کی رو سے منع ہے۔

باب ماجاء فی الثناء بالمعروف

”عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صُنِعَ اليه معروف فقال لفاعله: جزاك الله خيراً فقد ابلغ في الثناء“۔ (حدیث حسن جید غریب) ^۱

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے ساتھ نیک سلوک کیا گیا پس اس نے ایسا کرنے والے سے کہا: جزاک اللہ خیراً تو اس نے شاندار انداز سے تعریف کی۔

تشریح:۔ معروف عام ہے خواہ کوئی ہدیہ ہو یا خدمت، مدد یا نیک مشورہ، تعلیم و تربیت اور دیگر اچھے

باب ماجاء فی الثناء بالمعروف

^۱ الحدیث رواہ بمعناه الطبرانی فی الكبير ۱۴۹/۲ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۴۴، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۲۴۰ ج: ۶ کتاب الادب.

اچھے کام ہوں۔ سابقہ باب میں گذرا ہے کہ اگر بدلہ دینے کی گنجائش ہو تو اولاً بدلہ دے مگر گنجائش نہ ہونے کی صورت میں تعریف کرے، اس باب کی حدیث گویا ثنا کی تفسیر ہے کہ اگر وہ جزاک اللہ خیراً کہہ دے تو یہ سب سے اونچی تعریف ہے کیونکہ اس نے اپنی کوتاہی کا اقرار کیا کہ تیرا یہ سلوک اتنا زیادہ ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا پس تجھے اللہ ہی اس کا بدلہ دے اور ظاہر ہے کہ جب اس نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تو یقیناً اللہ کا بدلہ اس سلوک سے بدرجہا بہتر و افضل ہوگا۔

یہ ایسا ہے جیسے اللہ نے ہم کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے کہ ”یا ایہا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیماً“۔^۱ تو ہم نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی کہ ”اللہم صل علی محمد“ یعنی ہم تو قاصر ہیں، اللہ تو ہی ان پر رحمتوں کا نزول مزید بڑھا دے چنانچہ اسی بناء پر درود پڑھنے کا ثواب بھی بڑھ جاتا ہے۔ تدبر

آخر ابواب البر والصلة

ابواب الطب

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

طب بکسر الطاء جسمانی و ذہنی علاج و معالجے کو کہتے ہیں ویسے ”ط، ب“ مادہ میں مہارت کے معنی پائے جاتے ہیں لہذا کہا جائے گا کہ حسن تدبیر اور مہارت سے علاج کرنے کا نام طب ہے گویا بغیر عمدگی و مہارت کے علاج کرنے والے کو طبیب نہیں کہا جائے گا۔

آج کل لوگ طبیب پر حکیم کا اطلاق کرتے ہیں یہ اطلاق گویا ذکر عام والمراد منہ الخاص کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ حکمت کا مفہوم بہت وسیع ہے جیسا کہ میبذی وغیرہ کتب کے اوائل میں بیان ہوا ہے جبکہ طب حکمت کا ایک چھوٹا سا شعبہ ہے، اور جہاں تک ڈاکٹر کا اطلاق ہے تو یہ بھی اگرچہ عام لفظ ہے ہر P.H.D کرنے والے کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے خواہ وہ کسی بھی فن و شعبے میں ہو، تاہم اس سے بھی حکیم کی طرح عوام میں معالج ہی مراد ہوتا ہے۔

علم طب کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کی تدوین کب ہوئی؟ اس سوال کا جواب کافی مشکل ہے بلکہ کوئی حتمی بات کہنا ناممکن ہے کیونکہ قدیم زمانے کی کوئی مستند تاریخ قرآن و سنت کے علاوہ محفوظ نہیں ہے حتیٰ کی یہود و نصاریٰ نے ساوی کتب کے تاریخی واقعات کو بھی اپنی تلیسیات کا نشانہ بنایا ہے اور قرآن و سنت میں علم طب کی ابتداء و تدوین کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔

طب کا ثبوت :- جو بات یقین سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں میں طب کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے بلکہ جانداروں کی بہت سی اقسام بھی اس علم سے وابستہ رہی ہیں اور بنی جنس حیوانی اپنی اپنی استعداد کے مطابق علاج سے مستفید رہے ہیں، اس لئے یہ علم متفقہ طور پر مسلمات میں سے ہے۔ تاہم طب اور علاج کو اسباب کے درجہ میں ماننا چاہئے اس سے زیادہ مؤثر ماننے میں ایمان کا خطرہ ہے بلکہ ضیاع ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علاج روٹی اور پانی کی طرح ظاہری اسباب میں بھی شامل نہیں بلکہ اسباب مخفی میں سے ہے لہذا اس کو ظنی اسباب کا درجہ دینا چاہئے، ہاں جہاں سمیت بہت زیادہ نمایاں ہو تو اسی تناسب سے حسن ظن میں

یا یقین میں کوئی حرج نہیں، جیسے گردوں کی پتھری کے لئے جراحی سے مرض کا ازالہ یقینی ہے بشرطیکہ زخم بگڑ نہ جائے، اسی طرح ٹائیفائیڈ اور لیبریا کی صحیح تشخیص سے بھی ماہر ڈاکٹر کا علاج نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، باقی عام علاج ظنی ہے۔

دوسری جانب جو لوگ طب، علاج اور اسباب کا انکار کرتے ہیں تو ان کی بات محض بے معنی ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس کی تردید میں وقت ضائع کیا جائے۔

امام ترمذی نے ابواب میں صحیح احادیث سے ثابت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پرہیز اور علاج کی رخصت عطا فرمائی ہے بلکہ بعض روایات میں امر کے صیغے بھی آتے ہیں۔

ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے جو الگ کتابی شکل میں ”طب نبوی“ کے نام سے چھپ گئی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: ”موجودہ معالجین کا سرمایہ علم طب یا تو قیاس ہے، بعض نے تجربہ، بعض نے الہام ربانی، کسی نے سچا خواب اور کسی نے ایک زیرک دانا دماغ کی پیداوار کہا ہے۔“

بہتوں نے اس فن کو حیوانات و بہائم کا درس بتلایا ہے پھر اس کی کچھ مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی کچھ بعید از عقل نہیں کہ وحی الہی کے ذریعہ مضر قوتوں اور منافع کا علم ہم تک پہنچا ہو۔ بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ علاج کے عمدہ ہونے کے تمام باکمال اطباء اور اساطین فن نے اقرار کیا ہے۔

بہر حال ان ابواب میں جسمانی، قلبی اور روحانی علاج کے بہت سارے طریقے مروی ہیں جیسا کہ باقی کتب احادیث میں بھی طب پر مستقل ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

باب ماجاء فی الحمیۃ

”عن ام المنذر قالت: دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعہ علیؑ ولنادوا ل معلقة قالت فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يأکل ومعہ علیؑ يأکل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلیؑ: مہ، یا علیؑ فانک ناقة قال فجلس علیؑ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم يأکل قالت فجعلت لہم سلقا وشعیرا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یا علیؑ! من هذا فأصاب فانه اوفق لک۔“ (هذا حدیث حسن غریب)

حضرت ام الممنذر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں

تشریف لائے، حضرت علیؑ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور ہمارے یہاں کچی کھجوروں کے خوشے لٹکے ہوئے تھے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کھانے لگے اور ان کے ساتھ حضرت علیؑ بھی کھانے لگے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا بس کرو، بس کرو اے علیؑ! کیونکہ تم ابھی (بیماری کی وجہ سے) کمزور ہو۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت علیؑ بیٹھ گئے جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بدستور کھاتے رہے، ام الممذرؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ان کے لئے چقندر اور جو کا کھانا تیار کیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علیؑ اس میں سے لو کیونکہ یہ تیرے موافق (مفید) ہے۔

لغات:- قوله ”الحجبة“ بکسر الحاء، بچاؤ اور حفاظت کے معنی میں ہے اور بالخصوص مریض کے نقصان وہ چیزوں سے پرہیز کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

قوله ”دوال“ والیہ کی جمع ہے ناچنے کھجوروں کی شاخ۔ قوله ”معلقة“ لٹکی ہوئی، ممکن ہے کہ یہ درخت گھر کے صحن میں ہو اور اس کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں مگر ظاہر یہ ہے کہ اس خوشے کو توڑ کر لایا گیا ہو اور گھر میں چھت وغیرہ کے ساتھ لٹکایا گیا ہو جیسا کہ عام معمول ہے کیونکہ یہیں کھجوریں پختہ ہو کر کھائی جاتی ہیں۔ قوله ”مه“ اسم فعل ہے بمعنی اکلف یعنی رک جاؤ اور کھانے سے بس کرو!۔ قوله ”ناقة“ بروزن صاحب اس آدمی کو کہتے ہیں جو بیماری سے ٹھیک ہو جائے مگر ابھی تک کمزوری باقی ہو۔ قوله ”یسلق“ بکسر السین چقندر کو کہتے ہیں۔ یہ شام کی طرح ایک ترکاری ہے اس سے چینی بھی بنائی جاتی ہے جو غیر معیاری ہوتی ہے۔ قوله ”قاصب“ امر کا صیغہ ہے بمعنی أدرك یعنی کٹل و خذ۔ قوله ”أوفق لك“ بمعنی موافق تر اور مناسب تر کے ہے۔ یہ اسم تفصیل مبالغے کے لئے ہے تفصیلی معنی میں نہیں کیونکہ پھر تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ کھجور بھی موافق ہے مگر چقندر زیادہ موافق ہے حالانکہ یہ معنی صحیح نہیں، لہذا یہ کہا جائے کہ چقندر بذات خود تیرے لئے مفید ہے کہ نرم غذا ہے لہذا خطرے کا اندیشہ نہیں ہے۔

تشریح:- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالکل شروع میں کھانے سے نہیں روکا کیونکہ دو تین کھجور کھانے سے پیٹ کے سخت ہونے یا دوسرے ضرر کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے البتہ زیادہ کھانا نازک پیٹ کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے کہ کھجور بھاری غذا ہے اور مرض کی وجہ سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے اس لئے جب تک مکمل صحت یابی نہ ہو تو ثقیل غذا سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (کذا فی البذل وفیہ: وفی الحدیث دلیل

علی فضل علم الطب وان الطیب یقبل قوله ویرجع الیہ)

اس حدیث نے استنباط کرتے ہوئے امام ترمذیؒ نے پرہیز کے ثبوت پر باب باندھا ہے، اور یہی باقی علماء کی بھی رائے ہے چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے بھی اس حدیث پر ایسا ہی باب باندھا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی اس آیت سے بھی پرہیز کا ثبوت ہوتا ہے ”وَأَن كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ... إِلَىٰ قَوْلِهِ... فَيَتِمُّوْا صَعِيدًا طَيِّبًا“ الآية ۱۔ اس آیت میں مریض کے لئے مرض بڑھنے سے بچنے کے لئے تیمم کی رخصت دی گئی ہے۔

مرض لاحق ہونے سے قبل پرہیز اور دوا کا حکم:۔ باب کی حدیث سے تو یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ مرض کے دوران یا جب تک کہ اس کے اثرات باقی ہوں تو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صورت ایسی ہو جس کو بطور حفظ ما تقدم کے اختیار کرنے سے بیماری سے بچا جاسکے تو کیا حالت صحت میں اس پر عمل کرنا جائز ہے؟ مثلاً زیادہ ٹھنڈے پانی سے پرہیز یا آج کل جیسے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو ابن العربیؒ کے کلام سے اس کی کراہیت معلوم ہوتی ہے:

”فنقول ان من الطب استرسال المرء على شهواته في صحته، وكفه عما يضره

في مرضه من الاطعمة والاشربة فاذا احتسنى في صحته مخافة ان يمرض فهو من

باب استعمال الادوية مخافة ان يمرض وهو مكروه“۔ (عارضۃ الاحوی)

یعنی حالت صحت میں جو دل کرے وہ آزاد ہے (یعنی امور مباح میں) جبکہ مرض میں نقصان دہ کھانے پینے سے پرہیز کرے، اگر وہ صحت میں پرہیز کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے صحت میں مرض سے بچنے کے لئے دوا کا استعمال اور یہ مکروه ہے۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ اس بارے میں جستجو کے باوجود فقہ حنفیہ میں کوئی صریح جزئیہ نہ مل سکا لیکن اصول کی رو سے ایسا لگ رہا ہے کہ جس ضرر کے لاحق ہونے کا اندیشہ قوی ہو تو اس سے بچاؤ کی صورت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں خواہ وہ تحفظ پرہیز کی صورت میں ہو یا دوا کے استعمال سے ہو، ہاں توہمات کے درپے نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی چیز کسی جہت سے مفید ثابت ہوتی ہے تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔

چنانچہ مدیۃ المصلیٰ اور اس کی شرح الحلیٰ المسکى بشرح الکبیر (کبیری) میں ہے:

ابواب الطب عن رسول الله ﷺ

باب ماجاء في الحمية

”والجنب الصحيح فى المصر اذا خاف بغلبة ظنه عن التجربة الصحيحة ان

اغتسل ان يقتله البرد او يمرضه يتيمم عند ابى حنيفة رحمه الله... وان كان

خارج المصر يتيمم بالانفاق“۔ (کبیری ص: ۶۶)

اس عبارت میں ظن غالب اور صحیح تجربے کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ کسی مرض کا قوی اندیشہ جبکہ وہ مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہو اور محض خیال اور وہم نہ ہو مریض اور میٹج ہے اس کے ضرر سے بچنے کی تدبیر کے لئے۔ (تدبر) چونکہ آج کل خسرہ، پولیو اور بعض دیگر امراض کا لاحق ہونا خصوصاً بچوں کے حق میں عام مشاہدہ ہے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے چیچک سے بچاؤ کے لئے ٹیکوں کی مہم جوئی مفید ثابت ہوئی ہے اور آج کل مذکور الصدر بیماریاں بھی کافی حد تک کنٹرول ہو چکی ہیں اس لئے میرے نزدیک ان سے حفاظت کے پیش نظر ٹیکے لگانا اور لگوانا دونوں جائز ہیں۔ واللہ اعلم

ابوداؤد کے ابواب الطب میں ”باب فی تمر الحجوة“ میں مرفوع حدیث ہے ”من تصبّح بسبع تمرات عسوة لم يضره ذاك اليوم سم ولا سحر“۔ اس کے بعد دونوں بابوں میں عود ہندی اور سرے کے فوائد مروی ہیں۔ (ابوداؤد ص: ۵۳۱ ج: ۲، میر محمد کتب خانہ)

اس قسم کی احادیث اور مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا ضخیم مجموعہ بن جائے گا جس سے کم از کم جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس بارے میں طاعون زدہ علاقے میں جانے کی ممانعت والی روایت اور یہ آیت ”ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة“ کے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

حدیث آخر:۔ حضرت قتادة بن العمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔

تشریح:۔ اس روایت میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں اور ان سے روایت کرنے والے

۲ الحدیث أخرجه أيضاً بخارى فى صحيحه ص: ۸۱۹ ج: ۲ ”باب العجوة“ كتاب الاطعمة، أيضاً كتاب الطب باب: ۵۶ و ۵۲، صحيح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۲ كتاب الاشربة، أيضاً مسند احمد ص: ۲۹۶ ج: ۱ حدیث: ۱۵۷۵، أيضاً سنن كبرى للبيهقى ۳۳۵/۹، وابونعيم فى الحلية ۳۶۲/۵، والبغوى فى شرح السنة ۳۲۳/۱۱، واورده المصنف فى زوائد المسند برقم: ۳۰۴۶، والمتقى الهندى فى كنز العمال: ۳۳۸۵۰، بحواله مجمع الزوائد ص: ۳۶ ج: ۵ كتاب الاطعمة. ۳ سورة البقرة آیت: ۱۹۵.

حضرت محمود بن لبید بھی صحابی ہیں جیسا کہ امام ترمذیؒ نے تصریح کی ہے تاہم ان کی عمر چھوٹی تھی اس لئے یہ روایت بغیر واسطہ قنادہ کے مرسل ہوگی جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے۔ مگر اس سے روایت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑیگا کہ ”الصحابہ کلہم عدول“۔ لہذا مراہیل صحابہ بالاتفاق حجت ہیں۔

اس روایت میں ”حماہ الدنیا“ میں لفظ ”من“ مقدر ہے ”ای حماہ من الدنیا“۔ اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ دنیا انسان کے لئے رغبت کی چیز ہے مگر وہ سخت نقصان دہ ہے، جب آدمی کے پاس زیادہ مقدار میں جمع ہو جائے تو آدمی حد آدمیت سے عموماً خارج ہو جاتا ہے اور اپنے فرائض سرانجام دینے کے بجائے خواہشات نفسانیہ کی تکمیل میں لگ جاتا ہے، اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو دنیا کے مناصب اور مال و متاع سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ بددماغی کا شکار نہ ہوں۔ اس مضمون کو سمجھانے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی مثال دی ہے مگر یہاں یہ قید ملحوظ رہے کہ یہاں تمام بیماروں کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہ مریض مراد ہے جس کے لئے پانی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے جیسے استقاء، دل کا مریض جب مرض شدت اختیار کر لے اور پھینچ دے کام کرنا چھوڑ دیں یا گردے فیل ہو جائیں وغیرہ، تو ایسا مریض شدت پیاس کی وجہ سے پانی کو ترستا ہے مگر نقصان کے پیش نظر اس کے ہمدرد پانی نہیں دیتے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دنیاوی مال و متاع یا منصب سب لوگوں کے لئے برا نہیں جیسے پانی تمام مریضوں کے لئے یکساں نہیں، لہذا جن نیک لوگوں کو دنیا ملتی ہے وہ مزید صالح بن جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے مثال دی ہے کہ پیر اگر سانپ سے کھیلتا ہے تو وہ اس کے لئے مضر نہیں مگر عام آدمی اگر سانپ ہاتھ میں پکڑے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ تدبر

باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ

”عن اسامة بن شريك قال قالت الاعراب: يا رسول الله! ألا نتداوى؟ قال نعم يا عباد الله تَدَاوَوْا فإن الله لم يَضَعْ دَاءً الا وَضَعَ له شفاءً“ او قال دواءُ الاداءِ واحداً فقالوا يا رسول الله وَمَا هُوَ؟ قال الهَرَمُ“۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ

۱۔ الحديث أخرجه أيضاً الطبرانی في الكبير، مجمع الزوائد ص: ۹۸ ج: ۵ کتاب الطب.

یہ باب دوا کی اہمیت اور اس کی ترغیب کے بارے میں ہے۔

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اعراب نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اے اللہ کے بندوں دوا استعمال کرو کیونکہ اللہ نے کوئی بیماری پیدا نہیں کی مگر اس کے لئے شفاء بھی پیدا فرمائی ہے یا فرمایا (راوی کو شک ہے) کہ دواء (ضرور پیدا کی ہے) سوائے ایک بیماری کے تو انہوں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! وہ کیا (بیماری) ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بڑھاپا۔ (یعنی بڑھاپا بیمار ہے جس کا کوئی علاج نہیں)

لغات:- قوله ”لم يضع“ ای لم یخلق۔ قوله ”شفاء“ او دواء ”الخ“ لفظ ”اد“ راوی کے شک کے لئے ہے۔ قوله ”الهرم“ بروزن ترقی یعنی بڑھاپا۔ پھر الهرم مرفوع بنا بر خبریت ہے ”ای هو الهرم“۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ سے علاج کی رخصت معلوم ہوئی جو ان صوفیہ کے خلاف حجت ہے جو ترک علاج اور توکل پر زور دیتے ہیں گویا وہ علاج کو توکل کے منافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ تاثر غلط ہے کیونکہ توکل ترک اسباب کو نہیں کہتے بلکہ اسباب پر یقین نہ کرنے کو کہتے ہیں، دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں فرمائی ہیں، ہتھیار جمع کئے اور استعمال فرمائے ہیں جنگوں میں صحابہ کرام کو سورجوں پر بٹھایا ہے اور ان جیسے اسباب اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے جبکہ حدیث الباب میں ”تداووا“ امر کا صیغہ ہے جس کا ادنیٰ تقاضہ اباحت کا ہے پس اگر اسباب اختیار کرنا منافی توکل ہوتا تو سید المتوکلین اس کا حکم کیسے کر سکتے ہیں معلوم ہوا کہ اسباب اختیار کرنا الگ چیز ہے اور ان پر اعتماد کرنا دوسری شے ہے ایک مسلمان اور کافر میں یہی فرق ہوتا ہے کہ کافر اپنے حاصل کردہ اسباب پر بھروسہ اور فخر و ناز کرتا ہے جبکہ مسلمان کا اعتماد اسباب کے بجائے اللہ پر ہونا چاہئے۔

پھر العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے امام غزالیؒ سے نقل کیا ہے کہ اگر مریض کو کسی دوا سے شفاء کا یقین ہو (جیسے گردے کا آپریشن کر کے پتھری نکالنا) اور وہ علاج نہ کرے اور مر جائے تو گناہ گار ہوگا جبکہ گمان کی صورت میں اسے اختیار ہے اور وہ ہم کی صورت میں ترک علاج اولیٰ ہے۔

۲ وعن انس ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ عزوجل حیث خلق الداء خلق الدواء لتداووا، رواه مصنفه ابن ابی شیبہ ۳۵۹/۷، ابن عبد البر فی التمهید ۲۸۵/۵، ومسنده احمد ص: ۶۳۰ ج: ۳، حدیث: ۱۲۱۸۶، مجمع الزوائد ص: ۹۶ ج: ۵، کتاب الطب.

گویا جہاں اسباب میں قوت اور مرض میں شدت ہوگی تو علاج کی تاکید زیادہ ہوگی جبکہ مرض کے نسبتاً کم نقصان اور علاج کے پیش نظر حکم میں تخفیف آتی ہے حتیٰ کہ توہم کی صورت میں ترک ہی افضل ہے اور متوکل کے لئے اس آخری درجے پر عمل کرنا یعنی علاج نہ کروانا کافی ہے۔

ادویات وغیرہ کے اسباب کی تاثیرات کا اصولی حکم واختلاف ”باب کراہیۃ البول فی المختسل“ میں گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۱۳۸، ۱۳۹ ج: ۱)

غرض ادویات استعمال کرتے وقت اعتماد دواء پر نہیں بلکہ اللہ جل جلالہ پر ہی ہونا چاہئے مگر اس نیت سے استعمال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز دوسرے کے ساتھ مجوی ہوئی ہے چنانچہ اگلے درجے تک جانے کے لئے سیر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ تدبر

پھر بڑھاپے کو مرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مرض کی وجہ سے بدن کمزور ہو کر ختم ہو سکتا ہے اسی طرح بڑھاپے سے بھی بالآخر موت آ ہی جاتی ہے یعنی کلام میں بڑھاپے کو مرض سے تشبیہ دی گئی ہے یا پھر ہرم سے مراد موت ہے مگر بڑھاپا چونکہ موت کا قریبی اور قوی سبب ہے اس لئے موت پر بڑھاپے کا اطلاق کیا گیا گویا کہ مجازاً۔

ابن العربی نے عارضہ میں اس کی چار وجوہات بیان کی ہیں مگر اول کو پسند کیا ہے۔ من شاء الاطلاع فلیراجع۔

باب ماجاء مَا يُطْعَمُ الْمَرِيضَ

”عن عائشة قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اخذاهلہ الوعک امر بالحساء فصنع ثم امرهم فحسوا منه وکان يقول: انه لیرتو فواد الحزین ویسرو عن فواد السقیم کما تسرو احد اکن الوسخ بالماء عن وجهها“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب ان کے گھر والوں (میں سے کسی) کو بخار ہو جاتا تو حریرہ پکانے کا حکم دیتے چنانچہ وہ تیار کیا جاتا پھر ان کو حکم فرماتے تو چلو لے

سے اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال: ما انزل اللہ من داء الا انزل له دواء علم ذالک من علمہ او جهل ذالک من جهله الا السام قالوا یا نبی اللہ وما السام؟ قال: الموت، مجمع الزوائد ص: ۹۷ ج: ۵ حدیث: ۸۷۷۸۔

لے کر وہ تناول فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ یہ غم زدہ شخص کے دل کو قوت (اور تسکین) دیتا ہے اور بیمار کے دل سے بیماری کا آلم دور کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی پانی سے اپنے چہرے سے میل کچیل کو زائل کرتی ہے۔

لغات:۔ قولہ ”الْوَعَك“ بروزن عبد بخار کو کہتے ہیں، یہ اخذ کا فاعل جبکہ ”اهله“ مفعول مقدم ہے۔ قولہ ”الحساء“ بروزن صحاب ہر نرم غذا کو کہتے ہیں جس کو چبانے پر پڑتا ہو مگر عام طور پر جو آٹا پانی میں پکا کر اور پھر اس پر تیل یا گھی ڈال کر تیار کیا جاتا ہے اُسے کہا جاتا ہے، اہل مکہ اسے حریرہ کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں پہلے اس کا استعمال کافی زیادہ ہوتا تھا اور طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اسے بڑے تھال میں ڈال کر درمیان سے خالی جگہ بنائی جاتی، اس میں دودھ، گھی اور چینی یا گڑ ڈالتے پھر چلو سے نوالہ سائنا کر اُسے دودھ میں ڈبو کر کھاتے۔ تحفہ میں ہے: ”وہو طبیخ يتخذ من دقيق وماء ودهن وقد يخلط ويكون رقيقاً يَحْسَى“۔ تاہم دودھ اور شہد کے ساتھ تیار ہونے والے حریرہ کو تلمینہ کہتے ہیں جیسا کہ نام سے واضح ہے کیونکہ لبن دودھ کو کہتے ہیں چنانچہ صحیحین ۱ میں تلمینہ ہی کے الفاظ آئے ہیں، یہ تلمینہ حریرہ کی ایک قسم ہے، اسی طرح ثابت ”جو“ پانی میں اُبال کر بھی حریرہ بناتے ہیں جسے ماء الشعیر کہا جاتا ہے جبکہ تلمینہ میں جو (وغیرہ) کا آٹا ہوتا ہے اور یہ قسم زیادہ مفید ہوتی ہے۔ (صرح بہ ابن القیم فی الطب النبوی)

قولہ ”لیرئو“ ای یَشُدُّ وبقوی یعنی دل کو فرحت و طاقت بخشتا ہے۔ قولہ ”یسرو“ ای یکشف ویزیل یعنی دل کی تکلیف اور درد کو زائل کرتا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ بیماری سے قوت شہوانیہ اور قوت ہاضمہ دونوں کمزور ہو جاتی ہیں اس لئے معدہ سخت اور ثقیل غذا ہضم نہیں کر سکتا بنا بریں حالت مرض اور افاقہ کی صورت میں مریض کو نرم غذا دینا ہی مناسب ہے جیسا کہ آج کل ڈاکٹر ز دودھ اور ڈبل روٹی دیے کو کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ڈبل روٹی کا وجود نہ تھا اس لئے نرم غذا کی صورت تلمینہ اور حریرہ ہی کی ہو سکتی تھی، نیز کبھی مریض اتنا لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے کہ سخت غذا کو چبا بھی نہیں سکتا چنانچہ ابن العربی نے عارضہ کے اسی باب میں اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ دشمن سے ساری رات

باب ماجاء ما یطعم المریض

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۱۵ ج: ۲ ”باب التلمینة“ کتاب الاطعمة، ایضاً زواہ فی الاشریة، صحیح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۶ ”باب التلمینة“ ابواب الطب، ایضاً مسند احمد ص: ۱۱۸ ج: ۷ حدیث: ۲۳۹۹۱، ایضاً راجع جمع الفوائد ص: ۲۵۲ ج: ۲ کتاب الطب، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

بھاگتا رہا اور سخت کوفت میں مبتلا تھا دوسرے دن ایک قلعہ میں پہنچا انہوں نے میرے سامنے روٹی اور گوشت رکھا باوجودیکہ میں ایک شب دروز سے بھوکا تھا مگر اس روٹی کے نگلنے پر قادر نہ تھا، کھانے کو حلق سے اتارنے کی غرض سے پانی پیا مگر وہ روٹی پانی میں گر گئی اور میں کھانہ سکا اگر یہ بجائے روٹی کے حریرہ ہوتا تو میں کھا لیتا۔

غرض حریرہ میں بھر پور غذا بیت بھی ہے اور نرم ہونے کی بناء پر اس کا کھانا بھی آسان ہے اس لئے مریض کے لئے مفید ہے خاص کر جب گرم ہو کیونکہ مرض کی وجہ سے حرارت غریزہ کم ہو جاتی ہے اس لئے دل متاثر اور معدہ کمزور ہو جاتا ہے، جب گرم گرم کھا لیا جائے تو اس سے حرارت غریزہ بحال ہونے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے جیسا کہ ابن القیمؒ نے طب النبوی میں اس کی تفصیل میں بیان کیا ہے، اور یہی ایک وجہ دل کے غم دور کرنے کی ہے۔ دوسری وجہ دل کو راحت پہنچانے کی یہ ہے کہ تلمینہ میں فرحت بخش ادویات کی طرح کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے دل کو سرور اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے معدہ وغیرہ اعضاء میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور چونکہ خشکی سے بے چینی جنم لیتی ہے اس لئے خشک مزاج آدمی اور بوڑھے شخص کو غصہ زیادہ آتا ہے۔ حریرہ سے نمی اور تری پیدا ہوتی ہے جس سے خشکی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ کذافی الطب النبوی لابن القیم الجوزیہ (فصل ۴۸)

باب ماجاء لاتکروا مرضاکم علی الطعام والشراب

”عن عقبہ بن عامر الجھنی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لاتکروا مرضاکم علی الطعام فان اللہ تبارک وتعالیٰ یطعمہم ویسقیہم“۔ (حسن غریب)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مریضوں کو کھانے پر مجبور مت کرو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو کھلاتا پلاتا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں بکر بن یونس بن بکر ضعیف راوی ہیں۔ تاہم امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابن ماجہؒ اور حاکم نے بھی اس کی تخریج کی ہے اس لئے اس مضمون کو قبول کرنا پڑے گا۔

باب ماجاء لاتکروا مرضاکم علی الطعام والشراب

۱۔ سنن ابن ماجہ ص: ۲۴۶ ”باب لاتکروا المریض علی الطعام“ ابواب الطب، مستدرک حاکم ص: ۳۲۶ ج: ۵

حدیث: ۸۳۳۰ کتاب الطب، ایضاً آوردہ المصنف فی کشف الاستار برقم: ۳۰۱۸ مجمع الزوائد ص: ۹۹ ج: ۵، ایضاً جمع الفوائد ص: ۲۴۶ ج: ۲ حدیث: ۷۴۷۳۔

پس اس حدیث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ مریض کو خلاف خواہش کھانے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ دوم یہ کہ اس کو من جانب اللہ کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔

پہلی بات تو بدیہی ہے کیونکہ جب کھانے کا اشتیاق نہ ہو اور اسے زبردستی کھلایا جائے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد دوبارہ کھالے اور ظاہر ہے کہ یہ کھانا کوئی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ مضر ہی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے تو اسی طرح مریض کی حرارت غریزہ کم ہونے کی صورت میں وہ کھانے کو ہضم نہیں کر سکتا۔ اگر اسے زبردستی کھلایا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بدن مزید بھاری پن اور ثقل محسوس کرے گا اور عین ممکن ہے کہ بڑا ہوا نظام ہضم مزید بگاڑ کا شکار بن جائے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو بعض شارحین نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے یعنی جس طرح کھانے پینے سے آدمی روٹی اور پانی سے بے فکر ہو جاتا ہے اسی طرح مریض بھی اس صبر کی وجہ سے جو اسے اللہ تبارک و تعالیٰ عطا فرماتا ہے کھانے پینے سے بے فکر ہو جاتا ہے اور یہی کھانے کا مقصد ہوتا ہے، لہذا تحصیل حاصل کی ضرورت نہیں۔

مگر ابن القیم طب نبوی میں لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بہت لطیف ہے اطباء کی عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ وہی سمجھے گا جو روح اور قلب کے معاملات سے پوری طرح واقف ہو، پھر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب نفس کسی امر کی طرف متوجہ ہو کر مشغول رہتا ہے تو کھانے پینے کی مانگ اور طلب ختم ہو جاتی ہے پس جب نفس کو غیر معمولی شغل اور خصوصاً نشاط پیش آئے تو وہ غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے اس سے طبیعت آسودہ ہو جاتی ہے اور ساری قوتوں میں جان آ جاتی ہے۔ (مزید تفصیل طب نبوی فصل ۳۴ میں دیکھی جاسکتی ہے)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ یہ وجہ مشاہدے کے عین مطابق ہے کہ اس کا مشاہدہ ہر دور کے آدمیوں میں کیا جاسکتا ہے، بچے سارا دن اگر کھیلتے رہیں تو ان کو اپنی بھوک اور پیاس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور اس کا ہم بچپن میں بارہا تجربہ کر چکے ہیں۔ راقم کو کئی سالوں کا تجربہ ہے کہ جب لکھنے کا کام زیادہ ہوتا ہے تو ان دنوں میں بھوک بالکل مٹ جاتی ہے اس لئے بھوک لگانے کی خاطر کبھی کبھار اس تسلسل کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ بھی تجربہ ہے کہ روزہ رکھنے سے بھوک کی تکلیف تو ہرگز نہیں ہوتی البتہ کبھی کبھی پیاس کا احساس ہوتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ، گوکہ میں اس کو بیماری سمجھتا ہوں لیکن اس بھوک نہ لگنے سے بحمد اللہ میرا کام کبھی نہیں رُکا ہے۔ عرصے سے لکھنے پڑھنے

کا کام بدستور جاری ہے۔

دنیا کے بے شمار واقعات ایسے ہیں کہ بہت سے لوگ کھانے پینے کا کام بہت کم کرتے ہیں مگر وہ اپنا روحانی کام شد و مد کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو جس طرف متوجہ کیا جائے یہ وہی کام کرتا رہتا ہے۔ عورتوں کے تصور سے عورتوں کی طلب بڑھتی ہے۔ کھانے کے تخیل سے بھوک لگتی ہے۔ اور آخرت کے تفکر سے نعمت ہائے جنت اور رضائے باری تعالیٰ کی غیر معمولی تمنا لاحق ہوتی ہے اور مادی کھانے پینے کی طلب مٹ جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی الحبة السوداء

”عن ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: علیکم بھذہ الحبة السوداء فان فیہا شفاء من کل داء الا السام، و السام الموت“۔^۱ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کلونجی کا استعمال ضرور کیا کرو کہ اس میں ہر بیماری سے شفاء ہے سوائے سام کے اور سام موت ہے۔

لغات: قولہ ”الحبة السوداء“ کلونجی کو کہتے ہیں جو عموماً اچار میں استعمال ہوتی ہے۔ ابن العربی عارضہ^۲ میں لکھتے ہیں: ”والحبة السوداء الشونیز“۔ شونیز فارسی لفظ ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے ”العرف الشذی“ میں فرمایا ہے کہ فارسی میں اس کو سیاہ دانہ بھی کہتے ہیں مگر ہندی زبان میں سیاہ دانہ ایک زہریلے بیج کو کہتے ہیں۔ قولہ ”علیکم بھذہ الحبة السوداء“ اسی باستعمال الحبة السوداء۔ قولہ ”السام“ موت کو کہتے ہیں۔

تشریح: اس حدیث سے کلونجی کا فائدہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے یعنی اللہ نے اس میں ہر بیماری سے شفاء کا اثر ودیعت فرمایا ہے البتہ اگر کوئی بیماری ایسی ہو جس سے موت مقدر ہو تو اس میں مفید ثابت نہ ہوگی کیونکہ

باب ماجاء فی الحبة السوداء

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۳۸ ج: ۲ ”باب الحبة السوداء“ کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۶ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۳۷۸ ج: ۲ حدیث: ۷۵۰۳، ۷۵۰۴، ۷۵۸۲، ایضاً جمع الفوائد ص: ۲۸۹ ج: ۲ حدیث: ۷۵۱۸، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۰۱ ج: ۵ حدیث: ۸۲۹۷۔ ۲۔ روی الطبرانی فی الاوسط عن انس بن مالک ان النبی ﷺ کان اذا اشتکی تقمح کفا من شونیز ویشرب علیہ ماء و عسلاً، مجمع الزوائد ص: ۱۰۰ ج: ۵ حدیث: ۸۲۹۵۔

اسباب تقدیر کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ تمام اسباب میں اللہ عزوجل کی یہی سنت جاریہ ہے کہ اس عالم میں اسباب کو مؤثر بنایا ہے مگر جہاں اسباب میں تضاد و تضاد آجائے تو پھر کبھی ترجیح قوت سبب کی بناء پر ہوتی ہے اور کبھی کسی مصلحت کی بناء پر یہ سبب کشاکش اس وقت ہوتی ہے جب مقررہ وقت نہیں آ جاتا۔ اجل آنے پر اسباب فیل ہو جاتے ہیں۔ (مزید تفصیل حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھی جاسکتی ہے)

اس حدیث کے مضمون میں تو کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کلونجی ایک مفید دوا ہے اور العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ابوعلی سینا نے اس کے چالیس سے زیادہ فائدے ذکر کئے ہیں۔ تاہم قابل غور صرف یہ پہلو ہے کہ یہ حدیث شریف اپنے عموم پر محمول ہے جیسا کہ الفاظ سے عموم معلوم ہوتا ہے یا مرادِ مشکلم یہاں خاص ہے؟ تو اس بارے میں شارحین حدیث کے دونوں قول ہیں۔ عام شارحین کی رائے یہ ہے کہ کلونجی چونکہ مزاج کے اعتبار سے خشک اور گرم ہے اس لئے یہ فقط ان امراض میں مفید ہے جو رطوبت اور برودت کی وجہ سے لاحق ہو جائیں اور مدینہ منورہ زاد ہا اللہ نوراً و شرفاً کے لوگوں کو اکثر اسی قسم کی بیماریاں لاحق ہوتی تھیں۔

جبکہ شارحین کا دوسرا فریق اسے عموم پر محمول کرتا ہے، لہذا اب مطلب یہ ہوگا کہ کلونجی مفید تو تمام امراض میں ہے تاہم اس کے استعمال کے طریقے مختلف ہیں، کبھی مفرد مفید ہوتی ہے اور کبھی دوسری اشیاء کے ساتھ ملانے سے فائدہ دیتی ہے لہذا اگر اس کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے جو ماہر طبیب ہی بتا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں شفاء نہ ہو، اس کے فوائد اور طرق استعمال طب نبوی لابن القیمؒ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کل کلونجی کا تیل ملتا ہے تجربے سے وہ بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

باب ماجاء فی شرب ابوالابلی

”عن انس ان ناساً من عربینہ قلموا المدینۃ فاجتروا فابغضہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اہل الصلۃ وقالوا شربوا من البانہا و ابوالہا“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء فی شرب ابواب الابل

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۶۶۳ ج: ۲ کتاب التفسیر، ایضاً أخرجه فی الجہاد باب: ۱۵۳، ولی الدیات باب: ۲۲، صحیح مسلم ص: ۵۷ ج: ۲ کتاب القسامۃ، سنن ابن ماجہ ص: ۱۸۵ کتاب الحدود، والنسائی ص: ۱۶۷ و ۱۶۸ ج: ۲ کتاب المحاربة، ایضاً مسند احمد ص: ۶۳۷ ج: ۳ جلیث: ۱۲۲۲۸، ۱۲۲۵۷ وغیرہ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ عرینہ قبیلے کے مدینہ آئے تو وہ پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے (یعنی آب و ہوا موافق نہ آئی) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو اور ان کا پیشاب بھی۔

ملفوظ:- اس حدیث کی شرح ”باب ماجاء فی بول مایکل لحمہ“ میں تفصیلاً گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص ۲۳۵ تا ۲۵۲ ج ۱)

باب من قتل نفسه بسم او غیرہ

”عن ابی ہریرۃ اراہ رفعہ قال: من قتل نفسه بحلید جاء یوم القیمۃ وحلیدتہ فی یدہ یتوجأ بہا بطنہ فی نار جہنم خالداً مُخلداً ابدًا، ومن قتل نفسه بسم فسمہ فی یدہ یتحسأ فی نار جہنم خالداً مُخلداً ابدًا“۔ اگلی حدیث جو کہ صراحۃً مرفوع ہے اس میں یہ اضافہ ہے ”ومن تردی من جبل فقتل نفسه فهو یتردی فی نار جہنم خالداً مُخلداً فیہا ابدًا“۔^۱ (حدیث صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے راوی کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ اس کو مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کہ جو شخص لوہے سے خودکشی کر لے تو وہ قیامت کے دن آئے گا دریاں حالیکہ اس کا لوہا (آگہ قتل) اس کے ہاتھ میں ہوگا وہ دوزخ میں اس کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا ہمیشہ ہمیش کے لئے (یعنی جب تک جہنم میں رہے گا یہی عمل کرتا رہے گا) اور جس نے زہر سے خودکشی کر لی تو اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ بمشکل پیتا ہی رہے گا دریاں حالیکہ وہ جہنم میں ہوگا (اور جب تک دوزخ میں ہوگا) یہ کام ہمیشہ کرتا رہے گا۔ اس کے بعد امام ترمذیؒ نے دوسری سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے وہ مرفوع ہی ہے اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جس نے کسی پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خود کو ہلاک کیا تو وہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے (پہاڑ سے) چھلانگیں مارتا رہے گا۔

لغات:- قولہ ”اراہ“ بضم الہزہ بمعنی ظن و گمان کے آتا ہے۔ قولہ ”یتوجأ“ مہموز اللام ہے وجأ

باب من قتل نفسه بسم او غیرہ

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۶۰ ”باب شرب السم والدواء بہ“ کتاب الطب، ومسلم فی الایمان حدیث: ۱۷۵، وابوداؤد فی الطب باب: ۱۱، والنسائی فی الجنائز باب: ۶۸، الترغیب والترہیب ص: ۲۰۵ ج: ۳.

سے بمعنی مارنے کے جیسے چھار مارنا یا نیزہ وغیرہ جیسا کہ حاشیہ قوت میں ہے۔ قولہ ”بھا“ منہیر حدیدہ کی طرف راجع ہے مگر مراد کہ قتل ہے خواہ چھری یا نیزہ وغیرہ ہو یا بندوق کی گولی۔ قولہ ”فسی نار جہنم“ یہ حال ہے اسی حال کو نہ فی نار جہنم یعنی ایک مصیبت آگ کی ہوگی اور دوسری مسلسل خودکشی کرتے رہنے کی۔ والعیاذ باللہ۔ قولہ ”بسم“ اس میں سین پر تینوں حرکات یعنی فتحہ، ضمہ اور کسرہ جائز ہیں۔ تاہم فتح زیادہ فصیح ہے، اس میں میم مشدد ہے۔

قولہ ”یتحساہ“ حسا یحسو مجرد سے بمعنی تھوڑا تھوڑا پینے کو کہتے ہیں جبکہ باب کی حدیث میں تاء کے اضافے سے اس میں تکلف کا معنی ادا کرنا مقصود ہے یعنی نہ چاہتے ہوئے بھی اور ننگے پر قدرت کم ہونے کے باوجود وہ مجبوراً پیتا رہے گا۔ قولہ ”ہتردی“ رذتی ہلاکت کو کہتے ہیں جبکہ رذاة چٹان کو کہا جاتا ہے۔ پس یتردی کے معنی چٹان یا کسی اونچی جگہ سے خود کو گرانے اور چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے ہوئے۔ تاہم چونکہ یہاں جبل کا ذکر بھی آیا ہے اس لئے یہاں ”ہتردی“ میں تجرید ہوگی۔

تشریح:- اس حدیث کے ظاہر سے معتزلہ استدلال کرتے ہیں جو مرتکب کبیرہ کے مٹل فی النار یعنی جہنم میں ہمیشہ پڑے رہنے کے قائل ہیں گو وہ خوارج کی طرح گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر نہیں کہتے۔

اہل السنۃ والجماعۃ چونکہ ہر مؤمن و مومنہ کی نجات کے قائل ہیں، جس کے بے شمار دلائل ہیں، اور اپنے محل میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں: مثلاً شرح عقائد، شرح مواقف وغیرہا میں، اس لئے وہ اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کرنے کے بجائے اس کی ایسی تشریح و تاویل کرتے ہیں جس سے باقی نصوص جو نجات مؤمن پر دال و صریح ہیں کا باب کی احادیث سے کسی طرح کا تعارض نہیں آتا، چنانچہ ایک مطلب تو امام ترمذیؒ نے بتلایا ہے کہ ”وروی محمد بن عجلان... ولم یذکر فیہ خالداً مٹلداً فیہا ابداً“ الخ یعنی اس روایت کے بعض طرق میں اگرچہ ”خالد الخ“ کا اضافہ ہے مگر محمد بن عجلان اور ابوالزناد وغیرہما کے طریق میں یہ اضافہ نہیں ہے۔^۱ اور اگرچہ یہ اضافہ ماننا چاہئے کہ ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے مگر یہاں یہ اصول نہیں چلتا کیونکہ پھر دوسری نصوص سے روایت باب کا تعارض آتا ہے لہذا جن حضرات نے یہ اضافہ نقل نہیں کیا ہے ان کی روایت زیادہ اصح ہے، ”وہذا اصح“ الخ۔

اس کا دوسرا جواب بصورت تسلیم اضافہ وہی ہے جس کی طرف اوپر ترجمہ کے ضمن میں اشارہ کیا گیا ہے

یعنی وہ شخص جب تک جہنم میں ہوگا تو یہ عمل جس کے ذریعہ اس نے خود کو قتل کیا ہے دہراتا رہے گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا علیٰ هذا "خالداً مخلداً کاتعلق فی نار جہنم" کے ساتھ نہیں ہے بلکہ "بتو جابہا اور یتحساه اور یتردی" کے ساتھ ہے۔ تدبر۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں اور مولانا محمد چراغ علی صاحب نے عرف میں بحوالہ شاہ صاحبؒ کے فرمایا ہے کہ ہر محل کا اپنا خلود ہوتا ہے لہذا دنیا کا خلود موت پر ختم ہو جاتا ہے اور عالم برزخ کا حشر پر، تو اسی طرح عصاة مؤمنین کے خلود سے مراد ان کے طبقہ جہنم کے خاتمے تک ہوگا۔ تدبر ثانیاً

راقم کے نزدیک یہ جواب پہلے سے بھی زیادہ صحیح ہے کہ اس سے بہت ساری نصوص کا مطلب سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے اور کسی طرح کا اشکال بھی وارد نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی جوابات دیئے گئے ہیں: مثلاً یہ حکم حلال سمجھنے والے کا ہے یا تہدید پر محمول ہے یا خاصیت المفرد ہے وغیرہ وغیرہ۔

تنبیہ:- صاحب تحفۃ الاحوذی نے امام ترمذیؒ کے جواب کا مطلب یہ لیا ہے کہ گویا امام ترمذیؒ اس زیادتی کو راوی کے وہم پر محمول کرتے ہیں اور پھر امام ترمذیؒ پر "زیادة الشقة مقبولة" سے اعتراض کر کے ان کے جواب کو رد کر دیا ہے۔

لیکن راقم کے نزدیک امام ترمذیؒ کے قول کا صحیح مطلب وہی ہے جو اوپر پہلے نمبر پر بیان ہوا فلا اشکال۔ خودکشی حرام ہے:- اس حدیث اور اسی طرح کی دیگر نصوص سے کہ بموجب خودکشی کی حرمت پر اتفاق ہے اور یہ کہ خودکشی گناہ کبیرہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح دوسرے کی جان لینا جائز نہیں، اسی طرح اپنی جان کی حفاظت بھی فرض ہے، کسی کو اپنے نفس کا کلی اختیار حاصل نہیں، نہ کوئی عورت زنا میں آزاد ہے، اور نہ ہی کوئی شخص اپنی جان کا مالک ہے۔ اور اگر مالک بھی ہے تو مجازاً محدود پیمانے پر، پس جتنی اجازت شریعت کی طرف سے ہے اس سے آگے کوئی اختیار نہیں، لہذا جہاں کسی کو غلام بنانا اور بیچنا جائز ہے تو وہ اس میں آزاد ہے اور جس کو فروخت کرنا ممنوع ہے جیسے خر تو وہ ناجائز ہے، خودکشی کرنے والا اپنے اختیار سے غیر معمولی تجاوز کرتا ہے جو سنگین جرم ہے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ خودکشی کرنے والا گویا تقدیر سے بھاگتا ہے کہ وہ دنیوی تکالیف پر صبر نہیں

۳ کماورد فی ابی داؤد: من حسا سماً فی یدہ یتحساه فی نار جہنم خالداً مخلداً فیہا ابداً ص: ۱۸۵ ج: ۲ "باب فی الادویۃ المکروہۃ" کتاب الطب، ایضاً سنن نسائی ص: ۲۷۹ ج: ۱ ابواب الجنائز.

کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خودکشی سے جان چھوٹ جائے گی تو جس طرح دنیاوی تکلیفات سے تنگ آ کر دعائے موت جائز نہیں اسی طرح خودکشی بھی جائز نہیں۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خدا تعالیٰ کے فیصلے پر مطمئن نہیں، اس لئے گویا اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے جبکہ رضا بر قضا واجب ہے تاہم شدید ذہنی دباؤ اور ٹینشن کی وجہ سے اگرچہ وہ اس عمل سے کافر نہ کہلائے گا جب تک کہ حلال نہ سمجھنے لگے مگر قلبی تصدیق کے باوجود یہ عمل انتہائی قبیح ہے۔

چوتھی وجہ: یہ ہے کہ وہ اپنے پسماندگان کو غم اور صدمے سے دوچار کرتا ہے جبکہ ایذائے مؤمن اور خصوصاً والدین و اقارب کی حرام ہے۔ وغیرہ ذالک من الوجوه

تاہم اگر ایک آدمی کسی نیک غرض سے خودکشی کرے جیسے آج کل کے خودکش حملے تو کیا وہ بھی عین خودکشی محرم کے حکم میں ہے؟ تو اس بارے میں علمائے وقت کی آراء مختلف ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ مسئلہ بہت مشکل ہے کہ اگر اس کی اجازت دی جائے تو ایک تو اس کی کوئی واضح دلیل نہیں۔ دوم اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے۔ اور آج کل کوئی ہفتہ خودکش حملے سے خالی نہیں گذرتا ان میں نانوے (۹۹) فیصد بلکہ تمام تر حملوں میں بڑی تعداد میں شہری ضرور ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف کفار کے پاس ہر قسم کے وسائل ہیں ان کے آگے نہتے مسلمانوں اور مجاہدین کا جتنا تقریباً ناممکن ہے، اگر اس عمل کی اجازت نہ دی جائے تو ان کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟؟؟

حدیث آخر:۔ ”عن ابی ہریرۃ قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الدواء العیث یعنی السم“۔^۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبیث دواء سے منع فرمایا ہے یعنی زہر سے۔

لغات:۔ قولہ ”الدواء العیث“ یہ لفظ عام ہے مطلق گندی اور حرام ادویات پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر راوی نے اس کی تفسیر زہر سے کی ہے، لہذا اس پر حمل کرنا اولیٰ ہے۔ پھر یہ کس راوی کی تفسیر ہے؟ تو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہو یا کسی اور کی ہو۔

تشریح:۔ پھر ادویات کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ نجس، حرام اور مستفاد چیزیں یعنی جن سے

۱۔ ایضاً رواہ ابوداؤد ولفظہ: نہی رسول اللہ ﷺ من الدواء العیث ص: ۱۸۵ ج: ۲ کتاب الطب، جمع الفوائد

طبیعت گھسن کرتی ہے بلا ضرورت استعمال نہیں کی جانی چاہئے خصوصاً کھانے میں تو ہرگز استعمال نہ کی جائیں جبکہ بعض دیگر صورتوں میں مباح اور جائز الاستعمال ہیں جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا۔ زہر میں بھی اگر شفاء اغلب ہو تو جائز ورنہ نہیں۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التداوی بالمسکر

”عن سماك انه سمع علقمة بن وائل عن ابيه انه شهد النبي صلى الله عليه وسلم وسأله سويد بن طارق او طارق بن سويد عن الخمر فنهاه عنه فقال إن التداوی بها، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنها ليست بدواء ولكن هاداء“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے تو (اسی اثناء میں) سويد بن طارق نے یا طارق بن سويد نے (راوی کو شک ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خمر (شراب) کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا، انہوں (طارق) نے کہا کہ ہم اس کو بطور علاج معالجہ کے استعمال کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دواء نہیں بلکہ داء یعنی بیماری ہے۔

تشریح:- حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کرنے والے صحابی کا نام کیا ہے؟ تو اس بارے میں اختلاف ہے جیسا کہ اس روایت میں راوی کے شک کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے۔ ابوداؤد^۲ کی روایت بھی شک کے ساتھ ہے۔ امام بخاری نے بھی تردد کا اظہار کیا ہے^۳ مگر راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح طارق بن سويد ہے۔ اور ابوداؤد میں اسی کو مقدم ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ^۴ نے بھی طارق بن سويد ہی ذکر کیا ہے یعنی بلا شک و تردد کے۔ (کذا فی البذل ص: ۵۵ ج: ۶)

چونکہ عربوں کی اکثریت کے نزدیک شراب کو شفاء کا سبب مانا جاتا تھا اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نظریے کی تردید فرمائی کہ ”انہا ليست بدواء ولكن هاداء“۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التداوی بالمسکر

۱۔ روی بمعناه ابوداؤد ص: ۱۸۵ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً رواہ مسلم بحوالہ جمع القوائد ص: ۲۵۲ ج: ۲ حدیث: ۷۵۵۰۔ ۲۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۵ ج: ۲ کتاب الطب۔ ۳۔ ایضاً صحیح مسلم ص: ۱۶۳ ج: ۲ کتاب الاشربة۔ ۴۔ کذا فی سنن دارمی حاشیہ: ۱ ص: ۱۵۳ ج: ۲ حدیث: ۲۰۹۵ کتاب الاشربة۔

شراب ہو یا کوئی اور نجس چیز حالت اضطرار میں اس کا استعمال بغرض جان بچانے کے بالاتفاق جائز ہے مثلاً کسی کا لقمہ گلے میں پھنس جائے اور کوئی پانی وغیرہ مانع چیز اس کو اتارنے اور نکلنے کی نہ ملے ہو اور جان کو خطرہ ہو تو اسے اتارنے کے لئے شراب کا گھونٹ بقدر ضرورت پینا جائز ہے۔ اس میں ابن قاسم کے علاوہ کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے بلکہ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کہ جان بچانا ضروری ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: ”وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرَرْتُمْ عَلَيْهِ“۔ (انعام آیت ۱۱۹) اس میں ”ما“ کا کلمہ عام ہے تمام انجاس و محرمات کو شامل ہے۔ (کذا فصلہ النووی فی ”المجموع“ و شرح مسلم، وابن العربی فی العارضة الاحوذی وغیرہما)

پھر ابن العربیؒ نے اس بارے میں سخت موقف اپناتے ہوئے لکھا ہے: ”لَا مَنْفَعَةَ فِيهَا“، یعنی شراب میں کسی طرح کا فائدہ نہیں ہے، گویا وہ اس حدیث کے الفاظ ”أَنْهَ الْيَسْتِ بَدَءَ“ سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ نکرہ فی سیاق اللفظی عموم کے لئے آتا ہے، مگر قرآن کا ظاہر اس موقف کی نفی کرتا ہے ”قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا“۔ (البقرة آیت: ۲۱۹) اس لئے کہا جائے گا کہ شر میں کچھ جسمانی اور وقتی فائدے ہو سکتے ہیں مگر اس کے نقصانات اور خصوصاً دینی و روحانی مضرتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے فوائد بچ ہو جاتے ہیں کیونکہ جہاں فوائد و نقصانات جمع ہو جائیں تو اکثر حکم اغلب پر مبنی ہوتا ہے۔ اور جہاں تک حدیث الباب کا تعلق ہے تو اس نفی کی وجہ سے ذرائع اور حرم باب ہے، کیونکہ عرب اس کو شفاء کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

اس مسئلے کی کچھ وضاحت ”باب ماجاء فی بول ما یوکل لحمہ“ میں بھی گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات

ترمذی از ص: ۲۴۷ تا ص: ۲۵۱ ج: ۱)

پھر بذل المجہود میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس قسم کی احادیث سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ حرام اشیاء سے کسی طرح کی تدوی جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ حکم عدم حاجت کی صورت پر محمول ہے یعنی جب ضرورت نہ ہو حرام و نجس کی، یا ضرورت تو ہو مگر متبادل کا انتظام ہو سکتا ہو، جب کوئی چارہ نہ رہے تو پھر نشہ آور اشیاء کے علاوہ دیگر نجاستوں کا بطور علاج استعمال جائز ہے، نیز تدوی بالمحرم کی نفی اس جہت سے مقید ہے جس جہت سے اس کی حرمت معتبر ہو مثلاً کسی چیز کا کھانا حرام ہو تو اس کو کھانے کے طور پر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا (یعنی حالت اختیار میں اور بغیر ضرورت کے جبکہ جسم کے ظاہری حصہ پر لگانا ممنوع نہ ہوگا) اور جن اشیاء سے مطلقاً منع آیا ہو جیسے خمر، خنزیر اور میوہ تو ان کا استعمال بہر صورت ممنوع ہے۔ الخ (بذل المجہود ص: ۴۰ ج: ۶)

در مختار میں ہے:

”وَجَوَزَ ابُو الْلَيْثِ بَيْعَ الْحَيَاتِ اِنْ اَنْتَفَعَ بِهَا فِي الْاَدْوِيَةِ وَالْاَلَاوَرْدَةِ فِي الْبَدَائِعِ بَاَنَّهُ

غَيْرِ سَدِيدٍ لِأَنَّ الْمَحْرَمَ شَرْعًا لَا يَجُوزُ الْاَنْتِفَاعُ بِهِ لِلتَّدَاوِي كَالْحَمْرِ“ الخ۔

اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ نے اپنے حاشیہ رد المحتار میں تدوی بالحرم کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے:

”قَالَ فِي النِّهَايَةِ وَفِي التَّهْذِيبِ يَجُوزُ لِلْعَلِيلِ شَرْبُ الْبُولِ وَالدَّمِ وَالْمَيْتَةِ لِلتَّدَاوِي

اِذَا أَخْبَرَهُ طَبِيبٌ مُسْلِمٌ أَنَّهُ فِيهِ شِفَاءٌ ۖ وَلَمْ يَحْدِثْ مِنَ الْمَبَاحِ مَا يَقُومُ مَقَامَهُ ۖ وَانْ قَالَ

الطَّبِيبُ يَتَعَجَّلُ شِفَاءً لَّكَ بِهِ فِيهِ وَجْهَانِ وَهَلْ يَجُوزُ شَرْبُ الْعَلِيلِ مِنَ الْخَمْرِ

لِلتَّدَاوِي ؟ فِيهِ وَجْهَانِ ، كَذَا ذَكَرَهُ الْإِمَامُ التَّمْرَتَاشِيُّ ۖ وَكَذَافِي الذَّخِيرَةِ ۖ وَمَاقِيلِ

اِنْ اَلَا يَجُوزُ اِذَا لَمْ يَعْلَمْ اِنْ فِيهِ شِفَاءٌ ۖ اِمَّا اِنْ عَلِمَ وَلَيْسَ لَهُ دَوَاءٌ غَيْرُهُ يَجُوزُ“ الخ۔

(ص: ۲۳۸ ج: ۵، باب المحرفات من الميوع، ایچ ایم سعید کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ اضطراری حالت میں ہر محرم جائز ہے، جبکہ نارمل حالت میں کسی محرم کا استعمال جائز

نہیں جبکہ ضرورت کی صورت میں خمر، خنزیر یا دیگر مسکرات کے علاوہ باقی محرّمات و نجاسات جائز ہیں جبکہ خمر میں

دو قول ہیں: رائج عدم جواز ہے، باقی مسکرات میں تخفیف ہے۔

باب ماجاء فی السعوط وغیرہ

”عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنْ خَيْرٌ مَا تَدَاوِيْتُمْ بِهِ السَّعُوطُ

وَاللَّدُودُ وَالْحَمَامَةُ وَالْمَشْيُ فَلَمَّا اشْتَكَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَدَّهُ اصْحَابُهُ فَلَمَّا فَرَّغُوا

قَالَ لَّهُمْ قَالَ فَلْتُوا كُلَّهُمْ غَيْرَ الْعَبَّاسِ“۔^۱

باب ماجاء فی السعوط وغیرہ

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً بخاری ص: ۸۵۱ ج: ۲ ”باب اللدود“ کتاب الطب، ایضاً أخرجه فی المغازی ص: ۸۳ وفی

البدایات باب: ۲۱، ۱۴ وصحیح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ کتاب السلام، مستدرک احمد ص: ۷۹ ج: ۷ حدیث: ۲۳۷۳۲،

۲۶۹۳۲، ۳۳۳۳۹ جمع الفوائد ص: ۲۳۶ ج: ۲۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم جو دوائیں لیتے ہو ان میں سحوط ولد و دوجامت اور مشی بہت اچھی ہیں، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنس نفیس بیمار ہوئے تو صحابہ کرامؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (بلا اجازت) دوا پلا دی، چنانچہ جب وہ فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سب کو دوا پلا دو، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان تمام شرکاء کو دوا پلا دی گئی سوائے عباسؓ کے۔

لغات:- قولہ ”السعوط“ بروزن رسول، ناک میں ڈالنے والی دوا جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مریض کو چت لٹا کر اس کے دونوں شانوں کے درمیان کوئی چیز رکھتے ہیں تاکہ سر نیچے رہے پھر اس کی ناک میں دوا آلود پانی یا تیل ڈالتے ہیں تاکہ اسے چھینک آئے، اور اس سے دماغ کھل جائے۔ قولہ ”لدود“ یہ بھی رسول کے وزن پر ہے، وہ دوا جو منہ میں ایک جانب ڈالی جائے اور اگر گلے میں یا منہ کے درمیان میں پکا دے تو اسے دجو رکھتے ہیں۔ قولہ ”جسامة“ بکسر الحاء پچھنے اور سیگی لگوانے کو کہتے ہیں جسے احتجام بھی کہا جاتا ہے۔ قولہ ”المشی“ بفتح المیم و کسر الشین وتشدید الیاء، مشی سے ماخوذ ہے ہر مسہل و دست آور دوا کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بار بار قضائے حاجت کے لئے جانے پر مجبور کرتی ہے۔ قولہ ”اشتکی“ ای مرض۔

تشریح:- سحوط اور لدود کرنا دونوں قدیم زمانے کے علاج معالجے کے اہم طریقے تھے گو کہ آج بھی ناک اور منہ میں ڈالنے کے قطرے رائج ہیں لیکن ان میں کسی مخصوص جانب سے ڈالنے کو اہمیت نہیں دی جاتی، جبکہ پچھنے لگوانے اور دست آور دویات کا استعمال آج بھی مروج و معروف ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے لدود کا مندرجہ بالا فائدہ ملحوظ رکھتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض وصال میں دوا پلا دی۔ بعض روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے ان کو منع فرمایا مگر وہ یہ سمجھے کہ یہ بھی تشریحی نہیں بلکہ طبعی ہے کیونکہ تقریباً ہر مریض طبعا دوا کو ناپسند کرتا ہے جبکہ یہ بھی تشریحی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ بمنزلہ نص کے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی بات اس بناء پر تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہو چکا تھا کہ اس مرض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہونے والا ہے، ایسے میں علاج کا کوئی فائدہ نہیں رہتا بلکہ بعض علماء نے کراہیت علاج کی تصریح کی ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اسے ذات الحبب کی بیماری سمجھ کر لدود کو تجویز کر رہے تھے حالانکہ یہ وہ بیماری نہ تھی، بناء بر ہر تقدیر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افاقہ ہوا تو فرمایا کہ ان سب کو لدود کیا جائے سوائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے۔ چنانچہ جتنے بھی صحابہ اس وقت گھر میں موجود تھے سب کو لدود کیا گیا

حتیٰ کہ بعض امہات المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی دوا پلا دی گئی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ قیامت کے دن ان کی گرفت نہ ہو جائے اور یہ کہ اللہ کی ناراضگی سے محفوظ ہوں۔ عارضۃ الاحوزیٰ میں ہے: ”لَسَلَايَاتُونَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَعَلَيْهِمْ حَقٌّ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَدْرِكُهُمْ عَطَبٌ عَظِيمٌ“۔ اس لئے جب ماں باپ کو اپنے بچوں پر غصہ آجائے تو ان کو کچھ نہ کچھ عملی سزا دینا مناسب ہے تاکہ وہ اللہ کی ناراضگی سے بچیں، اگر کوئی یہ کہے کہ معافی بھی تو ہو سکتی تھی، تو اس کا جواب ابن العربیؒ نے دیا ہے کہ معافی میں ایک فائدہ ہوتا یعنی اللہ کی ناراضگی سے حفاظت جبکہ لدود کرنے میں دو فائدے ہوئے، ایک غلطی کا ازالہ، اور دوم تادیب: ”فَانْ قَبِلْ فَهَلْ اَعْفَا عَنْهُمْ؟ قُلْنَا ارَادَ أَنْ يُوَدِّبَهُمْ لِنَلَايَعُوْا دَوَالِي مَثَلَهَا فَيَكُونُ لَهُمْ اَدْبًا وَقَصَاصًا فَتَكُونُ فَائِدَتَيْنِ وَذَلِكَ خَيْرٌ مِنْ وَاحِدَةٍ“۔ (عارضۃ الاحوزیٰ)

یہاں یہ اشکال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو اجتہادی غلطی تھی جس پر مواخذہ نہیں ہوتا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ شارع کی موجودگی میں اجتہاد معتبر نہیں، ہاں البتہ صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ان کی غیر موجودگی میں اجتہاد کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ کو اس تقریر میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ اگرچہ بعض روایات کے مطابق انہوں نے اس عمل کا حکم دیا تھا مگر لدود کرنے کے وقت موجود نہ تھے تو وہ متسبب تھے مگر مباشر نہیں تھے اور جب مباشر موجود ہو تو متسبب کا مواخذہ نہیں ہوتا ہے۔

بعض نے جواب دیا ہے کہ ان کو تادبا چھوڑا یا وہ روزے سے تھے لیکن حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں ان دونوں کو رد کیا ہے۔ واللہ اعلم

باب کی دوسری حدیث:۔ ”عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان خير ما تداوitem به اللدود السعوط والحمامة والمشى وخير ما اکتحلتم به الاثمد فانه يحلو البصر وينبت الشعر قال وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم له مكحلة يكتحل بها عند النوم ثلاثا في كل عين“۔^۱ (حسن غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جو دوائیں استعمال کرتے ہو ان میں لدود و سعوط و حمامت اور مشی بہتر ہیں، اور جو سرمہ تم استعمال کرتے ہو اس میں سب سے اچھا ”اثمد“ ہے کیونکہ وہ نگاہ کو تیز کرتا ہے اور پلکوں کے بال اُگاتا ہے (ابن عباس) فرماتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سرمہ دانی تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ لگاتے۔

لغات:- قولہ ”اشمد“ بکسر الهمز وواو المیم وینھما ثاء ساکنہ، کالے سرے کو کہتے ہیں خواہ اصفہان کا ہو یا حجاز مقدس کا، تاہم حجاز میں جو پتھر اس کا ہوتا ہے وہ سرخی مائل ہوتا ہے مگر اصفہان کا پتھر زیادہ عمدہ ہوتا ہے کہ کالا ہے۔ قولہ ”مکحله“ بضم المیم والحاء وینھما کاف ساکنہ، اصل میں آلہ کا صیغہ ہے جو سلائی کو کہتے ہیں مگر خلاف القیاس یہ سرمہ دانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور یہاں یہی مراد ہے۔ قولہ ”یکحل بہا“ ای منہا، لہذا باء بمعنی من کے ہے جیسا کہ شکل کی روایت میں ”منھا“ ہی ہے۔

تشریح:- اس مسئلے کی وضاحت ابواب اللباس میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ج: ۵ ص: ۵۶۵ ”باب ماجاء فی الاستحالة“)

یہاں اس بحث کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔ سرمہ سفید بھی ہوتا ہے اور کالا بھی جبکہ بعض کالا سرخی مائل بھی ہوتا ہے گوکہ استعمال ان سب کا جائز ہے مگر کالا زیادہ مفید ہے جیسا کہ حدیث الباب میں ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق سرے میں چاندی کی آمیزش ہوتی ہے جو جراثیم کش ہے اس لئے سرے کے استعمال سے آنکھوں کا فاسد مادہ باہر نکل آتا ہے، پھر سیاہ رنگ روشنی کے تمام رنگوں کا انجذاب کرتا ہے جو بصارت میں کلیدی کردار کا حامل ہے کہ دیکھنا روشنی جذب کرنے سے عبارت ہے۔ راقم نے ”شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت“ نامی کتاب میں اس کی پوری وضاحت پیش کی ہے۔

سرمہ زینت کے لئے استعمال کرنا بھی جائز ہے اور بطور دوا کے بھی، تاہم بطور نفع رات کو استعمال مفید تر ہے کہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سرمہ سرایت کر کے پورا اثر دکھاتا ہے مگر مردوں کو زینت سے پرہیز کرنا چاہئے، جبکہ عورتوں نے آج کل جو رواج بنایا ہے کہ سرمہ لگا کر بازار میں چلتی ہیں باقی چہرہ ڈھانپ لیتی ہیں اور آنکھیں دکھاتی ہیں یہ عمل شیطانی حرکت سے کم نہیں کہ ایسی حالت میں پلکیں دلوں کو ایسے جھپتی ہیں جیسے تیر نشانہ کو چیرتے ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کرنا لازمی ہے، اگر عورتیں اس سے اجتناب نہ کریں تو مرد اپنی نگاہیں پست رکھیں تا کہ وہ کسی فتنے کا شکار نہ ہوں ورنہ وہ خود اپنے ذمہ دار ہوں گے۔

پھر سرمہ لگانے کی کوئی خاص ترتیب نہیں مگر بہتر و مستحب یہ ہے کہ طاق عدد اور داہنی آنکھ سے شروع کا اہتمام کیا جائے کہ پہلے دائی میں تین پھر بائیں میں تین سلائی پھیر دے یا پہلے داہنی میں ایک پھر بائیں میں

کے جنت میں داخل ہوں گے، ”ہم الذین لایسترقون ولا یطیرون ولا یتکونون وعلی ربہم یتوکلون“۔^۱ جبکہ اگلے باب میں اور بعض دیگر روایات میں اس کی اباحت معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔

”عن جابر قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی ابی بن کعب طبیباً فقطع منہ عرقاً ثم کواه“۔ (رواہ ابن ماجہ و احمد و مسلم)

ان روایات کو متعدد طریقوں سے جمع کیا گیا ہے: ایک یہ کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل ثابت ہے جیسا کہ اگلے باب میں ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ثابت ہے تو وہ رگ کے خون روکنے کی غرض سے تھا جبکہ نبی کی روایات تداوی کی صورت پر محمول ہیں کہ جب عرب اس عمل کو موثر سمجھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، گویا نہی تنزیہ کے لئے ہے، یا مطلب یہ ہے کہ اس کو ہر بیماری کے لئے مفید نہ سمجھا جائے بلکہ یہ مخصوص امراض میں مفید ہو سکتا ہے عام نہیں ہے۔ یا بطور حفظ ماقدم کے اوپر محمول ہے، یہ تینوں توجیہات ابن العربی نے عارضہ میں بیان کی ہیں، حاشیہ ترمذی میں بھی یہی بات کی گئی ہے۔

اس بارے میں دوسری تطبیق یہ ہے کہ جواز کی روایات ضرورت پر محمول ہیں جبکہ نبی کی روایات عدم ضرورت پر، اللکوب الدرری میں اسی کو لیا ہے۔ علیٰ ہذا حضرت عمران بن حصینؓ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ضرورت کے موقع محل کو سمجھ نہ سکے، اس لئے ہم کامیاب نہ ہوئے یعنی ایسے موقع پر داغ لگوا لئے جس کی ابازت نہ تھی جس کا علم پہلے سے نہ تھا بعد میں ہوا۔

بعض روایات کے مطابق اس عمل سے ان کی بیماری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اس لئے انہوں نے کامیابی کی دو مرتبہ نفی کی یعنی پہلی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بیماری ٹھیک نہیں ہوئی، اور دوسری میں یہ کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے جبکہ حدیث کا صحیح مطلب اور محل و موقع سمجھنا بڑی کامیابی ہے، ترجمہ میں اسی توجیہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاہم حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت تھانوی صاحبؒ نے ایک اور حدیث کی روشنی میں یہ مطلب لیا ہے کہ حضرت عمرانؓ سے فرشتے ملتے اور سلام کرتے تھے جب انہوں نے داغ

۱۔ رواہ احمد فی مسندہ ص: ۶۱۲ ج: ۵ حدیث: ۱۹۳۶۳، ایضاً ص: ۴۳۸ ج: ۱ حدیث: ۲۳۳۳ و ۳۷۹۶۔

۲۔ رواہ مسلم ص: ۲۲۵ ج: ۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۹ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۲۵۵ ج: ۴۔

حدیث: ۱۳۹۷۰۔

دو یا تین پھر اخیر ادا ہنی میں ایک تاکہ اس سے ابتداء بھی ہو اور اسی پر انتہاء بھی ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔
 قوله ”وہو حدیث عباد بن منصور“ یعنی باب کی دونوں حدیثیں ایک ہی درجے کی ہیں یعنی حسن غریب، کیونکہ دونوں میں مدار سند عباد بن منصور ہیں۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الکی

”عن عمران بن الحُصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نهی عن الکی فابتلینا فاکتوبینا فما افلحنا ولا انجحنا“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داغ دینے سے ممانعت فرمائی ہے مگر جب ہم (بیماری میں) مبتلا ہوئے تو ہم نے داغ لگوا لئے پس نہ تو ہم (علاج میں) کامیاب ہوئے اور نہ ہی (اس سے بچنے میں) مقصد کو پہنچے۔

لغات:- قوله ”الکی“ اکتوی مطاوع نحوی اور کواہ الکیۃ وکتبا، گرم لوہے یا پتھر وغیرہ سے جسم کے کسی حصے کو داغ دینے کو کہتے ہیں، تاہم یہ عمل کپڑے یا مخصوص قسم کی گھاس سے بھی کیا جاتا ہے۔
 قوله ”فما افلحنا ولا انجحنا“ لغوی اعتبار سے دونوں کے معنی کامیابی کے آتے ہیں، تاہم ”افلح“ کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں عموماً اخروی نعمتوں کے حصول میں کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں حدیث میں معنی لغوی مراد ہے۔ کمایا آتی شرحہ

تشریح:- آگ سے داغ دینے سے نہی کے بارے میں متعدد روایات ثابت ہیں ازاں جملہ ایک روایت باب کی بھی ہے، ایک اور روایت میں ہے: ”نهی عن الکی“۔ ایک حدیث میں ہے: ”من اکتوی او استرقی فقد برئ من التوکل“۔ (رواہ الترمذی^۲) ایک اور روایت میں ہے کہ ستر ہزار آدمی بغیر حساب

ع وعن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ کان اذا اکتحل جعل فی العین الیمنی ثلاثاً و فی العین الیسری مرو دین وجعلها و تراً، رواہ الطبرانی فی الکبیر برقم: ۳۶۳/۲ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۱۳ ج: ۵ حدیث: ۸۳۵۶۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الکی

۱۔ روی بمعناه صحیح بخاری ص: ۸۳۸ ج: ۲ کتاب الطب، سنن ابی داؤد ص: ۱۸۳ ج: ۲ ”باب فی الکی“ کتاب الطب، سنن ابی ماجہ ص: ۲۴۹ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۵۸۹ ج: ۵ حدیث: ۱۹۳۳۰۔
 ۲۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۴۹ ”باب الکی“ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۳۰۳ ج: ۵ حدیث: ۱۷۷۱۵۔

لگوا دیئے تو وہ سلسلہ رک گیا پھر جب انہوں نے اس سے توبہ کر لی تو بفضلہ تعالیٰ وہ مبارک سلسلہ پھر شروع ہوا جیسا کہ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، علیٰ هذا ”ولا نأجحنہ“ میں اسی حسرت کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاج میں بہت زیادہ غلو کی ضرورت نہیں ہے جہاں تک ممکن ہو الاہل فالاہل پر اکتفاء کر لینا چاہئے، ہاں جہاں ضرورت پڑے گی تو حسب ضرورت مہنگا اور مشکل علاج مباح ہوتا جائے گا حتیٰ کہ بعض صورتوں میں مکروہات پھر محرّمات اور حالت اضطراری میں تمام ممنوعات خواہ مسکرات ہی کیوں نہ ہوں حلال ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

”عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کَوَىٰ سعد بن زرارۃ من الشوكة“۔ (ہذا حدیث حسن غریب وقد اخرجہ الطحاوی فی معانی الآثار^۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن زرارہ کو سرخ پھنسی کی وجہ سے داغ لگایا... (یا لگوا یا)۔

لغات:- قولہ ”من الشوكة“ بفتح الشین طاقت اور دبدبہ کو بھی کہتے ہیں اور نوکیلی چیز جیسے کانٹے اور ہتھیار وغیرہ کو بھی کہتے ہیں چونکہ ان چیزوں میں تکلیف ہوتی ہے اس لئے جسم پر سرخ پھنسیوں کو بھی کہتے ہیں کہ یہ سخت دہ تکلیف ہوتی ہیں۔

تشریح:- سعد بن زرارہ یہ لفظ ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ بھی مروی ہے یعنی اُسعد جبکہ زرارہ میں زاء مضموم ہے، امام ترمذیؒ کا مقصد بیان جواز ہے جس کی وضاحت سابقہ باب میں گذری ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

۱۔ ایضاً اخرجہ الطبرانی فی الکبیر برقم: ۵۵۸۳ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۱۶ ج: ۵ کتاب الطب، مسند احمد ص: ۱۳ ج: ۵ حدیث: ۱۶۱۸۲۔

باب ماجاء فی الحجامة

”عن انس قال كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحتجم فی الاخذعین والکاهل وکان یحتجم لسبع عشرة وتسع عشرة واعدی وعشرين“۔^۱ (ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم گردن کی دونوں جانب کی رگوں میں پھنچنے لگواتے اور کندھے (کی رگ کاہل) پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سینگی لگواتے سترہ تاریخ کو، اور انیس اور اکیس کو۔

لغات:- قولہ ”الحجامة“ بکسر الحاء سینگی اور پھنچنے لگانا، سینگی دراصل سوراخ کیا ہوا سینگ ہوتا ہے جسے بدن کے کسی حصے پر رکھ کر منہ سے خون چوسا جاتا ہے جس سے جسم کی گرمی اور فاسد خون باہر نکل جاتا ہے، آج کل سرنج کی طرح ایک آلہ دستیاب ہے جس کے ذریعہ یہ عمل آسانی ہوتا ہے۔ قولہ ”الاخذعین“ گردن کی دونوں جانبوں کی دو رگوں کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الکاهل“ دونوں شانوں کے مابین کر کے اوپر والے حصہ کی رگ کو کہا جاتا ہے۔

تشریح:- اچھی صحت وہ ہوتی ہے جو اعتدال اخلاط کے ساتھ ہو، جب چار اخلاط یعنی سوداء خون، بلغم اور صفراء میں کسی ایک کا اعتدال ختم ہو جائے تو بدمذہ مریض بن جاتا ہے پس اگر کوئی عنصران میں سے اپنی مقدار سے کم ہو جائے تو اس کا تذکرہ مناسب کھانے پینے یا ادویات سے ہوتا ہے جبکہ زیادتی کی صورت میں اس کے اخراج کی ضرورت پڑتی ہے، جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خون کے اخراج کے لئے پھنچنے لگوائے جائے اور باقی کے اخراج کے لئے اسہال کرانا ہے۔ (طب نبوی فصل: ۴)

پھنچنے لگوانے کے فوائد کافی زیادہ ہیں، تاہم وقت اور مقام کا لحاظ رکھنا اس کے لئے بہت اہم ہے، گرم علاقوں کے لوگوں کے لئے گرمیوں کے موسم میں یہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام سانسی اصول کے مطابق کہ حرارت سے شئی پھیل جاتی ہے جبکہ برودت سے سکڑ جاتی ہے، گرم علاقے میں خون میں شدت آتی ہے خصوصاً گرم موسم میں اس لئے خون کا اخراج مفید رہتا ہے، آج کل بلڈ پریشر وغیرہ جیسے امراض کی

باب ماجاء فی الحجامة

۱۔ راجع للاحادیث حول عنوان الحجامة سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۱ کتاب الطب، مجمع الزوائد ص: ۱۰۴

ج: ۱۰۹، جمع الفوائد ص: ۲۳۸، ۲۳۷ ج: ۲ کتاب الطب، سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۸، ۲۳۹ ابواب الطب.

شکایت عام ہے، یہ خون کی بے اعتدالی ہی کی وجہ سے تو ہے۔

تاہم مذکورہ قاعدے کی بناء پر ٹھنڈے علاقوں کے لوگوں کے لئے اور خصوصاً جسم کے اندر دینی امراض کے ازالے کے لئے فصد یعنی رگ کا خون نکالنا زیادہ مفید ہے کہ گرمی سے خون جلد کی طرف آ جاتا ہے مگر ٹھنڈی وجہ سے وہ رگوں میں ہوتا ہے اور جلد سخت اور مسامات بند رہتے ہیں۔ (تذبر) سر کی بیماریوں کے لئے گردن کی رگ میں مفید ہے جیسا کہ حدیث باب میں گردن کی رگ کا ذکر ہے۔

پھر چونکہ خون کامدّ و جزر سے تعلق ہے روشنی تیز ہونے کی صورت میں اس میں زیادتی آتی ہے اس لئے سب سے اچھا وقت قمری مہینے کا نصف آخر خصوصاً تیسری چوتھائی نہایت مفید ہے۔ بعض حضرات نے بروز ہفتہ، بدھ اور جمعہ کو کچھ لگوانا مضر قرار دیا ہے۔

دوسری حدیث:- ”عباد بن منصور قال سمعت عكرمة يقول كان لابن عباس غلّمة ثلاثة حمامون فكان اثنان يغفلان وواحد يحجّمُهُ ويحجّم اهلَهُ قال وقال ابن عباس قال نبی اللہ نعم العبد الحجام يذهب بالدم ويُنخِفُ الصّلب ويحلّو عن البصر وقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حين عرج به ”مامرّ علیّ“ ملاً من الملائكة الا قالوا اعليك بالحمامة وقال: ان خير ما تحت حِمْون فيه يوم سبع عشرة ويوم تسع عشرة ويوم احدى وعشرين، وقال: ان خير ما تداو بتم به السعوط واللّدود والحمامة والشمشي وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لذّہ العباس واصحابه فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من لذّني؟ فكلّهم امسكوا فقال لا يبقى احدم من في البيت الا لذّ غير عمه العباس، قال النضر اللدود الوُجور“۔ (حدیث حسن غریب)

حضرت عبادہ بن منصور فرماتے ہیں کہ میں نے عکرمہ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابن عباس کے تین غلام تھے جو حجامت کا کام جانتے تھے (یا حجامت ان کا پیشہ تھا) پس ان میں سے دو تو کما کر لاتے جبکہ ایک ان کو اور ان کے گھر والوں (یعنی متعلقین) کو بیگی لگاتا تھا، عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کے نبی نے ارشاد فرمایا ہے: کہ اچھا غلام بیگی لگانے والا ہوتا ہے جو (زائد و فاسد) خون کو نکالتا ہے اور پیٹھ (کی گرانی) کو ہلکا کر دیتا ہے اور نگاہ کو تیز کرتا ہے اور فرمایا (ابن عباسؓ نے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں اوپر جاتے ہوئے فرشتوں کی کسی جماعت سے نہیں گزرے مگر انہوں نے کہا کہ آپ کچھ کورواج دیں اور یہ کہ تمہارے کچھ لگانے کے ایام میں بہترین تاریخیں سترہ، انیس اور اکیس ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ معالجہ کا بہترین طریقہ ناک سے دوا چڑھانا، منہ سے کھلانا، پچھنے لگانا اور جلاب ہے، اور یہ کہ (جب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ میں دوا پلائی حضرت عباس اور صحابہ کرامؓ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (افاقہ ہونے کے بعد) فرمایا کہ کس نے میرے منہ میں دوا ڈالی؟ تو سب خاموش ہوئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھر میں جتنے بھی لوگ ہیں ان میں کوئی نہ بچے مگر سب کو دوا پلائی جائے سوائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ کے۔

نضر راوی کہتے ہیں کہ لدود وہی وجور ہے۔ (پہلے گذرا ہے کہ لدود جانب سے دی جاتی ہے اور وجور منہ کے درمیان یا حلق میں ٹپکائی جاتی ہے)

لغات :- قوله ”غِلْمَةٌ“ غلام کی جمع ہے۔ قوله ”يُغْلَان“ ضم الياء وكسر الغين، أَغْلٌ يُغْلُ کے صلہ میں جب ”علی“ آجائے تو بمعنی آمدنی لانے کے آتا ہے، پھر غَلَّةٌ اگرچہ مطلق آمدنی کو کہتے ہیں حتیٰ کہ زمین کی پیداوار کو بھی غلہ کہا جاتا ہے، مگر یہاں پچھنے لگانے کی اجرت مراد ہے۔ قوله ”يُخَفُّ“ إخفاف سے ہے بمعنی ہلکا کرنے کے۔ باقی الفاظ کی شرح پہلے گذری ہے۔

تشریح :- اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ پچھنے لگانا اور لگوانا دونوں جائز ہیں اور یہ کہ اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس کی اجرت حضرت ابوطیبہ رضی اللہ عنہ کو دی ہے جیسا کہ صحیحینؒ کی روایت میں ہے، ہاں یہ بات ہے کہ یہ پیشہ اختیار کر لینا پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح ہر وہ کام شرعاً ناپسند کیا جاتا ہے جس میں کسی طرح گندگی کے لگنے کا قوی احتمال ہو۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ج: ۵ ص: ۲۰۸، ۲۰۹، باب ما جاء في كسب الحجام، ابواب البیوع)

باقی روایت کی تشریح پہلے گذری ہے، البتہ اس روایت کے اخیر میں یہاں یہ اضافہ ہے کہ گھر کے تمام افراد کو دوا پلائی گئی چنانچہ حافظ ابن حجر اور حافظ عینی رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی پلائی گئی، ممکن ہے کہ وہ بھی اس مشورے میں شریک ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ”من فی البیت“ کے عموم کو دیکھ کر ان کو دوا دی ہو۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۴۹ ج: ۲ ”باب الحجامۃ من الداء“ کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۵ ج: ۲ عن ابن

عباس ان النبی ﷺ احتجم واعطی للحجام اجرہ واسقط، کتاب السلام.

۲۔ کما رواہ احمد فی مسنده ص: ۱۷۱ ج: ۱ حدیث: ۲۴۳۲۹، ص: ۵۹۱ ج: ۷ حدیث: ۲۶۹۳۲.

باب ماجاء فی التداوی بالحناء

”عن علی بن عبید اللہ عن جدته وکانت تخدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت: ماکان یسکون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرحةً ولانکبة الا امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضع علیها الحناء“۔^۱ (هذا حدیث غریب واعرجه ابن ماجه)

علی بن عبید اللہ اپنی دادی (سہیلی ام رافع زوجہ ابی رافع) سے نقل کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتی تھی، انہوں نے فرمایا کہ کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی زخم تلوار وغیرہ کا یا پتھر اور کانٹے کا نہیں لگتا تھا مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس پر مہندی لگانے کا حکم دیتے۔

لغات:- قوله ”ماکان یسکون“ اس میں یکون زائد برائے تاکید بھی ہو سکتا ہے اور تاویل کر کے اسے غیر زائد بھی مانا جاسکتا ہے ایسا کہ قرحة ولانکبة نکون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”الخ“۔ قوله ”قرحة“ بفتح القاف اور ضمہ بھی جائز ہے، وہ زخم جو تلوار یا چھری وغیرہ کا ہو۔ قوله ”نکبة“ بفتح النون بروزن رحمة جیسا کہ قرحہ بھی اسی وزن پر ہے، پتھر یا کانٹے کے زخم کو کہتے ہیں، ولانکبة میں لازماً زائد برائے تاکید ہے۔ قوله ”الحناء“ بکسر الحاء وتشدید النون، مہندی کے پتے اور مہندی۔

تشریح:- یہ روایت ابن ماجہ میں اس طرح ہے: ”قالت کما لا یصیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرحة ولا شوكة الا وضع علیہ الحناء“۔^۲ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ترمذی کی روایت میں کان کی ضمیر برائے شان ہے۔ دوم یہ کہ یکون زائد ہے الا بتاویل کما مر۔

چونکہ مہندی میں قوت قابضہ پائی جاتی ہے اسی طرح یہ مزاج کے اعتبار سے ٹھنڈی بھی ہے جبکہ دوسرے درجے میں یہ خشک ہے اس لئے زخم پر لپ کرنے سے خون بھی بند ہو جاتا ہے اور زخم کی گرمی بھی ختم ہو کر درد میں کمی آ جاتی ہے، اسی بناء پر یہ اس درد سر کے لئے بھی مفید ہے جو شدت حرارت کی وجہ سے ہو، اپنی کثیر المنفعت خصوصیات کی وجہ سے یہ ہر قسم کی پھنسیوں، گلے ہوئے اعضاء، مرطوب دانوں اور خارش کے ازالے کے لئے مفید ہے، لوگوں کا تجربہ ہے کہ پاؤں کے تلوؤں کی جلن دور کرنے کی غرض سے اس کا لپ کرنا

باب ماجاء فی التداوی بالحناء

۱۔ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۰ باب الحناء ابواب الطب، جمع الفوائد ص ۲۵۰ ج: ۲ کتاب الطب۔

۲۔ سنن ابن ماجہ حوالہ بالا۔

بھی مفید ہے، تاہم ابن العربیؒ نے عارضہ میں حنا سے متعلق تمام احادیث کی صحت سے انکار کیا ہے۔ شاید حدیث الباب حسن ہو۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الرقیۃ

”عن عَقَّارِ بْنِ الْمَغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَكْتَوَىٰ أَوْ اسْتَرْقَىٰ فَهُوَ بَرِيٌّ مِنَ التَّوَكُّلِ“۔ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص داغ لگوائے یا دم کرائے تو وہ توکل سے خالی ہے۔

لغات:- قولہ ”الرقیۃ“ ضم الراء وسكون القاف، جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

”عن انس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم: رَخَّصَ فِي الرقية من الحمة والعين والنملة“۔^۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچھو کے ڈنگ اور نظر بد اور پہلو کی پھنسیوں کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت فرمائی ہے۔

لغات:- قولہ ”الحمة“ ضم الحاء وتخفيف الحيم، بچھو کے ڈنگ مارنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”العين“ منظر لگنا مراد ہے خواہ انسان کی ہو یا جنات کی۔ قولہ ”النملة“ بروزن رحمة، وہ پھنسیاں جو پہلو پر نکلتی ہیں۔

دونوں بابوں کی تشریح:- چونکہ جھاڑ پھونک اور داغ دینے سے علاج میں کامیابی کی صورت میں آدمی کا عقیدہ کچھ نہ کچھ متزلزل ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے اگرچہ خواص اس سے محفوظ رہتے ہیں مگر عوام بیچارے تو فائدے کو دیکھتے ہیں اور ظاہری فائدہ جس چیز سے حاصل ہوتا ہے عوام اسی کو مفید بلکہ مؤثر سمجھنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہ ظن غلبہ اختیار کرتا رہتا ہے اس لئے پہلے باب کی حدیث میں ان دونوں سے روکا گیا، پس

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

۱۔ روی بمعناه ابو داؤد ص: ۱۸۷ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً رواہ مسلم فی الایمان، جمع الفوائد ص: ۲۵۳ ج: ۲ کتاب

مطلب یہ ہوا کہ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ کامل توکل سے محروم ہو جاتا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بغیر اضطراب اور ضرورت کے ایسا کرے گا تو وہ توکل میں نقصان اٹھائے گا، یا پھر یہ روایت اس وقت سے متعلق ہے جب لوگ نئے نئے مسلمان ہو رہے تھے اور قرآنی تعلیمات ابھی ابتدائی حالت میں تھیں جب لوگوں نے عقائد کی تفصیل معلوم کر لی تو پھر یہ حکم منسوخ ہوا اعلیٰ حد اس ممانعت کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن دوسرے باب میں اس کی رخصت بیان ہوئی ہے پس اس رخصت کو پہلے باب کی وجہ ممانعت کے تناظر میں دیکھنا ہوگا، یعنی پہلے باب کی حدیث میں نبی کی جو وجہ ہوگی جواز کی حدیث میں اس وجہ کی نفی رخصت کی علت ہوگی۔

بہر حال اس بارے میں دونوں جانب بہت ساری صحیح احادیث مروی ہیں، نبی کے بارے میں بھی اور اباحت کے متعلق بھی^۱ جن میں تطبیق کی صورتیں وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ جھاڑ پھونک کرنے اور کروانے میں فرق ہونا چاہئے کیونکہ حدیث بالا میں لفظ ”استرتی“ کا استعمال ہوا ہے اور یہ معلوم ہے کہ باب استفعال کی ایک خاصیت طلب فعل (یعنی مأخذ الاشتقاق) بھی ہے، لہذا اسی خاصیت کے تناظر میں کہا جائے گا کہ جھاڑ پھونک کروانے کی غرض سے کسی کے پاس جانا نہیں چاہئے اور نہ ہی اسے طلب کرنا چاہئے البتہ اگر کوئی آدمی از خود چل کر مریض کے پاس جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ رقیہ کے کلمات والفاظ مشروع ہوں کیونکہ اس سے توکل پر اثر نہیں پڑتا، اسی طرح استرتی یعنی طلب رقیہ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جبکہ اسے اسباب کے درجہ میں مان کر اعتماد صرف اللہ پر ہو مگر یہ قدرت عوام کو شاید حاصل ہونا مشکل ہو، لہذا جھاڑ پھونک کے وقت ان کو بتانا چاہئے کہ شفا دینے والا صرف اللہ ہے اسی نے اپنے کلام میں شفا رکھی ہے۔ مزید تفصیل درکار ہو تو دیکھئے (تشریحات ترمذی ص: ۲۲۸ تا ص: ۲۳۲ ج: ۴، باب ماجاء فی التعوذ للمریض، ابواب الجنائز)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث ”لارقیۃ الا من عین او حمة“^۲ میں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن بیماریوں میں رقیہ زیادہ مفید ہے ان میں سے یہ دو بطور خاص قابل ذکر ہیں گور قیہ باقی امراض میں بھی مفید ہے۔

۱ راجع للروایات جمع الفوائد ص: ۲۵۳ تا ۲۵۷ ج: ۲.

۲ رواہ البخاری ص: ۸۵۰ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً رواہ مسلم فی الایمان و ابو داؤد فی الطب باب: ۱۷، مسند احمد

ص: ۴۳۷ ج: ۱ حدیث: ۲۳۳۳. حفیظ الرحمن الحنفی عفی عنہ

بہر حال جب دوا یا رقیہ سے فائدہ محسوس ہو تو شفاء کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہئے کہ درحقیقت وہی

شفاء دینے والا ہے۔

باب ماجاء فی الرقية بالمعوذتین

”عن ابی سعلقال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: يتعوذ من الحان وعین

الانسان حتی نزلت المعوذتان فلما نزلتا أخذ بهما وترك ما سواهما“۔^۱ (حدیث حسن غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور انسانی

بد نظری سے پناہ مانگتے تا آنکہ معوذتین نازل ہوئیں، پس جب یہ دونوں (سورتیں) نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے انہی دونوں کو معمول بنایا اور باقی کا پڑھنا ترک کیا۔

لغات :- عوذ اور عیاذ پناہ اور پناہ میں آنے کو کہتے ہیں جبکہ تعوذ پناہ لینے کو کہا جاتا

ہے۔ قولہ ”المعوذتان“ اصطلاح میں سورہ فلق اور سورہ الناس دونوں کو کہتے ہیں۔

تشریح :- چونکہ نظر بد ایک حقیقت ہے اور ہر ایک کو لگ سکتی ہے اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

جنات کے شر اور نظر بد کے ضرر سے بچنے کے لئے دعائیں مانگتے مثلاً ”اعوذ باللہ من الحان وعین

الانسان“ پھر جب لبید بن اعصم یہودی اور اس کی بیٹیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تو اس سے

شفاء کے لئے یہ دونوں سورتیں نازل ہو گئیں جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے تب آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کا پڑھنا معمول بنایا اور باقی معوذات کا پڑھنا کم کر دیا، کیونکہ ان سورتوں میں

جو جامعیت اور برکت ہے وہ دوسری ادعیہ تعوذ میں نہیں ہے لہذا باقی تعوذات کا پڑھنا بدستور جائز ہے

منسوخ نہیں۔

قال ابن العربی فی العارضة: ”اذا کان الافضل الرقية بكتاب اللہ فالفاتحة

اصل... وبالمعوذتین... او بکلمات المروية عنه فی تعویذ الحسن وفی

تعویذ جبریل وثابت“۔

باب ماجاء فی الرقية بالمعوذتین

۱۔ الحدیث أخرجه النسائی ص: ۳۱ ج: ۲ کتاب الاستعاذة، سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۱ ”باب من استرقى من العين“

ابواب الطب. ۲ جمع الفوائد ص: ۲۵۵ ج: ۲.

معوذتین کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں مگر یاد رہے کہ کسی سورت یا آیت کا مکرر نازل ہونا ممنوع نہیں، یہ مسئلہ اور اسی طرح ان دونوں سورتوں کے بارے میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے مع الاجوبہ راقم کی کتاب ”زاد البیرونی علوم التفسیر“ میں ملاحظہ ہو کہ یہ مسئلہ تفسیر کا ہے۔

باب ماجاء فی الرقية من العین

”عن عبید بن رفاعۃ الزرقی ان اسماء بنت عمیس قالت: یا رسول اللہ! ان ولد جعفر تُسرِع الیہم العین افاسترقی لہم؟ قال ”نعم“ فانہ لو کان شئٌ سابق القدر لسبقہ العین۔“ (حدیث حسن صحیح) ^۱

حضرت عبید بن رفاعہ سے روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! جعفرؓ کی اولاد کو نظر بد لگ جاتی ہے تو کیا میں ان کے لئے جھاڑ پھونک کر سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں“ کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت حاصل کر سکتی تو آنکھ سبقت لے جاتی۔ (یعنی بد نظری)

تشریح:- حضرت اسماء بنت عمیسؓ بصیغہ تصغیر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں، یہاں سوال اپنے ہی بچوں کے بارے میں مراد ہے مگر حضرت جعفرؓ کی خوب صورتی کو سوال میں آجا کر کرنا مقصود ہے تاکہ نظر بد لگنے کی وجہ بھی ساتھ ساتھ ذکر کر دیں کیونکہ ”الولد سر لایہ“ یعنی میرے بچوں کو خوب صورتی کی وجہ سے نظر بد لگتی ہے کیونکہ آخر وہ جعفر ہی کے بچے ہیں نظر کیوں نہ لگے گی، پھر وَلَدُ بَنَفْتَمِینِ مفرد اور جمع ایک تادس مذکر اور مؤنث سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس کا بہترین ترجمہ اردو میں ”اولاد“ ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا ان کی خصوصیت نہیں بلکہ عام اذن ہے بشرطیکہ وہ کلمات ماثور یا کم از کم معنی صحیح پر مشتمل ہوں اور جہاں تک جواب میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ مبالغے کے لئے ہے تاکہ لوگ نظر بد سے بچنے کی تدبیر کریں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو تدبیر بتلائی تھی اور اگر نظر بد لگ جائے تو اس کے لئے جھاڑ پھونک کریں کیونکہ نظر بد کی مستعار تاثیر اتنی قوی ہے کہ اگر کوئی

باب ماجاء فی الرقية من العین

۱۔ جمع الفوائد ص: ۲۵۴ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً راجع للروایات مجمع الزوائد ص: ۲۸۱ تا ۱۳۱ ج: ۵ کتاب الطب۔

چیز تقدیر پر غالب آسکتی تو نظروہ چیز ہے جو غالب آجاتی مگر اللہ کا فضل ہے کہ کوئی چیز تقدیر کو مغلوب نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ سب تقدیر کا حصہ ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نظر بد کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ نقل اور عقل دونوں کے خلاف چلتے ہیں اور یہ کہ یہ تاثیر دراصل روح کی ہوتی ہے اسی بناء پر نابینا شخص کی بھی نظر بد لگتی ہے۔ (راجع للتفصیل زاد المعاد و تشریحات ترمذی ص: ۲۳۰ ج: ۴، باب ما جاء فی التعوذ للمریض) اس کی کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

حدیث آخر:- ”عن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعوذ الحسن والحسین بقول: اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَهَامَةٍ وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّامَةٍ وِیَقُولُ: هَلْکَذَا کَانَ اِبْرَاهِیْمَ یُعَوِّذُ اسْحَقَ وَاسْمَعِیْلَ“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے تعوذ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے میں تمہارے لئے اللہ کے کلام کے ذریعہ پناہ مانگتا ہو جو پورا ہے ہر شیطان سے اور ہر زہریلی چیز سے اور جنوں میں ڈالنی والی آنکھ سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح تعوذ فرماتے حضرت اسحاق اور اسمعیل (علیہما السلام) کے لئے۔

لغات مع التشریح:- قولہ ”التامة“ اس سے کلمات کی توصیف اس لئے کی گئی کہ اللہ کا کلام پورا اور مکمل ہے اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں یا اس لئے کہ وہ تعوذ کے لئے کافی ہے، پھر کلمات سے مراد کلام بھی ہو سکتا ہے جو کہ قرآن ہے اور اسماء و صفات بھی ہو سکتی ہیں۔ قولہ ”هامة“ ہر وہ زہریلا جانور جس کے کاٹنے سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے جبکہ اس سے کم درجے کا جانور سام کہلاتا ہے یعنی اس کا زہر قاتل نہیں۔ هامة، ہم بمعنی فکر سے بھی ہو سکتا ہے یعنی ہر اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں جو پریشان کرنے والی ہو۔

قولہ ”لامة“ لامہ، جنوں کی ایک قسم یا درجہ ہے، جب آدمی کو نظر بد لگتی ہے تو وہ معیون پاگل اور مجنون جیسا حواس باختہ محسوس ہوتا ہے وہ خود بھی اپنی حالت صحیح طور پر نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟

باب ماجاء أن العين حق والغسل لها

”عن يحيى بن ابی کثیر قال ثنی حبة بن حابس التميمی ثنی ابی انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم يقول: لا شئ فی الهام، والعین حق“۔ (حدیث غریب واخرجه احمد^۱، وکذا اخرجه البخاری فی الادب المفرد)

حضرت حابس تمیمی رضی اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہام کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نظر لگنا بچ ہے۔

لغات :- ہام جمع ہے ہامتہ کی بروزن ساعۃ یعنی میم کی تخفیف کے ساتھ۔ بعض نے تشدید کو بھی جائز کہا ہے۔ ہام یا ہامتہ سراور کھوپڑی کو بھی کہتے ہیں اور ”بومہ“ یعنی اُلُو کو بھی کہا جاتا ہے اور ایک چھوٹے سے پرندے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو رات کو قبرستان میں رہتا ہے۔ قاموس الوحید وغیرہ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا اعتقاد تھا کہ مقتول کی کھوپڑی سے ایک پرندہ نکل کر گھر آتا ہے اور ”اسقونی، اسقونی“ پکارتا ہے یعنی مجھے سیراب کرو، اور مراد بدلہ لینا ہوتا ہے چنانچہ وہ مسلسل انتقام لینے تک یہ پکارتا رہتا ہے، اسلام نے اس عقیدہ کو باطل قرار دیا جیسا کہ حدیث باب میں مصرح ہے۔ (کذا فی الماشیتین)

ابن العربیؒ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں ”وحدیث ابی عیسیٰ ہذا صحیح“۔

تشریح :- ہام کے بارے میں کچھ کہانی زمانہ جاہلیت کے اہل عرب میں مشہور و مرسوم تھی، اس حدیث میں اس کی صریح نفی کی گئی، اس کے بعد اس قسم کی وہابیات کا زعم کسی طرح جائز نہیں، اسی طرح بعض مسلمانوں میں ارواح کے متعلق جو قصے مشہور ہیں کہ روح کبھی طوطے کی شکل میں کسی پنجرے میں بند ہوتی تھی اور کبھی موتی بن کر سانپ کے منہ میں محفوظ کر دی جاتی وغیرہ وغیرہ یہ ہندوں کے عقائد کا حصہ ہیں جو کہ تناسخ کے قائل ہیں لہذا پریوں، دیو اور شبنزادوں کے اس قسم کے مفروضی بلکہ منگھڑٹ قصہ نویوں سے پرہیز لازمی ہے کہ اس سے عقیدہ خراب ہو جاتا ہے کیونکہ اسلام میں تناسخ کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جہاں تک نظر بد کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ

اشیاء کی تاثیرات تولیدی نہیں اور نہ ہی تاثیرات کا دار و مدار اعداد پر ہے بلکہ عادی ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اشیاء میں بعض اثرات پیدا فرمائے ہیں، یہ اشیاء بمنزلہ اسباب ہوتے ہیں، ان کے استعمال یا رونما ہونے سے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی سنت جاریہ کے مطابق کچھ اثرات پیدا فرماتے ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل ”باب ما جاء فی کرہیۃ البول فی المغتسل“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۱ ص: ۱۳۸)

نظر بد آنکھ کا اثر ہے یا روح کا؟ اس کے بارے میں ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے:

”ولیس العین ہی الفاعلة وانما التأثير للروح ولشدة ارتباطها بالعین نسب

الفعل البہا وروح الحاسد مؤذیہ للمحسود اذی بیناً ولهذا امر اللہ رسولہ ان

یستعید بہ من شرہ“ الخ۔ (مختصر زاد المعاد ص: ۲۳۷ فصل فی حجة ابی بکر رضی اللہ عنہ)

یعنی نظر بد آنکھ کی تاثیر نہیں بلکہ دراصل روح کی تاثیر ہوتی ہے مگر آنکھ سے گہرے تعلق کی بناء پر نسبت آنکھ کی طرف کی جاتی ہے چنانچہ حسد کرنے والا شخص محسود کو سخت تکلیف پہنچاتا ہے یعنی نظر بد لگاتا ہے۔

بہر حال نظر ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم اس کی ماہیت کیا ہے تو یہ جاننا خاصا مشکل ہے ممکن ہے کہ جس طرح آج کل لیزر شعاعیں غیر مرئی حقیقت اور موثر قوت ہیں، اسی طرح یہاں بھی کوئی غیر مرئی طاقت خفیہ طریقہ سے وار کرتی ہو اور اس قسم کے حقائق کا کارخانہ قدرت میں وجود کوئی ناممکن نہیں، دیکھئے کبھی ایک بات سے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لو کان شئی

سابق القدر لسبقته العین واذا استغسلتم فاغسلوا“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

یعنی جب تم (عائِن) سے غسل کرنے کو کہا جائے تو غسل کر لیا کرو۔

لغات:- قولہ ”استغسلتم“ بصیغہ مجہول طلب غسل مراد ہے یعنی جب کسی کی نظر لگ جائے اور معین یا اس کے گھر والے عائِن سے کہیں کہ تم اپنے اعضاء دھو کر وہ مستعمل پانی ہمیں دے دو تو ایسا کرنا چاہئے۔

محشی نے مجمع البحار کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر عائِن غسل سے انکار کر دے تو اسے مجبور کیا جائے گا کیونکہ اس حدیث میں امر کا صیغہ ”فاغسلوا“ لزوم پر دلالت کرتا ہے۔

تشریح:- پھر غسل کا طریقہ حاشیہ میں تفصیل سے بتلایا ہے کہ عائِن کے پاس جب پانی لایا جائے تو وہ

پہلے چلو میں پانی لے کر مضمضہ کر کے کلی کا پانی اسی برتن میں ڈالے، پھر چہرہ دھو لے، پھر بائیں ہاتھ سے پانی لے کر دائیں پر ڈالے، و بالعکس، پھر بائیں ہاتھ سے پانی داہنی کہنی پر ڈالے، و بالعکس، پھر بائیں ہاتھ سے پانی لے کر سیدھے پاؤں پر ڈالے، و بالعکس یعنی پھر سیدھے ہاتھ سے پانی لے کر بائیں پیر پر ڈالے، پھر اسی طرح گھٹنے دھوئے اور پھر داخل الازار یعنی شرم گاہ اور ازار باندھنے کی جگہ کے درمیانی حصے کو دھوئے، یہ سارا مستعمل پانی اس برتن میں جمع ہونا چاہئے، فراغت کے بعد یہ سب پانی ایک بارگی معین کے اوپر پشت کی جانب سے ڈالے وہ اللہ کے حکم سے ٹھیک ہو جائے گا۔ تاہم ابن العربیؒ نے عارضہ میں دھونے کی اس تفصیل سے اتفاق نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

”ومن قال: لا یجعل الاناء فی الارض ویغسل کذا بکذا و کذا بکذا، فهو کله

تحکم و زیادة“۔ (العارضہ)

یعنی مندرجہ بالا طریقہ کار کی ضرورت نہیں اور نہ ہی برتن کو ہاتھوں میں معلق پکڑنے کی ضرورت ہے بلکہ صرف ہاتھ پاؤں اور داخل الازار دھونا جیسے بھی ہو کافی ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس وضو کے پانی کا نظر کے ازالہ سے کیا تعلق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے بعض اسباب انتہائی مخفی ہوتے ہیں تو پھر ان کے اثر کے ازالے کا طریقہ بھی باریک ہوتا ہے جس کا عام مشاہدہ کیا جاسکتا ہے دیکھئے جادو وغیرہ اور ریاضی کے اصول وغیرہ کو وہ کتنی باریکی پر مبنی ہوتے ہیں چنانچہ کچھ اجسام کو مخصوص زاویہ پر رکھنے سے ان میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک آدمی باقاعدہ ایک گھنٹے کے بعد آکر گھنٹی بجاتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے حالانکہ وہ کوئی انسان نہیں ہوتا ہے، آپ نظام شمسی پر غور کریں کہ مخصوص زاویہ پر واقع ہونے پر یہ اجرام فلکیہ کس طرح رواں دواں ہیں؟ جب آدمی اللہ عز اسمہ کے کارخانہ قدرت میں معلومات کی روشنی میں غور کرتا ہے تو اس قسم کے عجائبات کا مشاہدہ روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے۔

علاج کے اسباب کیا ہیں؟ اس بارے میں کئی آراء ہیں: ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد تجربے پر ہے ممکن ہے کہ یہ تمام اسباب بیک وقت مفید ہوں، علیٰ ہذا النظر بد سے شفاء اس تجربے کے تناظر میں نامعقول نہیں کہ اس قسم کے تجربات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں، مذکورہ تجربہ بھی زمانہ قدیم کا نسخہ تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا، علاوہ ازیں روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب کوئی چیز دیکھنے سے پسند آجائے تو آدمی

برکت کی دعا کرے، یا ”ماشاء اللہ ولا حولہ الا باللہ“ کہے تو نظر کے ضرر سے تحفظ ہو سکتا ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظر کے حوالے سے جو طریقے مختلف اقوام میں معمول بہا ہیں اور وہ مفید بھی ثابت ہوئے ہیں تو اگر ان میں کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ آتا ہو یا وہ اصول سے متصادم نہ ہوں تو وہ بھی قابل عمل ہیں مثلاً ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ عائن اپنے بدن پر سوتی کپڑا ملتا ہے پھر اس کی بتی بنا کر آگ لگا دی جاتی ہے اور معین اس دھوئیں کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے اور دھواں سونگھتا ہے، اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ شفاء بھی عنایت فرماتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلیہ اتم واحکم، سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا ۱۔

باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ

”عن ابی سعید قال: بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَرِيَّةٍ فَتَرَلْنَا بِقَوْمٍ فَسْتَلْنَا هُمُ الْقُرَى فَلَمْ يَقْرُوا فَلَدَغَ سَيْدُهُمْ فَأَتُونَا فَقَالُوا هَلْ فِيكُمْ مَنْ يَرْقِي مِنَ الْعُقْرِ؟ قُلْتُ نَعَمْ أَنَا وَلَكِنْ لَا أَرِيقُهُ حَتَّى تَعْطُونَا غَنَمًا قَالُوا إِنْ أَنْعَمْنَا عَلَيْكُمْ ثَلَاثِينَ شَاةً فَقَبَلْنَا فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ الْحَمْدَ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَبَرَأَ وَقَبَضْنَا الْغَنَمَ، قَالَ فَعَرَضَ فِي أَنْفُسِنَا مِنْهَا شَيْءٌ فَقُلْنَا لَا تَعْمَلُوا حَتَّى تَأْتِيَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَيْهِ ذَكَرْتُ لَهُ الَّذِي صَنَعْتُ قَالَ: وَمَا عَلِمْتَ أَنْهَارِقِيَّةٌ؟ أَقْبِضُوا الْغَنَمَ وَاضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ“۔ (هذا حديث حسن صحيح و أخرجه الشيخان وغيرهما ۱)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ کی شکل میں بھیجا تو ہم ایک قبیلہ والوں کے یہاں اتر گئے، ہم نے ان سے ضیافت طلب کی مگر انہوں نے ضیافت نہیں کی (یعنی کھانا نہیں کھلایا) اتنے میں ان کا سردار ڈسا گیا (یعنی سانپ یا بچھو نے ڈس لیا) تو وہ ہمارے پاس آ گئے اور کہنے لگے کہ تم میں کوئی بچھو کے ڈسے ہوئے کو دم کر سکتا ہے؟ میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں لیکن جب تک تم ہمیں بکریاں نہیں دو گے تب تک میں رقیہ نہیں کروں گا تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو تیس (۳۰) بکریاں دیں گے (کیونکہ سریہ والے بھی کل تیس صحابہ تھے) پس ہم نے قبول کر لیا پس میں نے اس پر سات مرتبہ الحمد شریف

ح کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۳۱ ج: ۵ حدیث: ۸۴۳۲، ح سورة البقرة آیت: ۳۲۔

باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ

۱ صحیح بخاری ص: ۸۵۴ ج: ۲ ”باب الرقی بالقرآن والمعوذات“ کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۳ ج: ۲

کتاب السلام، ایضاً رواہ ابو داؤد کذا فی جمع الفوائد ص: ۲۵۵ ج: ۲۔

پڑھ کر دم کیا چنانچہ وہ ٹھیک ہو گیا اور ہم نے وہ بکریاں لے لیں، فرماتے ہیں کہ اس سے ہمارے دلوں میں کھٹکاسا پیدا ہوا، تو ہم نے باہمی مشاورت سے طے کیا کہ جلدی نہ کریں یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا جائے، فرمایا کہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس عمل کے بارے میں آگاہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ (فاتحہ) رقیہ ہے؟ بکریوں کو اپنے پاس رکھو اور میرا بھی ان میں حصہ کرلو۔

لغات :- ”تعویذ“ باب ”تفعیل کا مصدر ہے، تحفظ کے پیش نظر یا شفاء کی غرض سے اسماء حسنی وغیرہ کلمات خیر لکھنا یا پڑھنا۔ قولہ ”فی سریہ“ بکسر الراء وتشدید الیاء المفتوحہ، لشکر کا وہ دستہ جس کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار سو افراد پر مشتمل ہو، یہاں جس سریہ کا ذکر ہے روایات کے مطابق یہ تیس نفوس پر مشتمل تھا۔ اصحاب السیر کی اصطلاح میں وہ لشکر جس کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شامل نہ ہوں سریہ کہلاتا ہے۔ قولہ ”القرئی“ بکسر القاف والفاء المقصورة، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قری اور ضیانت دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں البتہ ”ق، ر، ی“ مادہ میں جمع کے معنی پائے جاتے ہیں جبکہ ”ض، ی، ف“ میں میلان کے معنی ہیں، ”تقول قریئ الماء فی الحوض اذا جمعت فیہ متفرقة“ گویا میزبان اپنے مہمان کی خاطر محبت، خدمت، ٹھکانہ اور کھانا جمع کرتا ہے، اسی طرح وہ مہمان کی جانب مائل بھی ہوتا ہے۔

قولہ ”فلدغ“ بھینہ مجہول، لدغ بچھو کے ڈنگ مارنے اور سانپ کے ڈسنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”من یرقی“ رقا، یرقی، رقیاء، جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں۔ قولہ ”وما علمت انہا رقیہ؟“ اگلی روایت میں ہے ”وما یدریک انہا رقیہ؟“ ابن العربی فرماتے ہیں کہ یہاں ”بہ“ مقدر ہے ”ای ما علمت بہ انہا رقیہ؟“ قولہ ”وفی الحدیث الثانی۔“ قولہ ”جعلاء“ بالضم، أجزت۔ قولہ ”قطعیاً“ گلہ، ریوڑ۔

تشریح :- واضح رہے کہ اس قسم کا ایک واقعہ نسائی^۱ میں بھی مروی ہے جس سے تعارض کا شبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہے کہ وہ آدمی مجنون اور پاگل تھا جبکہ یہاں لدغ کا ذکر ہے لیکن وہ الگ واقعہ ہے کہ یہاں راتی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور اس میں حضرت علاقہ بن صحرار رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس لدغ کو فاتحہ سے شفاء ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب ابن العربیؒ نے عارضہ میں دیا ہے کہ انہوں نے ”ام الکتاب“ کے نام اور جامعیت مضمون سے معلوم کیا تھا یعنی قرآن

میں شفاء تو ہے اور فاتحہ ام الکتاب ہے، لہذا اس میں بھی شفاء کی خاصیت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اجتہاد کی تردید نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ ان کا اجتہاد صحیح تھا اور یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں اجتہاد و استنباط فرماتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسافر کے پاس کھانے پینے کا انتظام نہ ہو تو وہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام نے انطاکیہ والوں سے کیا تھا، عارضہ میں ہے کہ رقیہ کی اقل مقدار تین بار پڑھنا ہے اور اکثر سات مرتبہ، ابوسعید خدریؓ نے اکثر پر عمل کیا ”رغبة فسی تحصيل البر والاحذ بالاثق“۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی حکم میں شک پڑ جائے تو یقین کے حصول تک توقف کرنا چاہئے اور یہ کہ تحصیل یقین میں کوشش تیز کرنی چاہئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رقیہ پر اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں بحوالہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نقل کیا ہے کہ امر دنیاوی کی غرض سے ختم القرآن یا بخاری پر بھی عوض لینا جائز ہے جبکہ علامہ شامیؒ نے ”شفاء العلیل“ میں لکھا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے تلاوة پر اجرت لینا حرام ہے، علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ پر شرح عقود رسم المفتی میں بھی بحث کی ہے بلکہ اس مسئلہ کا ذکر ان امثلہ میں کیا ہے جو مصنفین حوالہ جات میں اصل کتاب کے مراجعت کے بغیر نقل کرتے ہیں جن کی تعداد علامہ شامیؒ نے تلاش اور تتبع کے بعد (۲۰) ہیں ذکر کی ہے، چنانچہ متعدد کتابوں میں تلاوة مجردہ یعنی بغیر تعلیم کی غرض سے تلاوت پر اجرت لینے کو جائز لکھا ہے حالانکہ یہ خطا ہے۔ (دیکھئے شرح عقود رسم المفتی ص: ۶، ۷ یا شفاء العلیل وبل الغلیل فی بطلان الوصیۃ بالبخسات والتمہایل)

البتہ تعلیم القرآن پر اجرت لینا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تو جائز ہے ہی مگر متاخرین فقہائے حنفیہ نے بھی ضرورتاً جائز لکھا ہے گواصل مذہب میں جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ اجرت علی الطاعات کے اوپر مبنی ہے۔

جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے جو بطور قیاس تعلیم پر اجرت کو جائز مانتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ رقیہ امر مباح ہے جبکہ تعلیم فرض ہے گو کفایہ ہے، نیز رقیہ کا نفع دنیوی و جسمانی ہے جبکہ تعلیم کا نفع اخروی اور دینی ہے، تعلیم عبادت ہے جو حق اللہ ہے اس پر مخلوق سے اجرت لینے کا کیا مطلب؟

چونکہ مال محبوب ترین عند اکثرین ہے اس لئے اجرت لینے میں اہل علم، لوگوں میں مغرض شمار ہوتے

ہیں کہ محبوب کی طمع رکھنے والے سے تو حسد و عداوت یقینی چیز ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام آتے ہی اعلان فرماتے ”لا اسئلكم عليه اجراً“^۳ الا یہ۔

بہر حال اب مسئلہ پر اتفاق ہو چکا ہے اس لئے فریقین کے دلائل ذکر کرنے میں کوئی معتد بہ فائدہ نہیں، نیز اس کی وضاحت کسی حد تک پہلے گزری ہے۔ (فلیراجع تشریحات ترمذی ج: ۱ ص: ۴۸۳، باب ماجاء فی کراہیۃ ان یأخذ المؤمن علی اذانه اجراً) تاہم وہاں حنابلہ کا مذہب مثل حنفیہ کے مذکور ہے جبکہ ان کا مذہب مثل الجہور ہے۔ فلجنبہ۔

اس حدیث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ رقیہ سے تقدیر میں تبدیلی آ جاتی ہے کیونکہ رقیہ، دعا اور دوا یہ سب تقدیر کا حصہ ہیں کہ اللہ عزوجل نے جو بھی بیماری یا قدر فرمائی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی متعین فرمایا کہ یہ شخص فلاں ذریعہ اختیار کرے گا تو ٹھیک ہو جائے گا جبکہ بعض کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ وہ باوجودیکہ اسباب اختیار کریں گے مگر ان کو فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا۔

باب ماجاء فی الرقی والادویۃ

”عن ابی حزامۃ عن ابیہ قال: سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلت: یا رسول اللہ! ارایت رقی نسترقیہا و دواء ننداوی بہ وثقاة ننفیہا هل ترؤ من قدر اللہ شیئاً؟ قال ”ہی من قدر اللہ“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو حزامہ اپنے والد حضرت یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ بتا دیجئے کہ جو جھاڑ پھونک ہم کرواتے ہیں اور دوا استعمال کرتے ہیں اور ہتھیار سے اپنا تحفظ کرتے ہیں کیا یہ اللہ کی قدر و قضا میں سے کسی چیز کو روک سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ (اسباب) بھی اللہ کی قدر و قضا میں سے ہیں۔

لغات: - قولہ ”ابو حزامۃ“ بکسر الخاء وتخفیف الزاء۔ قولہ ”ارایت“ ای أخبرنی۔ قولہ ”رقی“ جمع رقیۃ۔ قولہ ”نسترقیہا“ ین و تاء طلب کے لئے ہیں ”ای نقرئہا لطلب الرقیۃ۔ قولہ ”دواء“ رقی پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ قولہ ”ننداوی بہ“ ای نستعملہ۔ قولہ ”ثقاة“ بضم التاء و تاء و قی اور وقایہ سے ہے

بمعنی سامانِ حفاظت جیسے ڈھال اور باقی ہتھیار وغیرہ۔ قولہ ”نتقیہا“ ای نہ خنر بسبھا یعنی ان سے اپنی حفاظت کرتے ہیں اور بطور احتیاط رکھتے ہیں۔ قولہ ”ہی من قدر اللہ“ یعنی یہ تینوں اسباب بھی تقدیر میں سے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں سوال کا مطلب تو واضح ہے کہ جب کوئی چیز تقدیر میں مقدر و مقرر ہو جیسے موت اور قتل وغیرہ تو پھر اس کے رد کرنے کی تدبیر سے کیا وہ فیصلہ تبدیل ہو جاتا ہے؟ اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ نہیں ہرگز نہیں قضاء میں کسی طرح تبدیلی ممکن نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اسباب اور دفاع کا سامان بھی تقدیر ہی میں ہے کہ اللہ نے جس طرح کسی مرض وغیرہ کی تقدیر فرمائی ہے تو ساتھ ساتھ یہ بھی مقدر فرمایا ہے کہ فلاں کی بیماری فلاں ڈاکٹر کے علاج سے ٹھیک ہوگی یا فلاں کے جھاڑ پھونک سے شفاء نصیب ہوگی اور فلاں دشمن کا حملہ فلاں ہتھیار سے پسپا ہوگا، لہذا ان میں تعارض نہ سمجھا جائے۔

تاہم یہ اسباب بہر حال مؤثر نہیں ہیں کیونکہ بعض اسباب و ذرائع کے بارے میں اگرچہ یہ مقدر ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے فائدہ ہوگا مگر بعض کے متعلق یہ بھی فیصلہ ہوتا ہے کہ ان سے کوئی فائدہ نہ ملے گا جبکہ بعض امراض وغیرہ کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ یہ بغیر دوا و دعا کے ختم ہوں گے۔ عارضۃ الاخذی میں ہے:

”وذلك لان الله خلق الاشياء ورتبها و ساقها في الوجود على تقدير معلوم ونظام متسق فمنه ما يوجد ابتداءً ومنه ما يوجد بعد غيره بحكمة هو اعلم بها لان الله كما قد يكون شفاء من غير دواء وقد يكون سقم بعد دواء وقد يكون شفاء بعد دواء وقد يكون كفاية بغیر تقیة“۔

یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوا سے مرض مزید شدید ہو جائے جیسا کہ بعض مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، لہذا تقدیر میں یہ تمام صورتیں مندرج ہوتی ہیں، کسی بھی امر موجود کو تقدیر کے منافی قرار دینا درست نہیں۔

قولہ ”وقد روی عن ابن عیینہ“ الخ یعنی اس حدیث کے بعض طرق میں ”عن ابن ابی خزامة“ آیا ہے جیسا کہ امام ترمذی نے ابواب القدر کے ”باب ما جاء لا ترد الرقي والدواء من قدر الله شيئاً“ میں اسی سند سے ذکر کیا ہے۔

مگر صحیح یہ ہے کہ یہ ”عن ابنی خزامة“ ہی ہے جیسا کہ زیر بحث باب کی سند میں ہے۔ عارضہ میں ہے کہ حدیث کا معنی بالا جماع صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الکماء والعجوة

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: العجوة من الجنة وفيها شفاء من السم والکماء من المن وماء هاشفاء للعین“۔^۱ (حدیث حسن غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عجوة جنت (کے پھلوں) میں سے ہے اور اس میں زہر سے شفاء ہے اور کھنٹی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔ (حدیث حسن غریب ہے، تاہم باب کی اگلی حدیث پر حسن صحیح کا حکم لگایا ہے)

”عن ابی ہریرۃ ان ناساً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالوا: الکماء جدری الارض، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الکماء من المن وماء هاشفاء للعین والعجوة من الجنة وهي شفاء من السم“۔ (حدیث حسن)

کھنٹی (کھمبی) من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔

لغات: بقولہ ”الکماء“ فتح الکاف وسکون المیم اس کے بعد ہمزہ مفتوحہ ہے، تاہم عام طور پر ہمزہ کے بجائے الف پڑھا جاتا ہے جیسا کہ حاشیہ پر ہے، اس کی جمع کما یا برعکس یا اکموء آتی ہے، یہ ایک قسم کی نبات ہے جسے لکڑی اور کھنٹی کہتے ہیں، اس کی شکل ہو ہو چھتری کی مانند ہوتی ہے، محدب سطح انتہائی نرم و ملائم ہوتی ہے جبکہ مقعر اوچھڑی کی طرح ہوتی ہے اس کو سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے، برسات میں بغیر بوئے نکلتی ہے، اس کو ساگ کے طور پر سالن بنا کر بھی کھایا جاتا ہے، راقم نے بھی کھائی ہے۔ بقولہ ”العجوة“ مفتوح العین وسکون الجیم، مدینہ منورہ کی وہ عمدہ کھجور جو سیاحی مائل ہوتی ہے، آج کل بہت مہنگی ملتی ہے، یہ لذیذ بھی ہے، اور امراض قلب، زہر اور سحر سے شفاء کے لئے بھی مفید ہے، مجمع البحار کے حوالے سے محشی نے نقل کیا ہے کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے لگایا ہے۔

بقولہ ”جدری الارض“ بضم الجیم وفتح الدال وکسر الراء وتشدید الیاء چیچک کو کہتے ہیں، یہ ایک دہائی بیماری تھی جو انتہائی مہلک تھی، بقول سائنس دانوں کے چیچک زدہ مریض کے ساتھ کمرے میں صرف پانچ

باب ماجاء فی الکماء والعجوة

۱۔ ایضاً روی بمعناہ احمد فی مسندہ ص: ۳۷۵، حدیث: ۲۲۳۲۹، ص: ۳۸۲، ج: ۶، حدیث: ۲۲۳۶۳، جمع الفوائد

ص: ۲۵۰، ج: ۲، وفی روایۃ احمد والطبرانی فی الکبیر: الکماء من السلوی الخ، مجمع الزوائد ص: ۳۰۔

سیکنڈ رہنے سے اس کا وائرس ختم ہو جاتا ہے اور پھر مریض میں انتہائی سرعت سے پھیل جاتا ہے، اس سے کبھی کبھار اتنی اموات ہو جاتیں کہ پوری کی پوری بستی خاموش ہو جاتی۔ اقوام متحدہ نے اس بیماری کے وائرس کو ختم کرنے کے لئے شدید محنت کی اور بالآخر ۱۹۷۷ء تک اسے قابو میں لا کر صومالیہ کے آخری مریض پر بفضلہ تعالیٰ اس کا خاتمہ ہوا ہے، اب یہ وائرس محض تجربات کی غرض سے صرف تین لیبارٹریوں جارجیا، روس اور اٹلانٹا (امریکہ) میں محفوظ و محصور کیا گیا ہے۔ تاہم ۱۹۷۸ء میں حادثاتی طور پر لیبارٹری کے اندر اس کے وائرس کے بوتل سے باہر آنے سے ایک آدمی کی موت واقع ہوئی تھی۔

قولہ ”المن“ لفظ من کا اطلاق احسان و انعام پر بھی ہوتا ہے، یہ معنی اسکی ہیں۔ اور بمعنی پیمانہ کے بھی آتا ہے، یہ معنی ظرفی ہیں جس میں دورِ طل آتے ہیں۔ اور تیسرے معنی ترجمین کے آتے ہیں جو ایک میٹھا سفید گوند پاؤڈر ہوتا ہے جو کھایا جاتا ہے اللہ نے بطور غذا بنی اسرائیل پر نازل کیا تھا۔ یہاں یہی تیسرا معنی مراد ہے۔ یہ زیتون نما درخت میں بکثرت ہوتا ہے، ہم بچپن میں اس کو شوق سے کھاتے تھے۔

تشریح:- عجوہ کھجور کے جنتی ہونے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں محشی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک تشبیہ ہے جس سے مراد اس کی عمدگی بیان کرنا ہے۔ المستر شد عرض کرتا ہے کہ اس تفسیر کے مطابق کہا جائے گا کہ جس طرح عربوں میں یہ عرف قائم تھا کہ عمدہ اور نفیس چیز کی تشبیہ اس چیز سے دیتے جو ”عجبر“ جنات کے شہر سے درآمد کی گئی ہو اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ بہت نفیس ہے چنانچہ تفسیر ابی سعود میں آیت سورہ رُحْمٰن ”عجری حسان“ کے تحت لکھا ہے کہ: ”نزع العرب انه اسم بلد الحن فینسبون الیہ کل شئی عجیب“۔ (کذا فی تفسیر روح المعانی وغیرہ) اس کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے، اس بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حقیقی اطلاق ہے، اور محشی کو کب نے ”جمع الفوائد“ سے بحوالہ بزار و کبیر روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترے تھے تو اپنے ہمراہ کچھ جنتی پھل لے آئے تھے پھر ان کی گٹھلیوں سے موجودہ عجوہ وغیرہ معرض وجود میں آئی ہے، تاہم دنیا میں آنے کے بعد جنت کے اثرات دنیاوی ماحول کی وجہ سے کم یا ختم ہو گئے ہیں، دنیا کا ماحول بعض اشیاء پر زیادہ اثر انداز ہوا ہے جبکہ بعض دیگر پر کم۔ عجوہ کافی حد تک محفوظ ہے۔ واللہ اعلم

عجوہ میں زہر اور سحر سے شفاء بعض کے نزدیک اس کی خاصیت دتا شہر ہے مگر بئذیٰ الحمدو میں ہے کہ امام

خطابی نے اس کی ذاتی خاصیت کی نفی کر کے فرمایا ہے کہ یہ اثر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت ہے، علاوہ ازیں عجوہ دل کی بیماری کے لئے بھی مفید ہے، چنانچہ ابوداؤدؒ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کی غرض سے تشریف لائے پھر اپنا دست مبارک میری دونوں چھاتیوں کے درمیان (یعنی دل پر) رکھا یہاں تک کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس کی، پھر فرمایا ”انک رجل مفود“ یعنی تجھے دل کی بیماری ہے۔ جاؤ حارث بن کلدہ کے پاس وہ طب کا کام کرنے والا آدمی ہے، تو وہ عجوہ کی سات کھجوریں مدینہ کی لے کر گھلیوں سمیت کوٹ لے اور تمہیں کھلا دے۔ نیز سحر اور زہر کے لئے بھی سات کھائے۔ (جیسا کہ ابوداؤد میں ہے، باب فی تمرۃ الحجۃ من کتاب الطب)

فائدہ:- بذل الحجود میں ہے کہ حافظؒ نے ”الاصابة“ اور ابن ابی حاتمؒ دونوں نے فرمایا ہے کہ حارث بن کلدہ (طیب) کا مسلمان ہونا صحیح روایت سے ثابت نہیں، لہذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل ذمہ میں سے ڈاکٹر و طبیب سے علاج کروانا درست ہے۔ نیز اس حدیث میں طبیب کو کیفیت بھی بتلادی۔

قولہ ”والکماء من المن“ جیسا کہ باب کی تیسری حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، میں یہ تاثر بیان ہوا جو عربوں کا زعم تھا کہ کھنسی زمین کا چپک ہے یعنی فاسد مادہ سے پیدا ہوتی ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زعم کو رد فرمایا اور کھنسی کی مدح فرمائی، اور جدید تحقیق سے بھی یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ چپک خراب خون یا مادہ کی وجہ سے نہیں نکلتا بلکہ ایک دائرے کے حملے سے ہوتا ہے۔ اور اگر عربوں کی اس اصطلاح کا مقصد محض تشبیہ ہو کہ جس طرح چپک جسم کے ظاہری حصے پر ہوتے ہیں اسی طرح کھنسی دانوں کی شکل میں روئے زمین پر نکلتی ہے تو پھر حدیث میں اس تشبیہ کی نفی مراد ہوگی، کیونکہ اچھی چیزوں کے لئے بُری مثال بیان نہیں کرنی چاہئے۔ باقی رہی یہ بات کہ اس کا استعمال کس طرح ہے تو اس کے لئے مابعد والی حدیث میں کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کھنسیاں لیں اور ان کو نچوڑا اور ان کا پانی ایک بوتل (شیشی) میں ڈالا پھر اس سے اپنی باندی کو بطور سرمہ لگاتا رہا یعنی ڈالتا رہا تو وہ ٹھیک ہو گئی۔

عارضۃ الاحوزی میں ہے کہ کھنسی کے پانی کی شفاء میں اس اعتبار سے اختلاف ہے کہ اسے کیسے استعمال کیا جائے؟ تو حضرت ابو ہریرہؓ اس کے خالص پانی کے استعمال کے قائل تھے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسے سرمہ میں ملا کر لگایا جائے۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ٹھیک ہیں، کبھی ایک طریقے سے فائدہ ہوتا

ہے، اور کبھی دوسرے سے، دونوں کا تجربہ کیا گیا ہے اور دونوں کے مثبت نتیجے نکلے ہیں۔

حضرت تھانوی صاحبؒ نے ”المسک الذکی“ میں اگلے سے پیوستہ ”باب ماجاء فی تمیید الحمی بالماء“ میں فرمایا ہے: ”پختگی عقیدے سے حق تعالیٰ شفاء دے ہی دیتے ہیں، عقیدے کا، انجارج حواجؒ میں بڑا دخل ہے۔“

باب کی آخری حدیث:- ”عن قتادة قال حَدَّثْتُ ابا هريرة قال: الشونيز دواء من كل داء الاالسام قال قتادة ياخذ كل يوم احدى وعشرين حبة فيجعلهن في خرقة فينقعها فيستعط به كل يوم في منخره الايمن قطرتين وفي الايسر قطرة، والثاني في الايسر قطرتين وفي الايمن قطرة، والثالث في الايمن قطرتين وفي الايسر قطرة“۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ شونیز (کلونجی) ہر مرض کی دوا ہے سوائے موت کے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ روزانہ اکیس دانے لے کر کپڑے میں لپیٹ دے اور پانی میں بھگو دے پھر اس (کے پانی) سے ناک کے دائیں نٹھنے میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ڈالے، اور دوسرے دن بائیں میں دو قطرے اور دائیں میں ایک قطرہ پکا دے، اور تیسرے دن دائیں میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ڈالے۔

یہ روایت ابو نعیم نے طب میں مرفوعاً نقل کی ہے، اس بارے میں پیچھے مستقل باب ”الحبة السوداء“ کے عنوان سے گذرا ہے۔ فلیراجع۔

لغات:- قولہ ”الشونيز“ یضم الشین وسكون الواو وکسر النون کلونجی کو کہتے ہیں، اور اسے حبة السوداء بھی کہتے ہیں۔ قولہ ”السام“ بروزن عام موت کو کہتے ہیں، وقد مر۔ قولہ ”فينقعه“ يفتح الياء مُنقع پانی میں بھگوئی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ پھر ان کو پانی میں اچھی طرح بھگوئے۔ قولہ ”فيستعط“ سحوط سے ہے، ناک میں ڈالنے والی دوا، وقد مر۔ قولہ ”منخر“ اس میں میم پر تینوں حرکات جائز ہیں مگر کسرہ مشہور ہے۔ کلونجی کے بہت سے فوائد مطولات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

باب ماجاء فی اجر الکاهن

”عن ابی مسعود قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: عن ثمن الکلب ومہر البغی وحلوان الکاهن“۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت، زانیہ کے مہر (یعنی اجرت) اور کاہن کی شیرینی (یعنی اجرت) سے منع فرمایا ہے۔

لغات:- قولہ ”مہر البغی“ نفی بروزن قوتی، فاحشہ اور زنا کا رعبوت کو کہتے ہیں، یہاں مہر سے مراد اجرت ہے۔ قولہ ”حلوان“ بروزن غفران، میٹھی چیز کو کہتے ہیں، اس سے مراد اجرت ہے، چونکہ یہ بغیر تعب و مشقت کے ملتی ہے اس لئے اس کو شیرینی سے تعبیر کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بلا عوض مفت میں ملتی ہے۔ قولہ ”الکاهن“ جو آدمی غیب کی خبر دینے کا دعویٰ کرتا ہے یا تاثر دیتا ہو جیسے آج کل کے اکثر عامل کرتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث سے ان تینوں اجرتوں کی ممانعت معلوم ہوگئی البتہ ثمن الکلب ہمارے نزدیک مقید و مشروط بشرط ہے جبکہ باقی دونوں کی تحریم پر اجماع ہے، یہ تینوں مسائل تشریحات ترمذی میں اپنے اپنے متعلقہ ابواب میں گزری ہے۔ (ثمن الکلب کے لئے دیکھئے تشریحات ج: ۵، باب ماجاء فی ثمن الکلب ص: ۲۰۶، مہر البغی کے لئے دیکھئے ج: ۴، باب ماجاء فی کراہیۃ مہر البغی ص: ۵۰۵، اور حلوان الکاهن کے لئے دیکھئے مذکورہ باب کے علاوہ، باب ماجاء فی کراہیۃ اتیان الحائض ج: ۱ ص: ۳۶۲)

اس باب میں کاہن کی تین قسمیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں:

(۱) جو دعویٰ کرے کہ مجھے جنات اخبار غیب بتلاتے ہیں۔

(۲) جو مقدمات سے نتائج اخذ کرنے کا دعویٰ کرے چاہے سائل کی باتوں، کپڑوں، ناخن وغیرہ سے کرے یا کسی اور ذریعہ سے۔

(۳) جو نجوم کی حرکات سے معلوم کرنے کا دعویٰ کرے جس کو عرف میں نجومی کہتے ہیں۔ حضرت

تھانوی صاحبؒ نے عزادہ کو بھی کہانت کی ایک قسم کہا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

باب ماجاء فی احد الکاهن

۱۔ الحديث اخرجه البخاری ص: ۲۹۸ ج: ۱ ”باب ثمن الکلب“ کتاب البیوع، ابو داؤد کتاب البیوع باب: ۶۳، جامع

الترمذی باب: ۴۶ کتاب البیوع.

”یہ عمل عرافہ ہے جو کھانت کی ایک قسم ہے اور محض حرام ہے نیز فی نفسہ حرمت کے ساتھ عوام کے فتنہ میں پڑنے اور گمراہی کا موجب بھی ہے اور دل میں آجانا القاء شیطانی ہے، یہ جواب انہوں نے ایک فتویٰ میں دیا ہے، سائل کہتا ہے کہ دو خصمین کے نام اور عمر اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں جان لیتا ہوں کہ کون غالب ہوگا۔ (تحفۃ العلماء ص ۵۳۰، ناشر البرکتہ)

اسی طرح علم رمل کے متعلق لکھتے ہیں:

”کہ متعارف رمل کی تعلیم و تعلم حرام ہے۔“ (ایضاً ص ۵۳۲)

جبکہ مسریم اور علم الارواح والماضرات کو قوت خیالیہ کا تصرف قرار دیا۔

آج کل کے اکثر عامل بھی اسی قوت فکریہ کے زور پر بعض لوگوں کے نفوس میں تصرف کرتے ہیں، واضح رہے کہ جس آدمی پر دوسرے کا تصرف چل سکتا ہے تو وہ اس کی عقل کی کمی کی نشانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عاملوں کا شکار عورتیں ہوتی ہیں۔

بہر حال علم غیب اللہ کا خاصہ ہے تاہم جو خاصہ ہے وہ حقیقی علم غیب ہے اس تک کسی بھی مخلوق کی رسائی ممکن نہیں اس کا دعویٰ کرنے والا کافر ہے خواہ اپنے لئے اثبات کا دعویٰ کرے یا کسی مقرب فرشتے یا بشر کے لئے جبکہ اس کی دوسری قسم مجازی اور اضافی علم غیب کہلاتا ہے اس کا دعویٰ حرام ہے اور کاہن اسی زمرے میں آتا ہے۔ حضرت تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ غیب کے دو معنی ہیں: حقیقی اور اضافی۔ حقیقی: وہ ہے جس کے علم کا کوئی ذریعہ نہ ہو، یہ خاص ہے حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے لئے اس کا حصول محال عقلی و شرعی ہے۔ غیب اضافی: وہ ہے جو کسی ذریعہ سے بعض کو معلوم کرادیا جائے، کسی (عمل) سحر یا کسی جن کے واسطے سے یا کسی نجومی یا کسی پنڈت کے واسطے سے کسی خبر کا یقین کر لینا خصوصاً جب کہ اس خبر سے کسی بری شخص کو متہم کر دیا جائے ایسا شدید حرام ہے کہ کفر کے قریب ہے۔ جب ان ذرائع کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں اور جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ان پر حکم لگانا کس درجہ سخت گناہ ہوگا جیسے حضرات کرنا، چور کا نام نکالنے کے لئے لوٹا گھمانا، یا آج کل جو عمل مسریم شائع ہوا ہے یہ تو بالکل مہمل اور خرافات ہیں جن میں اکثر جگہ تو عامل کا دھوکہ ہی ہوتا ہے، اور بعض عامل تو دھوکہ باز نہیں ہوتا مگر وہ خود دھوکہ میں ہوتا ہے، اس کو ان اعمال کی حقیقت معلوم نہیں، اول تو چور کا نام نکالنا اس عمل سے اس کا کچھ تعلق نہیں، یہ عامل کے یا کسی صاحب مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسریم کے جاننے پر موقوف ہے، اور حضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں، وہ اگر سب

نہیں تو اکثر اسی قبیل سے ہیں۔

پھر یہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزمایا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا (بشرطیکہ دوسرے عامل کو اس نامزد چور کا علم نہ ہو) خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب تصرفات قوت خیالیہ کے ہیں، تو جیسے کوئی شخص کسی واقعہ میں فکر و خیال کو صرف کر کے کوئی رائے قائم کرے، بس اس سے زیادہ ان اعمال کی کوئی حقیقت نہیں اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ بعض اعمال میں آیات قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان آیات کی تلاوت قوت خیالیہ کے یکسو کرنے کا محض حیلہ ہے ورنہ اصل فعل قوت خیالیہ کا ہے گو آیات نہ پڑھی جائیں جب بھی وہ تصرفات ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر صرف آیات پڑھی جائیں اور خیال کو دوسری طرف متصرف کر دیا جائے تو ہرگز یہ تصرفات ظاہر نہ ہوں، اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ فلاں دفعہ (عمل) اس کے مطابق نکلا، یوں تو آدمی کچھ بھی نہ کرے یوں ہی بکنا شروع کر دے کوئی نہ کوئی بات ٹھیک ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح ان خرافات میں اگر ایک دفعہ کوئی بات سچ نکلتی ہے تو سو دفعہ جھوٹ نکلتی ہے الخ۔ (ایضاً ص ۵۳۳)

اگر طول کا خوف مانع تفصیل نہ بناتا تو اس کی کلیات اور جزئیات اور واقعات کو وسط کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا۔

تنبیہ:- (۱) امور غیبیہ دو طرح کے ہیں: ایک کا تعلق احکام سے ہے اور دوسرے کا اکوان سے، علم احکام کلی طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء ہوا ہے جبکہ امور تکوینیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی حصہ ملا ہے، تاہم علم غیب تکوینی کلی طور پر یا کہنا چاہیے کہ اس کے اصول اور کلیات کا علم اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاصہ ہے، جزئیات منتشرہ پر بہت سے لوگوں کو حسب استعداد اطلاع دی گئی ہے، لیکن یہ تمام جزئیات اللہ کے علم کے مقابلے میں قطرہ بمقابلہ سات سمندر سے بھی کم ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام جس کشتی پر سوار ہوئے تو ایک چڑیا نے آکر اپنی چونچ سمندر میں ڈبو کر نکالی جس پر حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ”یا موسیٰ! مانقص علمی وعلمک من علم اللہ تعالیٰ الا کنقرۃ هذه العصفور فی البحر“۔ (بخاری جلد اول ص: ۲۳، کتاب العلم)

قابل غور ہے کہ ان دو انبیاء علیہم السلام کے پاس انتہائی وسیع علم تھا مگر پھر بھی انہوں نے یہ تشبیہ تقریب الی الفہم کے لئے دی ہے ورنہ اللہ کا علم تو لامتناہی ہے جبکہ سمندر متناہی ہے لہذا یہ نظیر ہے مثال نہیں ہے۔ ہر ہر ذرے اور پتے کا علم صرف اللہ کو ہے، البتہ انبیاء علیہم السلام کو جتنا حصہ ملا ہے اس میں شک کی کوئی

مگناش نہیں کیونکہ ان کے پاس علم بذریعہ وحی آتا ہے اور وحی ذرائع معرفت اور اسباب علم میں سب سے زیادہ مضبوط اور سو فیصد یقینی سبب ہے جبکہ کائناتوں اور نجومیوں کا دعویٰ محض خیال یا فراڈ اور دھوکہ پر مبنی ہوتا ہے، اس کے پاس کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہوتا پس جو چیز اندازوں اور انگلوں پر مبنی ہو اس کا دعویٰ کرنا یا اثبات کرنا غیر حقیقی غیر شرعی اور غیر عقلی ہی کہلانے کا مستحق ہے، یہ کوئی علم نہیں بلکہ تخمین اور دھوکہ دہی ہے۔ لہذا اس پر اجرت لینا بلا عوض لینے کی وجہ سے حرام ہے اگرچہ کوئی خوشی سے دے کیونکہ دھوکہ اسی کو تو کہتے ہیں کہ کسی کو ایسا چکر دے جس سے اس کے اوسان خطا ہو جائیں۔

تنبیہ ۲:- آلات کے ذریعہ جو چیز معلوم کی جاتی ہے جیسے الٹراساؤنڈ میں مرض یا رحم کے احوال معلوم کرنا، ہوا میں نمی کا تناسب معلوم کرنا، یا نبض سے بیماری یا دیگر آلات سے دل کی حرکات وغیرہ معلوم کرنا یہ علم غیب کے زمرے میں نہیں آتے، لہذا ان آلات کے ذریعہ کسی چیز کو معلوم کرنے کا دعویٰ علم غیب کے دعویٰ میں نہیں آتا کیونکہ یہ آلات انسانی دماغ اور عقل کے نتائج ہیں، لہذا ان کا حکم وہی ہے جو انسانی اعضاء کا ہے کہ فرع تابع اصل ہوتی ہے تو جس طرح کسی شے کا علم آنکھوں سے حاصل ہونا علم غیب نہیں تو اسی طرح عینک دور بین اور ایکس رے وغیرہ سے حاصل کردہ علم بھی علم غیب نہیں۔

سوال:- سورہ لقمن (آیت نمبر ۳۴) میں ہے ”ان اللہ عنده علم الساعة، ۱۰ یُنزل الغیث ۱۱ یوعلّم ۱۲ ما فی الارحام“۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رحم کے اندر کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

جواب:- اس میں لفظ ”ما“ عام ہے اس سے فقط لڑکے یا لڑکی ”من“ ہونے کا علم نہیں بلکہ نطفے کی ابتدائی احوال سے لے کر بچے کی ولادت تک تمام حالیہ حالات، اور مستقبل کے احوال حسین و جمیل ہونا، فصیح و بلیغ ہونا اور باقی تمام انسانی کردار کی استعدادات کا علم حتیٰ کہ اس کے علوم اور موت و حیات کی صلاحیت نطفے کے اندر معلوم ہونا سب مراد ہیں جبکہ انسانی ساخت کے آلات یہ جاننے سے قاصر ہیں اگر انی الجملہ کچھ ظاہری شکل نظر آجائے یا نطفے کے جین کی کچھ صلاحیتیں معلوم ہو جائیں تو اس سے تمام تکوینی امور کا علم کہاں لازم آتا ہے۔ آگے چل کر بھی ایسا ممکن نہیں کہ نطفے کو کسی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اس کی تمام صلاحیتیں بالفعل فوراً معلوم کی جاسکیں۔

اگر بالفرض کوئی آلہ ایسا بنا لیا جائے کہ جس سے انسانی ہمہ خوبیاں و خامیاں معلوم کرنے کا کام لیا جاسکے تو پھر بھی کوئی اشکال وارد نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آیت کریمہ میں علم کی بات کی گئی جو یقین کا درجہ ہے جبکہ

آلات کے ذریعہ یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ جزوی یقین یا ظن، اور ظن غالب ہوتا ہے، ایسا با اوقات ہوتا ہے کہ ایک لیبارٹری کی رپورٹ ایک طرح آتی ہے اور دوسری کی دوسری طرح۔ راقم نے خود جگر کے دو اعلیٰ لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کروائے تو ایک نے رپورٹ دی کہ جگر میں درم ہے جبکہ دوسری نے کہا کہ صحیح ہے، ڈاکٹر نے کہا کہ یہ دونوں اچھی لیبارٹریاں ہیں اب ممکن ہے کہ کسی تیسری سے رجوع کیا جائے۔ ایسے واقعات بے شمار رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ اگر شک نہیں تو زیادہ سے زیادہ ظن ہے جبکہ علم کی تعریف شرح العقائد میں یوں کی گئی ہے: ”هو صفة يتحلى بها المذکور لمن قامت هي به“۔ دوسری تعریف ہے: صفة توجب تميزاً لا يحتمل النقيض“۔ اور پہلی تعریف کو دوسری کی طرف راجع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ولكن ينبغي ان يحمل التحلي على الانكشاف التام الذي لا يشمل الظن لان العلم عندهم مقابل للظن“۔ (شرح العقائد ص: ۱۰) کون کہہ سکتا ہے کہ لیبارٹری رپورٹ میں نقیض کا احتمال نہیں ہے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التعليق

”عن عيسى وهو ابن عبد الرحمن بن ابي ليلى قال دخلت على عبد الله بن عكيم ابى معبد الجهنى اعوده وبه حُمرة فقلتُ أَلَا تُعَلِّقُ شَيْئاً؟ قَالَ: الموت اقرب من ذلك، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من تعلق شیئاً وکلَّ الیہ“۔^۱

حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے صاحب زادے عیسیٰ سے روایت ہے کہ میں عبد اللہ بن عکیم کے پاس گیا تاکہ ان کی عیادت کروں جبکہ ان کے جسم پر سرخ دانے (یا درم کے اثرات) ظاہر ہو گئے تھے تو میں نے ان سے عرض کیا، آپ کوئی چیز (تعویذ) آویزاں نہیں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا موت اس سے قریب تر ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی تعویذ (وغیرہ) کو لٹکائے تو وہ اسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔

لغات: - قولہ ”اعودہ“ عیادت بیمار پر سی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”حُمرة“ ایک قسم کے سرخ دانے ہیں جو چہرے اور بدن پر نکلتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ طاعون کی طرح جلد میں پھوڑے کی مانند درم ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التعليق

۱۔ رواه أيضاً النسائي ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب المحاربة، أيضاً مسند احمد ص: ۴۰۳ ج: ۵ حدیث: ۱۸۳۰۴، جمع

قولہ ”الاتعلق شیئاً“ تعلق کے معنی لٹکانے کے ہیں یعنی آپ گلے میں تعویذ وغیرہ نہیں باندھتے ہیں؟۔
 قولہ ”وکل الیہ“ بصیغہ مجہول، بضم الواو وتخفیف الکاف لیسوۃ یعنی وہ اپنے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اللہ کی غیبی مدد اس سے اٹھ جاتی ہے یا مطلب یہ ہے کہ اس سے اعلیٰ توکل کی نعمت مرتفع ہو جاتی ہے۔

تشریح:- یہ روایت محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اپنے بھائی عیسیٰ سے نقل کرتے ہیں، عبد اللہ بن عکیم (بالتصغیر) مخضرمین میں سے ہیں یعنی انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے مگر ملاقات نہیں ہوئی ہے،^۱ عارضۃ الاحوذی اور تحفۃ الاحوذی دونوں کے متن پر یہاں یہ اضافہ موجود ہے:

”وعبداللہ بن عکیم لم یسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان فی زمن

النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقول کتب الینار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔“

ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس موجود ترمذی کے نسخ سے یہ عبارت ساقط ہوئی ہو۔

اس روایت کے مطابق تعویذ باندھنا ناپسندیدہ عمل ہے اور یہی بعض صحابہ کرامؓ و علماء کا مذہب ہے جیسے ابن مسعود، ابن عباس، حذیفہ، اور عبد اللہ بن عکیم رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ، ان حضرات کا استدلال حدیث الباب کے علاوہ ابوداؤد وغیرہ کی حدیث سے بھی ہے جو عبد اللہ بن مسعودؓ سے مرفوعاً مروی ہے: ”ان الرقۃ والتماائم والتولة شرک“۔ (ابوداؤد باب فی تعلق التماائم من کتاب الطب، ص: ۵۴۲، میر محمد کتب خانہ^۲)

اس کے برعکس صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت اور دیگر بعض اہل علم اس کے جواز کے قائل ہیں بشرطیکہ وہ تعویذ آیات قرآنیہ یا اسماء الحسنیٰ وغیرہ پاکیزہ کلمات پر مشتمل ہو، عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عائشہؓ کا مذہب اسی کے مطابق ہے، ان حضرات کے نزدیک جیسا حکم گویا پڑھنے کا ہے اسی طرح تعویذ کا ہے، جھاڑ پھونک کا مسئلہ پہلے گذرا ہے، تاہم تعویذ نہ باندھنا افضل ہے۔

ان کا استدلال ابوداؤد باب کیف الرقی من کتاب الطب میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت

سے ہے:

”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کان یعلمہم من الفرع کلمات ”اعوذ

۱ وقال الحافظ فی تقریب التہذیب، عبد اللہ بن عکیم: بالتصغیر الجہنی، ابو عبد الکوفی مخضرم من الثانیۃ، وقد

سمع کتاب النبی ﷺ الی جہینۃ، مات فی امرۃ الحجاج ص: ۵۱۵ ج: ۲. قدیمی کتب خانہ کراچی

۲ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۵۲ ”باب تعلق التماائم“ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۶۲۹ ج: ۱ حدیث: ۳۶۰۴.

بکلمات اللہ التامة من غضبه ومن شرعباده ومن همزات الشیطنین وان
یحضرون“ و كان عبد اللہ بن عمرو یعلمہن من یعقل من ینہ ومن لم یعقل کنبہ
فاعلقہ علیہ“۔

اس پر صاحب بذل الحجو دیکھتے ہیں: ”فیہ دلیل علی جواز کتابۃ التعاویذ والرقیٰ
وتعالیقہا“۔ (بذل ص: ۱۰ ج: ۶، کتاب الطب)

جبکہ حضرت شاہ صاحب عرف میں اسی باب کے تحت فرماتے ہیں: ”یحوز التعليق باعوذ بکلمات
اللہ التامة الخ... ولعل تعليق ما هو محرب بالطب جائز“۔

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند پر بحث پہلے تفصیلاً گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۲
ص: ۱۵۰، باب ما جاء فی کراہیۃ البیج والشراء وانشاد الضالۃ فی المسجد) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند درجہ حسن تک
پہنچتی ہے، لہذا یہ قابل حجت ہے، دوسری بات یہ ہے کہ تعویذ ڈالنے سے ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے، جو علاج
کا ایک مستقل مفید طریقہ ہے، کیونکہ بہت ساری بیماریوں کا زور نفسیاتی طور سے بھی ٹوٹ جاتا ہے، چنانچہ ابن قیم
زاد المعاد کے حصہ طب میں لکھتے ہیں: ”کہ مستلمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آ جاتی ہے تو نفس
اور طبیعت دونوں قوی ہو جاتے ہیں اور بیماری دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ (دیکھئے طب نبوی فصل: ۳ طریقہ
علاج ص: ۲۹)

جواب:- جن حضرات نے تعویذ کو ناجائز کہا ہے ان کی مستدل روایات کا جواب یہ ہے کہ ان میں
مشرکانہ الفاظ یا مشتبہ کلمات والے تعویذات کی نہی مراد ہے، یا یہ کہ اگر ان کے مؤثر حقیقی ہونے کا عقیدہ ہو تو یہ
عمل شرک ہے یا شرک کی طرف لے جاتے ہیں، چنانچہ صاحب بذل الحجو دیکھتے ہیں: ”قولہ: شرک ای من
افعال المشرکین اولانہ یفرضی الی الشرک اذا اعتقد ان له تاثيراً حقیقۃ“۔ (بذل ص: ۷ ج: ۶)۔

ترمذی کی حدیث کا جواب حضرت گنگوہیؒ نے الکدکب میں یہ دیا ہے کہ یہ عمل توکل کے اعلیٰ درجات
یا توکل مطلق کے منافی ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس میں گناہ ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ ابوداؤد کی مندرجہ بالا روایت سے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ پڑھنے
پر قادر ہوں وہ بجائے تعویذ کے ان کلمات کو حفظ کر کے پڑھ لیا کریں جبکہ چھوٹے بچوں کے لئے اس کے
باندھنے میں کوئی حرج نہیں، نیز بچوں کا ذہن تعویذ کی تاثیر کی طرف نہیں جاتا ہے جبکہ بڑوں کے ذہن کا جلدی

گبڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، نیز اس عمل کو فروغ دینا اور پیشہ بنانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ آدمی اس عمل سے پردے میں رہنے کی کوشش کرے، اگر کوئی زیادہ اصرار کرے تو اسے یہ کہہ کر دیا جائے کہ درحقیقت شفاء دینے والا صرف اللہ ہے، اللہ نے اپنے کلام پاک کو شفاء کا ذریعہ بنایا ہے لہذا اسباب کے درجے میں اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں تو جیسے اس درجہ میں دوا جائز ہے تو تعویذ بھی جائز ہے۔

تنبیہ:- آج کل کے غیر مقلدین اور عربوں میں سے متاثرہ حضرات اس کو شرک کہتے ہیں حالانکہ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت تعویذ کے جواز کی ہے۔ دیکھئے تحفۃ الاحوذی:

اختلف العلماء... فی جواز تعليق التمام التي من القرآن واسماء الله تعالى

وصفاته فقالت طائفة يجوز ذلك وهو قول ابن عمرو بن العاص وهو ظاهر

ماروى عن عائشة وبه قال ابو جعفر الباقر واحمد بنى رواية الخ-

غير مقلدین کی متدل حدیث کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ فلیجز کر

باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء

”عن عبایة بن رفاعه عن جده رافع بن خدیج عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الحمی

فور من النار فابردوها بالماء“۔^۱

”وعن عائشة ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان الحمی من فیح جہنم فابردوها

بالماء“۔ (وکلا الحدیثین صحیح)

عبایہ بن رفاعہ اپنے دادا حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بخار (جہنم کی) آگ کا (اثر) جوش ہے، پس اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ بخار دوزخ کی تپش ہے پس اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔

باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء

۱۔ روی بمعناہ بخاری ص: ۴۶۲ ج: ۱ کتاب بدء الخلق، رواہ مسلم فی کتاب السلام، سنن ابن ماجہ فی ابواب الطب

باب: ۱۸، دارمی فی الرقاق باب: ۵۵، مؤطا مالک عین باب: ۱۶، ۱۵، مسند احمد ص: ۸۰ ج: ۱ حدیث: ۲۶۳۳۔

۲۔ الحدیث اخرجه ايضاً ابن ماجه ص: ۲۵۱ ابواب الطب۔

لغات :- قولہ ”الحُمی“ بضم الحاء وتشدید الحیم والفاء المقصورہ، حاء اور میم کے مادہ میں حرارت کا معنی پایا جاتا ہے، یہاں مراد بخار ہے کیونکہ اس سے بھی درجہ حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قولہ ”فور و فیح“ دونوں میں فاکین مفتوح اور عین کلمتین ساکن ہیں، اور دونوں کے معنی ایک ہیں یعنی حرارت کی شدت اور جوش۔

تشریح :- بخار کو آگ یا دوزخ کی آگ کا اثر اور بھڑاس قرار دینے کا مطلب اس کی شدت حرارت بیان کرنا ہے جو تشبیہ کی ایک قسم ہے جیسے محاورہ میں کسی تنگ جگہ کو قبر اور مجبوس جگہ کو جیل کہا جاتا ہے۔

اس موقع پر زمانہ قدیم کے اطباء نے حدیث شریف پر اعتراض کیا تھا کہ غسل کرنے سے اور بخار والے مریض پر پانی ڈالنے سے تو بخار اور بھی بڑھ جاتا ہے پھر یہ کیسی صحیح ہو سکتی ہے؟؟؟ اس کے جواب میں علماء کرام اور شارحین عظام نے مختلف اور متعدد توجیہات کی ہیں مثلاً یہ زم زم کے پانی کے بارے میں ہے، یا حجاز کے بخار کے متعلق ہے جیسے ”شرق و اوغربوا“ الحدیث سب کے لئے نہیں یا گرمی سے لگنے والے بخار کے بارے میں ہے وغیرہ وغیرہ جن کا نقل کرنا تطویل بلا طائل ہے۔

بخار کے لئے غُسل، جدید تحقیق کی روشنی میں :- جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج کل سائنسی دور ہے اور نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، ان تحقیقات سے ایک طرف قدیم نام نہاد حکماء کے بہت سارے نظریات غلط ثابت ہوئے تو دوسری جانب پیغمبر اسلام کے ارشادات کی تائید و تائید ہوئی، اگر ایسے مسائل کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد بن جائے گی۔ راقم کا اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ ہے اللہ قبول فرما کر اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

من جملہ ان امور میں سے موضوع بحث مسئلہ ہے، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک سائنسی ضابطے کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ حرارت سے شئی پھیل جاتی ہے اور ٹھنڈک سے سکڑ جاتی ہے، اس کی بے شمار فرعیات ہیں مثلاً اگر سائیکل کی ٹائر میں ہوا بالکل پوری ہو مگر جب وہ گرم سڑک پر چلتی ہے تو وہ ہوا پھیل جانے سے ٹائر پھٹ جانے کا سبب بنتی ہے جبکہ گرم پانی برف خانہ میں منجمد ہو کر برف بن جاتا ہے، پس جب کسی چیز کے اندر حرارت جمع ہو جائے اور اس کے مسامات کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ حرارت باہر نکل جاتی ہے اس کے برعکس جب مسامات بند رہیں تو وہ حرارت باہر نہیں نکل سکتی پھر وہ اپنا رد عمل کسی نہ کسی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔

اگر تھوڑا اندر برکیا جائے اور غور سے کام لیا جائے تو انسانی معلوم ہوگا کہ سردیوں میں نظام ہضم تیز ہوتا ہے، پرانے مٹکے کا پانی گرم ہوتا ہے اور سردیوں میں زلزلوں کی شرح زیادہ ہوتی ہے، اس کے برعکس گرمیوں میں

ہاضمہ کمزور رہتا ہے، نئے مکے کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمیوں میں زلزلے کم ہوتے ہیں، کیونکہ پہلی صورتوں میں مسامات بند ہوتے ہیں اس لئے حرارت اندر رہتی ہے باہر نہیں نکلتی سکتی ہے کیونکہ سردیوں میں جسم کے مسامات بند ہوتے ہیں تو معدے کی حرارت تیز ہوتی ہے پرانے مکے کے مسامات بند ہوتے ہیں تو پانی، اندرونی گرمی کی وجہ سے ٹھنڈا نہیں رہ سکتا، یہی سردیوں کے چشموں کا راز ہے کہ اندر زمین گرم ہوتی ہے اس لئے پانی گرم نکلتا ہے اور گیس محبوس ہونے کی وجہ سے زلزلے کا سبب بنتی ہے، جبکہ گرمی میں مسامات کھل جاتے ہیں تو زمین کا پیٹ ٹھنڈا رہتا ہے اس لئے پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، ہاضمہ کمزور ہو جاتا ہے اور زلزلے کم ہو جاتے ہیں، تازہ مکے میں بھی مسامات کھلے رہنے کی وجہ سے پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔

آج سے چند سال قبل تک ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ جب بخار تیز ہو جائے تو مریض کے جسم پر برف کے ٹکڑے رکھے جائیں یا ٹھنڈے پانی کی پٹی کی جائے مگر اب حال ہی میں انہوں نے مندرجہ بالا ضابطہ کی طرف لوٹ کر تسلیم کیا ہے کہ برف کا تجربہ غلط تھا، ہونا یہ چاہئے کہ نارل پانی سے تیز بخار کا ازالہ کیا جائے یعنی اگر موسم گرم ہو تو قل کا پانی تیز بخار والے مریض پر ڈالا جائے اس سے جسم کے مسامات کھل جائیں گے تو اندر کی حرارت مسامات کے ذریعے نکل کر بھاپ اور بخارات بن جائیں گی، اس طرح اندرون درجہ حرارت کم ہو جانے سے جو عبارت ہے بخار سے خود بخود مریض کو افاقہ نصیب ہوگا اور یہ طریقہ کار ہر بخار اور ہر مریض کے لئے مفید ہے بشرطیکہ بخار تیز ہو جس کی طرف حدیث الباب میں اشارہ واضح موجود ہے، لہذا نہ تو یہاں کسی مکان کی قید کی ضرورت ہے اور نہ زمان کی، اور نہ ہی بخار کی تقسیم کی ضرورت ہے، اس بارے میں غلط فہمی کی بنیاد کم بخار یا ٹھنڈے پانی کے استعمال پر تھی۔ فبذا لک فلیر حوا

اس کی مزید وضاحت ”باب الدواوی بالرماد“ سے پہلے والے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ زلزلوں کے اور بھی اسباب ہیں یہ بھی یاد رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک ضابطہ کے مطابق ارشاد فرماتے ان میں بہت سے ضابطے عرفی ہوتے ہیں جو صحابہ کرامؓ کو معلوم ہوتے اس لئے وہ سمجھ پاتے مثلاً کوئی شخص غوی کے سامنے یہ کہے کہ ”زید قائم“ میں دونوں مرفوع ہیں تو اسے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں جو ضابطہ طبی اور سائنسی ہوتے تو صحابہ کرامؓ اپنے بے مثال یقین کی بناء پر اس پر عمل کرتے اور ان کو فائدہ بھی ہوتا اور کوئی شک و اشکال بھی پیش نہیں آتا۔ مگر آج کل ہر آدمی اور خصوصاً پڑھے لکھے جاہل دعوے بہت کرتے ہیں مگر سمجھنے کی کوشش کم کرتے ہیں کہ سمجھنے کے لئے وسیع علم کی ضرورت ہے جو آج کل غناء سے کم نہیں۔

حدیث آخر:- ”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم : کان یعلّمہم من الحمی ومن الاوجاع کلہا ان یقول: بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم من شر کل عرقٍ نَعَارٍ ومن شرِّ حرِّ النار“۔^۱ (حدیث غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بخار اور ہر دکھ درد سے شفاء کے لئے یہ دعاء پڑھنا سکھاتے تھے ”بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم“ الخ یعنی میں پناہ مانگتا ہوں اللہ عظیم کی ہر بھڑکتی رگ کے شر سے اور آگ (بخار) کی حرارت (وشدت) کے شر سے۔

لغات:- قولہ ”الاجاع“ وفتح تحقیق کی جمع ہے ہر قسم کی تکلیف اور دکھ درد کو کہتے ہیں۔ قولہ ”عرق“ بکسر العین وسکون الراء، ہر شے کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں، رگ کو بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اصل ہے اور یہاں یہی رگ والامعنی مراد ہے۔ قولہ ”نعار“ بفتح النون وتشدید العین، یہ لفظ ”یاء“ کے ساتھ بھی منقول ہے، وہ رگ جس میں خون جوش مارنے لگے جیسے ہائی بلڈ پریشر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اضطراب اور بے چینی کا ترجمہ بھی کیا ہے، یہ بھی بلڈ پریشر کے لوازمات میں سے ہے، گویا عرق، نعار بمعنی ہائی بلڈ پریشر کی بے چینی اور شر کے ہنے جس سے کبھی کبھار دماغ کی رگ پھٹ بھی جاتی ہے، تاہم اصل لغت میں ”نعار“ بکری کی آواز کو کہتے ہیں، پس مراد نعرہ لگانے اور آواز دینے والی رگ بھی ہو سکتی ہے۔

تشریح اور جدید تحقیق:- آج کل یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جو رگیں دل سے تمام بدن کو خون سپلائی کرتی ہیں جن کو شریان کہتے ہیں، وہ ہائی بلڈ پریشر اور سخت بخار میں آواز نکالتی ہیں جو آلات سے بہر کیف اور خالی کان سے بھی سنی جاسکتی ہے۔ (فسیمان اللہ)

باب ماجاء فی الغيلة

”عن عائشة عن بنت وہب وہی جُدّامة قالت سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اردت ان انہی عن الغیال فاذا فارس والروم یفعلون ولا یقتلون اولادہم“۔^۱ (حدیث صحیح)

باب ماجاء فی الغيلة

۱۔ الحدیث أخرجه ایضاً ابن ماجہ ص: ۱۳۵ ”باب الغیل“ ابواب النکاح.

حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت جد امہ بنت وہب سے روایت کرتی ہیں فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سنا ہے کہ، میں دودھ پلانے والی کے ساتھ مجامعت سے روکنا چاہ رہا تھا مگر جب دیکھا کہ فارسی اور رومی لوگ ایسا کرتے ہیں اور (اس سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرتے۔ (اس لئے میں نے منع نہیں کیا)

لغات:۔ قوله ”غيلة“ بکسر الغین اس کی تفسیر امام ترمذی نے اسی باب میں امّ مالک سے نقل کی ہے: ”والغیال، والغيلة ان یطأ الرجل امرأته وهی ترضع“، یعنی جب عورت بچے کو دودھ پلاتی ہو تو ان دونوں میں اس سے ہم بستری کرنا غیلہ اور غیال ہے۔ علیٰ ہذا غیال بھی بکسر الغین ہے۔

تشریح:۔ عربوں میں یہ بات مشہور تھی کہ جب عورت کے ساتھ دورانِ رضاعت مجامعت کی جائے تو چونکہ اس سے حمل ٹھہرنے کا امکان رہتا ہے پھر دودھ خراب یعنی نرم اور فاسد ہو جاتا ہے جس سے دودھ پیتے بچے کو صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے نقصان اور ضعف لاحق ہو جاتا ہے، پھر کل وہ گھوڑے پر شہسواری میں کمزور ہوتا ہے اور یہ بات فی الجملہ کسی حد تک صحیح تھی کہ جن لوگوں کے بچے جلدی جلدی پیدا ہوتے ہیں وہ ماں کا دودھ پوری مدت تک نہیں پی سکتے ہیں، اگر پیتے بھی ہیں تو دونوں صورتوں میں ان کی ہڈیاں اور پٹھے مضبوط و طاقتور نہیں ہوتے ہیں اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا جیسا کہ نسائی و ابوداؤدؒ میں ہے: ”لا تفتلوا اولادکم سرّاً فان الذخیل یدرک الفارس فیدعثره عن فرسه“۔ (لفظہ لابی داؤد، باب فی الغیل، کتاب الطب) یعنی اپنی اولاد کو خفیہ لہ لیتے سے قتل مت کرو کہ زمانہ رضاعت میں جماع کا اثر گھڑسوار پر ظاہر ہو کر اسے گھوڑے سے پچھاڑتا ہے، تاہم ضروری نہیں ہے کہ زمانہ رضاعت میں جماع سے حمل ٹھہر جائے کیونکہ دودھ پلانے کی مدت میں عموماً ماہواری نہیں آتی ہے، دوسرے حمل ٹھہرنے کا امکان ویسے بھی ان دنوں میں کم ہوتا ہے اور اسی نکتے کو آج کل خاندانی منصوبہ بندی والے ملحوظ رکھے ہوئے ہیں، پہلے وہ کہتے تھے کہ بچے کو بوتل کا دودھ پلاؤ مگر جب شرح پیداوار بڑھ گئی تو پریشان ہو کر اب کہتے ہیں کہ بچے کی صحت کے لئے سب سے اچھی غذا ماں کا دودھ ہے، نمبر تین حمل کی ابتدائی دنوں میں دودھ ٹھیک ہی رہتا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس اور رومیوں پر قیاس کرتے ہوئے اس نہی کو جزوی طور پر منسوخ فرمایا کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے ورنہ

توروی اور فارسی لوگ گھوڑے پر تھننے سے قاصر ہوتے، نیز ان لوگوں کی طب پر نظر ہے اور آبادی بھی بڑی تعداد میں ہے جس سے معلوم ہوا کہ نقصان کا اندیشہ بہت کم ہے اس لئے اجازت عنایت فرمائی، ہاں عربوں کے مقابلے میں وہ کمزور تھے اس لئے پہلے منع فرمایا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیاس اور اجتہاد فرماتے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ (کذا فی البذل) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ کبھی نبی کی حکمت دفع مفسدہ ہوتا: ”وین فی مواضع ان الحکمة فیہا دفع مفسدۃ کالنبی عن الغیلة اتمامہ مخافة ضرر الولد“۔ (قالہ فی مقدمۃ کتابہ)

باب ماجاء فی دواء ذات الجنب

”عن زید بن ارقم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کان ینعش الزیت والورس من ذات الجنب قال قتادة ویلکذ من الجانب الذی یشتکیہ“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذات الجنب سے شفاء کے لئے زیتون کے تیل اور ورس کی تعریف فرماتے، قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ دوا اسی جانب سے منہ میں ڈالی جائے جس جانب تکلیف ہو۔

لغات مع تشریح:۔ قولہ ”الزیت“ روغن زیتون۔ قولہ ”الورس“ بروزن شمس ایک قسم کا پودا جو رنگائی کے کام میں لایا جاتا ہے، ہندوستان، عرب اور ملک حبشہ (ایتھوپیا) میں پیدا ہوتا ہے، خصوصاً یمن میں۔ قولہ ”ذات الجنب“ یہ تسمیۃ الحال باسم محل ہے، وہ درد جو پسلیوں کے نیچے محسوس ہوتا ہے، اس کو ذات الرئة بھی کہتے ہیں یعنی پھیپھڑوں کی سوزش، بعض حضرات نمونیا پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی جو ورم اور سوزش کی وجہ سے ہو، دوسری جو ریح کی بناء پر ہو، حاشیہ پر حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہاں یہی عربی یعنی وجع ریجی مراد ہے، جبکہ حقیقی درد سینے کی جھلی میں سوزش، یا پھیپھڑوں کے متاثر ہونے یا دل کی دائیں جانب کے بڑا ہونے سے ہوتا ہے، اس کے ماتھ اکثر بخار بھی ہوتا ہے اور سانس لینے میں

دشواری بھی ہوتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے باب کے آخر میں یہی معنی مراد لیا ہے، ”و ذات الحنطب یعنی السِّل“ سل پھیپھڑوں کی بیماری کو کہتے ہیں جس میں یہ بیماری زخم کی وجہ سے ہوتی ہے گویا نمونیا طرز کی بیماری ہوتی ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مطلب زیادہ قرین قیاس ہے ہاں البتہ کھانسی (ٹی بی) کے لئے قُسط بحری مفید ہے کہ گرم بھی ہے اور خشک بھی۔

باب کی اگلی حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم ذات الحنطب کا علاج کُٹ اور زیتون سے کریں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قُسط بحری سے مراد کُٹ ہے اس کو ”کوٹ“ اور ”کوٹھ“ بھی لکھتے ہیں، اسے بحری اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ہندوستان سے براستہ سمندر لائی جاتی تھی، مسلمؒ کی روایت میں عود ہندی کا لفظ آیا ہے اسے کُست بھی کہتے ہیں، یہ ایک جڑی ہے جو کشمیر کے اونچے پہاڑوں میں پائی جاتی ہے عموماً چرواہے اس کو لاکر بازار میں بیچتے ہیں۔ راقم کو بچپن میں طاقت کی غرض سے اور سایہ سے شفاء کے لئے دی گئی تھی جس کا بڑا مثبت نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ عود ہندی کی دو قسمیں اور بھی ہیں مگر وہ خوشبو میں استعمال ہوتی ہیں، یہاں وہ دونوں مراد نہیں، ایک عود ہندی عطری کہلاتی ہے جسے ”اگر“ کہا جاتا ہے اور جس سے اگر بتیاں بھی بنائی جاتی ہیں، اور دوسری ”قُسط اظفار“ اس کو کُست بھی کہتے ہیں اور اظفار الطیب بھی، یہ بھی ایک قسم کی خوشبو ہے، یہ آخری دونوں قسمیں یہاں مراد نہیں۔

تکملۃ فتح الملہم میں ہے کہ اظفار الطیب کو اردو میں ”نخ“ کہتے ہیں۔ (تکملۃ فتح الملہم ص: ۳۴۹)

(ج: ۳)

بعض اطباء نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ ذات الحنطب گرمی سے پیدا ہوتا ہے لہذا اس کا علاج کسی سرد دوا سے ہونا چاہئے کیونکہ علاج بالصد ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں کیونکہ علاج بالشل بھی ہوتا ہے اور علاج بالصد کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، علاوہ ازیں حاشیہ میں امام نوویؒ نے بحوالہ طیبی نقل کیا ہے کہ حکیم چالینوس وغیرہ نے بھی قُسط بحری کو ذات الحنطب کے لئے مفید قرار دیا ہے۔

باب

”عن عثمان بن ابی العاص انه قال اتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبی وجع قد کادیہلکونی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: امسح بيمينک سبع مرات وقل اعوذ بعزة اللہ وقدرته وسلطانہ من شر ما اجد قال ففعلت فاذهب اللہ ما کان بی فلم ازل أمره به اهلی وغیرہم۔“
(حسن صحیح) ^۱

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے جبکہ مجھے درد کا ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جو قریب تھا کہ مجھے ماردیتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا داہنا ہاتھ درد والی جگہ پر سات مرتبہ پھیر دو اور یہ دعاء پڑھو: اعوذ بعزة اللہ الخ حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ نے وہ درد دور فرما دیا پس میں تو ہمیشہ اپنے گھر والوں اور دوسروں کو اس کی تجویز دیتا ہوں۔

تشریح:- یہ ایک روحانی علاج ہے جس کے متعلق... امین قیّم زاد المعاد ”طب نبوی“ میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آتی ہے تو نفس اور طبیعت دونوں قوی ہو جاتے ہیں اور بیماری کے دور کرنے میں اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے میں پوری مدد دیتی ہے، اس سے چند طور پہلے لکھتے ہیں: ادویہ قلبیہ ادویہ روحانی قوت قلب، اعتماد علی اللہ، اسی سے سب کچھ مانگنا، اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار، اپنی بے کسی کا اظہار، بے چارگی کا بیان، صدقہ، دعا، توبہ، استغفار، مخلوق کے ساتھ بھلائی، درمندوں کی فریادری، مصیبت زدگان کی یاورى، یہ سارے طریقے علاج کے جو خود مذہب اسلام نے اور دینا کے دوسرے مذاہب کے متبعین نے بار بار آزمائے ہیں، ان میں شفا کا وہ انداز، تاثیر کی وہ تیزی انہیں نظر آئی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے تجربہ کار اور حاذق طبیب بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ (طب نبوی ص: ۳۱، فصل: ۳)

راقم نے خود اس کا تجربہ کچھ یوں کیا ہے کہ کلفٹن اور ڈیفنس کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے جو امریکہ سے پڑھ کر آیا تھا اس نے سو فیصد یقین سے میرے گلے میں کینسر کی تشخیص کی تھی اور آپریشن کرنے میں اتنی جلدی کر رہا تھا کہ عید کے دن سے بھی تاخیر کو جان لیوا قرار دیتا تھا اور کہتا کہ اگر کچھ ہوا تو ذمہ داری آپ کی اپنی

باب

ہوگی، اللہ کے فضل سے میں آج اس کے بعد سات سال تک زندہ ہوں گو کہ میں نے پھر آغا خان ہسپتال سے آپریشن کروایا مگر وہ دانہ ختم نہیں ہوا، پھر میں نے سورۃ مجادلہ چالیس روز تک پڑھنے کا التزام کیا اور بفضلہ تعالیٰ 2003 سے 2010 تک زندہ ہوں۔ والحمد للہ علی ذالک

حال ہی میں جاپان کے ایک سائنس دان پروفیسر مسارو ایمو تو کی تحقیق آئی ہے کہ جب پانی پر بسم اللہ یا قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں تو خوردبین میں وہ پانی پھولوں کی طرح دکھائی دیتا ہے جبکہ شیطانی الفاظ پڑھ کر دم کرنے سے پانی کے قطرے ڈراؤنی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

باب ماجاء فی السننا

”عن اسماء بنت عُمیس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: سألها بما تَسْتَمِشِينَ؟ قالت بالشُّبْرِمِ اقال: حارٌّ قالت نم استمشیْتُ بالسَّنَفِ اقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لو ان شیئاً کان فیہ شفاء من الموت لکان فی السننا“۔ (حدیث غریب) ۱

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم کونسی مسہل (جُلاب) استعمال کرتی ہو؟ کہنے لگیں ”شبرم“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو بہت گرم کھینچنے والی چیز ہے فرماتی ہیں کہ پھر میں سنا سے اسہال لینے لگی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اگر کسی چیز میں موت سے شفاء ہوتی تو سنا میں ہوتی۔

لغات مع التشریح:- قوله ”تَسْتَمِشِينَ“ واحد مؤنث مخاطبة کا صیغہ ہے اس میں سین طلب کے لئے ہے اور مشی کے بارے میں پہلے گزرا ہے کہ دست آورد کو کہتے ہیں یعنی مسہل اور جلاب۔ قوله ”الشبرم“ بضم الشین وسکون الباء وضم الراء یہ چنے کے دانوں کے برابر بیج ہوتے ہیں جن کو ابال کر پانی پیاجاتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ کسی درخت کی جڑ کا چھلکا ہوتا ہے۔ قوله ”حار حار“ پہلا لفظ حاء بغیر نقطے کے ساتھ ہے جس کے معنی گرم کے ہے مگر دوسرے لفظ میں متعدد روایات ہیں، بعض نے اس کو حاء کے ساتھ پڑھا ہے، علی ہذا یہ اول کی تاکید ہے۔ بعض نے اس کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، پھر یہ تکیہ کلام ہے۔ تیسرا قول وہی ہے جو ہمارے

نہنوں کے مطابق یعنی جیم کے ساتھ ہے، اس کو بھی اکثر شارحین نے تاکید اور تکیہ کلام پر محمول کیا ہے مگر حضرت گنگوہیؒ الکو ب میں فرماتے ہیں کہ اس کو اول کا تابع یعنی تاکید بنانا صحیح نہیں بلکہ یہ تائیس کے لئے ہے اور جر سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کہ ضرورت سے زیادہ دست آور ہے اور معدے کے تقریباً تمام مواد کو کھینچ کر ضرر اور ضعف کا موجب بنتا ہے۔ اور ترجمہ میں اسی کو لیا ہے۔ قولہ ”بالسنا“ ایک پودا ہے جس کی پتیاں دست آور اور مسہل ہیں۔ راقم اس کو کافی عرصہ سے استعمال کر رہا ہے، بہت مفید ہے، قبض کشا بھی ہے، اور دیگر امراض کے ازالہ میں بھی معاون ہے خصوصاً سناے کی گو کہ اس کا نام پنساریوں نے سناے کی ہی مشہور کیا ہے، اس کے فوائد کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی چیز موت سے شفاء بخش ہوتی تو وہ سنا ہوتی، آخر یہ تعبیر ترغیب ہی کے لئے تو ہے کہ اسے استعمال میں رکھا جائے، اس لئے بعض اطباء تو اسے ہر نسخہ میں یا اکثر ادویات میں شامل کرتے ہیں البتہ اس کا استعمال اپنے طور پر نہیں بلکہ ماہر نباتات یا ماہر طبیب کے مشورے سے ہونا چاہئے۔

باب ماجاء في العسل

”عن ابی سعید قال جاء رجل الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: اِنَّ اَخِي استطلق بطنه فقال اِسْقِه عَسَلًا ففسقاه، ثم جاء فقال یا رسول اللہ! انی قد سَقَيْتُهُ فلم یزده الا استطلاقًا قال فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صدق اللہ وکذب بطن اَخیک اِسْقِه عَسَلًا ففسقاه فَبَرًّا“۔ (حدیث حسن صحیح) ۱

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ چالو ہو گیا ہے (یعنی کثرت سے دست آرہے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُسے شہد پلاؤ چنانچہ اس نے پلا دیا، وہ شخص پھر آیا اور کہا اے اللہ کے رسول! میں نے اس کو پلا ہی دیا مگر اس نے تو پیٹ کی روانی میں اور اضافہ کر دیا، ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

باب ماجاء في الغسل

١. الحديث أخرجه البخاري ص: ٨٣٨ ج: ٢ "باب الدواء بالعسل" كتاب الطب، ايضاً ص: ٨٥١ ج: ٢ كتاب الطب، صحيح مسلم ص: ٢٢٤ ج: ٢ كتاب السلام، مسند احمد ص: ٣٩٤ ج: ٣ حديث: ١٠٤٢٢، ١٠٤٢٣، ١١٢٦١ جمع الفوائد ص: ٢٢٩ ج: ٢. الحنفى عفى عنه

وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے (کہ ”فیہ شفاء للناس“) مگر تیرے بھائی کا پیٹ غلط کرتا ہے، اس کو (پھر) شہد پلاؤ تو اس نے پھر پلایا چنانچہ وہ ٹھیک ہو گیا۔

لغات: ”استطلق“ اس کو مجہول و معروف دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے یعنی پے در پے دست آرہے ہیں، بخاری کی روایت (ص: ۸۵۱ ج: ۲) میں اسی طرح ہے جبکہ دوسری (۸۴۸ ج: ۲) میں ”یشتکی بطنہ“ ہے۔ قولہ ”و کذب طبن اعیک“ یہاں کذب کی نسبت بطن کی طرف مجازاً ہے کیونکہ صدق و کذب اقوال کے اوصاف ہیں مگر عرب خطا اور غلطی پر بھی کذب کا اطلاق کر کے قائل کے بجائے فاعل و عامل کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں یعنی تیرے بھائی کے پیٹ نے شفاء والی چیز کو قبول نہیں کیا۔

تشریح:۔ بخاری نے کی روایت میں ہے کہ وہ شخص تین مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست روکنے کے لئے اسے شہد پلانے کا مشورہ دیا، اس پر بظاہر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ شہد تو گرم اور مسہل یعنی دست آور ہے پھر اس حکم کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ طریقہ کار کوئی قاعدہ کلیہ کے طور پر نہیں بتایا کہ گویا ہر اسہال کے مریض کو شہد پلایا جائے حتیٰ کی مذکورہ اعتراض وارد ہو جائے (گوکہ بعض صحابہ کرام نے اس سے حکم کلی سمجھا تھا اور وہ ہر بیماری میں شہد پیتے تھے) بلکہ کچھ مواد فاسد ہو کر پیٹ سے نکلنے والے تھے جس کے اخراج کے لئے شہد مفید و معاون ثابت ہوا، یہ نکتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ جب پیٹ فاسد مواد سے فارغ ہوگا تو خود بخود ڈھیک ہو جائے گا، وہ آدمی اس حکمت کو نہیں جانتا تھا، یہ طریقہ علاج بالمثل کہلاتا ہے جو بعض مواقع میں مفید ثابت ہوتا ہے لہذا یہ اس شخص کے لئے خصوصی طریقہ علاج تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا طبی اصول سے معلوم ہوا تھا، یا پھر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار معجزہ کے لئے تھا جو خرق عادت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ (کذا فی العارضة)

پس نہ تو اس حدیث کو ضابطہ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس آیت ”فیہ شفاء للناس“ کے کو عام لینا چاہئے کیونکہ بعض امراض شہد کے استعمال سے مزید بگڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولم يذكره على العموم... وقد كان جماعة من الصحابة يتناولونه على ظاهره ويشربون في أدوائهم العسل ممزوجاً بالماء والزيت... ولا يخفى ان من

الامراض ما اذا شرب صاحبه العسل خلق الله الآلَم بعده وان قوله (تعالى) في العسل "فيه شفاء للناس" انما هو في الاغلب۔ الى آخر ما حررناه

باب

”عن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال: ما من عبد مسلم يعود مريضاً لم يحضر اجله فيقول سبع مرات: اسأل الله العظيم بالعرش العظيم ان يشفيك إلا عوفي“۔ (حسن غريب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جو شخص کسی ایسے مریض کی عیادت کرے جس کی اجل پوری نہ ہوئی ہو اور وہ یہ دعا ”اسئل اللہ العظیم“ الخ سات مرتبہ پڑھے تو اس کو ضرور شفاء ہوگی۔

باب

”ثوبان عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا اصاب احدكم الحمى فان الحمى قطعة من النار فليطفها عنه بالماء فليستقع في نهر جار فليستقبل جرته، فيقول: بسم الله اللهم اشفي عبدك وصدق رسولك، بعد صلوٰۃ الصبح وقبل طلوع الشمس وليغمس فيه ثلاث غمسات، ثلاثة ايام فان لم يبرأ فثلاث فخمس فان لم يبرأ فخمس فسبع فان لم يبرأ ففى سبع فتسع فانها لا تكاد تجاوز تسعاً باذن الله“۔ (هذا حديث غريب)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم میں سے کسی کو بخار ہو جائے تو چونکہ بخار آگ کا ایک ٹکڑا ہے اس لئے اس کو پانی سے بجھا کر دور کرے یعنی جاری نہر میں داخل ہو جائے اور اس کی بہاؤ کی جانب منہ کر کے یہ دعا پڑھے: ”بسم اللہ اللہم اشفہ“ الخ یہ کام صبح کی نماز کے بعد اور سورج نکلنے سے پہلے کرے اور چاہئے کہ (نہاتے وقت) تین غوطے لگائے، تین دن تک ایسا کرے، پس اگر تین میں ٹھیک نہ ہو تو پانچ دنوں تک کرے، اگر پانچ میں اچھا نہ ہو جائے تو سات دن تک ایسا کرے، اور اگر سات میں بھی ٹھیک نہ ہو جائے تو نو دن تک یہ عمل کرے کیونکہ اللہ کے حکم سے وہ نو دنوں سے زیادہ نہیں

بڑھ سکے گا۔

لغات :- ”فلیطفہا“ اطفاء سے ہے بمعنی بجھانے، روایت اگرچہ بغیر ہمزہ کے ہے مگر قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ فاء کے بعد ہمزہ ہو ”فلیطفہا“۔

قولہ ”فلیستنقع“ استنقع کے معنی پانی کے تالاب وغیرہ میں غسل کے لئے اترنے کے ہیں، یہ فلیطفہا کا بیان ہے اور خود مبتین ہے، اس کا بیان ”فلیستقبل“ نے کیا ہے۔ قولہ ”حریثہ“ بکسر الجیم پانی کی رَو اور بہاؤ کو کہتے ہیں۔

تشریح :- بخار کا علاج پانی کے ذریعہ کرنے کی بحث اور جدید تحقیق کی روشنی میں تفصیل ”باب ما جاء فی تبرید الحمی بالماء“ میں گزری ہے وہیں دیکھ لی جائے، مزید یہ ہے کہ جو ضابطہ وہاں بتلایا گیا تھا اس کے مطابق اصل بات جسم کی اندرونی گرمی کو خارج کرنا اور درجہ حرارت کو کسی نہ کسی طرح کم کرنا ہے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کے جسم میں ایک خود کار لیول ودیعت فرمایا ہے، اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جسم کے اندر ۹۸.۶ فارن ہیٹ درجہ حرارت کو محفوظ رکھتا ہے خواہ باہر کا موسم کیسا ہی ہو یعنی شدید گرمی ہو یا سخت سردی ہو مگر اندر کا درجہ حرارت اسی طرح ۳۶ سینٹی گریڈ رہتا ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسم کے اندر اس قسم کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جو اس لیول کو متاثر کرتے ہیں نتیجہً جسم کی اندرونی گرمی کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور کھال کی سطح پر ٹھنڈکی وجہ سے مسامات بند ہو جاتے ہیں اس طرح گرمی کے اخراج کا عمل فیل ہو جاتا ہے، چونکہ قوت حاسہ کھال میں ہے اس لئے بخار میں مریض کو سردی لگتی ہے اگرچہ اندر شدید گرمی ہوتی ہے، بخار کے اتارنے کے لئے جو ادویات دی جاتی ہیں ان میں دو طرح کے اثرات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے (۱) جو ان جراثیم کو ختم کر دیں۔ (۲) جو اس لیول کے عمل کو بحال کر کے گرمی کا بیرون جسم منتقل کرنے کا عمل بحال کر کے گرمی کا اخراج کریں۔

صاف پانی میں اللہ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ان جراثیم کو چُن چُن کر ہلاک کر دیتا ہے، دوسرے اس سے مسامات کھل جانے سے اندر کی گرمی بھاپ بن کر خارج ہو جاتی ہے، لہذا حدیث باب میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ کئی فوائد پر مشتمل ہے مثلاً صبح کے وقت پانی صاف ستھرا بھی ہوتا ہے اور صبح کے وقت غسل سے آدمی ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہو جاتا ہے جس کا اپنا اثر بھی ہے، اور نفسیاتی اعتبار سے بھی مفید ہے، نیز دعاء اور سنت کے مطابق روحانی علاج کے ثمرات بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

باب التداوی بالرماد

”عن ابی حازم قال سئل سهل بن سعدؓ وانا اسمعُ: بِأَيِّ شَيْءٍ دُوِيَ جُرْحَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ: مَا بَقِيَ أَحَدًا عَلِمَ بِهِ مَنِي كَانَ عَلَى يَأْتِي بِالْمَاءِ فِي ثُرْسِهِ وَفَاطِمَةَ تَغْسِلُ عَنْهُ الدَّمَ وَأُحْرِقَ لَهُ حَصِيرٌ فَخُشِيَ بِهِ جُرْحُهُ“۔ (حدیث حسن صحیح) ۱

حضرت ابو حازم فرماتے ہیں کہ سهل بن سعدؓ سے دریافت کیا گیا جبکہ میں (یہ گفتگو) سن رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کا علاج کس چیز سے کیا گیا تھا؟ تو حضرت سهل نے فرمایا کہ اس بارے میں مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں بچا ہے، علیؓ اپنی ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے اور فاطمہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون دھوتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک چٹائی (بوریا) جلادی گئی اور اسی (راکھ) سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کو بھر دیا گیا۔

لغات: - قولہ ”الرماد“ بالکسر راکھ کو کہتے ہیں۔ قولہ ”دوی“ مجہول کا صیغہ ہے جیسے دوی۔ قولہ ”جرح“ بضم الجیم، چوٹ اور زخم کو کہتے ہیں، جمع جروح آتی ہے۔ قولہ ”ترسہ“ بضم التاء ترس، سپر اور ڈھال کو کہتے ہیں۔ قولہ ”حصیر“ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی اور بوریا، ٹاٹ۔ قولہ ”فحشی“ بصیغۃ مجہول، جشو بھرتی کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس سے کسی چیز کو بھرا جائے جیسے تکیہ میں روٹی وغیرہ۔

تشریح: - یہ روایت بخاری کی کتاب المغازی (ص: ۵۸۳ ج: ۲) پر بھی آئی ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ جب اس زخم پر راکھ لگا دی گئی تو ”فاستمسک الدم وکسرت رباعيته يومئذ وجرح وجهه وکسرت البيضة على رأسه“، مگر واضح رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رباعی دانت پورا شہید نہیں ہوا تھا بلکہ صرف ایک چھوٹا سا کلکڑا لگ ہو گیا تھا اور ساتھ نچلا ہونٹ مبارک بھی زخمی ہوا تھا، یہ عتبہ بن ابی وقاص کے تیر لگنے کی وجہ سے ہوا تھا، اس خون دھونے کی وجہ بخاری کی روایت کے مطابق اسے روکنا تھا جبکہ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں: ”أما غسل الدم فلازالة النجاسة إن قلنا إن دمه نجس، وإزالة التلويث إن قلنا إن دمه

باب التداوی بالرماد

۱۔ الحدیث رواہ البخاری ص: ۵۸۳ ج: ۲ کتاب المغازی، ایضاً بخاری ص: ۸۵۲ ج: ۲ ”باب حرق الحصیر لسید بہ الدم“ کتاب الطب، ایضاً رواہ مسلم کذا فی جمع الفوائد ص: ۲۴۷ ج: ۲۔

طاہر۔“

جہاں تک حصیر یعنی چٹائی یا بوریا اور ٹاٹ جلا کر اس کی راکھ زخم پر ڈالنے کا تعلق ہے تو یہ بھی بخاری کی روایت کے مطابق خون روکنے کے لئے تھا ”فلسمارات فاطمة ان الماء لا یزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحرقتهافاً لصقتها فاستمسک الدم“۔^۱

جدید تحقیق:- انسانی جسم میں کسی عضو کے زخمی ہونے کی صورت میں اور بالخصوص زنگ آلود لوہے یا آلودہ چیز سے چوٹ آنے سے زخم میں ایسے جراثیم داخل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جن سے تشخ (ٹینٹس) کا خطرہ ہوتا ہے جس کے لئے آج کل ٹیکے لگائے جاتے ہیں مگر آگ میں اللہ عزوجل نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ اگر کوئی جگہ یا چیز آگ سے جلادی جائے تو وہ جراثیم مکمل طور سے ختم ہو جاتے ہیں گویا پھر ٹیکہ لگوانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کوئی سوتی کپڑے کو جلا کر گرم راکھ اگر زخم پر رکھ دی جائے یا گرم پانی سے دھویا جائے تو وہ جگہ جراثیم سے صاف ہو جاتی ہے۔

غرض یہ ایک روایتی علاج تھا اور ہمارے یہاں آج بھی مروج ہے اس کا مقصد صرف خون بند کرنا ہوتا تھا مگر آج ثابت ہوا کہ یہ جراثیم کش بھی ہے۔

اس حدیث میں حضرت سہل بن سعدؓ کا یہ فرمانا کہ ”ما بقی احد اعلم به منی“ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی نیک غرض مثلاً ترغیب کے لئے یا مسئلہ کو موثر بنانے کے لئے ایسا دعویٰ و اظہار کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے عجب وغیرہ خرابی کا اندیشہ اپنے حق میں یا دوسرے کے حق میں پیدا نہ ہو اور اسی طرح دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی ہو۔

حاشیہ بخاری پر بحوالہ کرمانی اس حدیث سے کچھ اور مسائل بھی مستنبط کئے گئے ہیں: (۱) اس نے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام پر آزمائشیں اور بیماریاں آتی تھیں تاکہ وہ اس کا اجر بھی حاصل کریں۔ (۲) اور تاکہ امت کو اس پر چلنا یعنی صبر کرنا آسان ہو۔ (۳) اور یہ کہ معلوم ہو کہ انبیاء بھی بشر ہیں ان کو وہ تمام عوارض لاحق ہو سکتے ہیں جو عام انسانی جسموں کو لاحق ہوتے ہیں۔ (۴) اور یہ کہ یقین ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام مخلوق ہیں اس طرح وہ معجزات دیکھنے سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ (جیسا کہ بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بعض نے نبی علیہ السلام کی بشریت سے انکار کر دیا ہے) (۵) اس میں خود وغیرہ ہتھیار پہننے کا استحباب معلوم

ہوا اور یہ کہ یہ توکل کے منافی نہیں۔ (بخاری ص: ۵۸۴ ج: ۲، حاشیہ نمبر: ۲)

باب

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا دخلتم علی المریض فَنَفْسُوْاْ لَهُ فِیْ اَجَلِهِ فَاَنْ ذَاكَ لَا تَرُدُّ شَيْئًا وَّيُطَلَّبُ نَفْسُهُ“۔ (هذا حدیث غریب) ^۱

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اس کے لئے دراز کی عمر کی بات (دعا) کرو کیونکہ تمہاری بات کوئی چیز (موت) دور تو کر نہیں سکتی مگر اس کے دل کو خوش کر لے گی۔

لغات: بقولہ ”فَنَفْسُوْاْ لَهُ“ تنفیس سے ہے، اس کے صلہ میں ”عن“ بھی آتا ہے، اس کے معنی خوش کرنے، تسلی دینے اور سکون بخشنے کے ہیں۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی کی عیادت کرو تو اس مریض کے سامنے ہمت بڑھانے اور صحت و شفاء کی امید بیدار کرنے کی باتیں کرو مثلاً یہ تو معمولی بیماری ہے، آج کل تو اس سے زیادہ سخت بیماریوں کا علاج ایسا آسان ہے جیسے چیونٹی کا دم وغیرہ، کیونکہ ان باتوں سے اگرچہ اسے تشفی تو نہیں ہوگی اور نہ ہی تقدیر و قضاء میں رد و بدل ممکن ہے مگر اس بیچارے کا دل تو خوش ہوگا اس کو تسلی تو ضرور ہوگی۔

اس سے ایک طرف یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اور خصوصاً پریشان حال کا دل خوش کرنا چاہئے۔ دوسری طرف عیادت کا طریقہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے سامنے خوش افزا باتیں کی جائیں، اس کے لئے درازی عمر اور شفاء کی دعا کی جائے اور اس کو مرض کے فضائل یعنی اس کا رفع درجات کا ذریعہ ہونا اور گناہ کا کفارہ ہونا بیان کرے، اور یہ کہ موقعہ کی مناسبت سے بیٹھنے میں یہ خیال رکھے کہ کہیں مریض کو یا گھر والوں کو زیادہ بیٹھنے سے تکلیف تو نہ ہوگی، اس لئے عام آدمی کو چاہئے کہ مقدارِ فوائِدِ ناقہ سے زیادہ نہ بیٹھے الا یہ کہ زیادہ بیٹھنے میں کوئی فائدہ ہی نہ ملے۔

آخر ابواب الطب واول ”ابواب الفرائض“

باب

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً ابن ماجه ص: ۱۰۴ ”باب ماجاء فی عیادة المریض“ ابواب الجنائز۔ حقیق الرحمن لکھی

ابواب الفرائض

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

باب ماجاء في من ترك مالا فلورثته

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ترك مالا فلأهله ومن ترك ضیاعاً فإلی“۔ (حدیث حسن صحیح)^۱

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے (موت کے بعد) مال چھوڑا تو وہ اس کے گھر والوں (ورثہ) کا ہے، اور جو شخص محتاج اولاد چھوڑے تو وہ میرے ذمہ ہے۔

لغات: بقولہ ”الفرائض“ فریضۃ کی جمع ہے جیسے شرائط جمع ہے شریطۃ کی، فرض لغت میں کاٹنے کو کہتے ہیں خصوصاً جب اس کا مفعول بہ قابل قطع چیز ہو جیسے فرض العود والشوب وغیرہما فرض بواسطہ حرف جر کے بھی متعدی ہوتا ہے جیسے فرض علیہ اس کے معنی لازم کر دینے کے ہیں اور جب صلہ میں ”لہ“ آجائے تو بمعنی عطیہ یا حصہ مقرر کرنے کے آتا ہے جیسے ”ماکان علی النبی من حرج فیما فرض اللہ لہ“۔ (الآیۃ ۱۰) جبکہ اصطلاح میں فریضہ بندوں پر شارع کی طرف سے فرض و لازم کیا ہوا حق، عمل اور قانون کہلاتا ہے اور میراث کی تقسیم کو بھی کہتے ہیں کیونکہ احکام کی بھی حد بندی ہوتی ہے اور میراث کی بھی۔ اس لئے لغوی معنی قطع ان دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ علم میراث کے ماہر کو فاض اور فرضی کہتے ہیں۔ بقولہ ”ضیاعاً“ اس میں ضاد کا فتح و کسرہ دونوں جائز ہیں، یہ دراصل مصدر ہے مگر اس کا اطلاق میت کے ان ورثہ اور اولاد پر کیا گیا ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں، چونکہ ان کے ضائع ہونے کا خطرہ رہتا ہے اس لئے ان کو ضیاع سے تعبیر کیا، پس مطلب یہ ہوا ”من ترك اولاداً کو عیالاً ذوی ضیاع“۔ عارضہ میں ہے: ”أما الضیاع فهو کل من لا مال له ولا قوة“۔

ابواب الفرائض عن رسول الله ﷺ

باب ماجاء من ترك مالا الخ

تشریح:- یہاں فرائض سے مراد علم میراث اور اس کے مطابق عمل درآمد کرنا ہے، اس علم کی اہمیت اگلے باب میں بیان کی گئی ہے، یہ مستقل فن کے طور پر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کے اصول متعلقہ کتب سراجی وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہاں نہایت اختصار کے پیش نظر اتنی سی بات کرنا مناسب ہے کہ میت کے ترکہ کے ساتھ چار قسم کے حقوق متعلق ہوتے ہیں، وہ حقوق بالترتیب یہ ہیں: (۱) سب سے پہلے تکفین و تجہیز اور تدفین کے اخراجات ہیں جو میانہ روی سے ادا کئے جائیں گے گوان سے ساری میراث ختم ہو جائے۔ (۲) پھر جتنا مال بچا ہے اس سے سارے دیون اور قرضے وغیرہ حقوق ادا کئے جائیں۔ (۳) ماقی کے ثلث میں سے وصیت کے مطابق خرچ کیا جائے اگر وصیت کی ہو اور جائز مصرف میں خرچ کرنے کے لئے کی ہو۔ (۴) چوتھے نمبر پر جو کچھ بچ جائے وہ قرآن و سنت اور اجماع امت کی ہدایات کے مطابق مستحق وارثوں میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ (کذا فی السراجی)

ان تقسیمات کا ایک بڑا حصہ یہاں ترمذی کے ابواب الفرائض میں بیان ہوگا۔

حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کوئی مال چھوڑا، تو وہ مال اس کے ورثہ کا ہے یعنی ترتیب بالا کے مطابق مگر جو شخص اپنے پیچھے ایسے بچے وغیرہ چھوڑے جو غریب ہوں اور ان کا کوئی مالی یا جانی سہارا نہ ہو تو ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری میری ہے، امام ترمذی نے ”فالی“ کا مطلب یہی بیان کیا ہے ”و معنی قوله: من ترك ضیاعاً یعنی ضائعاً لیس له شیء فالی بقول انا اعوله وانفق علیه“۔

اس ذمہ داری میں دیون کی ادائیگی بھی شامل ہے مگر امام نوویؒ فرماتے ہیں جیسا کہ حاشیہ پر ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے، آج کسی حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ (بغیر کفالت کے) لوگوں کے دیون ادا کرتی رہے۔

شروع میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنازہ لایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے کہ اس پر دین ہے؟ اگر اثبات میں جواب ملتا اور اس کی ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے فرماتے ”صلوا علی صاحبکم فان علیہ دینا“۔^۳ یعنی تم نماز جنازہ پڑھو میں نہیں پڑھتا کہ اس پر دین

۳ رواہ ابو داؤد، ص: ۱۱۹ ج: ۲ ”باب فی التشدید فی الدین“ کتاب البیوع، ایضاً سنن نسائی کتاب الجنائز باب: ۶۷، سنن دارمی کتاب البیوع باب: ۵۳۔

ہے، مگر جب اللہ نے مسلمانوں کو فتوحات سے نوازا اور بیت المال قائم ہوا تو غریب مدیون میت کے دیون اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھالی، عارضۃ الاحوزی میں ہے:

”قال ابن شہاب: فلما فتح اللہ علیہ الفتوح قال: من توفی من المؤمنین فعلیّ

قضاء. ومن ترك مالا فلورثته“ وانفرد ابن شہاب بلفظ القضاء... وفيها... قال

ابن شہاب هذا ناسخ لتركه الصلوة علیہ“ (علی المیت)

گوکہ ابن العربی اس کو مرسل ہونے کی بناء پر مسند کے لئے ناسخ ماننے کو تیار نہیں، مدیون میت کی طرف سے کفالہ کی صحت اور عدم صحت کے حوالے سے اختلاف و دلائل اور قدرے تفصیل ”باب ماجاء فی المدیون“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۳۹۵ ج: ۴، من ابواب الجناز)

باب ماجاء فی تعلیم الفرائض

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تَعَلَّمُوا الفرائض والقرآن وَعَلَّمُوا الناس فانی مقبوض“۔ (هذا حدیث فیہ اضطراب النسخ)^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فرائض اور قرآن سیکھئے اور لوگوں کو سکھائیے کیونکہ میں لیا جانے والا ہوں۔ (یعنی وفات پانے والا ہوں)

لغات و تشریح:۔ قولہ ”الفرائض“ غریضہ کی جمع ہے، کما مر۔ اس سے مراد یا تو علم میراث ہے جیسا کہ امام ترمذی کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کی تخریج میراث کے باب میں کی ہے، اور ابواب الفرائض کے عنوان میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہ علماء کی ایک جماعت کی بھی تفسیر ہے۔ اور یا مراد ہر وہ حکم ہے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، بخشی نے اسی احتمال کو ظاہر کیا ہے۔ اور لفظ قرآن بھی اس معنی کی تعین کا قرینہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمام طریقے و سنن مراد ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (بحیثیت تشریع) صادر ہیں، علیٰ ہذا مطلب یہ ہوا کہ قرآن و سنت سیکھو کیونکہ میں دنیا سے چلا جاؤں گا

۱۔ کذا فی حاشیۃ صحیح البخاری ص: ۳۲۳ ج: ۱۔

باب ماجاء فی تعلیم الفرائض

۱۔ الحدیث روی بمعناہ ابن ماجہ ص: ۱۹۴ ابواب الفرائض، سنن دارمی مقدمہ باب: ۲۴، مستدرک حاکم

پھر ان دونوں پر اطلاع کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ (کذا فی الحاشیہ بحوالہ مجمع البحار) قولہ ”وعلموا الناس“ اس کا مفعول بہ مقدر ہے ای المذکور۔ قولہ ”فانی مقبوض“ ای سَيَقْبِضُنِي اللہ تعالیٰ یعنی اللہ عنقریب مجھ پر موت کا پردہ ڈالنے والے ہیں، پھر یہ علم منقطع ہو جائے گا۔

اگر فرائض سے مراد میراث ہو تو اس علم کی اہمیت یہاں سے معلوم ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کے سیکھنے کی تاکید فرمائی بلکہ اس کے سکھانے پر بھی زور دیا ہے اور جلد حصول کی ترغیب دی۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث میں اضطراب بیان کیا ہے، وجہ اضطراب یہ ہے کہ خوف سے یہ روایت مسندات ابی ہریرہؓ میں بھی مروی ہے جیسا کہ یہاں ہے اور مسندات ابن مسعودؓ میں بھی ہے، علاوہ ازیں محمد بن قاسم اور شہر بن حوشب کنزور بھی ہیں، البتہ اس مضمون کی حدیث مسند احمد، نسائی اور مستدرک حاکم میں قابل اعتبار سند سے آئی ہے۔

باب ماجاء فی میراث البنات

”عن جابر بن عبد اللہؓ قال جاءت امرأة سعد بن الربیع بابتیہامن سعد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: یا رسول اللہ! ہاتان ابنتا سعد بن الربیع قُتِلَ ابوہما معک یوم احد شہداء وان عمہما اخذہما فلم یدع لہما مالاً ولا تنکحان الا ولہما مال، قال یقضی اللہ فی ذلک فنزلت اية الميراث فبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی عمہما فقال: اعطی ابنتی سعد الثلثین واعطی امہما الثمن وما بقی فهو لک۔“ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سعد بن الربیع کی بیوی سعد سے اپنی دونوں بیٹیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! یہ دونوں سعد کی بیٹیاں ہیں ان کا باپ آپ کے ساتھ معرکہ احد کے دن شرکت کی بناء پر قتل کر کے شہید کیا گیا ہے اور ان کے چچا نے ان کا (سارا) مال لے لیا ہے اور ان کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے، حالانکہ ان کی شادی بغیر مال کے نہیں ہو سکے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بارے میں اللہ فیصلہ فرمادیں گے چنانچہ میراث کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چچا کے پاس حکم بھیجا اور فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی حصے دے دو اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دو اور باقی (پانچ بٹا چوبیس، ۵/۲۴) آپ کا ہے۔

ترکیب:- قولہ ”قتل ابوہما معک الخ“ اس میں معک ظرف مستقر ہے یعنی کا بنما مقدر کے ساتھ

متعلق ہے ظرف لغوی یعنی قتل کے ساتھ متعلق کرنا مفید معنی ہے کیونکہ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ شہید ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احد میں شہید نہیں ہوئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھ احد کے میدان میں شریک تھے اور اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ تدبر

تشریح:- ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جس روایت میں ہے کہ ”ہاتان ابتنا ثابت بن قیس بن شماس“ تو وہ غلطی اور سہو پر محمول ہے کیونکہ ثابت جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ عورتوں کو میراث میں سے حصہ نہیں دیا جاتا بلکہ مردوں اور عصبہ میں سے بھی عموماً اسی کو ملتا جو طاقت ور ہوتا، گویا زیادہ تر دار و مدار بازو کی طاقت پر تھی، ذوی الفروض اور عصبہ کی تقسیم اور تمیز اس وقت نہیں تھی۔

جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں کے لئے زین اصول اور ضابطوں کے مطابق عادلانہ نظام بنام اسلام نازل فرمایا تو اس میں باقی مظلوم جماعات، انواع اور افراد کی طرح عورتوں کو بھی میراث میں متعین حق دینے کا حکم فرمایا۔

باب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا ہے ”یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساءً فوق الاثنین فلھن ثلثا مائرک ہوان کانت واحدة فلھا النصف“۔ (نساء آیت نمبر ۱۱، الخ)

اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ پہلے ذوی الفروض کے حصے دیئے جائیں، ذوی الفروض سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے قرآن میں حصے مقرر کئے گئے ایسے لوگ کل ملا کر بارہ ہیں، چار مرد اور آٹھ عورتیں، مرد یہ ہیں: (۱) باپ۔ (۲) جد صحیح یعنی دادا۔ (۳) ماں شریک بھائی اور (۴) شوہر۔ عورتیں یہ ہیں: (۱) بیوی۔ (۲) بیٹی۔ (۳) پوتی اگر چہ دور والی ہو۔ (۴) سگی بہن۔ (۵) سوتیلی بہن۔ (۶) ماں شریک بہن۔ (۷) ماں۔ (۸) جدہ صحیحہ (دادی اور نانی)۔ اگر ان سے مال بچ جائے یا ذوالفروض نہ ہوں تو پھر ماقبی پہلی صورت میں اور سارا ترکہ دوسری صورت میں عصبہ کو ملتا ہے، عصبہ کی متعدد صورتیں ہیں مگر اولین ترجیح عصبہ نسبہ کو حاصل ہے ان میں الاقرب فاقرب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ (راجع للتفصیل باب معرفۃ الفروض الخ و باب العصبات، من سراجی)

چونکہ دو بیٹیوں کو ثلثان ملتے ہیں اور اولاد کی صورت میں بیوی کو ثلث ملتا ہے اس لئے حدیث الباب میں

مسئلہ ۲۳ (چوبیس) سے بنا، سولہ حصے بیٹیوں کو، تین بیوی کو، باقی پانچ رہ گئے، وہ عصوبت کی بناء پر چچا کو دے دیئے۔ یہاں یہ ضابطہ قابل لحاظ ہے کہ میراث میں تمام نسبتیں میت کی طرف ہوتی ہیں اور یہ کہ دو بنات اور دو سے زیادہ کا حکم ایک ہوتا ہے یعنی ایک کو نصف اور زیادہ کو ثلثان یہ اس وقت ہے کہ ان کے ساتھ مرد نہ ہو یعنی بلا تعصیب ورنہ تو پھر عورت کا حصہ مرد کے آدھے کے برابر ہوگا سوائے ماں شریک بہن کے کہ جب آدمی نکالہ ہو یعنی اس کے اصول و فروغ نہ ہوں، اور ایک بہن اور بھائی ماں شریک ہوں تو ہر ایک کا حصہ سدس ہوگا اور اگر زیادہ ہوں تو سب ثلث مال میں برابر کے شریک ہوں گے جیسا کہ نساء آیت نمبر ۱۲ میں ہے۔

باب ماجاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصلب

”عن هُزَيْلِ بْنِ شَرَحْبِيلٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى أَبِي مُوسَى وَسُلَيْمَانَ بْنِ رَبِيعَةَ فَسَأَلَهُمَا عَنْ ابْنَةِ وَابْنَةِ ابْنِ بَوَاحِشٍ لَابٍ وَامٍ فَقَالَا لِلْإِبْنَةِ النِّصْفَ وَلِلْأَخْتِ مِنَ الْآبِ وَالْأُمِّ مِاقِبَى وَقَالَا لَهَا انْطَلِقِي إِلَى عَبْدِ اللَّهِ فَاسْأَلِيهِ فَإِنَّهُ سَيُتَابِعُنَا فَأَتَى عَبْدُ اللَّهِ فَذَكَرَ لَهُ ذَلِكَ وَخَبَرَهُ بِمَا قَالَا فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ: بِقَضَائِي إِذَا وَمَا نَأْمَنُ الْمُحْتَمِلِينَ وَلَكِنِّي أَقْضِي فِيهَا كَمَا قَضَى رَسُولُ اللَّهِ لِلْإِبْنَةِ النِّصْفَ وَلِابْنَةِ الْإِبْنِ السُّدُسَ تَكْمَلَةُ الثَّلَاثِينَ وَلِلْأَخْتِ مِاقِبَى“۔ (هذا حديث حسن صحيح) ۱

ہزیل بن شرحبیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص ابو موسیٰ (اشعری) اور سلیمان بن ربیعہ کے پاس آیا اور ان سے ایک بیٹی، ایک پوتی اور سگی بہن کی (میراث کی) بابت پوچھا، تو ان دونوں نے کہا کہ آدھا ترکہ بیٹی کا ہے اور باقی (آدھا) بہن کو ملے گا (یعنی پوتی کو نظر انداز کر دیا) پھر دونوں نے اس شخص سے کہا جاؤ عبداللہ (ابن مسعود) کے پاس اور ان سے پوچھو وہ بھی ہماری پیروی کریں گے (یعنی ایسا ہی جواب دیں گے) چنانچہ وہ آدمی عبداللہ بن مسعود کے پاس گیا اور ان سے اس فیصلے کا تذکرہ کیا اور ان دونوں کی بات سے بھی آگاہ کیا، تو عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اگر میں ایسا فیصلہ کروں تو غلطی کروں گا اور صحیح جواب دینے والوں میں سے نہ ہوں گا لیکن میں تو (ان کے مطابق نہیں بلکہ) اس بارے میں وہی فیصلہ کروں گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے بیٹی کے لئے آدھا ہے اور پوتی کو چھٹا ملے گا تا کہ ثلثین کو پورا کیا جائے اور باقی

باب ماجاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصلب

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری و ابو داؤد و النسائی و احمد و البيهقی بحواله سنن دارمی ص: ۴۷ ج: ۲ حلیث: ۲۸۹۰، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۱۹۵ ابواب القرائن.

(دوسرے ۲/۶) بہن کے ہیں۔

تشریح: قولہ ”شرحییل“ بضم الشین وفتح الراء وکون الحاء وکسر الباء۔ یہ واقعہ کوفہ میں اس وقت پیش آیا تھا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بعد از ابن مسعودؓ ”گورنر بنالیا گیا تھا، سلیمان بن ربیعہ کوفہ کے قاضی تھے۔ (قالہ الحافظ کذا فی النسخۃ)

ان دونوں حضرات کا فیصلہ سورہ نساء کی دو آیتوں سے ماخوذ ہے چنانچہ انہوں نے بیٹی کو آدھا دینے کو کہا کیونکہ اس آیت میں ہے: ”وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ“ (نساء آیت ۱۱) اور بہن کو آدھا دینے کا حکم اس آیت سے لیا: ”إِنْ امْرَأَتُ إِبْرَاهِيمَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا النِّصْفُ مِمَّا تَرَكَ“۔ (نساء آیت نمبر: ۱۷۷)

پہلی آیت میں ہے کہ اگر بیٹی ایک ہے تو اس کو آدھا ملے گا، اور دوسری میں ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کی سگی بہن کو تمام ترکہ کا آدھا دیا جائے گا، اب جب دونوں کو آدھا آدھا لگایا گیا تو پوتی کے لئے کچھ بھی نہ بچا، یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے دوسری آیت سے مسئلہ اخذ کیا ہو اور غلط فہمی ”ولد“ کے لفظ سے ہوئی کہ انہوں نے اس سے مراد بیٹا یعنی نرینہ اولاد لے لی جبکہ علم میراث میں ولد بمعنی مولود یا بمعنی مطلق اولاد ہوتا ہے پھر ولد، پوتے اور پوتی کو بھی شامل ہے جبکہ ان حضرات نے صرف صلی اولاد تک محدود سمجھا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ پوتی کا حصہ قرآن میں نہیں ہے، جبکہ ابن مسعودؓ سمجھ رہے تھے کہ ولد بمعنی اولاد ہے اور پوتے، پوتیاں بھی اولاد ہوتی ہیں، اس لئے انہوں نے سابقہ فیصلہ کی موافقت سے انکار فرمایا، پھر دارقطنی کی روایت میں ہے کہ: ”وَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ الْخ“ چونکہ بیٹی بمقابلہ پوتی کے اقرب ہے لہذا قوت قرابت کی وجہ سے اس کو نصف ملا، چونکہ بنات کا حصہ ثلثان سے زیادہ نہیں ہو سکتا، اس لئے پوتی کو سُدس دیا تاکہ ثلثان کو پورا کیا جائے، باقی دوسرے بچے گئے وہ حقیقی بہن کے ہوئے، پس مسئلہ کی تصحیح چھ (۶) سے ہوئی۔

مسئلہ ۶

بنت بنت الابن أخت

۳ ۱ ۲ = ۶

باب ماجاء فی میراث الاخوة من الاب والام

”عن علی انه قال انکم تقرؤون هذه الآیة ”من بعد وصیة توصون بها وادین“ وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالذین قبل الوصیة وان اعیان بنی الأم یرثون دون بنی العلات الرجل یرث اخاه لایبہ وامہ دون اخیه لایبہ“۔ (وکنارواہ احمد والحمیدی وابن ماجہ) ^۱

حضرت علیؑ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو ”من بعد وصیة الخ“ (یعنی اس میں بظاہر وصیت مقدم ہے دین پر) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت سے پہلے دین کی ادائیگی کا حکم کیا ہے اور یہ کہ حقیقی (سگے) بہن بھائی وارث ہوں گے نہ کہ علاقائی (یعنی سوتیلے) آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے علاقائی (سوتیلے) کا نہیں۔

لغات:۔ قولہ ”اعیان بنی الام“ عین کی طرف منسوب ہے جو بمعنی نفس اور ذات کے آتا ہے، مراد حقیقی بھائی ہے کہ وہ گویا اس کی جڑ کی دوسری شاخ ہے۔ قولہ ”دون بنی العلات“ علۃ سوکن کو کہتے ہیں تو بنو العلات سے مراد باپ شریک یعنی سوتیلے بھائی ہیں، ”عل“ لغت میں دوسری بار پینے کو کہتے ہیں، وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

تشریح:۔ علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کبھی کسی چیز کو اہمیت اور مقتضائے حال کی بناء پر مقدر کیا جاتا ہے چونکہ انسان طبعاً بخیل ہوتا ہے اور وصیت میں مطالبہ کرنے والے لوگ بھی عموماً نہیں ہوتے ہیں بخلاف دین کے کہ دین خود اس کو وصول کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں، اور ورثہ کے لئے روکنا ممکن یا آسان نہیں ہوتا، اس لئے وصیت کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے اور تاکید کرنے کے لئے آیت میں اس کا ذکر دین پر مقدم کیا، غرض تقدیم ذکر کی سے یہ نہ سمجھا جائے، کہ یہ حکم بھی مقدم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قاعدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صریح منقول پیش کر رہے ہیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

پھر اس آیت میں ”من بعد وصیة توصون بها وادین“ ^۲ لفظ ”او“ بمعنی واو کے ہے، کیونکہ کبھی دونوں بھی ہوتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ ”او“ مانعہ الجمع کے لئے نہیں ہے۔

باب ماجاء فی میراث الاخوة من الاب والام

^۱ سنن ابن ماجہ ص: ۱۹۷ ”باب میراث العصبۃ“ ابواب الفرائض، مسند احمد ص: ۱۲۸ ج: ۱ حدیث: ۱۲۲۶، ایضاً ص: ۱۳۲ و ۲۱۰۔ ۲ سورة النساء آیت: ۱۲۔

”الرجل يرث اخاه لایه وامه دون اخیه لایه“ یہ جملہ ماقبل کی تفسیر ہے یعنی اگر کسی کے ماں باپ شریک بھائی موجود ہوں تو وہ صرف باپ شریک بھائی پر مقدم ہوں گے، یعنی یعنی حقیقی بھائی علاقائی و سوتیلے پر مقدم ہے حق میراث میں، چونکہ عربوں میں قرابت کا اصل دار و مدار باپ کے رشتے پر ہوتا تھا، عورت کی رشتہ داری کی نسب و حسب میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی، دوسری طرف قرآن میں لفظ ”اخوة“ مطلق آیا تھا جس سے یہ توہم ہو سکتا تھا کہ سگے بھائی اور سوتیلے میراث کے استحقاق میں برابر و مساوی ہوں گے تو اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا: ”وان اعیان بنی الام یرثون دون بنی العلات“ اس میں ”ام“ کا ذکر بطور خاص کر کے واضح کر دیا کہ میراث میں کوئی بھی قرابت خواہ باپ کی وجہ سے ہو یا ماں کی طرف سے مرحلات میں سے ہے تو چونکہ اعیانی بھائیوں کے ساتھ دو قرابتیں ہوئیں اور سوتیلے کے ساتھ فقط ایک، اس لئے قوت قرابت کی وجہ سے اعیانی مقدم ہوں گے، سراجی میں ہے:

”ثم یرجحون بقوة القرابة اعنی ذالقرابتین اولی من ذی قرابة واحدة ذکر اکان

او انئی لقول علیه السلام ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات“۔

(سراجی ص: ۱۴، باب العصابات)

پس مطلب یہ نکلا کہ سگے بھائی نہ ہونے کی صورت میں سوتیلے مستحق ہوں گے، اس روایت میں اگرچہ حارث مشکم فیہ ہے مگر پھر بھی روایت پر عمل متفقہ ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ روایت کی قوت اور ضعف کا دار و مدار صرف رادیوں کی حالت پر نہیں ہے بلکہ امت اور مجتہدین کا تعامل بھی قابل لحاظ ہے:

”قال السخاوی فی فتح المغیث بشرح الفیہ الحدیث، و کذا اذا تلقت الامۃ

الضعیف بالقبول یعمل بہ علی الصحیح حتی انه ینزل منزلة المتواتر فی انه

ینسخ المقطوع بہ ولہذا قال الشافعی رحمہ اللہ فی حدیث: لا وصیۃ لوارث انه

لا ینتہ اہل الحدیث ولكن العامة تلقتہ بالقبول و عملوا بہ حتی جعلوہ ناسخاً

لآیۃ الوصیۃ“۔ (تأمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص: ۲۴)

باب میراث البنین مع البنات

”عن جابر بن عبد اللہ قال جاءني رسول الله صلى الله عليه وسلم: يعودني وانامريض في بنى سلمة فقلت يا بنى الله كيف اقسام مالى بين ولدى؟ فلم يرُدَّ عَلَيَّ شيئاً فنزلت: ”يوصيكم الله في اولادكم للذكر مثل حظ الانثيين“ الاية۔ (حسن صحيح)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس میری عیادت کے لئے تشریف لائے جبکہ میں بنی سلمہ میں بیمار پڑا تھا، میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! میں اپنا مال اپنے بچوں میں کس طرح تقسیم کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی ”يوصيكم الله الخ“۔^۱

تشریح:- بنو سلمہ فتح السین و کسر اللام، خزرج کی شاخ اور حضرت جابرؓ کا قبیلہ ہے۔

پہلا اشکال:- یہاں یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اس وقت تو حضرت جابرؓ کی کوئی اولاد نہ تھی بلکہ نو (۹) بہنیں تھیں جیسا کہ اگلے باب کی روایت میں ہے، اور صحیحین^۲ کی روایت میں ہے: ”فقلت يا رسول الله انما يرثني كلالة“۔ اور بخاری کی ایک اور روایت میں بھی بہنوں کی تصریح ہے: ”انما لي اخوات“۔^۳ تو اس طرح ان روایات میں تعارض آگیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ”ولدى“ کا لفظ حدیث باب میں راوی کے ”وہم“ پر مبنی ہے یا پھر چونکہ وہ بہنیں عمر میں ان سے چھوٹی تھیں اور چھوٹوں پر اولاد اور بچوں کا اطلاق ہوتا ہے گویا زائید ہوتا ہے۔ (قالہ الکنکوی فی الکوکب)

دوسرا اشکال:- یہ ہے کہ ”يوصيكم الله الخ“ یہ آیت تو حضرت سعد بن ربیعؓ کی بیوی کے استفسار کے جواب میں نازل ہوئی تھی اور خود حضرت جابرؓ کی حدیث بھی سابقہ ”باب ما جاء في ميراث البنات“ میں اس کی تصریح کرتی ہے، جبکہ حضرت جابرؓ کے قصہ میں تو سورۃ نساء کی آخری آیت نازل ہوئی تھی تو یہ بھی تعارض ہے، ابوداؤد میں بھی اس کی تصریح ہے: ”قال فنزلت اية الميراث يستفتونك قل الله يفتيكم في

باب میراث البنین مع البنات

^۱ مسوۃ النساء آیت: ۱۱۔ ۲ صحیح بخاری ص: ۳۲ ج: ۱ ”باب صب النبی ﷺ وضوءه الخ“ کتاب الوضوء،

صحیح مسلم ص: ۳۳ ج: ۲ کتاب الفرائض ۳ صحیح بخاری ص: ۹۹۸ ج: ۲ ”باب ميراث الاخوة والاحوات“ کتاب الفرائض۔

الکلالۃ“۔ (باب فی الکلالۃ، اول کتاب الفرائض والیضاباب من کان لیس لہ الخ ص: ۳۹۹) اور ترمذی کے اگلے باب میں بھی ایسا ہی ہے۔

پہلا جواب:- اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ترمذی کی اس باب والی حدیث میں راوی سے وہم ہو گیا ہے، پس کہا جائے گا کہ اس حدیث میں دو موقعوں پر وہم پایا جاتا ہے۔

دوسرا جواب:- یہ ہے کہ اس روایت میں ”یوصیکم اللہ“ الایۃ سے مراد میراث کا حکم ہے جو سب کو شامل ہے۔ فلا اشکال

تیسرا جواب:- یہ ہے کہ کبھی ایک حکم کے نزول کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں لہذا کبھی راوی ایک سبب ذکر کرتا ہے اور کبھی دوسرا۔ (قالہ السیوطی فی الاتقان)

راقم نے اسباب نزول کی روایات میں تطبیق اور ترجیح کے اصول ”زادیسیر فی علوم التفسیر“ اور پرانے نام کے مطابق ”الزادیسیر فی مقدمۃ التفسیر“ میں ذکر کئے ہیں جن کو اس میں یا ”الاتقان“ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

باب میراث الاخوات

”عن جابر بن عبد اللہ قال مرضت فأتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعودنی فوجدنی قد أغوی علی فأتانی ومعہ ابوبکر وھما ماشیان فتوضأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصب علی من وضوءہ فأنفقت فقلت یا رسول اللہ! کیف أقضی فی مالی او کیف اصنع فی مالی؟ فلم یجبنی شیئاً وکان لہ تسع اخوات حتی نزلت آیۃ المیراث ”یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ“ الایۃ قال جابر بنی نزلت۔ (حسن صحیح) ۱

حضرت جابرؓ سے محمد بن الحنفیہ نے یہ فرماتے سنا ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے وہ میری عیادت کرنا چاہتے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پایا جبکہ میں بے ہوش ہو چکا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ان کے ہمراہ ابوبکرؓ بھی تھے، دونوں پیدل تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور وضو کے پانی میں سے کچھ میرے اوپر ڈالا تو مجھے افادہ ہوا، میں نے

۱۔ سورۃ النساء آیت: ۱۷۶۔

باب میراث الاخوات

۱۔ ایضاً أخرجه مسلم ص: ۳۴ ج: ۲ کتاب الفرائض۔

فوراً پوچھا اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کے بارے میں کیسے فیصلہ کروں؟ یا فرمایا (راوی کو شک ہے) میں اپنے مال میں کیا طریقہ اختیار کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، اس وقت ان کی نو (۹) بہنیں تھیں یہاں تک کہ یہ آیت میراث نازل ہوئی: ”یستفتونک الخ“ الایۃ۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ یہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی۔

تشریح:۔ کالہ وہ ہے جس کے اصول وفروع یعنی والد اور ولد کوئی نہ ہو اور دیگر ورثہ ہوں، حضرت تھانوی صاحب ”المسک الذکی“ میں فرماتے ہیں کہ: اس میں تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ فقط ہمیشہ ہی ہو۔ اور دوسری یہ ہے کہ فقط بھائی ہوں اور بہن کوئی نہ ہو۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ بھائی بہن دونوں ہوں۔ پہلی صورت میں سب کو سُدس، سُدس ملے گا۔ اور دوسری صورت میں سب کو برابر ملے گا۔ اور تیسری صورت میں لڑکے کو دو ہر اور بہن کو اکہرا، لیکن یعنی بھائی سے علاقائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں۔

اس حدیث سے ایک طرف عیادت کی سنت معلوم ہوئی اور دوسری طرف پیدل چلنے کی فضیلت یعنی ہو سکے تو پیدل چلنا افضل ہے جیسا کہ جمعے کے بارے میں ”ولم یرکب“ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ کہ وضوء کا مستعمل پانی پاک ہے گو کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت الگ ہے کہ ان کے مستعمل پانی میں اللہ نے شفاء رکھی تھی، تاہم عام لوگوں کے مستعمل پانی سے بچنا افضل ہے چنانچہ ”الاشباہ والنظائر“ میں ہے: ”الاولیٰ اَنْ لَا یصلی علی من دیل الوضوء الذی یمسح بہ“۔ (الاشباہ ص ۱۶۶، کتاب الصلوٰۃ) اسی طرح داڑھی وغیرہ کا پانی بھی مسجد میں نہ جھاڑے، اس حدیث سے حضرت ابو بکرؓ کی افضلیت معلوم ہوئی، اور یہ کہ بڑے بھی چھوٹوں کی عیادت کریں۔

باب ماجاء فی میراث العصبۃ

”عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الْحَقُّوْا الْفَرَاثِ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِیَ فَهُوَ لِأَوَّلٰی رَجُلٍ ذَكَرَ“۔ (حدیث حسن)^۱

باب ماجاء فی میراث العصبۃ

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الفرائض ”باب میراث الولد من ابیه وامه“ ومسلم فی کتاب الفرائض ”باب الحقوا الفرائض باهلها“ ابو داؤد کتاب الفرائض ”باب فی میراث العصبۃ“ والنسائی وابن ماجہ واحمد فی مسنده بحوالہ سنن دارمی ص: ۴۶۲ ج: ۲، ایضاً رواه الحاكم فی المستدرک ص: ۲۵۷ ج: ۵ حدیث ۸۱۴۳

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ (پہلے) صحابہ فروض کو ان کے حصے دو اور جو مال رہ جائے تو وہ قریب تر آدمی کے لئے ہے۔

لغات:- قولہ ”العصبۃ“ لغت میں عصب پٹھے کو کہتے ہیں جو ایک مضبوط واصل کو کہتے ہیں، مراد وہ ورثہ ہیں جو ذوی الفروض کے بعد باقی اور ان کی عدم موجودگی میں سارا مال لیتے ہیں۔ قولہ ”الحقوا“ بفتح الهمزة وکسر الراء ”ای اوصولو“ یعنی پہنچاؤ اور دلاؤ ادا کرو وغیرہ۔ قولہ ”لا ولی“ ”ای لا قرب“ یعنی نیت کے سب سے قریب تر۔ قولہ ”ذکر“ یہ تعقید اس لئے ہے کہ مرد عصوبت میں اصل ہے اور عورت مرد کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے گویا یہ رجل کی تاکید ہے تاکہ ذکر ت کو ا جا کر کیا جائے۔

تشریح:- حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب فروض جب اپنے اپنے مقررہ حصے لے لیں اور پھر بھی کچھ بچ جائے تو اگر عصبہ موجود ہوں تو وہ بچا ہوا مال دوبارہ ذوی الفروض پر تقسیم نہ ہوگا بلکہ وہ عصبہ کو دیا جائے گا، پھر عصبہ میں سے اولاد اس کا حق بنتا ہے جو میت سے اقرب ہو ثم الاقرب فالاقرب مثلاً اگر میت کا بیٹا ہو تو وہ پوتے پر اور باقی بھائیوں اور چچا وغیرہ سب پر مقدم ہے، پھر پوتا ہے پھر باپ ہے۔

اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ عصبہ نسبہ جو اصل ہے عصوبت میں، تین طرح کے ہیں: (۱) عصبہ بنفسہ (۲) بغیرہ (۳) مع غیرہ۔

عصبہ بنفسہ:- کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اور میت کے درمیان کسی عورت کا واسطہ نہ ہو لہذا کہا جائے گا کہ یہ قسم اول وہ مرد ہے جس کا نسب میت سے، بغیر واسطہ عورت کے ہو جبکہ دوسری اور تیسری قسمیں دونوں عورتوں پر مشتمل ہیں، پھر عصبہ بغیرہ جیسے بہن اپنے بھائیوں کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے اور عصبہ مع غیرہ جیسے بہن، بیٹی کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے، پھر عصبہ بنفسہ کی آپس میں چار قسمیں ہیں، سراجی میں ہے:

”اما العصبۃ بنفسہ فکل ذکر لا تدخل فی نسبة الی المیت اثنتی وھم اربعة

اصناف: (۱) جزء المیت (۲) واصلہ (۳) و جزء ایہ و جزء جدہ الاقرب

فالاقرب“۔

یعنی میت کی اولاد، اس کے اصول باپ دادا، میت کے باپ کے اجزاء یعنی بھائی اور اس کے دادا کے اجزاء یعنی چچا، اور اس کے ساتھ ان سب کے اصول و فروع۔

”وان علاوان سفلوا“۔ قال: یرجحون بقرب الدرجة اعنی اولہم بالمیراث جزء

المیت ای البنون ثم بنوهم وان سفلو اثم اصله ای الاب ثم الجد، ای اب الاب
وان علا ثم جزء ابیه ای الاخوة ثم بنوهم وان سفلو اثم جزء جدہ ای الاعمام
ثم بنوهم وان سفلو اثم یرجحون بقوة القرابة اعنی به ان ذا القرابتین اولی من
ذی قرابة واحدة ذکر اکان او انتی الخ۔ (سراجی ص: ۱۳، باب النصبات)

باب کی روایت اگرچہ مرسل ہے مگر کثرت طرق کی وجہ سے اور بعض اسانید میں موصول ہونے کی
بنا پر قابل عمل وقابل حجت ہے۔

باب ماجاء فی میراث الجد

”عن عمران بن حصین قال جاء رجل الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: إن ابنی
مات فمالی من میراثہ؟ فقال لك السدس فاعلموا لکی دعاء فقال: بَلَّكَ سدس آخر فاعلموا لکی دعاء
قال: ان السدس الآخر لک طعمه۔“ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرا پوتا فوت ہو گیا ہے تو مجھے اس کی میراث میں سے کیا ملے گا؟ (یعنی کتنا ملے گا)
تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے لئے چھٹا حصہ ہے جب وہ شخص جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
بلایا اور فرمایا تجھے ایک سدس (چھٹا) اور ملے گا، چنانچہ جب وہ جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھر
بلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوسرا سدس (چھٹا) تیرے لئے کھانے کو زاد دیا ہے۔

تشریح:۔ اس مسئلہ کی تصویر یہ ہے جیسا کہ حاشیہ پر ہے کہ میت کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک دادا، جیسا کہ
پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ لڑکیوں کو ثلثان سے زیادہ نہیں ملتا دوسری طرف دادا بمنزلہ باپ کے ہے اس لئے اولاد
کی صورت میں اس کا حصہ سدس یعنی چھٹا بنتا ہے، قال اللہ تعالیٰ: وَلَا يَوْرِيهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا
تَرَكَ ان كان له ولد۔“ (نساء آیت نمبر: ۱۱) اس لئے مسئلہ کی تصحیح چھ سے ہوئی، بیٹیوں کو ثلثین یعنی چار حصے ملے
اور سدس یعنی چھٹا دادا کو بطور فرض دیا، ایک بیٹے کو دادا کو بطور تعصیب دیا کیونکہ دادا ذوی الفروض اور عصبہ
دونوں میں سے ہے۔

مسئلہ ۶

بنان جد ع

۴ ۱ ۱ = ۶

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دونوں حصے ایک ساتھ اس لئے نہیں دیئے کہ ایسا کرنے سے سابقہ حکم کی تفسیح کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا، اس لئے دونوں حکموں کو آجا کر کرنے کے لئے الگ الگ کر کے دیئے تاکہ صاف طور سے معلوم ہو کہ جد کا حصہ ثلث نہیں بلکہ سدس ہے اور دوسرا سدس بطور تعصیب کے ہے، پھر اس کو قطعہ سے تعبیر کیا تاکہ مزید تصریح ہو کہ اس سے پہلا فرض متغیر نہ ہوگا وہ بدستور سدس ہی ہے اور رہے گا۔

اس کی مثال ذخیرہ احادیث میں اور بھی ملتی ہیں مثلاً عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے اپنی نابینا پن کا عذر پیش کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر پر نماز نماز پر صے کی اجازت چاہی کہ مثلاً اندھیرے میں لانے والا کوئی نہ ہو تو میں گھر پر نماز پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی مگر جب وہ جانے لگے تو پھر بلا کر پوچھا کہ اذان سنتے ہوں انہوں نے فرمایا ”ہاں“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیا کرو، اس میں پہلے اجازت، عام حکم ہے کہ معذورین گھر پر نماز پڑھ سکتے ہیں اور دوسرا ابن ام مکتوم کی خصوصیت ہے، اگر یہی حکم پہلی بار ارشاد فرماتے تو یہی حکم معلوم ہوتا کہ دیگر معذورین بھی نماز کے لئے مسجد میں آیا کریں۔ تدبر

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جد کا مسئلہ انتہائی مشکلات میں سے ہے اور اس سے اصول شرع میں نظر اور قیاس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ دین میں قیاس ایک زرین اصول ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر مسئلہ منصوص نہیں ہوتا ہے، یعنی بعض مسائل مستنبط بھی ہوتے ہیں، غیر مقلدین کو یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہئے کہ قیاس کتنا اہم ہے، نیز اہل قرآن کے نام سے جو لوگ انتشار پھیلاتے ہیں وہ بھی بتائیں کہ قرآن میں جد کا حصہ کیا ہے؟

”العرف الشذی“ میں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک دادا باپ کی طرح بھائیوں کے لئے حاجب بنتا ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک دادا بھائیوں کے ساتھ شریک ہوگا یعنی ان کا حصہ ساقط نہیں کر سکتا۔ امام صاحب کی طرح قول، ابو بکر صدیق، ابن عباس، حضرت عائشہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اور ابو داؤد اور بہت سے تابعین کا قول بھی یہی ہے کہ: ”ان السحد یسقط الاخوة والاعوات کالاب“۔ جبکہ جمہور کا مذہب وہی ہے جو صاحبین کا ہے۔ (کذا فی النقطۃ) تحفہ میں یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام میں یہ مسئلہ اختلافی رہا اور بہت سے صحابہ کرام حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل المنقب صحابی بھی اس میں بحث سے بچتے تھے۔

”قال وهذا التحذير والوعيد وما قبل می شأنه فی ذالك الوقت انما هو قبل تدوين

المذاهب الاربعة واستقرار الامر عليها عند كل مجتهد من الائمة الاربعة

ومقلديهم ولا صعوبة حينئذ فی الافتاء“ الخ۔

تفصیل کے لئے دیکھئے تحفة الاحوذی اسی باب کی شرح میں۔

غیر مقلدین کو ائمہ مجتہدین کے کام کی اہمیت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔

باب ماجاء فی ميراث الجدة

”عن قبيصة بن ذؤيب قال جاء ت الحدة أم الأم، وأم الأب إلى أبي بكر فقالت: ان ابن ابني او (قالت) ان ابن ابنتي مات وقد أخبرت ان لي في الكتاب حقاً، فقال ابو بكر: ما أجِدُ لكَ في الكتاب من حق وما سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى لكَ بشئٍ، وسأَسْأَلُ الناس، قال فسأَلَ الناس فشهد المغيرة بن شعبة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطاهما السدس، قال: ومن سمع ذلك معك؟ قال محمد بن مسلمة قال: فاعطاهما السدس ثم جاء ت التي تخالفها إلى عمر قال سُفِين وزادني فيه معمر عن الزهري ولم احفظه عن الزهري ولكن حفظته من معمرًا عن عمر قال: ان اجتمعما فهو لكما وأيتكما انفردت به فهو لها“۔^۱

حضرت قبيصة بن ذؤيب (بالصغير) سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک جدہ ماں کی ماں (ثانی) یا باپ کی ماں (دادی) ابو بکرؓ کے پاس آ کر کہنے لگی کہ میرا پوتا یا نواسا (یعنی اگر دادی تھی تو کہا میرا پوتا اور اگر نانی تھی تو کہا کہ نواسا) فوت ہو گیا ہے، اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب میں میرا حق بیان کیا گیا ہے، تو ابو بکرؓ نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تو تیرا کوئی حق نہیں پا رہا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے تیرے (جدہ کے) حق میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے کچھ سنا ہے البتہ میں جلد لوگوں سے پوچھتا ہوں، راوی نے فرمایا کہ انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو سدس دیا تھا، ابو بکرؓ نے فرمایا تیرے ساتھ اور کس نے سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ محمد بن مسلمہ نے (باب کی اگلی روایت

باب ماجاء فی ميراث الجدة

۱۔ روی بمعناه ابو داؤد وابن ماجہ، وابن حبان والبیہقی، قال ابن حجر: واسناده صحيح لثقة رجاله الا ان صورته مرسل

بحوالہ سنن دارمی ص: ۳۵۶ ج: ۲ حدیث: ۲۹۳۹، ایضاً مستدرک حاکم ص: ۲۵۷ ج: ۵ حدیث: ۸۱۴۳۔

میں ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر مغیرہ بن شعبہ کی طرح بات کی (چنانچہ ابوبکرؓ نے جدہ کو سدس دے دیا پھر دوسری جانب والی جدہ حضرت عمرؓ کے پاس آئی (یعنی اگر حضرت ابوبکرؓ کے پاس دادی آئی تھی تو عمرؓ کے پاس ثانی آئی و بالعکس) سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ معمر نے زہری کے حوالے سے مجھے یہ اضافہ بھی بیان کیا ہے، جو میں نے خود زہری سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ مجھے معمر کی زبان سے سُن کر یاد ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم دونوں یعنی دادی و ثانی جمع ہوں تو یہ سدس آپ کا مشترک ہوگا اور جو بھی اکیلی ہوگی تو سدس پورا اس کو ملے گا۔

تشریح:- حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ جدہ ایک ہو یا زیادہ، دادی ہو یا ثانی اس کا حصہ سدس ہے، ایک ہونے کی صورت میں پورا اور زیادہ ہونے کی حالت میں برابر تقسیم کیا جائے گا، صحابہ کرامؓ کے سامنے ہوا اور کسی نے اعتراض نہیں کیا، لہذا یہ اجماع تصور کیا جائے گا۔

البتہ یہاں کچھ شرائط ہیں جو قابل ذکر ہیں جیسا کہ سراجی میں ہے:

”وَلِلْحَدَّةِ السَّدْسِ لَامُ كَانَتْ أُولَابٍ وَاحِدَةً كَانَتْ أَوْ أَكْثَرَ إِذَا كُنَّ ثَابِتَاتٍ مُتَحَاذِيَاتٍ فِي الدَّرَجَةِ وَيَسْقُطَنَّ كُلُّهُنَّ بِالْأَمِّ وَالْأَبَوِيَّاتُ أَيْضًا بِالْأَبِّ وَكَذَلِكَ بِالْحَدِّ إِذَا كَانَ الْأَبُّ وَالْأُمُّ عُلْتُ فَانْهَارَتْ مَعَ الْحَدِّ لِأَنَّهَا لَيْسَتْ مِنْ قَبْلِهِ وَالْقُرْبَى مِنْ أَيْ جِهَةٍ كَانَتْ تَحْتَجُّبُ الْبُعْدَى مِنْ أَيْ جِهَةٍ كَانَتْ وَارِثَةً كَانَتْ الْقُرْبَى أَوْ مَحْجُوبَةً الْخ“۔

یعنی جدہ کا حصہ چھٹا ہے خواہ ثانی ہو یا دادی، ایک ہو یا زیادہ بشرطیکہ صحیحات ہوں (یعنی درمیان میں جَدَ فاسد حائل نہ ہو، جَدَ فاسد وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ ہو جیسے نانا) اسی طرح درجہ میں یعنی واسطوں میں مساوی ہوں، اگر ماں موجود ہو تو جدات ساری ساقط ہو جاتی ہیں جبکہ دادیاں باپ کی وجہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہیں، اسی طرح دادیاں، دادا کے ہوتے ہوئے بھی محروم ہوتی ہیں سوائے باپ کی ماں کے کہ وہ دادا کے ساتھ بھی وارث بنتی ہے کیونکہ اس کا قرب میت سے (یعنی اپنے پوتے سے) دادا کے واسطے سے نہیں (بلکہ اپنے بیٹے کے واسطے سے ہے) اور قریب والی جدہ کوئی بھی ہو دروالی کے لئے حاجب بنتی ہے خواہ کسی جہت سے بھی ہو، اسی طرح حاجبہ خود وارث ہو یا نہ ہو مگر دروالی کو محروم کرتی ہے۔ (راجع للفصل ان شئت السراجی ص ۱۲ و ص ۱۳ من فصل فی النساء)

اس روایت پر اگرچہ انقطاع کا اعتراض ہے کہ قبضہ کا سماع حضرت ابوبکرؓ سے ثابت نہیں مگر باب کی

اگلی روایت بلاشبہ صحیح ہے چونکہ مضمون دونوں کا ایک ہی ہے اس لئے یہ بھی صحیح ہوئی۔ ولذا قال الترمذی بعدہ
وہو اصح من حدیث ابن عیینہ۔

باب ماجاء فی میراث الجدة مع ابنہا

”عن عبد اللہ بن مسعود قال فی الجدة مع ابنہا: انها اول جدة اطعمہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سدساً مع ابنہا و ابنہا حی“۔ (ہذا حدیث لانعرفہ مرفوعاً الا من ہذا الوجه الخ)
حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے جو دادی کے بارے میں جس کا اپنا بیٹا بھی موجود ہو فرماتے ہیں کہ وہ پہلی جدہ ہے جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کے ہوتے ہوئے سدس دیا ہے جبکہ بیٹا بھی زندہ تھا۔

تشریح:- پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ علم میراث میں تمام نسبتیں میت کی طرف ہوتی ہیں، لہذا اس حدیث میں ابن کی نسبت میت کی طرف نہ سمجھی جائے بلکہ جدہ کی طرف جیسا کہ ضمیر ”ہا“ سے واضح ہے پس جدہ کے بیٹے سے مراد میت کا باپ ہے

اس بارے میں جمہور کا مذہب اور مفتی بہ قول وہی ہے جو سابقہ باب میں گذرا کہ باپ کے ہوتے ہوئے دادی میراث نہیں لے سکتی ”والابویات ایضاً (یسقطن) بالاب“۔ (سراجی) اور محشی نے بھی نقل کیا ہے اگرچہ اس بارے میں بعض صحابہ کرامؓ جیسے حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم باپ کے ساتھ دادی کے حق وراثت کے قائل ہیں۔ حدیث الباب ان کی دلیل ہے، امام ترمذیؒ نے بھی اس بارے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف نقل کیا ہے۔

جمہور کا اصولی استدلال یہ ہے کہ باپ موجود ہو تو وہ دادی کے لئے حاجب بنتا ہے اور حاجب کے ہوتے ہوئے محبوب وارث نہیں بن سکتا، چونکہ یہ استدلال بنیادی اور صحیح اصول و قواعد پر مبنی ہے اس لئے باب کی حدیث میں تاویل ناگزیر ہے جیسا کہ ابن العربیؒ عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں: ”ومراعات القواعد اولیٰ من مراعاة الالفاظ“۔ اسی قاعدے کی بناء پر وہ صوم عن المیت کے جواز والوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”فراعنی لفظاً وھدم اصلاً“۔ (دیکھئے عارضۃ الاحوذی ص ۱۹۱ ج ۳، باب ماجاء فی الصوم عن المیت یا تشریحات ترمذی ص ۲۶۰ ج ۳، باب ماجاء فی الصوم عن المیت)

باب کی حدیث کا جواب :- ایک تو یہ ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ امام ترمذی نے اشارہ کیا ہے، اسی باب کے تحت عارضہ میں: ”ولم یثبت“ یعنی یہ حدیث ثابت نہیں ہے، لہذا جمہور کے اصولی استدلال پر اثر نہیں پڑتا، کہ محمد بن سالم ضعیف ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث یعنی باپ کی خوشی اور رضامندی سے وادی کو بطور نفل دے دیا تھا نہ کہ بطور فرض، لفظ ”أَطْعَمَهَا“ اس کا قرینہ ہے۔

باب ماجاء فی میراث الخال

”عن ابی أَسَمَةَ بن سُهَيْل بن حُنَيْف قال کتب معی عمر بن الخطاب الی ابی عُبَیْدَةَ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اللہ ورسولہ مولیٰ من لامولٰی له والخال وارث من لا وارث له“۔ (حدیث حسن صحیح) ۱

ابو امامہ بن سہیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے میرے ہاتھ پر ابو عبیدہ کو لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے مددگار ہیں جس کا کوئی مددگار نہ ہو اور یہ کہ ماموں اس شخص (بھانجے) کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

تشریح :- یعنی عالم اسباب میں جس کا کوئی معاون نہیں تو اللہ اس کا بطور خاص مددگار ہے۔ یہ خط دراصل ابو عبیدہ بن جراح کے خط کا جواب تھا جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مقتول کی میراث کے بارے میں پوچھا تھا، جس کا سوائے ماموں کے کوئی دوسرا وارث نہیں تھا، حضرت عمرؓ کے جواب اور باحوالہ مرفوع حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ دیگر ورثہ نہ ہونے کی صورت میں ماموں وغیرہ ذوی الارحام میراث کے مستحق ہیں۔ امام ترمذی نے اس کو جمہور کا مذہب قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: ”والی هذا الحدیث ذهب اکثر اهل العلم فی توریث ذوی الارحام“ اس کے برعکس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مالکیہ وشافعیہ کے نزویک ذوی الارحام کی موجودگی کے باوجود میراث بیت المال میں جمع ہوگی ماموں وغیرہ کو نہیں دی جائے گی، حنفیہ کا مذہب وہی ہے جو جمہور اور اکثر اہل علم کا ہے یعنی ذوی الارحام کو میراث ملنے کا۔

باب ماجاء فی میراث الخال

۱ رواہ النسائی والدارقطنی وابن ماجہ، قال الالبانی فی صحیح الجامع ۳۹۶/۱ ”حسن“ سنن دارمی ص: ۳۳ ج: ۲

حدیث: ۲۹۷۷، ایضاً رواہ مستدرک حاکم ص: ۲۶۲ ج: ۵ حدیث: ۸۱۷۰۔

ذوی الارحام کون ہیں؟؟؟ تو سراجی میں ہے: ”ذوی الرحم ہو کل قریب لیس بذی سهم ولا عصبہ“۔ (باب ذوی الارحام، ص: ۳۴)

یعنی ہر وہ عزیز ورشتہ دار جو نہ تو ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ ہی عصبہ ہو جیسے نانی کے علاوہ ماں کے توسط سے تمام رشتہ دار (نھیال) اور نواسے ونواسیاں، بھانجے وبھانجیاں اور پھوپھیاں وغیرہ۔

جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے جو صحیح بھی ہے اور صریح بھی، اسی طرح امام ترمذی نے ذی الباب میں جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب بھی جمہور کی متدل ہیں علاوہ ازیں ”واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض“ لے لایۃ اور ”للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون“ (النساء آیت نمبر ۷) سے بھی جمہور کا استدلال ہے۔

اس کے برعکس مانعین کے پاس کوئی صریح اور صحیح نص نہیں ہے خصوصاً جب آج کل بیت المال بھی نہیں ہے اگر ہے تو برائے نام بلکہ ناکام ہے، تو ایسے میں وہ اگر ذوی الارحام کو نہ دیں تو کہاں پھینکیں گے؟ اس لئے جمہور کا مذہب اور خصوصاً موجودہ حالات میں بہت مضبوط ہے، صاحب تحفہ فرماتے ہیں: ”وہو قول الراجح“۔ قاضی شوکانی نے بھی ”نیل“ میں اس کی بھرپور تائید کی ہے، ابن العربی نے عارضہ میں باب کی حدیث میں لفظ ”خال“ کو عصبہ اور سلطان پر حمل کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر صاحب تحفہ نے اس کو تعسف کہا ہے جیسا کہ ظاہر ہے، کیونکہ خال اور سلطان میں کوئی علاقہ نہیں۔

باب ماجاء فی الذی یموت ولیس له وارث

”عن عائشة ان مولیٰ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم وقع من عذق نخلة فمات فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أنظروا هل له من وارث؟ قالوا: ”لا“ قال: فادفعوه الی بعض اهل القرية“۔ (حسن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام کھجور کے درخت (یا شاخ) سے گرا اور فوت ہو گیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تلاش کرو اس کا کوئی وارث ہے؟ صحابہ کرام نے فرمایا نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر (میراث) اس کے گاؤں کے بعض

(غریبوں) کو دے دو۔

لغات:- قولہ ”مولیٰ“ لغت میں اس کے تقریباً سترہ (۱۷) معانی ہیں مثلاً مالک، مددگار، دوست، حلیف، غلام، آزاد کردہ غلام اور آزاد کرنے والا آقا وغیرہا۔ یہاں آزاد کردہ غلام مراد ہے، اس کو مولیٰ اسفل بھی کہتے ہیں، جیسا کہ اگلے باب کے ترجمہ الباب میں ہے۔ قولہ ”عذق“ اگر عین کو مفتوح پڑھ لیا جائے تو نفس کھجور کے پھل دار درخت کو کہتے ہیں، اور یکسر العین کچھوں اور خوشوں والی شاخ کو کہتے ہیں، دونوں صورتوں میں عین کلمہ یعنی ذال ساکن ہے۔

تشریح:- اصولی طور پر اس غلام کی میراث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنی چاہئے تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معتق (بکسر التاء) تھے مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام مادی اشیاء کی میراث نہ لیتے ہیں اور نہ ہی دیتے ہیں تاکہ لوگ ان کو دنیا دار نہ سمجھیں، اور ان کو دنیاوی اشیاء سے طویل واسطے کی ضرورت بھی نہیں، اس لئے یہ مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بیت المال میں جمع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیت المال میں تصرف کے مالک تھے، دوسری طرف گاؤں والوں کو ایک گونہ تعلق تو تھا کہ جس کا بچپن جہاں گزرے وہاں سے اور وہاں والوں سے قلبی تعلق ہوتا ہے اسی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث گاؤں کے غریبوں کو دینے کا حکم دیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ میراث کی ملکیت غیر اختیاری سبب ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالک تو بن گئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشیاء کو ذخیرہ نہیں فرماتے اس لئے گاؤں والوں کو دینے کا حکم دیا تو یہ بھی صحیح وجہ بن سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بہر حال اگر کوئی آدمی ایسا ہو کہ اس کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو اس حدیث سے گاؤں والوں کو وارث نہ سمجھا جائے بلکہ وہ مال بیت المال میں جمع ہوگا۔

مگر جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آج کل تو بیت المال نہیں ہے تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب عرف شذی میں فرماتے ہیں کہ اس کو دینی مدارس میں جمع کرادیا جائے۔

”افتی ارباب الفتاویٰ بان بیوت الاموال انعدمت فیدفع الوراثة الى من یدلی

الى السمیت رضاعاً وافتی صاحب مجمع الانهر بوضعها فی المدارس الاسلامیة

وهذا یوافق اهل العصر ویفید ارباب الفتوی ”الخ۔ (العرف الشذی تحت ہذا الباب)

پھر اس تر کے کا مصرف مستحقین زکوٰۃ ہوں گے اس لئے ذمہ دار و محتاط مدارس میں دینا چاہئے۔

باب ماجاء فی میراث المولیٰ الاسفل

”عن ابن عباس ان رجلاً مات على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يدع وارثاً الا عبداً هو اعتقه فاعطاه النبي صلى الله عليه وسلم ميراثه“۔ (حدیث حسن)^۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فوت ہو گیا اور پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا مگر ایک غلام جس کو اس نے آزاد کیا تھا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غلام کو اس کی میراث دے دی۔

تشریح:- اس حدیث کی شرح میں وہی اصول ہے جو سابقہ باب میں بیان ہوا کہ ایسے آدمی کی میراث بیت المال میں جمع ہوگی، اور آج کل دینی مدارس میں، مولیٰ اسفل یعنی آزاد کردہ غلام کی میراث تو مولیٰ اعلیٰ یعنی آزاد کرنے والے کو ملتی ہے نہ کہ مولیٰ اعلیٰ کی مولیٰ اسفل کو مگر یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو بیت المال کے مال کا مصرف سمجھ کر اور ایک گونہ تعلق کی بناء پر دیا۔ تدبر

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والكافر

”عن اسامة بن زيد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم“۔ (حدیث حسن صحیح)^۱

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کافر کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث بن سکتا ہے۔

تشریح:- امام ترمذی نے اس بارے میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا ہے بلکہ فرمایا: ”والعمل على

باب فی میراث المولیٰ الاسفل

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً الحاكم في المستدرک ص: ۲۶۵ ج: ۵ حدیث: ۸۱۸۱۔

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والكافر

۱۔ رواه البخاری ص: ۱۰۰۱ ج: ۲ ”باب لا يرث المسلم الكافر الخ“ كتاب الفرائض، صحيح مسلم ص: ۳۳ ج: ۲ كتاب الفرائض وابدؤاؤد فی كتاب الفرائض ”باب هل يرث المسلم الكافر“ ومالك في الموطأ فی كتاب الفرائض باب ميراث اهل الملل، أيضاً رواه احمد والبيهقي بحواله سنن دارمی ص: ۴۶۶ ج: ۲ حدیث: ۳۰۰۰، مستدرک حاکم ص: ۲۶۳ ج: ۵ حدیث: ۸۱۷۳۔

هذا الحديث عند اهل العلم "البتہ مرتد کے بارے میں اختلاف نقل کیا ہے، لہذا اس باب میں دو مسئلے قابل ذکر ہیں: (۱) اصلی کا فرکی توریث کا۔ (۲) مرتد کی وراثت کا مسئلہ۔

پہلے مسئلے کی وضاحت یہ ہے کہ کافر تو بالا جماع مسلمان کا وارث نہیں بنتا، جبکہ اس کے برعکس مسلمان کے کافر کا وارث بننے میں اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں بنتا جبکہ بعض صحابہ کرامؓ جیسے معاذ بن جبل، معاویہ اور سعید بن المسیب وغیرہ رضی اللہ عنہم اس کے جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ حاشیہ میں ہے اور امام نوویؒ نے شرح مسلم میں بھی ذکر کیا ہے۔^۱

جمہور کا استدلال:- اس بارے میں باب کی حدیث سے ہے جس میں دونوں جانبوں سے میراث کے استحقاق کی نفی کی گئی ہے اسی طرح اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث آنے والی ہے جس میں صاف کہا ہے: "لا یتوارث اهل ملیتن" ^۲ نیز توارث موالات و نصرت پر مبنی ہے اور وہ مسلمان و کافر کے درمیان مفقود ہے۔

دوسرے فریق کا استدلال:- اس حدیث سے ہے: "الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ" ^۳ لہذا مسلمان عالی ہونے کی وجہ سے وارث بننا چاہئے کافر کا۔

جواب:- مگر اس حدیث سے اس کا استدلال درست نہیں کیونکہ یہاں علو سے مراد حجت و افضلیت ہے یعنی اسلام تمام پہلوؤں کے اعتبار سے تمام ملل و ادیان سے افضل ہے کوئی مذہب اس کے مساوی یا فائق نہیں ہو سکتا، اس کے مقابلے میں جمہور کی متدل حدیث نفی توارث پر صریح ہے۔ بہر حال اب اس مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہیں ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ مسلمان اور کافر کے درمیان توارث نہیں ہے۔

دوسرے مسئلے میں کافی اختلاف ہے اور کل ملا کر اس میں چھ مذاہب ہیں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اختلاف جانہین سے توارث کے بارے میں ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ مرتد مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا، پس یہ صرف مرتد کے بارے میں، اس حالت سے متعلق ہے جب وہ حالت ارتداد میں مرجائے یا مارا جائے یا دار حرب چلا جائے یعنی بغیر توبہ کے مرے۔

۱۔ النووی علی مسلم ص: ۳۳ ج: ۲۔

۲۔ ایضاً رواہ الدارمی فی سننہ عن عمرؓ ص: ۴۶۵ ج: ۲ حدیث: ۲۹۹۲۔

۳۔ رواہ البخاری ص: ۱۸۰ ج: ۱ "باب اذا اسلم الصبی لمات الخ" کتاب الجنائز۔

مذہب کی تفصیل حاشیہ کو کتب پر بحوالہ ماوردی منقول ہے۔ سراجی میں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مرتد نے جو مال حالتِ یدوت میں کمایا ہو وہ بیت المال (دینی مدارس) میں جمع کر دیا جائے گا، اور جو ارتداد سے پہلے کا ہے وہ مسلمان ورثہ کو بطور میراث ملے گا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ دونوں حالتوں کا مال مسلمان وارثوں کا ہے، اس کے برعکس امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں قسم کا مال بیت المال میں جمع ہوگا جبکہ مرتدہ عورت کا سارا ترکہ مسلمان وارثوں کا ہے بالا جماع۔ (فصل فی المرتد ص: ۵۸)

امام ترمذیؒ نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ امام احمدؒ، امام مالکؒ کا مذہب بھی امام شافعیؒ کے مذہب کی طرح ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک اگر ایک آدمی اپنے ورثہ کو محروم کرنے کی غرض سے مرتد ہو جاتا ہے تو پھر اس کی میراث مسلمان وارثوں کو ملے گی۔

امام شافعیؒ کی دلیل:- حدیث الباب ہے کما نقلہ الترمذی عنہ۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو مال اس نے حالتِ یدوت میں کمایا ہے اس کے متعلق تو یہ بات صحیح ہے مگر جو حالت اسلام کا ہے تو اس میں تو ریث کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مرتد ہو گیا والعیاذ باللہ تو وہ حکماً میت قرار پایا کیونکہ اسی وقت اس کا قتل واجب ہو گیا تھا، جو تاخیر تین دنوں تک ہوئی وہ اس کے شبہ کے ازالے کے لئے ہوئی، مگر جب وہ واپس مسلمان نہ ہوا اور قتل کیا گیا تو یہ قتل وقتِ ردت کی طرف منسوب ہوگا لہذا یوں سمجھا جائے کہ وہ ارتداد سے مر گیا تو یہ تو ریث المسلم من المسلم ہوئی۔ (تدبر) کچھ آثار بھی امام صاحبؒ کے مستدل ہیں جو حاشیہ تحفہ پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

حدیث آخر:- ”عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ”لا یتوارث اہل ملتین“۔

(حدیث غریب) ۵

دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے۔

تشریح:- ایک نسخہ میں یہاں مستقل باب مع العوان موجود ہے جیسا کہ بین السطور دیا ہے: ”باب لا یتوارث اہل ملتین“۔ اس مسئلہ کی نوعیت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی مگر وہاں مسلمان اور کافر کے درمیان توارث زیر بحث تھا یہاں اس میں توسیع ہوئی اور کہا کہ دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

یہ حدیث بظاہر امام احمدؒ کے مذہب پر زیادہ صریح ہے کیونکہ ان کے نزدیک تمام ادیان خواہ سماوی ہوں یا خود ساختہ سب مختلف ہیں لہذا کسی بھی ایک ملت والا دوسرے ملت والے کا وارث نہیں بن سکتا جبکہ حنفیہ و شافعیہ

کے نزدیک یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں، مالکیہ کے نزدیک ملل ساویہ سارے آپس میں مختلف ہیں اور باقی خود ساختہ تمام ملل ایک ہیں، بظاہر یہ حدیث ان تینوں مذاہب کے خلاف ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک ملت ہے اور کفر خواہ وہ کسی بھی مذہب والوں کا ہو دوسری ملت ہے علیٰ ہذا یہ حدیث سابقہ حدیث کی طرح ہوئی اور مطلب وہی ہوا جو سابقہ باب میں بیان ہوا یعنی اس میں مسلمان اور کافر کے ایک دوسرے سے توارث کی نفی کی گئی ہے باقی ملل کی بات اس میں نہیں کی گئی ہے لہذا وہ ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔ (کذا فی اللکوب وحاشیہ)

آج کل کے اہل بدعت کی وراثت و مناکحت کا حکم:- یہ بات ذہن میں رہے کہ بدعت کی اصطلاح قدماء کے نزدیک فکری اختراع اور اہل السنۃ والجماعت سے مختلف نظریات کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جبکہ متاخرین کے نزدیک اس کا اطلاق خلاف سنت کسی عمل کو ثواب کی غرض سے کئے جانے پر ہونے لگا، اور آج کل یہی متعارف ہے، اس لئے پھر بعض علماء کو تفصیل بتانے کی ضرورت پیش آئی کہ بدعت ایک مکفرہ ہے اور دوسری سیدہ ہے۔ تفصیل فتاویٰ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف یہ بات پیش نظر ہے کہ اگر کسی خاندان میں دیوبندی، بریلوی اور شیعہ تینوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے موجود ہوں تو ان کی توریث کا حکم کیا ہونا چاہئے؟

اس کا جواب خاصا مشکل ہے اور مفصل بھی، مگر اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہنا چاہئے کہ ایمان و اسلام یا توارث کا دار و مدار صرف ظاہری انتساب پر مبنی نہیں ہے کہ اگر کوئی شیعہ یا بریلوی ہے تو وہ کافر اور کوئی دیوبندی ہے تو وہ مسلمان ہے اصل چیز اعتقاد و اعمال ہیں گو کہ یہ نسبتیں شعاع کا کام دیتی ہیں، کسی کی تکفیر کا اصول یہ ہے کہ جو شخص ضروریات دین کو نہیں مانتا یا ان میں تاویل کرتا ہے تو وہ اہل قبلہ یعنی مسلمان نہیں ہے، ضروریات سے مراد وہ احکام ہیں جو اتنے تواتر سے مروی و ثابت ہوں جو گویا بدیہی بن چکے ہوں اور بحیثیت مسلمان وہ موٹی موٹی باتیں کسی پر مخفی نہ ہوں جیسے توحید، رسالت، قیامت وغیرہ عقائد میں سے اور نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ اعمال میں سے، جن میں تاویل و احتمال دیگر کی گنجائش نہیں۔ اور جو شخص ضروریات کو مانتا ہے اور ان میں تاویل نہیں کرتا، بالفاظ دیگر قطعی الثبوت نصوص جو قطعی المعنی ہوں جیسے محکم و مفسر، ان کو بلا تاویل ماننے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، شرح عقائد مع الممتن میں ہے:

”وَرَدَّ النُّصُوصُ بَانَ يَنْكُرُ الْأَحْكَامَ الَّتِي دَلَّتْ عَلَيْهَا النَّصُوصُ الْقَطْعِيَّةُ مِنَ الْكِتَابِ

والسنة كحشر الاجساد مثلاً ككفر لكونه تكذيباً صريحاً لله تعالى ورسوله (صلی اللہ علیہ وسلم) فمن قذف عائشة بالزنا كُفِرَ واستحلل المعصية صغيرة

كانت او كبيرة كفر اذا ثبت كونها معصية بدليل قطعی۔ (شرح عقائد ص: ۱۲۰)

پھر اس اصول پر بہت سی تفریعات کی ہیں جس کی تفصیل شرح عقائد وغیرہ کتب عقائد میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علی ہذا جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل مانتا ہو، یا ان کی الوہیت کا قائل ہو، یا حضرت جبریل علیہ السلام کی بابت یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وحی نازل کرنے میں ان سے چوک ہوئی اور بجائے حضرت علیؑ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے آئے، یا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر ہو، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو زنا سے متہم کرتا ہو، یا کوئی شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتا ہو، یا غیر اللہ کے لئے کلی و محیط علم غیب مانتا ہوں، یا اس قسم کی قطعیات کا انکار یا تاویل کرتا ہو تو وہ شخص مسلمان نہیں، نہ وہ کسی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی میراث مسلمان کو ملے گی، اسی طرح اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا جائز نہیں بلکہ منعقد ہی نہیں ہوتا، جبکہ ایسے نام کے شیعہ یا بریلوی جن کے عقائد صریحاً مخصوصات سے متصادم نہ ہوں یا اگر متصادم ہوں تو ان نصوص میں قطعیت نہ ہو، اور اگر ثبوت میں قطعیت ہو لیکن معنی میں تاویل کی گنجائش ہو تو ان کی تکفیر نہیں کی جانی چاہئے لیکن پھر بھی ان کی وراثت اور مناکحت سے بچنا چاہئے خصوصاً اپنی لڑکی ان کے مردوں کے نکاح میں ہرگز نہیں دینی چاہئے کہ وہ غلط آدمی کے تسلط میں دینے کے مترادف ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح میں انتہائی احتیاط برتنی چاہئے کیونکہ یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ کس رافضی کا عقیدہ و عمل خراب ہے اور کس کا نسبتاً اچھا ہے تو جیسے بعض ظن گناہ ہے مگر قرآن نے اس قلیل کی وجہ سے ظن کثیر سے ممانعت فرمادی اس لئے ان تمام لوگوں کی وراثت و مناکحت سے بچنا چاہئے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

”فاذا كان الرجل مُحْسِماً او قسرياً وولده موحدمات هل يرثه ام لا؟ بتنی

المسئلة على القول بتكفير المتأولين فان قلنا انهم غير كفار صلينا عليهم وجرى

الميراث، وان قلنا انهم كفار لم يصل عليهم ولا جرى الميراث فيهم۔“

پھر اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حارث محاسبی کا باپ میراث میں ستر ہزار درہم چھوڑ گیا تھا مگر انہوں نے

اس سے کچھ بھی نہیں لیا کہ باپ قدری تھا۔

قال ابن ہوازن: ”قیل انه ورث من ابیه سبعین الف درہم فلم يأخذ منه شیئاً لان اباه یقول بالقدر فرأى فی الورع ان لا يأخذ میراثه، فیحتمل احدو جہین إمالانہ کان یری إکفار من ابتدع وامانزہ وتورّع“۔ واللہ اعلم۔

حضرت تھانوی صاحبؒ کی تقریر ”المسک الذی علی الترمذی“ میں اس باب کے تحت فرمایا ہے: ”روافض وغیرہ جو فرقے ہیں وہ سب اسلام میں داخل ہیں جب تک کہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچیں اور ان سے نکاح وغیرہ بھی جائز ہے، اور فتویٰ میں چونکہ ہر شخص خود مختار ہے جو چاہے لکھ دے مگر اس باب میں بہت بڑی احتیاط کرنی چاہئے کہ تکفیر کے لئے نہایت قوی دلیل کی ضرورت ہے، اور جاننا چاہئے کہ کفر کی دو قسمیں ہیں: ایک تو کفر لزوماً ہوتا ہے، اور ایک التزاماً مثلاً کوئی شخص عمل کفار کے کرتا ہے اور جب اس سے دریافت کیا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اس صورت میں کفر لزوماً ہے یہ شخص کافر نہیں ہے، اور اگر کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم مسلمان ہو یا ہندو؟ اور وہ کہے کہ میں ہندو ہوں تو یہ کفر التزامی ہے کہ وہ اپنے کافر ہونے کا التزام کرتا ہے، سو یہ شخص واقعی کافر ہے، کیونکہ ملتزم کفر ہے اگرچہ وہ عمل مسلمان کے کرے۔“

المستزاد عرض کرتا ہے کہ حضرت تھانوی صاحبؒ کا فتویٰ ”امداد الفتاویٰ“ میں اسے سے نسبتاً سخت ہے ممکن ہے کہ جس زمانہ میں ترمذی پڑھا رہے ہوں تو اس وقت شیعیت کے غلو کے بارے میں زیادہ معلومات یا مشاہدہ نہ ہوا ہو مگر بعد میں رائے تبدیل ہوئی ہو۔ آج کل کے شیعہ عموماً بہت غالی ہیں اس لئے عام اہل فتاویٰ نے ان کی تکفیر کی ہے، میرے خیال میں جو ان پڑھ اور جاہل قسم کے شیعہ ہیں اور صرف نام کے شیعہ ہیں یا غالی نہیں تو ان کی تکفیر میں احتیاط لازمی ہے اگرچہ آج کل ان میں سے ایسے افراد عملاً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

متنبیہ:- جس طرح کسی کی تکفیر ایک خطرناک اور نازک ترین مسئلہ ہے تو اسی طرح تکفیر میں تساہل بھی بہت سے مفسد کو جنم دیتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی جن کے نظریات و اعمال ایمان سے خارج کر دینے والے ہوں تکفیر نہ کی جائے تو سادہ لوح مسلمان ان کے اعمال کو قبیح نہ سمجھ کر اختیار کریں گے اس طرح وہ بے چارے دائرہ ایمان سے خارج ہو جائیں گے، چنانچہ حضرت تھانویؒ آغا خانیوں کے نظریات و عقائد کے بارے میں

پوچھے گئے ایک سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں: ”خلاصہ یہ ہے کہ جب ان کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جائے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح خفیف ہو جائے گا اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہو سکیں گے، تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے کیا کوئی مصلحت اس مفہدہ کی مقاومت کر سکے گی؟“ الخ۔

(بوادر النواذر ص: ۴۱ طابع ادارہ اسلامیات لاہور)

باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: القاتل لایرث“۔^۱ (ہذا حدیث لایصح... واسحق قد ترکہ بعض اہل العلم... والعمل علی ہذا عند اہل العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قاتل (مقتول کی) میراث نہیں لے سکتا ہے۔

تشریح:- یہ حدیث اگرچہ بقریح امام ترمذی صحیح نہیں مگر جیسا کہ پہلے بار ہا عرض کیا جا چکا ہے کہ کبھی روایت کی سند ضعیف ہوتی ہے مگر تعامل ائمہ کی وجہ سے وہ صحیح ہوتی ہے، اس لئے امام ترمذی نے فرمایا کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے، نیز یہ روایت ”عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ“ کی سند سے نسائی یا سنن ابی داؤد میں بھی مروی ہے،^۲ اس لئے قابل حجت ہے۔ تاہم امام مالک فرماتے ہیں کہ قتل خطا میں قاتل کو مقتول مورث کی میراث میں سے مقررہ حصہ ملے گا دیت سے نہیں ملے گا جبکہ عمد میں وہ جمہور کے ساتھ ہیں، عارضہ میں ہے: ”وقال مالک: یرث من الخطأ الا من الدیۃ“۔^۳ حنفیہ وشافعیہ وغیرہ عمد اور خطا ہر دو میں حرمان کے قائل ہیں۔

ان کا استدلال حدیث باب سے ہے چونکہ روایت مطلق ہے عمد کی قید سے، اس لئے اس کا عموم پر رکھنا اولیٰ بلکہ ضروری ہے، کیونکہ خطا کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں۔ سراجی میں ہے:

باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

۱۔ ایضاً رواہ الدارمی ص: ۴۷۹ ج: ۲ حدیث: ۳۰۸۳، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۲۸۰ ج: ۲ کتاب الدیات، مسند احمد ص: ۸۰ ج: ۱ حدیث: ۳۴۸۔ ۲۔ لم اجده فی النسائی ولكن رواہ ابو داؤد عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ص: ۲۸۰ ج: ۲ ”باب دیات الاصاب“ کتاب الدیات۔ ۳۔ فی الدارمی: اذا قتل الرجل اخاه عمداً لم یورث من میراثہ ولا من دیتہ فاذا قتله خطأ ورث من میراثہ ولم یورث من دیتہ الخ ص: ۴۷۸ ج: ۲۔

”المانع من الارث اربعة: الرق... والقتل الذى يتعلق به وجوب القصاص أو

الكفارة، واحتلاف الدينين واحتلاف الدارين“۔

یعنی ہر وہ قتل حرام میراث کا سبب ہے جس سے یا قصاص لازم آتا ہو جیسے عمد یا کفارہ لازم آتا ہو جیسے

شہہ عمد اور خطاء۔

قتل کی تعریف یہ ہے کہ قتل کے ارادے سے کسی کو آگہ قتل سے ہلاک کر دے اس سے قصاص لازم آتا ہے، باقی اقسام سے نہیں، اگر قتل کرنے کا ارادہ تو ہو مگر وہ آگہ قتل اسلحہ یا اس کا قائم مقام نہ ہو جیسے پتھریاؤ یا ڈنڈا تو وہ شہہ عمد ہے، اور اگر مثلاً شکار سمجھ کر گولی چلائی وہ انسان کو لگ گئی تو وہ خطاء ہے جبکہ لیٹے ہوئے شخص کا کسی پر گرنا یا کروٹ کے نیچے سوتے میں دبا کر مارنے کو جاری مجری خطا کہتے ہیں، آج کل گاڑی کا ڈرائیور بھی اسی حکم میں ہے جیسے جانور کا سوار ہوتا ہے۔ (کمانی الہدایۃ ”باب جنایۃ البھیمۃ والجنائیۃ علیہا“ ص: ۵۲۴ جلد ۴) اقسام قتل کی تفصیل (تشریحات ج: ۵ ص: ۳۰۶) پر بھی گزری ہے۔

باب ماجاء فی میراث المرأة من دية زوجها

”عن سعيد بن المسيّب قال قال عمر الدية على العاقلة ولا ترث المرأة من دية زوجها

شيئاً فأخبره الضحاك بن سفيان الكلابي ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب اليه ان ورث امرأة أشيم الضبابي من دية زوجها“۔ (هذا حديث حسن صحيح) ۱

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دیت عاقلہ پر ہے اور عورت اپنے شوہر کی دیت میں سے کچھ بھی وراثت نہیں لے سکتی، تو ضحاک بن سفیان نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس لکھ کر بھیجا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو ان کے شوہر کی دیت میں سے میراث دے دو۔

لغات:- قوله ”دية“ خون بہا کو کہتے ہیں، یہ اصل میں مصدر ہے ”وَدَى القاتل“ اس وقت کہا جاتا ہے جب قاتل والوں کی طرف سے ولی مقتول کو جان کے بدلہ مال دیا جائے، مگر پھر اس کا اطلاق مال پر ہونے

لگا۔ قولہ ”العاقلة“ عقل سے ہے عقل کے معنی دیت بھی آتے ہیں، پس عاقلہ وہ لوگ ہوئے جو دیت ادا کرتے ہیں۔ اور عقل روکنے کو بھی کہتے ہیں چونکہ آدمی کا قبیلہ اس کو سمجھانے اور قتل و قتال اور فساد سے روکنے کا پابند ہوتا ہے اس لئے ان کو عاقلہ کہتے ہیں لہذا اگر وہ آدمی کسی کو قتل کر دے تو ذمہ داری دیت کی سب پر عائد ہوگی۔

تشریح:- حضرت عمرؓ کا مذہب یہ تھا کہ بیوی شوہر کی دیت میں حصہ دار نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ ایک دقیق نکتے پر مبنی تھی کہ دیت تو شوہر کی موت کے بعد ملتی ہے لہذا یہ شوہر کی کمائی نہیں نیز موت سے نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے علاوہ ازیں جب عورتیں دیت کی ادائیگی میں شریک نہیں تو تو ریشہ دیت میں بھی ان کا حصہ نہیں ہونا چاہئے۔

مگر جب یہ حدیث ان کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے اپنے مذہب سے رجوع فرمایا، اور حدیث کا حکم جس وجہ پر مبنی ہے وہ ان کی وجہ سے زیادہ اذق ہے، وہ یہ ہے کہ دیت اس مردے کی اسے زندہ تصور کر کے لگائی جاتی ہے کیونکہ لاش کی قیمت تو اتنی زیادہ نہیں ہوتی پس دیت بھی میراث کے مال میں شامل ہے اور نکاح بھی حکماً باقی ہے کہ عورت عدت گزارتی ہے۔ حدیث کی باقی تشریح ”باب ماجاء فی المرأة ترث من دیتہ زوجها“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۳۲۵ ج: ۵، ابواب الدیات)

باب ماجاء ان الميراث للورثة

والعقل للعصبة (على العصبة)

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی فی جنین امرأۃ من بنی لحيان سقط میتاً بغیرۃ عبد او امۃ ثم ان المرأة التي قضی علیہا بغیرۃ توفیت فقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میراثہا للبنینہا و زوجہا وان عقلہا علی عصبتہا“۔^۱

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو لحيان کی ایک عورت کے حمل کے بارے میں جو مردہ پیدا ہوا تھا فیصلہ فرمایا تھا، ایک غرہ دینے کا جو ایک غلام یا باندی ہے پھر جب وہ عورت مر گئی جس کے لئے غرہ کا فیصلہ ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں

باب ماجاء ان الميراث للورثة الخ

۱۔ الحدیث اخرجہ ایضاً البخاری ص: ۹۹۸ ج: ۲ ”باب میراث المرأة والزواج الخ“ کتاب الفرائض، ومسلم فی القسامة، ابو داؤد فی الدیات باب: ۱۹، والنسائی فی القسامة باب: ۳۹، مسند احمد ص: ۳۶۰ ج: ۳ حدیث: ۱۰۵۷۰۔

اور شوہر کی ہے اور اس کی دیت قاتلہ کے عصبہ پر واجب ہے۔

لغات:۔ قولہ ”جنین“ وہ بچہ جو ابھی تک پیٹ میں ہو پوشیدہ اور مستور ہونے کی وجہ سے اسے جنین کہتے ہیں کیونکہ جیم اور نون مادہ میں تسر عن الایمن کے معنی پائے جاتے ہیں، جمع اِحْتِ آتی ہے۔ قولہ ”لِحیان“ بکسر اللام وفتح۔ قولہ ”بغرة“ بضم الغین وتشدید الراء وتوین التاء المدورة، اصل میں گھوڑے کی پیشانی پر سفید نشان کو کہتے ہیں مگر توسعاً ہر عمدہ چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے غلام اور باندی افضل مالیت کی وجہ سے غرہ کہلاتے ہیں۔ قولہ ”عبد اوامة“ جر اور رفع دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہیں، جر بنا بر بدلیت اور رفع بنا بر خبریت یعنی ”هو عبد اوامة“۔ پھر کلمہ ”او“ شک کے لئے نہیں بلکہ اختیار کے لئے ہے۔

تشریح:۔ آج کل تو غلام نہیں پائے جاتے اس لئے مذکورہ بالا صورت میں پانچ سو درہم بطور دیت لازم ہوں گے جیسا کہ بعض روایات^۱ میں اس کا اضافہ بھی مروی ہے جو ایک سال میں ادا کئے جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ میں فریقین کی رعایت فرمائی ہے کیونکہ اگر زندہ بچے کی رعایت کر کے سواونٹ لازم فرماتے تو قاتل کے اہل قرابت کہتے کہ بچہ تو مرا ہوا تھا یعنی خود بخود، پھر ہم پر زندہ کی دیت کیسے؟ اور اگر مردہ فرض کر کے اس کا خون بہا معاف فرماتے تو بچے والے کہتے کہ ہمارا بچہ تو زندہ تھا وہ تو اس عورت کے وار کرنے سے ہلاک ہوا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین بین فیصلہ فرمادیا۔

قولہ ”ثم ان المرأة التي قضی علیها بغرة توفیت“ الخ اس عبارت میں اشکال ہے، وہ یہ ہے کہ اگر متوفیہ اس عورت کو قرا دیا جائے جو مضروبہ تھی تو سوال یہ ہے کہ فیصلہ تو اس کے خلاف نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے حق میں تھا پھر ”علیها“ کا کیا مطلب ہے حالانکہ ”علی“ تو الزام کے لئے آتا ہے اور اگر ضاربہ وجانیہ کو متوفیہ کہا جائے تو اول تو اس کی وفات کے تذکرہ کی کوئی وجہ نہیں اور دوم اس کی میراث کی تخصیص کذا کی بھی کسی بڑے فائدے پر مبنی نہیں۔ پس عام شارحین نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے اور فرمایا کہ متوفیہ دراصل محبیہ یعنی مضروبہ تھی کیونکہ ایک روایت میں ہے ”فقتلها و مافی بطنها“^۲ اور جہاں تک ”علیها“ کا تعلق ہے تو یہاں علی بمعنی لام کے ہے کما فی قولہ تعالیٰ ”لتکونوا شهداء علی الناس“^۳ اس صورت میں باقی تمام ضامراً مرجع بھی یہی محبیہ

۱۔ کذا فی روایۃ ابی داؤد ص: ۲۸۲ ج: ۲ ”باب دية الجنین“ کتاب الدیات۔ ۲۔ کذا فی روایۃ البخاری ”باب جنین المرأة“ کتاب الدیات، ومسلم فی القسامة ”باب دية الجنین“ ابو داؤد فی الدیات باب: ۱۹ والنسائی فی کتاب القسامة باب دية الجنین المرأة، بحوالہ دارمی ص: ۲۵۸ ج: ۲ حدیث: ۲۳۸۰، وفی سنن ابن ماجہ: فضربت احدھما الاخری بمسطح فقتلھا و قتل جنینھا الخ ص: ۱۹۰ ”باب دية الجنین“ ابواب الدیات۔ ۳۔ سورة البقرة آیت: ۱۴۳۔

عورت ہوگی سوائے آخری نمبر کے جو ”علیٰ عَصَبَتِهَا“ میں ہے کہ وہ جانیہ کی طرف راجع ہے، یہ توجیہ اوپر ترجمہ میں بھی اختیار کی گئی ہے، طبیٰ نے اس کو ظاہر کہا ہے، شیخ نے لمعات میں بھی اس کو اختیار کیا ہے، امام نوویؒ نے شرح مسلمؒ میں اس پر جزم کیا ہے کیونکہ دوسری حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے کامر۔

حضرت گنگوہی صاحبؒ نے الکوکب میں دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے۔ فمن شاء فليراجع۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر حکم نہیں لگایا ہے مگر یہ صحیح ہے کیونکہ اس کی اصل صحیحین میں موجود ہے۔ یہ حدیث ”باب ماجاء فی دیۃ الجنین“ میں بھی گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۵ ص: ۳۲۰، ابواب الدیات)

باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل

”عن تميم الداري قال سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما السنة في الرجل من اهل الشرك یسلم علی یدرجل من المسلمین؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هو آولی الناس بمحياه ومماته“۔ (هذا حدیث لانعرفه الا من حدیث عبد الله بن وهب)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مشرکین کے اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو مسلمانوں میں سے کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے؟ (یعنی اس کی میراث کا مستحق کون ہوگا؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق دار ہے (یعنی) زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔

تشریح:- جس کے ہاتھ پر کوئی شخص مسلمان ہو تو چونکہ مسلمان کرنے والے نے اس کو کفر سے نکالا اور اسلام میں داخل کیا تو گویا مردے کو زندہ کیا اس لئے وہ اس کے ساتھ اس کی حیات اور ممات میں زیادہ قریب سمجھا گیا اور وہ اس کی میراث بھی لے گا اور اس کی طرف سے دیت بھی ادا کرے گا، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ نو مسلم نے باہم معاہدہ اس مسلمان کرنے والے کے ساتھ کر لیا ہو کہ تم میرے بعد میرا تمام مال لے لینا کیونکہ میرے ورثہ کا فرہیں اور یہ کہ زندگی میں میرا ساتھ دینا، لہذا جب مسلمان اس نو مسلم کے نفع کا مالک ہو تو اس کے نقصان دیت وغیرہ کا بھی ذمہ دار ہوگا، اور اگر یہ معاہدہ نہ ہو تو بالا اتفاق اس کا مال بیت المال میں اور آج کل جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ذمہ دار دینی مدرسہ میں جمع ہوگا، کیونکہ بیت المال دیگر خیراتی ادارے مسلمانوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں گویا ایسے لا وارث آدمی کے وارث

ضرورت مند مسلمان ہوں گے۔ یہ مذہب حقیقہ کا ہے اور باب کی حدیث ان کی دلیل ہے۔ خفیہ کے نزدیک مذکورہ معاہدے کو موالات یا مولی الموالات کہتے ہیں پس اگر یہ معاہدہ نہ ہوا ہو یا اس نو مسلم کے مسلمان ورثہ بھی ہوں تو پھر مال وارثوں کو ہی ملے گا۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس شخص کا مال بیت المال میں جمع ہوگا، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث الباب کا حکم یا تو شروع اسلام سے متعلق ہے لہذا اب یہ منسوخ ہے یا مطلب اس کا نصرت و مدد کرنا اور نماز جنازہ پڑھانے کا حق ہے، نیز باب کی حدیث ضعیف ہے اس سے احتجاج نہیں ہو سکتا اس کے برعکس ان کا استدلال ”السواء لمن اعتق“^۱ سے ہے جیسا کہ امام ترمذی نے ان سے نقل کیا ہے۔

صاحب بذل الحمد نے اس حدیث پر کافی بحث نقل کی ہے اس میں ابو ذر عہ الد مشقی کا قول نقل کیا ہے:

”نری واللہ اعلم ان عبدالعزیز تحدث یحیی بن حمزہ من کتابہ وحدثہم بالعراق من حفظہ وھذا حدیث حسن متصل لم ارا احدا من اھل العلم یبلغہ...وفیہ ”وقد احتج بعبدالعزیز المذکور البخاری فی صحیحہ وانعرج لہ ھو و مسلم وقال یحیی ابن معین عبدالعزیز بن عمر ثقفی وقال ابن عمار ثقفی لیس بین الناس فیہ اختلاف“۔ (بذل ص: ۱۱۳ ج: ۵، کتاب القرآن ۲)

ہماری طرف سے ان کی متدل حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہر جگہ نہیں یہ تو اس غلام کے لئے ہے جس کے آقا نے اسے آزاد کیا ہو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی وراثت نہیں، غرض یہ حصر جو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بیان ہوا اضافی ہے کہ یہود نے شرط لگائی ولاء لینے کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصر اضافی کے طور پر ان کا دعویٰ استحقاق باطل فرمایا۔

اس کے علاوہ موالاۃ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی مجہول النسب آدمی دوسرے مجہول النسب شخص سے ارش (تاوان) اور ارث (میراث پانے) کا معاہدہ کرے، تو اگرچہ معاہدے پر عمل کرنے سے ہر فریق اس کو منسوخ کر سکتا ہے مگر عدم تنسیخ کی صورت میں بیت المال کے مقابلہ میں ان کا آپس میں توارث افضل ہے

باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل

۱۔ رواہ الطبرانی فی الارسط عن علی رضی اللہ عنہ حدیث: ۸۵۹۰ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۳

حدیث: ۷۱۸۳، ابھنا روی بمعانہ الدارمی ص: ۳۸۷ ج: ۲۔

خصوصاً آج کل جب بیت المال وزیر خازنہ کی جیب المال بنا ہے، یہ معاہدہ یک طرفہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اگرچہ معروف النسب ہو مگر دوسرا مجہول النسب اپنی ذمہ داری اور وفاداری کا عہد دوسرے سے کرے جو پانچ شرائط سے مشروط ہے۔ (الفقه الاسلامی وادلتہ ص: ۸۷۵ ج: ۱۰)

دوسری حدیث:- ”عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ايمار رجل عاقر يخره او امة فالولد ولد الزنا لا يرث ولا يؤورث“۔^۱ (والعمل على هذا عند اهل العلم ان ولد الزنا لا يرث من ابيه)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی کسی آزاد عورت یا باندی سے زنا کرے تو وہ بچہ (جو زنا سے پیدا ہوا) زنا کا بچہ کہلائے گا جو نہ تو (باپ یعنی زانی کا) وارث بنے گا اور نہ ہی اس کی میراث زانی کو ملے گی۔

لغات:- قولہ ”عاقر“ عمر سے بمعنی زنا کے، چونکہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا اس لئے یہ بچہ زانی کے حوالے سے کالعدم تصور کیا جائے گا لہذا اس کا باپ سے اور اس کے اقربہ وغیرہ سے کسی قسم کا تواریث نہیں چلتا وبالعکس حتیٰ کی اگر زانی اس بچہ کو اپنے گھر میں رکھ بھی لے اور پرورش بھی کرے تب بھی میراث ثابت نہ ہوگی، تاہم ملا عنہ عورت اپنے بچے کی وارث ہوتی ہے وبالعکس جیسا کہ باب کی آخری حدیث میں مصرح ہے۔

باب مَنْ يَرِثُ الْوَلَاءَ

”عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يرث الولاء من يرث المال“۔^۲ (هذا حديث ليس اسنادہ بالقوی)

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ولاء کی وراثت اسی کی ہے جو مال کا وارث ہوتا ہے۔

لغات:- قولہ ”ولاء“ بفتح الواو غلام کا وہ مال جو آزاد ہونے کے بعد اس نے حاصل کیا ہو اور اس کے مرنے کے بعد رہ جائے، نیز اس استحقاق و کفالت کو بھی ولّاء کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں لفظ ”مَنْ“ میں عصبہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ولّاء کا حق صرف ان لوگوں

۱۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۱۹۷ ابواب الدیات۔

باب مَنْ يَرِثُ الْوَلَاءَ

۲۔ رواہ احمد فی مسندہ ص: ۷۶ ج: ۱ حلیث: ۳۲۶ وفی روائع: یرث المال من یرث الولاء، رواہ احمد ص: ۳۹ حلیث: ۱۴۸۔

کو ہے جو مال کے مستحق ہیں مگر بطور عصوبت کے لہذا عورتیں ولاء کی مستحق نہیں مثلاً کسی نے غلام آزاد کر لیا پھر دونوں مر گئے اور غلام کا کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو ولاء معتق بالکسر کے بیٹے کو ملے گی بیٹی کو نہیں، ہاں اگر کوئی عورت غلام آزاد کر دے تو بلاشبہ وہ اپنے مولیٰ اسفل کی ولاء کی مستحق اور وارث ہوگی۔

یہ روایت دیگر طرق سے بھی مروی ہے لہذا قابل حجت ہے۔

آخری حدیث:- ”عن واثلة بن الاسقع قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المرأة تحوز ثلاثة موارث عتيقها ولقيطها وولدها الذي لا عنت عنه“۔^۱ (ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ عورت تین قسم کی میراث جمع کر سکتی ہے اپنے آزاد کردہ غلام کی اور لا وارث بچے کی میراث جو وہ کسی جگہ سے اٹھائے ہوئی ہو اور اس بچے کی میراث جس کے حوالے سے وہ لعان کر چکی ہو۔

لغات:- بقولہ ”تحوز“ بمعنی جمع وتاخذ یعنی لیتی ہے۔

تشریح:- جہاں تک آزاد کردہ غلام کی میراث کا تعلق ہے تو اس کا بیان اوپر بھی ہوا کہ معتقہ بالکسر اپنے معتق بالفتح کی میراث لے گی، بشرطیکہ دوسرے ورثہ غلام کے نہ ہوں، اس پر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم کا عمل تھا اور صحیح حدیث میں ہے ”الولاء لمن اعتق“۔^۲ اس میں ”من“ عام ہے عورتوں کو بھی شامل ہے، البتہ لقیط کی میراث اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے قوی روایات کو ترجیح دینا افضل ہے جن کے مطابق سبب توریث نسب یا موالات ہے جو یہاں نہیں ہے البتہ چونکہ اس عورت نے بچے کی دیکھ بھال کی ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہے اگرچہ اصولی طور پر اس کی میراث بیت المال میں جمع ہونا چاہئے۔ کما رمی ”باب ما جاء في الذي يموت وليس له وارث“۔ اور آخری حکم تو بدیہی ہے کیونکہ اگر شوہر نے لعان کی وجہ سے نسب سے انکار کیا ہے تو عورت تو منکر نہیں لہذا جزئیت کی بناء پر میراث ثابت ہوئی

نیز ماں کا حصہ قرآن میں مقرر ہے اس میں لاعتہ کا استثناء نہیں ہے۔ تدبر آخر الفرائض

۱۔ ایضاً رواہ ابوداؤد ص: ۴۷ ج: ۲ ”باب میراث ابن الملائعۃ“ کتاب الفرائض سنن ابن ماجہ ص: ۱۹۷ ابواب الفرائض، ایضاً رواہ احمد فی مسنده ص: ۵۳۴ ج: ۴ حدیث: ۱۵۵۷۴، رواہ الحاکم فی المستدرک ص: ۲۵۹ ج: ۵ حدیث: ۸۱۵۴۔ ۲۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط، کلا فی مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۴۔

ابواب الوصایا

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

باب ماجاء في الوصية بالثلث

”عن عامرين سعد بن ابی وقاص عن ابيه قال مرضتُ عام الفتح مرضاً شفيتم منه على الموت فاتاني رسول الله صلى الله عليه وسلم يعودني فقلتُ يا رسول الله! إن لي مالاً كثيراً وليس يرثني إلا ابنتي فاوصاني بمالي كله؟ قال: ”لا“ قلتُ ”فثلثي مالي؟“ قال: ”لا“ قلتُ فالشطر؟ قال: ”لا“ قلتُ فالثلث؟ قال: الثلث والثلث كثير، إنك ان تذر ورثتك أغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس، إنك لن تُنفق نفقة إلا أُحرقت فيها حتى اللقمة ترفعها إلى في امرأتك، قال قلتُ يا رسول الله أُخلف عن هجرتي؟ قال: إنك لن تُخلفَ بعدى فتعمل عملاً تريد به وجه الله إلا ازددت به رفعة ودرجة وَلَعَلَّكَ ان تُخلفَ حتى ينتفع بك اقوام ويضربك آخرون، اللهم امض لاصحابي هجرتهم ولا تردهم على اعقابهم لكن البائس سعد بن خولة يرثي له رسول الله صلى الله عليه وسلم ان مات بمكة“ (حسن صحيح)

حضرت عامر بن سعد اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں فتح مکہ والے سال بیمار ہو گیا، بیماری ایسی تھی کہ میں موت کے خطرے سے دوچار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کرنے میرے پاس تشریف لائے، پس میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے پاس بہت سارا مال ہے اور سوائے ایک بیٹی کے میرا کوئی دوسرا وارث (ذوی الفروض میں سے)

ابواب الوصایا عن رسول الله ﷺ

باب ماجاء في الوصية بالثلث

۱۔ الحديث أخرجه أيضاً البخاري ص: ۳۸۳ ج: ۱ كتاب الوصايا، ومسلم في كتاب الوصية، وأبو داود في كتاب الوصايا ”باب ماجاء فيما لا يجوز للوصي في ماله“ والنسائي في كتاب الوصايا ”باب الوصية بالثلث“ ومالك في الموطأ في كتاب الوصية ”باب الوصية بالثلث لا تتعدى“ بحواله سنن دارمي ص: ۵۰۰ ج: ۲ حديث: ۳۱۹۶.

نہیں ہے تو کیا میں پورے مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“۔ میں نے کہا دو تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“ میں نے کہا آدھے کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“ میں نے عرض کیا تو ایک تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کہ تہائی دے دو اور تہائی بھی بہت ہے“، بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑ دو تو یہ ان کے محتاج چھوڑنے سے جو کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں افضل ہے، بے شک تم کوئی چیز خرچ نہیں کرتے مگر اس پر ضرورت ہمیں ثواب دیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ نوالہ جسے اٹھا کر تم اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو (اس پر بھی اجر ملتا ہے) حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنی ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا؟ یا پیچھے ہٹ گیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک تم اگر میرے بعد زندہ رہے اور کوئی ایسا عمل کیا جس سے تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہو تو اس سے تیری بلندی اور مرتبے میں ضرور اضافہ ہوگا، اور امید رکھو کہ تم زندہ رہو گے اس وقت تک کہ فائدہ اٹھائیں گی تم سے کچھ قومیں اور نقصان پائیں گی دوسری اقوام، (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی) اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو باقی رکھ اور ان کو نہ لوٹا لٹے پاؤں لیکن بے چارے سعد بن خولہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افسوس فرماتے کہ ان کی موت مکہ میں ہوئی تھی۔ (بعد الحجرت ہوئی تھی یا قبل الحجرت؟ اس میں دونوں قول ہیں۔)

لغات: - قولہ ”الوصایا“ وصیہ کی جمع ہے جیسے عطایا جمع عطیہ وحد یا حدیہ کی، بحر اور مزید دونوں سے استعمال ہوتا ہے، مجرد سے ملنے کے معنی میں اور مزید خواہ باب افعال سے ہو یا تفعیل سے ملانے، پہنچانے اور سوچنے کے معنی میں آتا ہے، گویا وصیت کرنے والے نے کسی کے ذمے کچھ حق پہنچانے کا کام لگایا ہے، جبکہ عربی معنی وہی ہیں جو مشہور ہیں۔

قولہ ”اشفیت“ یعنی قریب ہو گیا تھا خطرے کے درپیش ہونے کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ قولہ ”عالة“ عائل کی جمع ہے بمعنی فقیر محتاج کے۔ قولہ ”ہتکفون“ کف بمعنی تھیلی کے، مطلب یہ ہے کہ وہ تھیلیاں پھیلا کر مانگیں۔

قولہ ”اخلف“ ای اچھی خلفا یعنی میں اپنی ہجرت کو جاری نہ رکھ سکوں گا اور پیچھے مکہ ہی میں وفات پا کر رہ جاؤں گا؟ یا مطلب یہ ہے کہ آپ سب لوگ مدینہ منورہ چلے جائیں گے اور میں یہاں مکہ میں رہ جاؤں گا؟

قولہ ”البائس“ بفس سے ہے خستہ حال محتاج اور مصیبت زدہ کو کہتے ہیں۔ قولہ ”یرئی“ رھیٹ
السمیت مرثیہ نوحدہ سرائی کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث کی شرح پہلے گزری ہے۔ (دیکھیے تشریحات ج: ۴: ص: ۲۳۴، ”باب ماجاء فی
الوصیۃ بالثلث والرابع“) یہاں ضروری شرح پیش ہے۔ ترمذی کی روایت میں سفیان بن عیینہ سے وہم ہوا ہے
کیونکہ امام زہریؒ کے باقی تمام شاگرد اسے حجۃ الوداع کا واقعہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ صحیحین میں ہے۔ اور حضرت
سعدؓ نے جو فرمایا کہ میری صرف ایک بیٹی ہے تو مطلب یہ ہے کہ متعین حصہ صرف بیٹی لے سکتی ہے باقی عصبہ کی نفی
مراد نہیں ہے اور چونکہ بیٹی کا نان نفقہ اور سکنی تو شوہر کے ذمہ ہوتا ہے لہذا کیوں نہ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں
صدقہ کر دوں؟

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ثواب فقط صدقہ سے ملتا ہے بلکہ وہ
تو خرچ کرنے سے بھی ملتا ہے خواہ آدمی اپنی زندگی کے بعد ورثہ کے پاس چھوڑے یا اپنی حیات میں بہ نیت ثواب
کسی کو کھلائے حتیٰ کہ اپنی بیوی کو کھلانا جہاں خواہش کی تکمیل بھی ملحوظ ہوتی ہے باعث اجر و ثواب ہے۔

عام طور پر مریض موت کا تذکرہ کرتے وقت زیادہ خطرہ محسوس نہیں کرتا مگر جب دوسرے لوگ اس کے
سامنے موت کا ذکر کریں تو وہ گھبرا جاتا ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وصیت کو منظور فرمالیا تو
وہ موت کے بارے میں زیادہ حساس ہو گئے اور ڈر گئے کہ اگر مکہ میں موت آگئی تو سفر کی موت اور وہ بھی حرم مکہ
میں تو اپنی جگہ مگر ہجرت کا مرتبہ تو کہیں بلند ہے وہ فوت ہو جائے گا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان
کو تسلی دلائی بلکہ خوشخبری بھی سنائی جو سو فیصد درست ثابت ہوئی کہ وہ بعد میں تقریباً ۵۰ھ تک بقید حیات رہے،
فاتح قادیسیہ کے نام سے مشہور ہو گئے بلکہ فاتح فارس، ایران و عراق بن گئے، ان کی وجہ سے دشمنوں کو نقصان اٹھانا
پڑا اور بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کو بے شمار غنائم ملے، اس کے بعد ان کا انتقال
ہوا اور چار بیٹے چھوڑ کر منزل مقصود تک جا پہنچے۔ چنانچہ باب کی روایت بھی ان کے صاحبزادے سے مروی ہے۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ لوگ بعد میں راہ حق سے کنارہ کشی اختیار کریں گے
خواہ کلی ہو یا جزوی جیسا کہ فتنہ ارتداد میں ہوا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کے لئے دعا
فرمائی جو اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوئی اور تمام مخلصین صحابہ کرامؓ اس فتنے سے محفوظ ہوئے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں
لکھتے ہیں کہ یہ مرتدین انصار و مہاجرین کے علاوہ تھے: ”و ذالک فی غیر الرہط الکریم والوسط الصمیم

من المهاجرین والانصار“۔

اس حدیث سے ان صحابہ کرامؓ کی رائے کو تقویت ملی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابعد والے اعمال پر ثواب ملنے کے قائل تھے جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی وہ سمجھتے تھے کہ ہماری نیکیاں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے کی ہیں اگر وہ کوتاہیوں کے برابر سرابریوں کی تو بھی زہے قسمت۔

رہا وصیت بالثلث کا مسئلہ تو یہ پہلے گزرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ثلث کی وصیت بالاتفاق جائز ہے، ابن العربیؒ نے اس کی نفی والے قول کو جہل کہا ہے البتہ اگر ثلث سے کم کی وصیت کر دے تو یہ افضل ہے خاص کر جب ورثہ محتاج ہوں عارضہ میں ہے: ”وقال الشافعی: ان كان ورثته فقراء أحییث ان لا يستوعب الثلث“۔ جبکہ متن ہدایہ میں ہے کہ ثلث سے کمی بہر حال مستحب ہے:

”قال ای القدوری: ویستحب ان یوصی الانسان بليون الثلث سواء كانت

الورثة اغنیاء او فقراء لان فی التنفیص صلة القربى بترك ماله علیهم“ الخ۔

البتہ اگر کسی نے ثلث سے زیادہ کی وصیت کی یا وارث کے لئے کی اور باقی ورثہ اس پر راضی ہوں ان میں بچہ اور مجنون نہ ہو یا کوئی وارث اپنے حق سے دستبردار ہو کر اجازت دیدے تو وہ بھی نافذ ہو جائے گی، متن ہدایہ اور ہدایہ میں ہے:

”ولا تحوز بما زاد علی الثلث إلا ان یحیزها الورثة بعد موتہ و هم کبار لان الامتناع

لحقهم و هم اسقطوه... ولا تحوز لوارثه... إلا ان یحیزها الورثة ولو جاز بعض

ورثه بعض تحوز علی المحیز بقدر حصته لولا ینہ علیہ وبطل فی حق الراد“ الخ۔

(ہدایہ، کتاب الوصایا ج: ۳، ص: ۵۶۳)

اشکال:- نوحدہ سرائی سے تو ممانعت آئی ہے خصوصاً میت کے مرثیہ کے بارے میں تو مسند احمد میں

روایت ہے: ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المراثی“۔^۱

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ ممنوع مرثیہ وہ ہے جو موت کا صدمہ دوبارہ بیدار کرے یا اجتماعی

۱۔ مسند احمد ص: ۴۷۵ ج: ۵ حدیث: ۱۸۶۵۹، ایضاً ص: ۵۱۸ ج: ۵ حدیث: ۱۸۹۲۵، ایضاً رواہ ابن ماجہ فی

سننہ ص: ۱۱۴ عن ابن ابی اوفی قال نہی رسول اللہ ﷺ عن المراثی ”باب ماجاء فی البكاء علی المیت“ ابواب الجنائز۔

واہتمام کے ساتھ ہو یا کثرت سے ہو، جیسا کہ محرم الحرام میں شیعہ کرتے ہیں یا عام لوگوں میں برسی منانے کا رواج فروغ پا چکا ہے، جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن خولہؓ پر اظہارِ افسوس کر رہے ہیں تو حہ سرائی نہیں فرما رہے کیونکہ ان کی وفات ہجرت کے بعد مکہ میں ہوئی تھی جیسا کہ عارضہ میں ہے: ”لما فاتہ من الثواب فی موتہ بمکۃ التی کان عرج عنہما مکرمًا“۔ یعنی یہ افسوس ہجرت کے ثواب کے فقدان پر ہے کہ کاش ان کو یہ ثواب بھی پورا مل جاتا۔

باب ماجاء فی الضرار فی الوصیۃ

”عن ابی ہریرۃ انہ حدّثہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الرجل لیعمل والمرأۃ بطاعۃ اللہ سنین سنۃ ثم یحضرہم الموت فیضار ان فی الوصیۃ فیحب لہما التارثم قرأ علی ابو ہریرۃ ”من بعد وصیۃ یوصی بہا الوالدین غیر مضار“ وصیۃ من اللہ الی قولہ... ذلک الفوز العظیم“۔ (حسن غریب)

شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں پھر جب ان کو موت آنے لگتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں ضرر پہنچاتے ہیں اس طرح ان کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے، پھر ابو ہریرہؓ نے یہ آیت پڑھ کر مجھے سنائی ”من بعد وصیۃ“ الخ۔

تشریح:- ہمارے پاس موجود ترمذی کے نسخوں میں یہاں باب کا عنوان نہیں ہے مگر امام ترمذیؒ کے طرزِ عمل کے مطابق باب ہونا چاہئے جیسا کہ صاحب عارضہ و تھہ دونوں نے نقل کیا ہے اس کی وجہ پہلے رفع یدین عند الركوع کے باب میں گذری ہے، نیز ان دونوں شروع کے متن پر اس حدیث کی تصحیح منقول ہے: ”قال ابو عیسیٰ ہذا حدیث حسن صحیح غریب“ الخ۔

یہاں ساٹھ سال سے اوسط عمر مراد ہے اور جہنم کا واجب ہونا از قبیل خاصیت المفرد ہے جس کا تذکرہ بارہا گذرا ہے یعنی اس عمل کی اپنی خاصیت اور تاثیر یہ ہے کہ ایسا کرنے والا لازمی طور پر جہنمی ہو اگرچہ حساب تو تمام اعمال کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔ تدر

وصیت میں ضرر کا مطلب وارث کو کسی طرح حق تلفی کر کے ناراض کرنا ہے جس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً وارث کو کلی یا جزوی طور پر محروم کرنا کسی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے جھوٹا اقرار بالمال کرنا وغیرہ۔

باب ماجاء فی الحث علی الوصیة

”عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما حق امرئ مسلم بيت ليلتين وله ما يوصى فيه الا ووصية مكتوبة عنده“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لائق نہیں ہے کسی مسلمان کے لئے کہ وہ دو راتیں گزارے اور اس کے پاس قابل وصیت کوئی چیز موجود ہو مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔

تشریح:۔ اس متن حدیث حدیث کی دو ترکیبیں ”باب ماجاء فی الحث علی الوصیة“، ”ابواب الجنائز“ میں گزری ہیں۔ (فلیراجع تشریحات ترمذی ج ۴ ص ۲۳۲) اس حدیث کی جو تشریح وہاں کی گئی ہے وہ کافی ہے، یہاں اس کا خلاصہ پیش ہے: ظاہر یہ کہ نزدیک وصیت کرنا واجب ہے۔ حدیث باب سے ان کا استدلال ہے، علاوہ ازیں یہ آیت بھی بظاہر ان کی متدل ہے: ”سکب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر ان الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف“۔^۲ جمہور کے نزدیک اگر کسی کے ذمہ واجب الاداء حقوق ہوں تو پھر تو اس کے متعلق آگاہی اور وصیت واجب ہے ورنہ ضروری نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر صحابہ کرامؓ نے وصیتیں نہیں کی ہیں، جو عدم وجوب کی بڑی دلیل ہے۔ حدیث الباب کا جواب یہ ہے کہ مسلم کی روایت میں ”لہ شیء یرید ان یوصی فیہ“۔^۳ کے الفاظ ہیں اور ارادہ وجوب کی نفی کرتا ہے، آیت کا حکم منسوخ ہے ناخ یہ آیت ہے: ”یوصیکم اللہ فی اولادکم“۔^۴ الخ یا یہ حدیث ہے ”لا وصیة لوارث“۔^۵ جبکہ آیت میں والدین کا ذکر ہے جو کہ ورثہ ہیں۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے

باب ماجاء فی الحث علی الوصیة

۱۔ الحدیث اخرجه البخاری ص: ۳۸۲ ج: ۱ کتاب الوصایا، صحیح مسلم ص: ۳۹ ج: ۲ کتاب الوصیة، ابو داؤد کتاب الوصایا ”باب ماجاء فیما یؤمر به من الوصیة“ سنن نسائی کتاب الوصایا ”باب الکراهیة فی تاخیر الوصیة“ موطا مالک کتاب الوصیة ”باب الامر بالوصیة“ سنن دارمی ص: ۴۹۵ ج: ۲ حدیث: ۳۱۷۵۔ ج: ۱ سورة البقرة آیت: ۱۸۰۔
 ۲۔ صحیح مسلم ص: ۳۹ ج: ۱ کتاب الوصیة۔ ج: ۱ سورة النساء آیت: ۱۱۔ ۳۔ رواہ ابن ماجہ ص: ۱۹۵
 ابواب الوصایا، سنن ابی داؤد ص: ۴۰ ج: ۲ کتاب الوصیة، سنن نسائی ص: ۱۳۱ ج: ۲ ”باب ابطال الوصیة للوارث“
 ابواب الوصایا، ایضاً مسند احمد ص: ۲۰۴ ج: ۵ حدیث: ۱۷۲۱۰، اعلاء السنن ص: ۳۰۱ ج: ۱۸ کتاب الوصایا۔

کہ امام شافعیؒ اس حدیث کو باوجود ضعف کے ناسخ مانتے ہیں لتعالل الالمة والالمة بہ۔

امام ترمذیؒ نے بھی جمہور کے موقف کے مطابق دونوں جگہوں میں ایک ہی طرح باب کا ترجمہ مرتب کیا ہے اور اس میں ”حث“ کا لفظ لائے ہیں جو ترغیب اور ابھارنے کے لئے آتا ہے نہ کہ وجوب کے لئے، نیز آگے باب باندھا ہے۔

باب ماجاء ان النبی ﷺ لم یوص

”عن طلحة بن مصرف قال قلت لابن ابی اوفیؓ: أوصى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال ”لا“ قلت وكيف تخبئت الوصية وكيف أمر الناس؟ قال اوصى بكتاب الله تعالى“۔ (حسن صحيح) ۱

طلحہ بن مصرفؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن ابی اوفیؓ سے دریافت کیا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں نے پوچھا پھر (قرآن میں) وصیت کیسے فرض کی گئی؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کا حکم کیسے دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔

تشریح:- حضرت طلحہ بن مصرف کا سوال یا تو مالی وصیت کے بارے میں تھا جیسا کہ دوسرے سوال کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے جو دو حوالے دیئے ہیں ان دونوں میں مالی وصیت مراد ہے یا پھر حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق پوچھنا مقصود تھا کیونکہ شیعہ نے یہ بات مشہور کر دی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے بارے میں خلافت کی وصیت فرمائی تھی اور ثلث مال کی بھی، چنانچہ یہی سوال حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی ہوا تھا اور دونوں نے نفی میں جواب دیا تھا۔

بہر حال جب حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ نے نفی میں جواب دیا تو اگرچہ یہ نفی والا جواب عام نہیں تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی وصیتیں فرمائی تھیں جیسے یہود و نصاریٰ کا جزیرۃ العرب سے اخراج، وفود سے حسن سلوک، لشکر اسامہ کی روانگی، انصار کے ساتھ نیک برتاؤ وغیرہ مگر بظاہر یہ لفظ یعنی کلمہ

”لا“ عموم نفی پر دلالت کرتا ہے اس لئے انہوں نے پھر سوال کیا کہ قرآن میں جو وصیت کا حکم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو وصیت کا جو حکم فرمایا تو کیوں نہ انہوں نے خود ایسا کیا؟

جواب ثانی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس خیر یعنی مال ہو تو وہ وصیت کرے، وہ بھی منسوخ ہے۔ کما تر۔ اور حدیث کا بھی وہی مطلب ہے جیسا کہ باب سابق میں گذرا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مال تھا ہی نہیں اور جتنا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کیا اور صدقہ کرنے کا حکم دیا، ہاں البتہ نفس وصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جو کتاب اللہ کو تھا منے اور اس پر عمل کرنے کے بارے میں ہے، اور اس حدیث سے باقی وصایا کی نفی مراد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ کوئی وصیت نہیں فرمائی بلکہ پہلے سوال کے جواب میں لفظ ”لا“ عام والمراد منہ الخاص اور دوسرے میں کتاب اللہ خاص والمراد منہ العام ہے اور بلاغت میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کبھی مراد متکلم مراد کلام سے عام ہوتی ہے اور کبھی خاص۔ والقاعدۃ مشہورۃ ومعروفۃ۔ تو جس طرح ”من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة“ کے میں رسالت بھی مراد ہے کیونکہ لا الہ الا اللہ تو حید و رسالت دونوں کے لئے اسم علم بن گیا ہے جیسے الحمد شریف پوری فاتحہ کا نام ہے تو اسی طرح کتاب اللہ بھی قرآن و سنت دونوں کا اسم علم ہے۔ فلیحفظ

باب ماجاء لا وصیۃ لوارث

”عن ابی امامۃ الباہلی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی خطبته عام حجة الوداع: ان اللہ تبارک وتعالیٰ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث، والولد للفراس وللعاہر الححر وحسابہم علی اللہ تعالیٰ ومن ادعی الی غیرابیہ وانتمی الی غیرموالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ التابعة الی یوم القیمۃ لاتنفق امرأۃ من بیت زوجها الا باذن زوجها قیل یا رسول اللہ ولا الطعام؟ قال: ذاک افضل اموالنا، وقال العاریۃ مؤداة والمنحۃ مردودۃ والدين مقضی والزعم غارم۔“

(هذا حديث حسن)

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ اخرجه الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۷۱۶۳، والوسط حدیث: ۲۴۲۶ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۳۲ ج: ۱

حدیث: ۲۲، ایضاً راجع لاحادیث جمع الفوائد ص: ۷ تا ۱۲ ج: ۱ کتاب الایمان، دار الکتب العلمیۃ بیروت.

کو حجۃ الوداع کے سال فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا پس اب کسی وارث کے لئے وصیت نہیں، اور بچہ صاحب فراش (خاندن) کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے اور جو شخص اپنی نسبت غیر باپ کی طرف کرے یا کوئی غلام اپنا انتساب غیر آقاؤں کی جانب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی جو قیامت تک اس کے درپے رہے گی، کوئی عورت خرچ نہ کرے اپنے شوہر کے گھر (مال) سے مگر اپنے شوہر کی اجازت سے، دریافت کیا گیا ”اے اللہ کے رسول کھانا بھی نہیں دے سکتی؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو ہمارے اموال کا بہتر حصہ ہوتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مائگی ہوئی چیز واپس کی جائے گی (یعنی بلا کی بیشی کے) اور دودھ والے جانور کو (یا مثلاً درخت وغیرہ) واپس کیا جائے گا اور دین ادا کیا جائے گا اور کفیل ذمہ دار ہے۔

تشریح:۔ قوله ”ان الله تبارك وتعالى اعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث“ قدیم عربوں میں وصیت کا دستور تھا اسلام کے اوائل میں یہ حکم فرض تھا مگر جب میراث کے احکام نازل ہوئے تو وارث کے لئے وصیت ختم کر دی گئی کیونکہ جب ہر آدمی کو اس کا حصہ مل گیا تو پھر اس کے لئے وصیت کی ضرورت ختم ہو گئی لہذا اب ماں باپ وغیرہما کے لئے وصیت کی چنداں ضرورت نہیں، یہ حدیث معنی کے اعتبار سے محکم و متواتر ہے اگرچہ سند اتنی قوی نہیں، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں: ”صحیح اجمعت الامۃ علی صحة الخبر و هو ناسخ الآية بالا جماع“ اسی طرح امام شافعیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

”حدیث لا وصیۃ لوارث انه لا یثبتہ اهل الحدیث ولكن العامة تلقته بالقبول

و عملوا به حتی جعلوه ناسخاً لآیۃ المیراث“۔ (تمس الیہ الحاجہ ص: ۲۴)

قوله ”الولد للفراش“ الخ یعنی جس کے فراش پر بچہ پیدا ہو خواہ وہ فراش بیوی ہو یا باندی تو اس کی نسبت شوہر یا آقا کی طرف ہوگی زانی محروم ہوگا۔ قوله ”و حسابہم علی اللہ“ یہ دفع تو ہم ہے کہ اگرچہ اس میں ولد الزنا ہونے کا احتمال ہے مگر وہ تو ایک خفیہ معاملہ ہے، اس کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ جہاں تک ضابطے کی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ حتی الامکان بچے کا نسب صاحب فراش سے ثابت مانا جائے گا۔ قوله ”ومن ادعی الی غیرہ“ الخ یعنی اس واضح اور صاف ضابطے کے باوجود جو شخص اپنا نسب غیر شرعی باپ یا آقا کی طرف منسوب کرے گا تو وہ ملعون ہوگا۔ الولد للفراش کی تفصیل پہلے گزری ہے (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۳۳، باب ما جاء ان الولد للفراش، من ابواب الرضاع)

قوله ”لأنفق امرأة من بیت زوجها إلا باذن زوجها“ یعنی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے اور اپنے من پسند لوگوں کو شوہر کے مال میں سے کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ ملک زوج کی ہے اور کسی کی ملک میں اس کے اذن کے بغیر تصرف جائز نہیں البتہ اذن، عام ہے خواہ صراحۃً ہو یا دلالتہً دونوں صورتوں میں بقدر اذن دے سکتی ہے اس میں پکا ہوا کھانا اور طعام یعنی غیر مطبوخہ چیز جس کے بارے میں سوال پوچھا گیا ہے برابر ہے۔ یہ مسئلہ بھی تفصیلاً پہلے گزرا ہے اگر چاہیں تو دیکھئے (تشریحات ج ۳ ص ۱۵۷، باب ماجاء فی نفقة المرأة من بیت زوجها، من ابواب الزکوة)

قوله ”العاریة مؤداة“ یعنی مستعار اور مانگی ہوئی چیز مالک کو واپس دینا ضروری ہے۔ قوله ”والمنحة مرسودة“ منہ اور منجھ وہ جانور یا درخت اور قرض پیسے وغیرہ ہیں جو کسی کو اپنی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے دیئے جائیں مثلاً دودھ کچھ مدت کے لئے حاصل کر لیا یا پھل دار درخت دے دیا اور جب اس نے دودھ کچھ مدت کے لئے حاصل کر لیا اور درخت کا پھل توڑ لیا تو پھر اصل کو واپس دے دیا یہ جائز ہے اور مستفید کو اس پر قبضہ یا دعویٰ ملک کی اجازت نہیں ہے۔

قوله ”والدين مقضى“ دین واجب الاداء ہے۔ قوله ”والزعم غارم“ کفیل ذمہ دار اور ضامن ہے حدیث کے یہ آخری تینوں احکام اتفاقی ہیں جبکہ ”العاریة مؤداة“ میں اختلاف ہے کہ آیا بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان ہے یا نہیں؟ جبکہ تعدی میں بالاتفاق تاوان ہے تو شافعیہ و حنابلہ کے نزدیک دونوں صورتوں کا حکم یکساں ہے یعنی تاوان بھرنا پڑے گا جبکہ خفیہ و مالکیہ کے نزدیک بغیر تعدی کی صورت میں تاوان اس لئے نہیں ہے کہ یہ امانت ہے فحکمھا حکمھا، اس مسئلے کی تفصیل بھی پہلے گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۱۹۸، باب ماجاء ان العاریة مؤداة، من ابواب البیوع)

حدیث عمرو بن خارجہ:۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب علی ناقته وانا تحت حرا نہاوی تقصع بجرتها وان لعابها یصل بین ګتفئ فسمعتہ بقول ان اللہ عزوجل اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیة لوارث والولد للفراس وللعاہر الحجر۔^۱

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر خطبہ

ارشاد فرمایا جبکہ میں اس کے گلے کے نیچے تھا اس وقت وہ جگالی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں شانوں کے درمیان ٹپک رہا تھا پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ اللہ عزوجل نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے پس وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں اور بچہ صاحب فراش کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے۔

تشریح:- قولہ ”جران“ ہنسی کی ہڈی سے لے کر گلے کے اس حصے تک ہوتا ہے جس میں اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے یعنی مذبح و منحر کے مابین۔ قولہ ”تفصع“ بمعنی تتلعق۔ قولہ ”بجرتھا“ الحجرة بالكسر، وہ محلول جو سفید جھاگ کی مانند ہوتا ہے اسے جگالی کہتے ہیں، یہ وہ جانور کرتے ہیں جن کے اوجھ میں دو خانے ہوتے ہیں اس سے حلال و حرام کے فرق کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

قولہ ”وان لعابھا یسیل“ الخ راوی کا اس طرح بیان کرنا یا تو تلذذ کے لئے ہوتا ہے کہ وہ منظر کتنا حسین ہوگا کہ جہاں رحمۃ اللعابین اور شفیع المذنبین ہوں اور جان نثاران مؤمنین کا جھرمٹ اور حرم پاک کی سرزمین ہو یہ نظارہ یقیناً ستاروں کے درمیان ماہتاب کے جلوے سے زیادہ پر نور ہوگا جو اس میں ایک بار حاضر رہا آفتاب دو عالم کے بعد وہ اس منظر کو کیسے بھول سکتا ہے اور اسے یاد کر کے کیوں نہ وہ محظوظ ہوگا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بتلانا مقصود ہو کہ یہ روایت مجھے اچھی طرح یاد ہے حتیٰ کہ وہ وقت اور حالت بھی مجھے یاد ہے تو کیوں ضروری و بنیادی بات یاد نہ ہوگی۔ وغیر ذالک من الوجوہ۔

اوٹنی پر خطبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے ورنہ عام لوگوں کے لئے جانور کی پشت بطور منبر استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے۔

باب ماجاء یبدأ بالدين قبل الوصية

”عن علی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالدين قبل الوصية وانتم تقرؤن الوصية قبل الدين“۔^۱

باب ماجاء یبدأ بالدين قبل الوصية

۱۔ وفی الدارمی: حدثنا قبيصة حدثنا سفيان عن سمع ابراهيم قال يبدأ بالكفن ثم بالدين ثم بالوصية ص: ۵۰۷ ج: ۲ حدیث: ۳۲۳۹۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی ادائیگی کا فیصلہ وصیت (پر عمل درآمد) سے پہلے فرمایا تھا اور تم تو وصیت دین سے پہلے پڑھتے ہو، یعنی اس آیت ”من بعد وصیة یوصین بہا و دین“ کے بغیر ہائیں۔

تشریح:- طبیٰ فرماتے ہیں یہ اخبار بمعنی انشاء ہے یعنی تم لوگ اس آیت میں وصیت جو پہلے پڑھتے، سنتے اور دیکھتے ہو تو اس کا مطلب سمجھا کر وہ دین مقدم ہے حکماً و اداء گو مؤخر ہے ذکر ا، پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وصیت کی تقدیم اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ہے۔ (دیکھئے ”باب ماجاء فی میراث الاخوان من الاب والام“۔ نیز وہاں حدیث کی سند کے متعلق بھی کلام دیکھا جاسکتا ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یتصدق او یعتق عند الموت

”عن ابی حبیبة السطائی قال اوصی الیٰ اخی بطائفة من ماله فَلَقیْتُ ابا الدرداء فقلتُ ان اخی اوصی الیٰ بطائفة من ماله فاین ترى لی وَضَعَهُ فی الفقراء والمساکین والمجاهدین فی سبیل اللہ؟ قال: اما انا فلو کنْتُ لم اُغْدِل بالمجاهدین سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: مَنْ لَمْ یُتَّقِ عند الموت کَمَثَلِ الذی یهدی اذ اشبع“۔ (حسن صحیح)

ابو حبیبة طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے کچھ حصے کی مجھے وصیت کی تھی (یعنی صدقہ کرنے کی) تو میری ملاقات حضرت ابودرداء (رضی اللہ عنہ) سے ہوئی، میں نے ان سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے ایک حصے کے بارے میں مجھے وصیت کی ہے تو آپ کی رائے میں میرے لئے وہ کس مد میں خرچ کرنا مناسب ہے فقراء و مساکین میں یا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں میں؟ انہوں نے فرمایا جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میں مجاہدین کے برابر کسی کو نہیں سمجھتا مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی مثال جو موت کے وقت آزاد کرتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو پیٹ بھرنے کے بعد ہدیہ کرتا ہے۔

تشریح:- ابو حبیبة کے بھائی نے ان کو وصی تو بنالیا تھا مگر کسی مد کا تعین نہیں کیا تھا کہ فلاں جگہ خرچ کر لو اس لئے انہوں نے بہتر جگہ اور موزوں ترین مد کی تلاش میں حضرت ابودرداءؓ سے مشورہ کیا بلکہ استفتاء کیا، جواب

میں حضرت ابو درداءؓ نے جو تعبیر فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ بجائے آخری گھڑی کے حالت صحت میں صدقہ افضل ہے کیونکہ ایسے میں آدمی کے ذہن کا پتہ چلتا ہے جبکہ آخری سانسوں میں صدقہ کرنے سے تو اپنے آپ کو وارثوں پر مقدم کرنا ہے جس سے بجائے ایثار کے حقوق سے فرار کا عندیہ ملتا ہے جو مستحسن نہیں۔ گویا یہ بدی بصورت نیکی سی معلوم ہوتی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ جب اشیاء میں رغبت تھی تو ان کو اپنے پاس رکھا اور جب رغبت کم یا ختم ہو گئی تب ان کو اللہ کی راہ میں چلا کر دیا یہ تو ایسا ہے جیسے آدمی خود کھاتا رہے اور صدقہ کی فکر نہ کرے مگر جب بیچ جائے تب ہدیہ یا صدقہ کرے، تاہم اگر کوئی شخص ایسا کرے تو پھر بھی بذات خود یہ ایک اچھا قدم ہے مگر پہلی صورت کی طرح نہیں اس لئے اس کے ثواب کو بڑھانے کی تدبیر ہونی چاہئے اس لئے حضرت ابو درداءؓ نے ایک بہترین مد کی نشاندہی فرمائی کہ جب وہ صدقہ جو بذات خود روحانی طاقت میں کمزور ہے اگر اسے جہاد جیسے عمل میں لگایا جائے اور اس سے حیات اسلامی کو تقویت ملے تو اس سے صدقہ کی روح بھی طاقت ور ہو جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ احیاء اسلام اور ابقائے دین کے مساوی کوئی مصرف نہیں اس لئے مجاہدین کے گھوڑے کی لید اور پیشاپ بھی ترازوئے اعمال میں تو لا جائے گا، طالب علم جب اپنے اوپر خرچ کرتا ہے تو قوی امید ہے کہ وہ اس کا صدقہ شمار ہوگا اور جو لوگ طلبہ پر خرچ کرتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں بڑی خوشخبری ہے ”فبذلك فليفرحوا“۔

باب

”عن عروة عن عائشة اخبرته ان بريرة جاءت تستعين عائشة في كتابتها ولم تكن قضت من كتابتها شيئا فقالت لها عائشة ارجعي الي اهلك فان احبوا ان اقضي عنك كتابتك ويكون ولاء لك لي فعلت فذكرت ذلك لبريرة لاهلها فابوا وقالوا: ان شاء ان تحتسب عليك ويكون لنا ولائك فلتفعل فذكرت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ابتاعني فاعتقني فانما الولاء لمن اعتق ثم قام رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ما بال اقوام يشترطون شروطا ليست في كتاب الله؟ من اشترط شرطاً ليس في كتاب الله فليس له وان اشترط مائة مرة“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عروہ اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ

نے ان کو خبر دی ہے کہ بریرہ آئی وہ اپنی کتابت میں حضرت عائشہؓ سے مدد مانگ رہی تھی (یعنی بدل کتابت کی) جبکہ انہوں نے خود بدل کتابت میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا، پس حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا جاؤ اپنے موالی کے پاس (اور ان سے پوچھو کہ) اگر وہ یہ پسند کریں کہ میں تیرا بدل کتابت ادا کر دوں اور تیری ولاء میری ہو جائے گی تو میں ایسا ہی کر لوں گی چنانچہ بریرہ نے اس کا تذکرہ اپنے موالی سے کیا، تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہنے لگے اگر عائشہؓ تجھ پر ثواب کماتا چاہیں اس شرط پر کہ تیری ولاء ہماری ہی رہے گی تو وہ کر لیں چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا خرید لو اور آزاد کر دو کیونکہ ولاء بے شک اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ارشاد خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی شرائط لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہوتی ہیں (یعنی روانہ نہیں) جو شخص ایسی شرط لگائے جو اللہ کی کتاب میں نہ ہو تو وہ شرط اس کے حق میں نہ ہوگی اگر چہ وہ سو (۱۰۰) شرائط عائد کرے۔

تشریح:- حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک یہودی کی باندی تھیں اس نے ان کو مکاتبہ بنایا مگر ان کے پاس بدل کتابت کا بندوبست نہ تھا وہ اس غرض سے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ جب مکاتبہ ادا کے کتابت سے قاصر ہو اور عجز کا اظہار کرے تو اس کی خرید و فروخت جائز ہو جاتی ہے اس لئے ام المؤمنین نے خریدنے کی ہامی بھری کہ تم جاؤ اور اپنے آقاؤں سے بات کرو مگر ان لوگوں نے یہ شرط لگائی کہ اگر ام المؤمنین خرید کر آزاد کرنا چاہیں تو ٹھیک ہے مگر ولاء پھر بھی ہماری ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو رد فرمایا۔ اس حدیث کی جزید وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔



ابواب الولاء والہبۃ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

”عن عائشۃؓ انها ارادت ان تشتري بريرة فاشتروا الولاء فقال النبی صلی اللہ علیہ

وسلم: الولاء لمن اعطى الثمن اولمن ولی النعمة“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بریرہ کے خریدنے کا ارادہ فرمایا تو ان لوگوں (بریرہ کے موالی) نے ولاء اپنے پاس رکھنے کی شرط لگا دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولاء تو اسی کی ہے جو قیمت ادا کرے یا فرمایا کہ نعت حاصل کرے۔

تشریح:- حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا (بروزن کریمہ) انصار کے ایک قبیلہ والوں کی کنیز تھیں، شیخ نے لمعات میں لکھا ہے کہ ان کے موالی یہود تھے، جمع ممکن ہے کہ انصار میں اولاً یہودی تھے۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خدمت کیا کرتی تھیں، صاحب فراست تھیں، اس لئے انہوں نے عبد الملک کو عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی خلافت کی خوشخبری سنا دی تھی، موالی نے ان کو مکاتبہ بنایا تھا البتہ اس بارے میں روایات میں تھوڑا سا اختلاف ہے کہ عقد کتنے پیسوں کے عوض ہوا تھا لیکن بہر حال وہ ادائیگی سے قاصر تھیں، اس لئے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئیں جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں گذرا ہے، حضرت عائشہؓ نے خریدنے کا ارادہ فرمایا مگر ان کے موالی نے ولاء کی شرط اپنے لئے لگا دی چونکہ یہ ایک باطل شرط تھی کیونکہ بیع مع الشرط جائز نہیں اور سود کے زمرے میں داخل ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سختی سے رد فرمایا۔ باب کی حدیث میں لفظ ”او“ راوی کے شک پر محمول ہے، عام روایات میں لفظ ”واو“ یعنی بغیر ہمزہ کے ہے ”الولاء لمن اعطى الثمن وولى النعمة“ مطلب

ابواب الولاء والہبۃ عن رسول اللہ ﷺ

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

۱۔ اخرجه ايضاً بخارى ص: ۹۹۹ ج: ۲۰ كتاب الفرائض، سنن ابی داؤد ص: ۴۸ ج: ۲ ”باب فى الولاء“ كتاب الفرائض،

مسند احمد ص: ۲۶۷ ج: ۷ حديث: ۲۵۰۰۶۔ ۲۔ كذا فى رواية ابی داؤد حواله بالا۔

یہ ہے کہ ولاء اس مالک کی ہے جو خرید کر آزاد کر دے لہذا نعمتہ سے مراد اعتاق ہے جو ولاء کی نعمت و حصول کو مستلزم ہے۔ لیکن اس حدیث میں بعض مقامات کو سمجھنے میں کافی الجھن محسوس ہوتی ہے، چنانچہ:

پہلی الجھن:- یہ پیش آتی ہے کہ جب حضرت بریرہ مکاتبہ تھیں تو حضرت عائشہؓ نے ان کو کیسے خرید لیا جبکہ حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں، یہ اعتراض مالکیہ وحنابلہ پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ ان کے یہاں بیع المکاتب جائز ہے، اس لئے ہر فریق نے اس کی الگ الگ تشریح کی ہے: مالکیہ وحنابلہ کہتے ہیں کہ مکاتب قابل بیع ہے اور بعد البیع بھی کتابت باقی رہے گی لہذا جب وہ مشتری کو اقساط ادا کر دیگا تو آزاد ہو جائے گا، جبکہ ہمارے یہاں اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مکاتب ادائے بدل کتابت سے قاصر آجائے اور مولیٰ اسے عاجز قرار دے کر عقد کتابت باہم رضامندی سے ختم کر دیں تب ہی وہ قن بن کر قابل بیع ہو جاتا ہے، اور یہاں حدیث میں یہی صورت پیش آئی تھی جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسری الجھن:- دوسری الجھن یہ پیدا ہوئی کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کی سختی سے تردید فرمائی جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں ہے: ”مابال اقوام یشترون شروطا لیست فی کتاب اللہ“ الخ کتاب اللہ سے مراد خدا کا حکم ہے یا قرآن کا اقتضاء ہے یعنی ایسی شرائط کی کوئی حیثیت نہیں جو شریعت میں ممنوع ہوں جبکہ مسلمؓ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: ”اشتريها و اعتقہا و اشتري لہم الولاء فان الولاء لمن اعتق“ الخ یعنی ولاء تو بہر حال تیری ہے مگر یہ شرط ان کی مان کر خرید لو اور آزاد کر لو۔ بظاہر اس پر دھوکہ دہی کا شبہ وارد ہوتا ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔ اس کا ایک جواب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دیا ہے کہ یہ از قبیل ارخاء العنان کے ہے۔ دوسرا جواب امام نوویؒ نے شرح مسلم میں دیا ہے کہ اگرچہ اصولی طور پر بیع مع الشرط تو منع ہے مگر یہ قضیہ اس سے مستثنیٰ ہے اور ایسے قضیے کا عموم نہیں ہوتا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو ظاہری شرط کے ساتھ بطور خاص جائز فرمادیا تاکہ بعد میں اس کو باطل قرار دیں اور ایسا طرز عمل و طرز تعلیم زیادہ مؤثر ہوتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حجۃ الوداع میں احرام حج کی اجازت دے دی اور پھر اسے فسخ فرمادیا کہ ان کو عمرہ کی ادائیگی کے بعد حلال ہونے کا حتمی حکم دیا تاکہ ان کی زمانہ جاہلیت والی عادت پوری طرح ختم ہو جائے۔ تو یہاں بھی مبالغہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط کو جاری رکھا اور پھر اسے ختم فرمادیا گویا خطبہ شفاء سے مؤخر

ہے۔

دونوں جوابوں کا مآل و مرجع ایک ہی ہے کہ یہ شرط باطل تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نظر انداز یا بظاہر جاری فرمادیا اور پھر اس کی نہی فرمادی: ”وقد تحتل المفسدة السيرة لتحصيل مصلحة عظيمة“۔ اس سے معلوم ہوا کہ عظیم فائدے کی خاطر معمولی نوعیت کا نقصان اٹھانا جائز ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر عورت ہوشیار ہو تو وہ اپنے مال میں خرید و فروخت وغیرہ کا اختیار رکھتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب معاشرے میں کوئی منکر رونما ہو تو امام اس پر تنبیہ کر کے اس سے منع کر دے۔ وعظ و نصیحت میں نرمی برتنے اور عام خطاب کی ترغیب بھی معلوم ہوئی وغیرہ۔ بہت سے فوائد کی حامل اس حدیث پر امام نوویؒ نے تفصیل سے بحث فرمائی ہے، چھ مواضع اور تیس فوائد بیان کئے ہیں۔ (جو چاہے تو وہ دیکھے شرح مسلم للنووی ص: ۴۹۳ و ص: ۴۹۴ جلد: ۱، باب بیان الولاء لمن احق)

باب النہی عن بیع الولاء و ہبتہ

”عبد اللہ بن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الولاء و ہبتہ“۔^۱ (حسن

صحیح)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء بیچنے اور ہبتہ کرنے سے ممانعت فرمائی ہے۔

تشریح:۔ ایک روایت میں ہے ”الولاء لُحمة کَلْمحة النسب“،^۲ یعنی جس طرح نسب بیچا اور ہبتہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک جڑی ہوئی حقیقت ہے اسی طرح ولاء بھی ہے اور جس طرح بیٹا باپ کی وجہ سے گویا حیات سے سرفراز ہو جاتا ہے اسی طرح آزاد کردہ غلام اپنے آقا کی وجہ سے رقیّت جو ایک گونہ موت و عدم حیات ہے سے چھٹکارا پاتا ہے۔

اس حدیث کے مضمون پر اجماع ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ ولاء کی بیع

باب النہی عن بیع الولاء والہیۃ

۱۔ رواہ الستہ واحمد، سنن دارمی ص: ۴۹۰ ج: ۲ حدیث: ۳۱۵۶۔

۲۔ رواہ الدارمی ص: ۴۹۰ ج: ۲ حدیث: ۳۱۵۹، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۳ حدیث: ۷۱۸۱۔

اور بہہ کے جواز کے قائل تھے مگر حدیث الباب ان کے خلاف حجت ہے تاہم آج کل نہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور نہ ہی عملی اختلاف کے لئے کوئی محل و میدان ہے۔

قولہ ”ویروی عن شعبۃ قال لوددت ان عبداللہ بن دینار“ الخ یعنی شعبہ فرماتے ہیں کہ میری خواہش تھی کہ عبداللہ بن دینار یہ حدیث بیان کرتے وقت مجھے اجازت دیتے تو میں اٹھ کر ان کے سر کو چومتا کیونکہ یہ واحد شخص ہے جن پر اس حدیث کی تمام اسانید جن کی تعداد پینتیس (۳۵) تک پہنچتی ہے جا کر ملتی ہیں اور جنہوں نے بغیر ان کی وساطت کے نقل کی ہے وہ ان کے وہم پر مبنی ہے جیسے یحییٰ بن سلیم کے طریق میں ہے۔ عارضہ میں ہے کہ جب صحابی کہے کہ ”امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکذا“ تو وہ روایت بالمعنی ہوتی ہے جو بالا جماع قبول ہے۔

باب ماجاء فی من تولی غیر موالیہ او ادعی الی غیرابیہ

”عن ابراہیم التیمی عن ابیہ قال خَطَبَنَا عَلِیُّ فَقَالَ: مَنْ زَعَمَ اَنْ عِنْدَنَا شَيْءٌ اَنْقَرُوْهُ الْاَكْثَابُ وَاللّٰهُ وَهَذِهِ الصَّحِیْفَةُ صَحِیْفَةٌ فِیْهَا اَسْنَانُ الْاَبْلِ وَاَشِیْءٌ مِنَ الْحِرَاحَاتِ فَقَدْ كَذَبَ وَقَالَ فِیْهَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّم: الْمَدِیْنَةُ حَرَمٌ مَا بَیْنَ عَرِّیِّ الْیَ ثَوْرٍ فَمَنْ اَحْدَثَ فِیْهَا حَدَثًا وَاَوْیَ مُخْدِنًا فَعَلِیْہِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْہُ یَوْمَ الْقِیَمَةِ صِرَافًا وَاَعْدَلًا وَمَنْ اَدْعٰی اِلَیْ غَیْرِ اَبِیْہِ اَوْ تَوَلٰی غَیْرَ مَوَالِیْہِ فَعَلِیْہِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ لَا یُقْبَلُ مِنْہُ صِرَافًا وَاَعْدَلًا وَذِمَّةُ الْمُسْلِمِیْنَ وَاحِدَةٌ یَسْعٰی بِہَا دِنَاھُمْ“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابراہیم التیمی اپنے والد حضرت یزید بن شریک التیمی تیم الرباب الکوفی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت علی نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جس شخص کا یہ غلط گمان ہو کہ ہمارے (اہل بیت کے) پاس کتاب اللہ اور اس صحیفے کے علاوہ کوئی دستاویز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں تو وہ جھوٹا ہے۔ اس صحیفے میں تو اونٹوں کی عمروں کی بابت اور زخموں کی دیت کے متعلق کچھ احکام ہیں اور فرمایا کہ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے ثور تک پارہ مدینہ حرم ہے پس جو شخص اس میں نئی باتیں گھڑے گا یا ایسا کرنے والے کو جگہ (پناہ) دے گا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور سارے فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہے قیامت کے دن اللہ نہ اس کی فرض عبادت قبول فرمائیں گے اور نہ نقلی، (بعض نے اس کا ترجمہ بالعکس بھی کیا ہے) اور جو

شخص اپنا نسب غیر باپ کی طرف منسوب کرے یا کوئی موالی (آزاد شدہ غلام) اپنا انتساب غیر آقا کی جانب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور سب فرشتوں اور لوگوں کی بھی، نہ تو اس کی نفل عبادت قبول ہوگی اور نہ ہی فرض، (والجمہور علی عکسہ کما مر) اور سب مسلمانوں کی امان ایک ہی ہے ایک ادنیٰ مسلمان بھی امان دینے کا حق رکھتا ہے۔

لغات:- قولہ ”المدينة حرم“ مدینہ منورہ کا نام تمدن سے نہیں ہے جیسے عام شہروں کے لئے مدینہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ تدین بمعنی اطاعت سے ہے یعنی وہ شہر جہاں اللہ عز وجل کی اطاعت سب سے زیادہ ہوئی ہے اور ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی حتیٰ کہ اسلام سانپ کی طرح سمٹ کر حرمین میں واپس آ جائے گا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ والوں نے کما حقہ مقام نہیں دیا اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تنگ کر دیا تو یثرب والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا انہوں نے بے مثال ایثار کا ثبوت دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ان کی اولاد، باغات اور آب و ہوا کی اصلاح کی دعائیں فرمائیں جن کی بدولت مدینہ یثرب نہیں رہا بلکہ طیبہ اور مدینہ منورہ بن گیا اور اس کے ساتھ وہ حرم بھی بن گیا، حرم بفتحین بمعنی حرمت و احترام والی جگہ۔ قولہ ”عیر الی نور“ دونوں بفتح الاول وسکون الثانی ہیں، مدینہ منورہ کی دو پہاڑیوں کے نام ہیں، بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ٹور تو مکہ مکرمہ میں ہے مگر یہ صحیح نہیں۔

(کذا قال صاحب القاموس کما بین السطور و حاشیۃ القوت و صاحب النہایہ کما فی الحاشیۃ علی الترمذی) (تو را حد کے شمال مشرق میں ہے۔ قولہ ”حَدَّثَنَا“ بفتحین وہ امر جدید جو اخیر القرون المشہور دہا بالخیریتہ میں نہ خود موجود ہوا اور نہ ہی اس کا کوئی منشأ استنباط موجود ہو، یعنی کسی طرح سنت سے ثابت نہ ہو۔ قولہ ”صرفا ولا عدلا“ ان کے معنوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے جمہور کے نزدیک صرف فرض کو اور عدل نفل کو کہتے ہیں جیسا کہ اوپر پہلے ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ حسن بصریؒ نے اس کے برعکس موقف اپنایا ہے جیسا کہ دوسرے ترجمہ میں لیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے صرف بمعنی توبہ اور عدل بمعنی فدیہ لیا ہے۔ اس میں مزید اقوال بھی ہیں۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مراد ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے عذاب دور ہو جائے۔

تشریح:- اس ارشاد پاک میں کئی مسائل ہیں، اختصار کے پیش نظر یہاں ان کے پیچیدہ پیچیدہ مباحث پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) پہلی بحث:- روانض اپنی خصلت کے مطابق یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ حضرت علیؑ کے پاس

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصیت نامہ ہے جس میں علم الاسرار، خلافت بلا فصل کے لئے ان کا انتخاب اور دیگر بہت ساری اشیاء جو اہل بیت کے لئے مخصوص ہیں درج ہیں، یہ محض ایک غلط تاثر تھا مگر اس تشکیک سے بعض حضرات کے ذہن میں شک نے جنم لیا اور بعض نے چہمہ گوئیاں بھی کیں، اس حوالے سے ”باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یوص“ میں بھی ایک روایت گزری ہے، حضرت عائشہؓ سے بھی سوال ہوا تھا چونکہ یہ ایک بے بنیاد بات تھی اس لئے ہر مجیب کی طرف سے سائل کو نفی میں جواب ملا ہے، حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث بھی صاف بتا رہی ہے کہ اہل بیت کے لئے کوئی مخصوص دستاویز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھوائی ہے، یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے، عارضہ میں ہے: ”مروی من طرق مجمع علی صحته ونقلہ“ امام بخاریؒ نے بھی کتاب العلم میں اس کی تخریج فرمائی ہے:

”عن ابی حنیفۃ قال قلت لعلیؓ: هل عندکم کتاب؟ قال ”لا یلا کتاب اللہ

او فہم أعطیہ رجلٌ مسلم او مافی ہذہ الصحیفۃ“ قال قالت و مافی ہذہ

الصحیفۃ؟ قال العقل وفکاک الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر“۔^۱

غرض دو ورق کے اس صحیفے میں کوئی خاص حکم جو اہل بیت نبوت کے لئے مخصوص ہو نہیں تھا، اگر اس کے جواب میں شیعہ یہ کہیں کہ وہ تقیہ کرتے تھے تو جواب یہ ہے کہ پھر ان کی شجاعت پر آپ نے جو بزدلی کا بدنامہ داغ لگایا اس سے آپ کی عقیدت کہاں گئی؟؟؟ باب کی روایت میں ”فقد کذب“ صاف تردید ہے۔

(۲) دوسری بحث:- اس پر اتفاق ہے کہ مدینہ منورہ مکہ کی طرح حرمت والی جگہ ہے۔ اس کا احترام ہر مکہ گو پر فرض ہے، مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا جس طرح مکہ کے احکام ہیں کہ وہاں کے درخت کاٹنا اور شکار کھیلنا جائز نہیں ہے تو اسی طرح مدینہ کا حکم بھی ہے؟ تو جمہور یعنی ائمہ ثلاثہ دونوں کا حکم ایک مانتے ہیں البتہ شافعیہ و مالکیہ کے ماہو المشہور مذہب کے مطابق جانی پر تاوان یعنی ضمان و جزاء نہ ہوگی کیونکہ یہاں نسک ادا نہیں ہوتے اس لئے یہ چراگاہ کی مانند صرف ممنوع ہے، جبکہ بعض حضرات جزاء کے بھی قائل ہیں، ان کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔

حنفیہ کے نزدیک اس کی حرمت بمعنی تعظیم و تکریم کے ہے جیسے مسجد کی تعظیم ہوتی ہے۔ ہاں مدینہ کی

ہریالی اور رونق کی خاطر درخت اور کنوئیں اور درود یو ارسب چیزیں محفوظ ہونی چاہئیں مگر مع ہذا اگر کسی نے کوئی شاخ کاٹ دی تو اس نامناسب حرکت کی کوئی سزا مقرر نہیں ہے اسی طرح شکار کا حکم ہے۔ ان کا استدلال ”یا ابا عمیر ما فعل النغیر“ سے ہے۔ اس کے جواب میں جمہور کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ باہر کی ٹہللی تھی مگر یہ جواب کارگر نہیں کیونکہ جب باہر کا پرندہ حرم میں آجائے تو اس کا حکم حرم کے جانوروں کی طرح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تحریم سے پہلے کا واقعہ ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۳) تیسری بحث:- حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے مدینہ منورہ میں بدعت کی یا کوئی جنایت کی یا مبتدع کو جگہ دی یعنی اسے روکا نہیں اور مدینہ سے باہر نکالا نہیں یا کم از کم اپنے مقدور بھرا خراج یا روک تھام کی کوشش نہ کی تو حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ہمیشہ کے لئے ملعون ہوگا۔ والعیاذ باللہ۔

تو یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ مدینہ میں بدعت گناہ کبیرہ ہے کیونکہ یہ مدینہ کی حرمت کے منافی ہے تاہم اگر وہ بدعت مکلفہ نہ ہو تو بلحاظ تحریم وہ کفر نہیں ہے اس لئے لعنت سے مراد کافروں والی لعنت نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قاتل مؤمن کی سزا طویل ہوتی ہے اسی طرح اگر یہ مبتدع توبہ نہ کرے تو قیامت تک یعنی طویل مدت تک مستحق لعن رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے خاتمہ بالخیر کی توفیق نصیب نہ ہو کہ بعض اعمال کی نحوست تباہ کن ہوتی ہے، ابن العربیؒ نے مختلف توجیہات کے بعد لکھا ہے: ”اوفی شخص یقترب بفعله سوء الخاتمة لانتهاک الحرمۃ“ اس صورت میں دوام لعن اپنے حقیقی معنی پر ہوگا۔

پھر اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی رحمت خاصہ یا عامہ سے دور فرما دے۔ فرشتوں کی لعنت کا مطلب ترک استغفار یا اس کے لئے بددعا کرنا ہے جیسا کہ لوگوں کی لعنت سے بھی یہی مراد ہے، یا لوگوں کی لعنت سے مراد ہجران یعنی ترک تعلق ہے۔

(۴) چوتھی بحث:- جو شخص اپنا نسب یا کوئی غلام اپنی موالات کی نسبت تبدیل کر دے تو وہ بھی ملعون ہے چونکہ زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ ایک آدمی کسی کو بتقی بنا کر اپنی طرف منسوب کرتا اور وہ متبقی بھی اس

۲ رواہ البخاری ص: ۹۱۵ ج: ۲ ”باب الکنیۃ للصبی الخ“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۲۱۰ ج: ۲ کتاب الادب،

ایضاً سنن ابی داؤد کتاب الادب باب: ۶۹، سنن ابن ماجہ کتاب الادب باب: ۲۴، مسند احمد ص: ۵۵۹ ج: ۳

پر راضی ہوتا، پھر سورۃ احزاب میں اس رسم کو باطل قرار دے دیا گیا لہذا اب جو ایسا کرے گا وہ اسلام میں جاہلیت کو پروان چڑھائے گا اس لئے وہ کفران نعمت کرتا ہے کہ اپنے باپ کے احسان کو فراموش کرتا ہے اور اپنا نسب غیر جگہ مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح غلام بھی احسان فراموشی کے ساتھ جھوٹی نسبت ظاہر کرتا ہے، اس لئے وہ دونوں اللہ کو پسند نہیں، اللہ نے ماں باپ کا حق مقرر کیا ہے، فرمایا: ”ان اشکر لی ولو الدیک“ ^{۳۷} اور مومنی کی موالات کو بھی احسان کہا ہے ”واذتقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ“ ^{۳۸} تو ایسا کرنے والا کفران اور ظلم کرتا ہے کہ ”وضع شی فی غیر محلہ“ کرتا ہے، ”وقال اللہ ان لعنة اللہ علی الظالمین“ ^{۳۹} یہ آیت فرشتے بھی پڑھتے ہیں اور مسلمان بھی، اس لئے یہ بھی لعنت کرنے والے بن گئے۔ واللہ اعلم وعلہ اتم

باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده

”عن ابی ہریرۃ قال جاء رجل من فزارۃ الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا رسول اللہ! ان امرأتی ولدت غلاماً اسود فقال له النبی صلی اللہ علیہ وسلم: هل لك من اهل؟ قال ”نعم“ قال فما الوانها؟ قال ”حمر“ قال فهل فیہا اُورق؟ قال: ”نعم ان فیہا لُورقاً“ قال: اُنئی اناھا ذالک؟ قال ”لعل عرقاً نزعها“ قال فهذا لعل عرقاً نزعہ۔“ ^۱ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص قبیلہ فزارہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میری بیوی نے کالے رنگ کا بچہ جنا ہے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا ”ہاں“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ان کے رنگ کیسے ہیں؟ اس نے کہا ”سرخ“ رنگ کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے؟ اس نے کہا ”ہاں“ ان میں سیاہی مائل بھی ہیں“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کالا رنگ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا شاید کسی رگ نے اتار لیا ہو۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کو بھی کسی رگ نے اتار لیا ہوگا۔ (یعنی کھینچ لیا ہوگا)

لغات:- قولہ ”حمر“ بضم الحاء وسكون الميم احمر کی جمع ہے، سرخ رنگ کا اونٹ یعنی اسمر۔ قولہ ”اُورق“

۳۷ سورة لقمان آیت: ۱۴۔ ۳۸ سورة الاحزاب آیت: ۳۷۔ ۳۹ سورة الاعراف آیت: ۴۴۔

بروزن افضل اس کی جمع ”ورق“ بضم الواو وسكون الراء آتی ہے جیسا کہ اگلے جملے میں جواباً مذکور ہے، گندمی اور خاکی رنگ کو کہتے ہیں، گندمی رنگ کے آدمی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہی مائل ہو، یہاں یہی مراد ہے۔ قولہ ”عِرْقًا“ بکسر العین رگ کو کہتے ہیں ”نَزَعَهُ، جَذَبَهُ“۔

تشریح:- بخاریؒ کی روایت میں ہے کہ یہ آدمی اعرابی تھا اور اس کا نام ضمضم بن قنادہ تھا، یہ اور ان کی بیوی دونوں میں کالا کوئی نہیں تھا مگر بیٹا کا لے رنگ کا پیدا ہوا تھا چونکہ عام لوگ ایسے حالات میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں اس لئے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی وجہ دریافت فرمائی کیونکہ ان کو بذات خود بھی شک لاحق ہوا تھا مگر مع ہذا یہ سوال یا اخبار قذف نہیں، مالکیہ کے نزدیک نہ صراحۃً قذف ہے اور نہ ہی تعریض جیسا کہ ابن العربیؒ نے عارضہ میں لکھا ہے: ”لیس فی سوال الاعرابی قذف لاهلہ لا بتعریض ولا بتصریح“ الخ۔ چونکہ ان کے نزدیک تعریض قذف بھی موجب حد ہے اس لئے دونوں کی نفی فرمائی جبکہ جمہور کے نزدیک صرف تصریح سے قذف تحقق ہوتا ہے تعریض سے نہیں اس لئے ان پر کسی طرح کا اشکال اور اس سے بچنے کے لئے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اونٹوں پر قیاس کرتے ہوئے اس اعرابی کو مثال سے سمجھایا کہ جس طرح سُرخ اونٹوں سے کا لے رنگ کا بچہ جنم لے سکتا ہے تو اسی طرح انسانوں کا حال بھی ہے کیونکہ ”مکمل شئ یرجع الی اصلہ“، لہذا اگر کسی کے آباء و اجداد میں کوئی آدمی کا لاگذا ہو گا تو وہ رنگ اولاد کی کسی پشت میں ظاہر ہونا غیر معمولی یا غیر فطری اور غیر طبعی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ الوان تو علامات ہیں اور علامۃ ذی العلامت سے مختلف بھی ہو سکتی ہے لہذا ماں باپ اور اولاد کے الوان مختلف ہونا تو عام مشاہدہ ہے دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں کتنی تبدیلی آچکی ہے رنگت کے علاوہ قد و قامت اور شکلوں میں واضح تفرقے موجود ہیں، الحاصل کسی بچے کو باپ کے رنگ سے مختلف ہونے کی وجہ سے منفی نہیں کیا جاسکتا۔

”قال النووی فی شرح مسلم وفی هذا الحدیث ان الولد یلحق الزوج وان خالف

لونہ لونہ“ حتی لو کان الاب ایض والولد اسود وعکسہ لحقہ ولا یحل لہ نفیہ

بمجرد المخالفۃ للون وکذا لو کان الزوجان ایضین فحاء الولد اسود

او عکسہ لاحتمال انه نزعہ عرق من اسلافہ "الخ۔ (کتاب اللعان ص: ۳۹۱ ج: ۱)
کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فی القافۃ

"عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل علیہا مسروراً تبرق اسار ووجہہ فقال:
آلم تر ان مُحْزَراً نَظَرَ اِنْفَالی زید بن حارثہ واسامۃ بن زید فقال: ہذہ الاقدام بعضہا من بعض۔"
(حسن صحیح) ۱

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اندر (جرہ) میں
تشریف لائے اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش تھے (اتنے خوش تھے کہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ
انور (پیشانی) کی لکیریں چمک رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے نہیں پتہ کہ مجرز (قیافہ شناس) نے
ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید دونوں کو دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ پاؤں ایک دوسرے سے ہیں۔

اگلی روایت کا مطلب ہے کہ ان دونوں حضرات باپ بیٹے نے چادر اوڑھ رکھی تھی صرف پاؤں نظر
آ رہے تھے تو قیافہ شناس نے پاؤں کو دیکھ کر یہ تجزیہ کیا۔

لغات:- قولہ "القافۃ" قائف کی جمع ہے قفا سے ہے، قافیہ یا قیافہ شناس خدا و خال سے معلوم کرنے
والا کہلاتا ہے۔ قولہ "تبرق" بضم الراء برق سے باب نصر سے واحد مؤنث کا صیغہ ہے جو جمع کے لئے بھی
استعمال ہوتا ہے، بجلی اور چمکنے کو کہتے ہیں یعنی خوشی کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک چمک رہا تھا
جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی۔

قولہ "اساریر" جمع الجمع کا صیغہ ہے واحد سر یا سر آتا ہے اور جمع اسرار و اسرۃ ہے، وہ لکیریں جو پیشانی
میں بنتے اور ہموار ہوتی رہتی ہیں۔ قولہ "الم تری" اصل میں ترین واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے لم جازمہ کی وجہ
سے نون کو حذف کر دیا ہے ای الم تعلمی؟۔ قولہ "محزرا" بضم الحیم و کسر الزاء المجرمۃ المشددة و بعد ہا زاء

باب ماجاء فی القافۃ

۱۔ الحدیث اخرجہ البخاری ص: ۱۰۰۱ ج: ۲ "باب القائف" کتاب الفرائض، ایضاً رواہ مسلم فی کتاب الرضاع، سنن
ابی داؤد ص: ۳۱۶ ج: ۱ کتاب الطلاق، سنن نسائی کتاب الطلاق باب: ۵۱، مسند احمد ص: ۱۲۰ ج: ۷
حدیث: ۲۳۰۰۵ و ۲۵۳۶۷۔

آخری۔ اگلی روایت میں راء مہملہ کے ساتھ ہے مگر صحیح زاء مجملہ کے ساتھ ہے۔

مجزز بن الاعور المدلجی کا خاندان قیافہ شناسی میں مشہور تھا اس لئے لوگ ان کے قول کو زمانہ جاہلیت میں حجت مانتے تھے۔

تشریح:- حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ السابقون الاولون میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت رکھنے والوں میں سے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس وقت متبنی بنالیا جب انہوں نے اپنے والد اور پچا کے ساتھ واپس جانے سے انکار فرمایا، یہ اصلاً غلام نہ تھے مگر رسم جاہلیت کے مطابق ان کو زبردستی غلام بنا کر بیچا گیا تھا، تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف ان کے صاحب زادہ حضرت اسامہؓ پر لوگ یہ تہمت یا کم از کم یہ شک کرتے تھے کہ ان کے والد زیدؓ ابیض یعنی سرخ و سپید ہیں تو یہ کیسے ان کا بیٹا ہو سکتا ہے کیونکہ اسامہؓ جب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ کالا ہے البتہ ان کی والدہ ام ایمن کے بارے میں شارحین کی دورائے ہیں کہ وہ کالے رنگ کی تھیں یا سفید؟ درحقیقت اور اصولی طور پر اسامہؓ زید ہی کے صاحب زادہ تھے کہ ”الولد للفراس“ کما مر۔ مگر دوسری طرف زمانہ جاہلیت کی یہ رسم اور علم القیافہ کی گردش ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی، کیونکہ شریعت شریفہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں آئی تھی تو گویا یہاں دو طرح کے دلائل باہم متعارض ہو گئے تھے، ظاہری رنگ والا قرینہ نفی نسب پر دلالت کرتا تھا اور اصول ”الولد للفراس“ اثبات کو مقتضی تھا لیکن عام لوگ تو ظاہر کو بآسانی جانتے اور اس پر اعتماد کرتے ہیں دیکھئے اگر ایک آدمی بہت بڑا ولی اللہ ہو مگر جب اس کے مقابلے میں اس سے کئی گنا چھوٹے آدمی سے کرامت ظاہر ہو جائے تو عام لوگ اسی صاحب کرامت پر زیادہ اعتقاد کرنے لگتے ہیں، اس لئے یہ ایک مسئلہ تھا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان تھے مگر جب قائف مجزز نے یہ بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بہت زیادہ خوشی ہوئی کیونکہ وہ غلط تاثر مکمل طور پر ختم ہوا، واضح رہے کہ یہ فحہ خواص کو ہرگز نہ تھا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ قیافہ شناسی حجت ہے؟ اس سے نسب ثابت ہو جاتا ہے یا نہیں؟ تو امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں ہے کہ حنفیہ امام ثوریؒ اور امام احنفؒ قیافہ شناسی کو حجت نہیں مانتے جبکہ باقی ائمہ ثلاثہ اس کی حجیت کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ سے اس بارے میں مختلف اقوال اور بھی ہیں۔ ثمرہ اختلاف یہ ہوگا کہ اگر کسی باندی سے مختلف لوگ جماع کریں جیسے زمانہ جاہلیت میں لوگ کرایہ پر باندیاں حاصل کرتے تھے یا بائع و مشتری میں اختلاف ہو جائے تو ان حضرات کے نزدیک فیصلہ قائف کے قول پر ہونا چاہئے۔ تاہم امام

شافعیؒ زنا سے نسب کے ثبوت کے قائل نہیں چنانچہ امام نوویؒ نے اسی صفحے پر لکھا ہے کہ نہ تو زنا سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ محرم نکاح ہے حتیٰ کہ زانی اپنے نطفے سے پیدا شدہ لڑکی سے خود بھی نکاح کا مجاز ہے:

”وقال مالك والشافعيّ وابو ثور وغيرهم لا اثر لوطی الزنا بل للزانی ان يتزوج ام

الزنى بها وبنتها بل زاد الشافعيّ فَجَوَزَ نكاح البنت المتولدة من مائه بالزنا“۔

بہر حال ان حضرات کا استدلال باب کی حدیث سے ہے کہ مجرز نے کہا ”ان هذه الاقدام بعضها من بعض“ اس کی نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی بلکہ اس پر اظہار مسرت بھی فرمایا۔ (ص: ۴۷۱ ج: ۱، باب العمل بالحاق القائف الولد)

حنفیہ کہتے ہیں کہ قیافہ شناسی ایک فنی چیز ہے لہذا یہ مدار حکم خصوصاً نسب جیسے نازک مسئلے میں ہرگز نہیں بن سکتا۔ دیکھئے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے پردہ کرنے کا حکم تو دے دیا جس کے بارے میں حضرت سعدؓ اور عبد بن زمعہ کے درمیان جھگڑا ہوا تھا، سعد بن ابی وقاصؓ کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ میرا بھتیجا ہے کہ اس نے مجھے اس کی وصیت کی ہے اور یہ اس (عتبہ بن ابی وقاصؓ) کے ساتھ مشابہت بھی رکھتا ہے جبکہ عبد بن زمعہ کہہ رہے تھے کہ ”هذا الخبي يارسول الله اولد على فراش ابي من وليدته“ ۱؎ تو مشابہت کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”واحتجبي منه يا سودة بنت زمعة“۔ مگر اس مشابہت کی بناء پر سعدؓ کے حق میں فیصلہ نہیں فرمایا، اسی طرح اگر قیافہ قابل حجت بات ہوتی تو پھر لعان کا حکم نازل نہ ہوتا بلکہ قیافہ شناس کو بلایا جاتا اور اسی سے معلوم کیا جاتا، نیز یہ کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں قیافہ شناس ماہر ہے اور فلاں غیر ماہر ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور جہاں تک حدیث الباب کا تعلق ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اصول کو حسی تقویت ملی اور تقویت و تائید تو کمزور دلیل سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور مجرز کی بات کو اس لئے رد نہیں فرمایا کہ یہاں تردید فی نسب کو مستلزم ہوتی جبکہ نفس تردید حضرت سعدؓ کے قصے میں ہوئی ہے اور وہ بھی کافی ہے۔ ہاں حضرت سودہؓ کو احتیاطاً پردے کا حکم بھی دے دیا۔

۱؎ کذا فی سنن ابن ماجہ ص: ۱۴۴ ”باب الولد للفراش واللعان الحجر“ کتاب النکاح وموطا مالک ص: ۲۴۱

”القضاء بالحاق الولد بابیه“ کتاب الاقضية ولفظه: فقال احبني وابن وليدة ابي ولد علي فراشه الخ.

باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الهدیۃ

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال تہادوا فان الہدیۃ تذهب وحر الصدر ولا تحقرن جارة لجارتہا ولو شق فیرسین شاة“۔ (غریب) ^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دوسرے کو ہدایا دیا کرو کہ ہدیہ سینے کی جلن (کینہ) کو دور کرتا ہے اور کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو کوئی چیز دینا معمولی نہ سمجھے خواہ وہ بکری کے گھر کا گلڑا ہی ہو۔

لغات:۔ قولہ ”حث“ بفتح الحاء وتشدید الثاء، ترغیب دینا اور ابھارتا دیا کسانا۔ قولہ ”تہادوا“ بفتح التاء، الدال، امر کا صیغہ تہادی بمعنی المحادثات سے ہے، جانین سے ہدیہ دینے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”وآخر“ بفتح الواو والحاء، دل کے میل اور کسی سے نفرت وغیرہ کو کہتے ہیں۔ قولہ ”لا تحقرن“ کا مفعول بہ مقدر ہے یعنی ہدیۃ۔ قولہ ”فیرسین“ بکسر الفاء والسين وینھما راء ساکنہ، گھر اور سُم کو کہتے ہیں۔ (یعنی گھر کے دونوں حصوں کے درمیان معمولی گوشت کا گلڑا ہی کیوں نہ ہو)

تشریح:۔ یعنی باہمی خوش گوار تعلقات کو استوار ناجوا اسلامی معاشرے کا کلیدی عنصر ہے آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے سے مزید مستحکم ہو جاتا ہے چونکہ عورتوں میں طبعی طور پر افتخار کا مزاج پایا جاتا ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ عورتیں ایک دوسرے کو معمولی ہدیہ دینا باعث شرم و عار جانیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی دینے والی، اسی طرح لینے والی ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ گھر کا گلڑا ہی کیوں نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس سے نیچے درجے کی کوئی چیز ہو نہیں سکتی اس لئے یہ تمثیل ہوئی کہ اپنے پڑوسیوں کو ضرور دیا کریں۔ مزید تفصیل راقم نے ”نقش قدم کامل“ میں لکھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دل میں مال کی محبت ہوتی ہے جب کوئی مال دیتا ہے تو اسی مقدار میں اس کے لئے دل نرم ہو جاتا ہے اور لازمی بات ہے کہ اس سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الہدیۃ

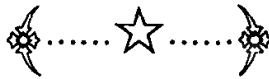
۱۔ وفي المعجم الاوسط للطبرانی: يانساء المؤمنین تہادوا ولو بفرسن شاة فانه یبیت المودة ویذهب الضغائن، ایضاً فی الاوسط یامعشر الانصار تہادوا فان الہدیۃ تسل السخیمۃ وتورث المودۃ الخ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۸۵ ج: ۴ حدیث: ۶۷۱۵۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الرجوع فی الہبة

”عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَثَلُ الَّذِي يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا كَالْكَلْبِ أَكَلَ حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فَرَجَعَ فِي قَيْعِهِ“۔^۱

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس شخص کی مثال جو کوئی ہدیہ دے کر پھر اسے واپس لیتا ہے اس گتے کی مانند ہے جو کھائے یہاں تک کہ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو قے کر دیتا ہے اور پھر (بھوک لگتے وقت دوبارہ) رجوع کرتا ہے اپنی قے کی طرف۔

تشریح:- جیسا کہ اوپر والے باب میں گذرا ہے کہ ہدیہ کا مقصد اچھے تعلقات اور قرب حاصل کرنا ہے جبکہ رجوع سے اس کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے، اس لئے رجوع کرنے سے آدمی کی مثال اتنی بُری بن جاتی ہے جیسے کتے کی مذموم حالت۔ باقی مسئلہ کی تفصیل پہلے گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۲۲۱ ”باب ماجاء فی کراہیۃ الرجوع من الہبة“ من ابواب البیوع)



باب ماجاء فی کراہیۃ الرجوع فی الہبة

۱۔ رواہ ایضاً ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ ص: ۱۷۲ ”باب الرجوع فی الہبة“ ابواب الہبات وابدؤد فی البیوع باب: ۸۱، والنسائی فی الہبة باب: ۲، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۶۱ ج: ۳ کتاب البر والصلۃ.

ابواب القدر

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

”قدر“ بفتح القاف والdal اور سکون dal بھی جائز ہے یعنی بروزن قمر بھی جائز ہے اور بروزن شمس بھی، تقدیر اندازے کو بھی کہتے ہیں یعنی ہر چیز کے لئے مقدار مقرر کرنا خواہ کیت کے لحاظ سے ہو یا کیفیت اور وقت وغیرہ کے لحاظ سے، اور قدرت کے معنی میں بھی آتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنی قدرت کاملہ سے عجیب و غریب اور عظیم نظام کو پیدا اور جاری فرمایا ہے۔

جاننا چاہئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پاک میں وحدت ہی وحدت ہے اس لئے نہ تو اس کا ثانی اور شریک فی الذات ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مظہر ہے نہ اس تک رسائی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا تصور بالکنہ و کنبہ ممکن ہے کہ وہ ذہناً و خارجاً بسیط ہی بسیط ہے البتہ تصور بالوجہ و بوجہ ہو سکتا ہے بایں طور کہ اس کی ذات پر اس کی صفات دال ہیں اور صفات پر اسماء حسنی دال ہیں نیز ان صفات کے مظاہر بھی ہیں لہذا ذات تک رسائی علم یا یوں کہنا چاہئے کہ تصور بالوجہ ان اسماء حسنی، صفات اور مظاہر کی وساطت سے ممکن ہے جو لوگوں کی استعدادات کے مطابق متفاوت ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ عزوجل کی صفت ابداع سے عالم بغیر کسی شے آخر کے معرض وجود میں آیا، پھر صفت تخلیق سے باقی خلقت اور موالید ثلاثہ یعنی حیوانات بشمول انسان کے، نباتات اور معدنیات معرض وجود میں آئے کہ یہ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اور صفت تدبیر سے ان امور کا انتظام و انصرام جاری و ساری ہے جو آج تک محار العقول بنا ہوا ہے۔

بہر حال کائنات اور مخلوق کی تخلیق سے قبل عالم کا جو علم یا اس کا نقشہ ہے کہ کیا کیا چیزیں پیدا ہوں گی؟ اور کب اور کیسے پیدا ہوں گی؟ پھر ان معلومات کو لوح محفوظ میں لفظ بلفظ درج کیا گیا ہے اس کا نام ہے ازلی فیصلے اور تقدیر ہے۔ لفظ قضاء بھی اس کے ہم معنی ہے جبکہ بعض حضرات نے اجمالی حکم ازلی کو قضاء اور اس کی تفصیل و جزئیات کو تقدیر سے تعبیر کیا ہے، بعض نے اس کے برعکس تعبیر کو اختیار کیا ہے۔

علم بالمعدوم تو جائز ہے مگر اس کے باوجود اس مسئلہ میں عقول حیران ہیں اور صحیح صورت حال سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے بڑے بڑے ارباب عقل کے قدم یہاں آکر پھسل جاتے ہیں، قاضی محمد مبارک رحمہ اللہ نے اللہ کے علم ازلی کے بارے میں تمام مذاہب نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”تفکرفی هذا المقام فانه من منزلة الاقدام“۔ اس لئے اس مسئلہ میں ازروئے عقل بحث کرنا ممنوع بھی ہے اور خطرناک بھی، تجربہ شائد ہے کہ جس نے اس کی تہہ تک جانے کی کوشش کی ہے وہ غرق و ہلاک ہوا ہے، کوئی قدری بن گیا یعنی منکر تقدیر اور کوئی جبری بن گیا ہے جو انسان کو پتھر کی طرح ماننے لگا ہے، حالانکہ تحقیق ان دونوں کے درمیان ہے کہ انسان کا سبب ہے مگر خالق نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے شرح عقائد اور نبراس وغیرہا۔

حاشیہ کو کب پر مرقات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؑ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا ”طریق مظلّم لا تسلكه“ یعنی تاریک راستہ ہے تم اس پر نہیں جاسکتے ہو، اس نے پھر سوال کیا تو فرمایا: ”بحر عمیق لا تلجہ“ یعنی گہرا سمندر ہے تم اس میں غوطہ زن نہیں ہو سکتے ہو، اس نے پھر سوال کیا تو فرمایا ”یسر اللہ خفی علیک فلا تفتشه“^۱ یعنی اللہ کا پوشیدہ راز ہے اس کی تفتیش حال مت کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ جو اللہ کے راز کو افشاء کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ رسوا کر دیا جاتا ہے۔^۲

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اہل سنت والجماعت کی تعریف یہ کی ہے جو ظاہر کتاب و سنت کو تھامے رکھے اگرچہ وہ عقل کے دائرہ کار سے باہر ہو یعنی ایسی نصوص جن میں عقل حیران رہ جاتی ہو ان پر کسی تاویل کے بغیر ایمان لاتے ہوں۔

”اختار قوم ظاہر الکتاب والسنة وعضوا بنوا جہم علی عقائد السلف ولم

یبالوا بموافقتها لاصول العقلية ولا لمخالفتها لها.... وهم اهل السنة“۔

(مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ)

یعنی اگرچہ شریعت کی کوئی چیز عقل کے منافی نہیں لیکن ایسا ممکن ہے کہ کوئی مسئلہ کسی کی عقل سے بالاتر ہو ایسے میں صحیح اور صریح نص کے اندر کسی قسم کی تاویل جائز نہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ محال عقل تو نہیں لیکن

ابواب القدر عن رسول اللہ ﷺ

۱۔ کذا فی مرقات المفاتیح ص: ۲۵۶ ج: ۱ ”باب الایمان بالقدر“۔ ۲۔ ایضاً راجع للروایات مجمع الزوائد ص: ۲۹۲

ج: ۷ کتاب القدر۔

محار العقل ہے اور میرا اس پر ایمان ہے۔

تقریب الی الفہم کی غرض سے ایک نظیر پیش کی جاتی ہے، اس سے تقدیر کے مسئلہ کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

جس طرح کوئی فاعل مختار اپنے اختیار سے اور ارادے سے، اور پوری بصیرت اور مہارت کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے تو اس سے پہلے اس کے ذہن میں یعنی علم میں اس کام کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کام کا فائدہ اور وجہ بھی ملحوظ ہوتی ہے جس کو علت غائی کہتے ہیں، پھر اگر وہ کام بہت بڑا ہو تو اس کا نقشہ بھی تیار کر لیا جاتا ہے جیسے بہت بڑی بلڈنگ بن رہی ہو یا کوئی کارخانہ تعمیر ہو رہا ہو تو انجینئر اس کا ماڈل تیار کرتا ہے اور جب کام شروع ہو جاتا ہے تو اس کی تمام کاروائی اور تفصیلات اس نقشے اور ماڈل کے مطابق نظر آتی ہیں، ایسا ہی (بلا تشبیہ) ازل میں جو فیصلے ہوئے اور مستقبل کی تمام تفصیلات جوازل میں لکھی گئی ہیں ان کا نام تقدیر ہے جس سے ذرا بھی آگے پیچھے ہونے کا کوئی امکان نہیں اگرچہ اللہ کو انجینئر کی طرح ماڈل تیار کرنے کی ضرورت نہیں مگر چونکہ اللہ کا ہر کام ضابطے سے ہوتا ہے اس لئے یہ تفصیلات لوح محفوظ پر اتاری گئی ہیں تاکہ اللہ کے لامتناہی علم اور بے انتہا قدرت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کیا جائے، کہ لامتناہی اوقات کا علم ازل میں رکھتا ہے اور ازل ہی سے ایک نظام مقرر کیا اب اس میں کبھی بھی سر موگڑ بڑ نہیں ہوتی۔ ”فسبحان اللہ احسن العالقین“۔ کچھ مزید وضاحت ابواب کے ضمن میں آئے گی۔

باب ماجاء من التشديد في الخوض في القدر

”عن ابی ہریرۃ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نتنازع فی القدر فغضب حتی احمر وجهہ حتی کأنما فقی فی وجنتہ الرمان فقال: أبهذا أمرکم؟ أم بهذا أرسلت الیکم؟ انما هلك من كان قبلکم حين تنازعوا فی هذا الامر عزمت علیکم ألا تنازعوا فیہ“۔^۱

(حدیث غریب یعنی صالح الترمذی کی وجہ سے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف

لائے جبکہ ہم تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا یہاں تک کہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اتنا زیادہ سرخ ہو گیا کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں رخساروں میں انار نچوڑا گیا ہو، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے؟ یا پھر میں اس کے ساتھ تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ بے شک تم سے پہلے لوگ اس وقت ہلاک (گمراہ) ہوئے جب انہوں نے اس معاملے میں باہمی منازعت اختیار کر لی، میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اس بارے میں جھگڑے (یعنی مباحثے) مت کرو!۔

لغات:- قولہ ”قُفِی“ بصیغہ مجہول بمعنی عُصْر یعنی نچوڑ دیا گیا ہو یا توڑ دیا گیا ہو۔ قولہ ”وَجَنَّتِہ“ ای خدیہ، دونوں رخسار۔ قولہ ”الرَّيْمَانُ“ بضم الراء اثار، ”حتی احمر“ غضب کا غایہ ہے اور ”حتی کأنما الخ“ احمر کا غایہ ہے۔ قولہ ”أَبْهَذَا الخ“ دواستفہام ہیں، دونوں انکاری ہیں اور انکار بعد الا انکار ترقی اور مبالغے کے لئے ہے۔ قولہ ”غَرَمْتُ“ ای اقسمتُ و اوجبتُ، یعنی میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور تم پر لازم کر دیتا ہوں۔

تشریح:- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ تنازعہ تقدیر کے ماننے اور نہ ماننے میں تھا ہرگز نہیں کیونکہ ایمان بالقدر تو فرض اور ایمان کا حصہ ہے بلکہ تقدیر کے اسباب اور حکمتوں کے جاننے اور اس حوالے سے عمل کی اہمیت کے بارے میں تھا مگر یہ مسئلہ اتنا نازک ہے کہ اس میں بحث سے لامحالہ افراط و تفریط جنم لیتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا کہ جب پہلے لوگ اس مباحثے کے نتیجے میں تباہ ہو چکے، تو پھر ایسا تلخ تجربہ کیوں دہراتے ہو، اس لئے سلامتی اور ایمان کی حفاظت بس اسی میں ہے کہ ہر خیر اور شر کا خالق، اللہ ہی کو مانیں اور جو اس نے حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کا التزام کیا جائے، آگے اللہ کیا کرتا ہے یہ تقدیر سے بحث پر منحصر نہیں بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہیں تو اپنے فضل سے جنت دے دیں اور چاہیں تو دوزخ میں ڈالیں جو اس کا عدل ہے، کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا اختیار ہے۔

باب

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: احتج ادم وموسى فقال موسى: یا ادم انت الذی خلقک اللہ ببیدہ ونفخ فیک من روحہ أغویت الناس وأخرجتهم من الجنة؟ قال فقال ادم انت موسى الذی اصطفاک اللہ بکلامہ اتلو منی علی عمل عملتہ کتبہ اللہ علیّ قبل ان یخلق

السموات والارض؟ قال فحج آدم موسى۔ (حسن عریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم و موسیٰ علیہما السلام دونوں نے آپس میں مدلل بحث کی پس موسیٰ نے کہا اے آدم! آپ وہی ہیں کہ اللہ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور آپ کے اندر اپنی طرف سے روح ڈالی، آپ نے لوگوں کو بھٹکا دیا اور ان کو جنت سے نکال باہر کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم نے اس کا جواب یوں دیا کہ تو وہی موسیٰ ہے کہ تجھے اللہ نے اپنے کلام کے ساتھ مخصوص کیا ہے، کیا تو مجھے ایسے عمل پر ملامت کرتا ہے جو میں نے کیا ہے! مگر اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے پہلے ہی میرے لئے لکھ دیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس آدم حجت (دلیل) میں موسیٰ پر غالب آگئے۔

لغات:- قولہ ”احتج“ احتجاج کے معنی حجت قائم کرنے اور استدلال کے ہیں۔ قولہ ”بیدہ“ تشابہات میں سے ہے جس پر پہلے بحث گذری ہے، متاخرین اس کا ترجمہ قدرت سے کرتے ہیں۔ قولہ ”من روحہ“ ”من“ ابتداء یہ ہے اور روح کی اضافت برائے تشریف و تعظیم ہے جیسے بیت اللہ، یعنی اللہ نے اپنی طرف سے ایک پاک روح آپ کے اندر ڈالی۔ قولہ ”اغویت“ اغواء سخت گمراہ کرنے کو کہتے ہیں یعنی مراد سے بہت دور لے جانا ہے یعنی جنت سے دنیا تک۔ قولہ ”اصطفاک“ ای اختارک، تجھے منتخب کیا ہے اور چن لیا ہے۔

تشریح:- بعض نسخوں میں اس باب کو مترجم بترجمہ ”باب ماجاء فی حجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام“ کیا گیا ہے، حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان یہ مناظرہ کب اور کہاں ہوا ہے؟ تو اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ملتی اس لئے شارحین نے مختلف احتمالات بیان کئے ہیں مثلاً عالم ارواح میں، عالم برزخ میں، ایک کی حیات کے زمانہ میں دوسرے کی روح کے ساتھ، شب معراج میں وغیرہ جبکہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ مناظرہ قیامت کے دن ہوگا مگر یقینی ہونے کی وجہ سے الفاظ ماضی کے استعمال کئے گئے جیسا کہ بلاغت کا اصول ہے، جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ تمثیل ہے۔

بہر حال حدیث کی صحت کے بعد زمان و مکان کے ابہام سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تاہم اس حدیث کے

باب (بلا ترجمہ)

۱۔ رواہ ایضاً احمد فی مسندہ ص: ۲۲۷ ج: ۳ حدیث: ۹۶۶۳ والطبرانی فی الکبیر حدیث: ۱۶۶۳، مجمع الزوائد ص: ۲۸۱ ج: ۷ حدیث: ۱۱۸۰۲، ایضاً روی بمعناہ بخاری ص: ۴۸۴ ج: ۱ کتاب الانبیاء۔

سمجھنے کے لئے چند باتیں ملحوظ رکھنا اہم ہیں:

ایک بات:- یہ کہ اللہ عزوجل کی صفات کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں کسی پر جلال کا غلبہ ہوتا ہے اور کسی پر جمال کا، حضرت ادم علیہ السلام ابوالبشر تھے اور باپ اپنی اولاد کے لئے جمال کا مظاہرہ کرے تو خوب ہوتا ہے گو کبھی کبھی جلال بھی ہونا چاہئے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش سے مباحثے کے لئے مختص کیا جانا تھا جس کا تقاضا تھا کہ جلال کا اظہار ہو پس یوں کہا جائے گا کہ حضرت ادم علیہ السلام پر جمال کا غلبہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جلال کا، اور خصوصاً امور تشریحی کے حوالے سے۔

دوسری بات:- یہ ہے کہ اس کون یعنی اس عالم میں دو طرح کے امور بیک وقت جاری ہیں ایک تکوینیہ اور دوسرے تشریعیہ، اللہ عزوجل نے اپنی کامل حکمت کے تقاضے سے امور تکوینیہ پر پردہ ڈالا ہے ورنہ نظام دنیا نہ چلتا، جبکہ امور تشریعیہ کو کھل کر بیان فرمایا ہے، انسان امر تکوینی کے آگے مجبور اور بے بس ہے جبکہ امور تشریعیہ میں باختیار ہے۔

تیسری بات:- یہ ہے کہ انسان جس طرح امور تشریعیہ پر بذات خود عمل کرنے کا پابند ہے اسی طرح دوسرے سے عمل کروانے کا بھی بقدر وسعت واستطاعت مکلف ہے۔

چوتھی بات:- یہ ہے کہ ہر امر وجوب کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوامر ارشاد کے لئے اور بعض اوامر کسی اور غرض کے لئے ہوتے ہیں جیسا کہ اصول فقہ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، اسی طرح نواہی میں بھی درجات ہیں۔

اس حدیث سے پہلے اگر ہم حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ سامنے رکھیں تو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی، بایں صورت کہ حضرت خضر علیہ السلام نے تین کام ایسے کئے جن کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صبر نہ ہو سکا اور فوراً نکیر فرمائی حتیٰ کہ نوبت فراق تک جا پہنچی، حالانکہ ان کے اندر راز کی باتیں تھیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھیں کہ عالم الغیب صرف اللہ ہی ہے۔

پس یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جلالی شان کے مطابق حضرت ادم علیہ السلام سے فرمایا کہ اتنی قدر دانی کے باوجود آپ نے لوگوں کو جنت سے نکالا یعنی شجرہ ممنوعہ میں سے کھا کر آپ کو نکالا گیا جس کی وجہ سے آپ کی اولاد دنیا میں پیدا ہوئی پس کوئی کافر و مشرک بن گیا اور کوئی فاسق، اگر آپ یہ خطا نہ کرتے تو سب لوگ جنت ہی میں ہوتے، جیسے حضرت خضر سے فرمایا تھا ”قوم حملوننا بغير نول عمدت الی

سفینتہم فخر قہما التفرق اہلہا؟“ حضرت آدم علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو حدیث میں ہے یعنی یہ تو میرے لئے پہلے سے مُقدّر تھا میں اس سے کیونکر بچ سکتا تھا؟ اسی بناء پر حضرت آدم علیہ السلام مناظرہ میں غالب رہے، یعنی اول تو ”ولا تقربا هذه الشجرة“ کے دنیا میں آنے سے پہلے کا حکم ہے جبکہ ابھی تک انسان کے اوپر تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالا گیا تھا اور جنت تو دار التکلیف نہیں ہے ہاں اس سے پہلے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دنیا میں ہوا تھا، ثانیاً یہ حکم ایک تکوینی امر سے وابستہ کیا گیا تھا لہذا اس کی حیثیت اسی امر تکوینی کی ہو گئی تھی یعنی یہ حکم تکوینی اور تشریحی کے بین بین تھا، تشریحی امور کی خلاف ورزی کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں اور تکوینی کی جدا گانہ ہوتی ہیں اس لئے آدم علیہ السلام کی اولاد کو اگر اس کا بوجھ اٹھانا پڑے تو اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں، اگر ایک آدمی جہنم میں جاتا ہے تو وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے نہیں، حضرت آدم علیہ السلام پر الزام اس وقت آتا کہ شجرہ ممنوعہ میں سے کھانے کے بعد ان کی اولاد سیدھی جہنم میں چلی جاتی حالانکہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ نے ان کو جنت میں دوبارہ جانے کے تمام اسباب کا انتظام فرمایا ہے بلکہ پہلے کی جنت میں اور بعد کی جنت میں ایک واضح فرق ہے کہ اگر انسان یوں ہی جنت میں پیدا ہوتا تو اس سے انسانی صلاحیت کا پتہ کیسے چلتا؟ حتیٰ کہ ابن قیمؒ نے اس موضوع پر مستقل کتاب ”مفتاح دار السعادة“ لکھ کر موقف اختیار کیا ہے کہ انسان کو جنت کے عوض نعم البدل ”علم و ارادہ“ یعنی کسب و عمل دیا گیا ہے:

والمقصود ان اللہ سبحانہ و تعالیٰ لما اقتضت حکمتہ و رحمته اخراج ادم وذریئہ من الجنة أعاضہم افضل منها“ الخ۔ (ص: ۲۸، دار الکتب العلمیہ)

یہ طویل جواب اس لئے اختیار کیا گیا کہ جو جواب اس موقع پر مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جواب عالم آخر سے متعلق ہے اس لئے وہاں تقدیر کا حوالہ دینا صحیح ہے۔

راقم کو اس سے شرح صدر نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قبر اور محشر میں فساق یہی استدلال کرتے حالانکہ صریح نصوص کے مطابق ان کا کوئی عذر اور تقدیر کا حوالہ عند اللہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب ماجاء فی الشقاء والسعادة

”سالم بن عبد اللہ یحدّث عن ابيه قال قال عمر بنارسل اللہ اَرَآیْتَ مَا نَعْمَلُ فِیْهِ
امر مبتدع او مبتدأ او فیما قد فرغ منه؟ قال فیما قد فرغ منه یا بن الخطاب و کذل مُبَسِّرٌ امامن کان من
اهل السعادة فانه یعمل للسعادة وامامن کان اهل الشقاء فانه یعمل للشقاء“۔^۱ (حسن صحیح)
حضرت سالم اپنے والد حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت عمرؓ نے عرض
کیا: اے اللہ کے رسول! اس بارے میں ارشاد فرمادیں کہ جو عمل ہم کرتے ہیں وہ نیا ہوتا ہے یا فرمایا (شک
الراوی) کہ ابتدائی ہوتا ہے یا پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے فراغت حاصل کی جا چکی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ وہ ایسا ہے جس سے فراغت ہو چکی ہے، اے ابن الخطاب! اور ہر ایک کو آسانی دی گئی ہے پس
جو نیک بختوں میں سے ہو تو وہ بلاشبہ خوش نصیبی کا کام کرتا ہے، اور جو شخص بد نصیبوں میں سے ہو تو وہ بلاشبہ بد بختی
کا عمل کرتا ہے۔

لغات:- قولہ ”مبتدع او مبتدأ“ لفظ ”أو“ راوی کے شک کے لئے ہے کہ اصل لفظ مبتدع ہے
یا مبتدء مطلب دونوں کا ایک ہی ہے یعنی جو کام ہم کرتے ہیں وہ اسی وقت وجود پذیر ہوتا ہے؟ قولہ ”قد فرغ
منه“ یعنی اس کا ریکارڈ اور قبل العمل کوئی دوسرا وجود بھی ہوتا ہے۔ قولہ ”میسر“ اسم مفعول کا صیغہ ہے، آسانی
و سہولت دیا ہوا شخص یعنی ہر آدمی کو تقدیر کے مطابق عمل کی آسانی دی گئی ہے۔

تشریح:- جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علم بالمعدوم جائز ہے جیسے قیامت ابھی قائم نہیں ہوئی ہے
مگر ہمیں اس کے متعلق بہت ساری اشیاء سے آگاہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح ازل میں انسان نہیں تھا مگر اللہ تبارک
و تعالیٰ کو انسان کی رگ رگ اور اول تا مرگ تمام بیرونی و اندرونی کیفیات، اعمال اور ارادوں کا علم تھا یہ ایسا ہے
جیسے بلا تشبیہ کوئی ڈیم بن رہا ہو اور انجینئر پانی کی سطح پہلے سے معلوم کر کے نشانات لگائے تو جب وہ ڈیم تیار
ہو جائے تو پانی اسی سطح تک پہنچ جاتا ہے نہ کم ہوتا ہے اور نہ زیادہ، البتہ یہاں تھوڑی بہت غلطی کا امکان رہتا ہے
جبکہ تقدیر میں اور مابعد کے واقعات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ کما ہوا لفظ ہر

باب ماجاء فی الشقاء والسعادة

۱۔ رواہ مفصلاً أحمد فی مسنده، بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۸۵ ج: ۷ حدیث: ۱۱۸۱۶۔

اسی بناء پر انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ پہلے سے اللہ کو معلوم اور لوح محفوظ میں مکتوب و موجود ہوتا ہے اور چونکہ تقدیر انسانی مزاج اور چاہتوں کے مطابق ہے اور ہر شخص اپنے مزاج کا کام شوق سے اور آسانی سے کرتا ہے اس لئے یہ اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے انسان کے لئے آسان ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی ازل علم الہی میں چور تھا تو اس کے لئے چوری لکھی گئی ہے اور آج اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ کام بڑی خوشی سے کرتا ہے، اور اس سے کوئی جبر بھی لازم نہیں آتا کیونکہ اگر کسی کو معلوم ہو کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور پھر پانی چھوڑ دے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پانی اس لئے نیچے کی طرف جا رہا ہے کہ فلاں آدمی نے پہلے معلوم کیا تھا یا پیش گوئی کی تھی۔ تدبر

دوسری حدیث: - ”عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علیؑ قال: بینما نحن مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو یبکت فی الارض اذ رفع رأسہ الی السماء ثم قال ما منکم من احد الا قد علم قال وکیع الا قد کتب مقعده من النار و مقعده من الجنة قالوا: اقلنا تکمل یا رسول اللہ؟ قال: لا اعملوا فکل ميسر لما خلق له۔“ (حسن صحیح)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ دریں اثنا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین کرید رہے تھے اچانک اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر فرمانے لگے تم میں سے کوئی نہیں مگر معلوم کیا گیا ہے، امام و کیع فرماتے ہیں کہ مقرر کیا (یعنی لکھا) گیا ہے اس کا ٹھکانا دوزخ میں سے اور جنت میں سے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! تو کیا ہم اسی پر تکیہ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! بلکہ عمل کرتے رہو کہ ہر شخص کو اس عمل کی آسانی دی گئی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

تشریح: - بقولہ ”یبکت“ وہ کرید رہے تھے، ایک روایتؓ میں ہے کہ یہ واقعہ جنت البقیع میں جنازہ کے وقت پیش آیا تھا، قبر ابھی تیار نہیں ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد صحابہ کرامؓ بیٹھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لکڑی سے زمین کو کرید رہے تھے چونکہ یہ عمل عموماً سوچ و بچار کے دوران ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اس وقت عالم بالا کے ساتھ تھا اس لئے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر مذکورہ ارشاد فرمایا۔

۱۔ ایضاً رواہ البخاری ص: ۹۷۷ ج: ۲ کتاب القدر، ومسلم ص: ۳۳۳ ج: ۲ کتاب القدر۔ ۲۔ کذا فی صحیح مسلم : عن علی قال کنا فی بقیع الغرقہ فأتانا رسول اللہ ﷺ الخ ص: ۳۳۳ ج: ۲ کتاب القدر۔

علامہ طبریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے سوال واستیذان کا منشا یہ تھا کہ کیوں نہ ہم تقدیر پر بھروسہ کر دیں کیونکہ ہوگا تو وہی جو تقدیر میں ہے ہم خواہ کچھ بھی کریں لیکن تقدیر کو تو تبدیل نہیں کر سکتے ہیں۔ اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم قانون شریعت میں دخل اندازی مت کرو تمہیں عمل کرنے کا مکلف بنایا گیا لہذا تم عمل کرو۔ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا مطلب یہ تھا کہ جنت یا دوزخ میں جانے کے لئے دو مؤثر ہیں ایک عمل، یہ ظاہری مؤثر ہے اور دوم اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارادہ یہ اصل اور حقیقی مؤثر ہے تو ہم بجائے ظاہری مؤثر کے حقیقی پر کیوں بھروسہ اور تکیہ نہ کریں؟ اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا دار الاسباب ہے اور ظاہری اسباب حقیقی مؤثر کے ساتھ مربوط ہیں لہذا عمل کرتے رہنا کیونکہ اچھے اعمال نیک بختی کی علامات ہیں جبکہ بُرے اعمال بد بختی کی نشانیاں ہیں اس لئے بُرے اعمال سے بچنا چاہئے، اور نیک اعمال چھوڑنا نہیں چاہئے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے عمل کی مشقت کا سہارا لیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تقدیر پر بھروسہ کر لیں گے تو آسانی ہو جائے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک بختوں کے لئے کیا مشکل ہے ان کے لئے تو اعمال آسان بنا دیئے جاتے ہیں جیسا کہ بزرگوں کے احوال سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قوة عینی فی الصلوٰۃ“، تدریس۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آدمی کے دو ٹھکانے ہوتے ہیں اگر وہ جنت میں جائے تو دوزخ والی رہائش گاہ خالی رہتی ہے اور دوزخ میں جانے سے جنت والی خالی رہتی ہے۔ حاصل حدیث یہ ہے کہ اگرچہ سب کچھ تقدیر میں تو ہے مگر توکل ترک اسباب کا نام نہیں بلکہ تم تقدیر پر تکیہ یوں کرو کہ خلوص نیت کے ساتھ عمل کر کے تقدیر اور قضاء پر راضی رہو۔

باب ماجاء ان الاعمال بالخوا تیم

”عن عبد اللہ بن مسعود قال حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو الصادق المصدوق ان احدکم یجمع خلقه فی بطن امه فی اربعین یوماً ثم یموت مثل ذالک ثم یموت مضعاً مثل ذالک ثم یرسل اللہ الیہ الملك فینفخ فیہ الروح ویؤمر باربع یمکتب رزقه واجله وعمله

و شقی او سعید فوالذی لا إله غیره ان احدکم لیعمل بعمل اهل الجنة حتی ما یمکون بینہ و بینہ الا ذراع ثم یسبق علیہ الکتاب فیختم لہ بعمل اهل النار فیدخلہا“ الخ۔ (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بات بتائی اور وہ سچے ہیں اور ان کی سچائی مانی ہوئی ہے کہ تم میں سے ایک کی خلقت (کے مادہ) کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی ہی مدت میں گاڑھا خون بن جاتا ہے پھر اسی طرح وہ لوتھڑا بن جاتا ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے پھر اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے وہ اس کا رزق لکھتا ہے، اس کی اجل، اس کا عمل اور یہ کہ وہ بد بخت ہے یا نیک بخت، پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ تم میں سے ایک جنتیوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز سے زیادہ فاصلہ نہیں بچتا کہ اتنے میں اس پر (تقدیر کا) لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے تو اس کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہو جاتا ہے پس وہ اسی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بے شک تم میں سے ایک دوزخ والوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ذراع سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا پھر اس پر (تقدیر کا) لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے تو اس کا خاتمہ جنت والوں کے عمل پر ہوتا ہے اس طرح وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

لغات:- ”وہو الصادق المصدوق“ جملہ معترضہ ہے، صادق کے معنی تو ظاہر ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ان صفات میں سے ایک ہے جن کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبل النبوت بھی مشہور ہو چکے تھے۔ ”مصدق“ کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی تسلیم کی گئی ہے حتیٰ کہ ابوسفیان نے ہر قل کے دربار میں اس کا برملا اقرار کیا حالانکہ اس وقت ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت و مخالفت چل رہی تھی اور خود ابوسفیان فرماتے ہیں کہ اگر ساتھیوں کا ڈر نہ ہوتا کہ یہ بعد میں میری طرف غلط نسبت مشہور کر دیں گے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بولتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچ ہی کہا گیا ہے کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی تو وحی سے بات کرتا ہے جو سراسر درست اور سو فیصد صحیح اور سچ ہی سچ پر مبنی ہوتی ہے۔ قولہ ”یجمع خلقہ“ مطلق سے مراد نطفہ ہے جو انسانی تخلیق کا مادہ اور بنیادی عنصر ہے۔ اور جمع سے مراد یہ ہے کہ رحم جسے حیوان مشتاق الی الذکر کہتے ہیں جماع کے وقت منہ کھولتا ہے اور جماع کے بعد بند کرتا ہے۔ قولہ ”اربعین یوماً“ یہ اوسط اور عام مدت ہے کیونکہ عام انسانوں میں چالیس دنوں میں تغیر اور تبدیلی آتی

ہے۔ بعض کی استعداد اچھی ہوتی ہے وہ اس سے پہلے اور بعض اس کے بعد تبدیل ہو جاتے ہیں جیسا کہ زندہ انسانوں میں اس کا مشاہدہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ قولہ ”علقة“ ای دماغیظا حامداً یعنی گاڑھا خون جیلی کی طرح۔ قولہ ”مضغہ“ گوشت کا ٹھنڈا اور ٹکڑا، مضغ اصل میں چبانے کو کہتے ہیں چونکہ یہ ٹھنڈا ایک بوٹی کی بقدر ہوتا ہے جس کو چبایا جاسکتا ہے اس لئے مضغ سے تعبیر کیا۔

تشریح:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس حدیث کے بیان کے وقت ایک منفرد انداز کلام اختیار کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی تخلیق تین اندھیروں میں ہوتی ہے، جس کا مشاہدہ خالی آنکھ سے ممکن نہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نبی ہیں اس لئے وہ ہی ایسے معاملات کی خبر دے سکتے ہیں، لہذا اس کے ماننے میں تردد کی گنجائش نہیں۔

احادیث میں اربعینات کے الفاظ اور تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس کو تعارض نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ اختلاف نطفے کی استعداد کے اختلاف پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر لغات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ تبدیلی اکثری واغلی ہے اور شریعت کے احکام چونکہ اغلب حالات پر وارد ہوتے ہیں اس لئے حدیث میں اربعینات ثلاثہ کا ذکر بکثرت آیا ہے اگرچہ اس مدت میں کمی بیشی متوقع ہے، چنانچہ ابن رجب حنبلی نے شرح الخمسین میں یہ عمل دوسرے اربعین کے اول میں ہونے کے بارے میں بھی روایت نقل کی ہے:

ففی صحیح مسلم.... اذا مر بالنطفة اثنان واربعون ليلة بعث الله اليها ملكاً

فصورها الخ.... وفيه وحديث مالك بن الحويرث يدل على ان التصوير

يكون للنطفة ايضاً في اليوم السابع..... (راجع للتفصيل شرح الخمسین من

ص: ۶۲ الى ۷۵)

بہر حال ضابطے کے تحت فقہاء نے چار مہینے جو کہ تین اربعینات ہیں، سانس لینے کی حد مقرر کی ہیں۔
(تفکر ولا تعجل)

اگرچہ کچھ نہ کچھ حیات تو نطفے میں بھی ہوتی ہے مگر یہاں بنے بنائے انسان کی بات ہو رہی ہے اس حوالے سے ایک سوئس دنوں میں پورا ڈھانچہ تیار ہو کر سانس لیتا ہے، اسی دوران ایک فرشتہ جو ارحام پر مقرر ہے اور اللہ کی جانب سے مامور ہوتا ہے آکر اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کی زندگی کا ریکارڈ بنا کر فائل میں درج کرتا ہے، ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ موقف اختیار فرمایا ہے کہ ”ویوم ماریع“ میں حکمت یہ ہے کہ اللہ عزوجل

کے اوامر پر تنبیخ کا پردہ آسکتا ہے جبکہ اخبار میں نسخ ممکن نہیں گویا رحم مادر میں جو تقدیر ہوتی ہے اس میں تبدیلی ممکن ہے البتہ لوح محفوظ میں تغیر کا امکان نہیں، یہ مسئلہ تقدیر معلق و مبرم کی طرف راجع ہو جاتا ہے۔

الرابعة قوله ”ویومر“ هذه الفائدة العظمیٰ: لانه لو اخبر فقال: اجله كذا ورزقه كذا وهوشقى او سعي لماتغير خبره ابدالان خبر الله لا يجوز ان يوجب بخلاف مخبره لوجوب الصدق له، ولكنه يأمر بذلك كله والله سبحانه ان ينسخ أمره ويقلب ويصرف العباد فيه من وجه الى وجه فافهموا هذا فانه نفيس وفيه يقع المحو والتبديل وامافى الخبر فلا يكون ذالك ابداء كذا لك يقع المحوفى صحائف الملك ويرفع الى مافى ام الكتاب وهو تأويل قوله ”يمحو الله ما يشاء ويثبت“۔^۱ (عارضه الاحوذی)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ تقدیر مبرم اور معلق کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اسی طرح امکان کذب کا مسئلہ بھی پہلے سے کم نہیں یہ موقع اس کے بیان کا نہیں تاہم عارضہ کی اس عبارت سے بہت ساری روایات میں تطبیق آسان ہو جاتی ہے۔ فاغتنم هذا

وہ مزید لکھتے ہیں کہ لوگوں کی چار قسمیں ہیں: ایک وہ جو عمر بھر مؤمن رہے۔ دوم اس کے برعکس جو زندگی بھی کافر رہے۔ سوم جو پہلے مؤمن ہو اور موت کے قریب کافر ہو جائے۔ اور چہارم اس کے برعکس جو پہلے کافر ہو اور موت کے قریب مؤمن بن جائے۔ اس حدیث میں آخری دونوں قسموں کا بیان ہے۔
محشی نے ملا علی قاریؒ کی مرقات^۲ سے ایک جامع عبارت نقل کی ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنے نیک اعمال کی وجہ سے عجب اور کبر وغیرہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے اور گناہوں کی بناء پر مایوس نہیں ہونا چاہئے، نہ کسی بظاہر نیک آدمی پر جنتی کا حکم لگایا جائے اور نہ ہی کسی گناہ گار کو دوزخی قرار دینا چاہئے کہ اعتبار تو خاتمہ کو ہے نہ معلوم کون آخر میں کیسے رہتا ہے؟ غرض بین الخوف والرجاء رہنے کی پابندی کرے۔

باب ماجاء ان الاعمال بالخوا تیم

۱۔ سورة الرعد آیت: ۳۹۔ ۲۔ قال الملا علی قاری فی المرقاة: اقول فی الحدیث تنبیہ علی ان السالک ینبغي ان لا یفتقر باعماله الحسنه ویجتنب العجب والتکبر والاخلاق السیئة ویكون بین الرجاء والخوف ومسلماً بالرضا تحت حکم القضاء الخ ص: ۲۶۷ ج: ۱، مکتبہ حقانیہ ملتان

اشکال:- یہ تو بڑا مشکل معاملہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی عبادت میں اور اللہ کی اطاعت میں گزر جائے اور جب موت قریب ہو جائے تو سب نیکیاں نیست و نابود ہو جائیں اور آدمی عمل بد (کفر) کی وجہ سے دوزخ میں چلا جائے؟

حل:- یہ بد انجامی صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے اعمال میں مخلص نہیں ہوتے ہیں ان کے اعمال اگرچہ ظاہری شکل میں بہت اچھے اور زیادہ محسوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ جان سے خالی ہوتے ہیں وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود دھوکے میں ہوتے ہیں: "قال اللہ تعالیٰ 'يُخَدَعُونَ اللہ وَالَّذِينَ امْنَوْا مَا يَخْدَعُونَ اِنَّهُمْ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللہ مَرَضًا لَّخٌ' " گویا موت کے وقت ان کی دو موت آ جاتی ہیں ایک جسمانی اور دوسری روحانی۔

اس کے برعکس جو لوگ مخلص اور قضاء پر راضی ہو کر عمل میں مگن رہتے ہیں وہ اللہ کے فضل کرم سے سوء خاتمہ سے محفوظ ہوتے ہیں، تاہم یہاں یہ سوال بھی باقی رہتا ہے کہ خلوص کی حد کیا ہے؟ اس کے جواب میں ابن قیمؒ مفتاح دار السعادة میں لکھتے ہیں:

"ان خواص الامة ولبابها لما شهدت عقولهم حسن هذا الدين وجلالته وكمالہ وشهدت قبح ما خالفه ونقصه ورداء ته خالط الايمان به ومحبه بشاشة قلوبهم فلو خيبر بين ان يلقى في النار وبين ان يختار ديناً غيره لا يختار ان يقذف في النار وتقطع اعضاءه ولا يختار ديناً غيره وهذا الضرب من الناس هم الذين استقرت اقدامهم في الايمان وهم ابعد الناس عن الارتداد عنه واحقهم بالثبات عليه الى يوم لقاء الله" الخ۔ (ص: ۳۳۱)

یعنی اگر کسی کا ایمان اس حد تک پختہ ہے کہ وہ ایمان کو جان و مال اور اعضاء و ابکار ہر چیز سے عزیز و لذیذ سمجھتا ہے تو وہ خاتمہ بالسوء سے محفوظ ہے اب ہر آدمی خود ہی فیصلہ کرے کہ اس کا ایمان اس کے نزدیک کتنا قیمتی ہے؟

باب ماجاء كل مولود يولد على الفطرة

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: كل مولود یولد علی الفطرۃ فابواه یہودانہ ویُنصرانہ ویُسَرِّکانہ، قیل یا رسول اللہ! فمن هلك قبل ذاك؟ قال: اللہ اعلم بما كانوا عاملین به۔“^۱ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ ملت (اسلامیہ کی استعداد) پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اس کو یہودی بناتے ہیں اور نصرانی بنادیتے ہیں اور اسے مشرک بنادیتے ہیں، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! جو اس (بلوغت) سے پہلے مرجائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے تھے۔

• لغات:- ”ملت“ صحیحین^۲ کی روایت میں لفظ ”فطرت“ آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی کی روایت بالمعنی ہے اور شیعین کی بلفظہ ہے، فطرت سے مراد ملت اسلامیہ ہے یا اس کی استعداد، اس میں اختلاف ہے، تفصیل تشریح میں ملاحظہ ہو۔ البتہ لغت میں فطرت بمعنی انشقاق اور تقطیع یعنی پھٹنے اور پھاڑنے کے بھی آتا ہے۔ اور بمعنی ابتداء کے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ قولہ ”یہودانہ“ النخ یہ تینوں صیغے مضارع کے ہیں اور باب تفعیل سے ہیں یعنی وہ بچے ماں باپ کی تعلیم اور اثر ماحول کی وجہ سے بے دین کر دیئے جاتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث شریف میں تین باتیں اہم ہیں: پہلی یہ کہ جیسا کہ فطرت کے لغوی معنی سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی تخلیق کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے تو وہ کون سی ابتداء ہے۔ دوسری یہ کہ انسانی بچے کی یہ حالت کس نوعیت کی مراد ہے آیا اس سے مراد اسلام ہے یا استعداد وغیرہما۔ تیسری بات یہ ہے کہ کافروں کے نابالغ بچے کہاں ہوں گے؟

(۱)۔۔۔ پہلی بات کے متعلق ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اس کتابت کی طرف اشارہ ہے جب اللہ عزوجل نے قلم پیدا فرمایا تھا، یا پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو ذر کی شکل میں

باب ماجاء كل مولود يولد على الفطرة

۱۔ راجع ایضاً مجمع الزوائد ص: ۳۱۶ ج: ۷ حدیث: ۱۱۹۳۸۔

۲۔ صحیح بخاری ص: ۹۷۶ ج: ۲ کتاب القدر، صحیح مسلم ص: ۳۳۶ ج: ۲ کتاب القدر۔

پیدا فرمایا تھا اور ان کو اللہ کی ربوبیت پر مقرر اور گواہ بنایا تھا، ”وقال بعضهم من لم يعلم هو المكتوب عليه وهو فسی الرحم“ الخ اس تیسری رائے کو انہوں نے لاعلمی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ عام شارحین نے صرف اسی کو لیا ہے کہ جب انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرت اور ملت کے مطابق ہوتا ہے اور حدیث میں لفظ ”یولد“ بھی اس کی طرف مشیر ہے۔

(۲)... دوسری بات میں اختلاف ہے مگر قابل ذکر اقوال دو ہیں: (۱) امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس فطرت سے مراد دین اسلام ہے پس مطلب یہ ہوگا کہ ہر انسانی بچہ مسلمان یعنی عقائد اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے والدین غلط پرورش کر کے اسے گمراہ کر دیتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ فطرت سے مراد اسلام قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ”والاصح ان معناه ان کل مولود یولد لدمیثاً لاسلام“ الخ۔ (ص: ۳۳۷ ج: ۲)

عارضۃً الاحوذی میں ہے:

”ومعنی ولادته علی ذالک کلہ یرجع الی انہ یولد سلیمًا عن عیب غیر مکتسب
لشعی کما قال اللہ: ”واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لاتعلمون شیئاً“
(النحل: ۷۸) ثم یعود الی ما أمر اللہ بہ او کتبہ من عملہ بالتیسیر الی ذالک اما علی
یدی ابویں وهذا اکثر وعنه وقع الخبر واما بقربین وقد اخبر اللہ عنه فقال:
”وقیضنا لهم قرناء“ والابویں قرین۔“

یعنی انسانی بچہ یہودیت، نصرانیت اور شرک وغیرہ ہر قسم کے عیوب سے پاک پیدا ہوتا ہے جیسا کہ جانور سلیم الاعضاء پیدا ہوتے ہیں مگر جس طرح ان کے مالک ان کے کان وغیرہ کاٹ دیتے ہیں اور ان کو معیوب بنادیتے ہیں اسی طرح انسانی بچے کو ماں باپ معیوب اور گمراہ کر دیتے ہیں جو حدیث بالا میں بیان ہوا یا اس کے ساتھی اور غلط ماحول کے اثرات گمراہ کر دیتے ہیں جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے۔

یہی رائے علامہ تورپشتی، علامہ طیبی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ اور اس سے ملنے جلتے معنی کے قائل حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہم بہت سے حضرات کی ہے۔

فریق اول کا استدلال سورہ روم کی اس آیت سے ہے: ”فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم“ (روم آیت ۳۰) اس میں گویا فطرت کی تفسیر دین قیم سے کی گئی ہے۔

ان کا دوسرا استدلال عیاض بن حمار کی مرفوع حدیث سے ہے، یہ حدیث قدسی ہے: ”انی خلقت عبادی حنفاء کلّهم فاجتالهم الشیطان عن دینهم“ کے بعض طرق میں ”حنفاء مسلّمین“ کے الفاظ ہیں جو زیادہ صریح ہیں، نیز حدیث الباب میں بھی لفظ ملت آیا ہے، معلوم ہوا کہ فطرت سے مراد ملت اور اسلام ہی ہے۔

فریق ثانی کا استدلال یہ ہے کہ اگر انسانی بچہ مسلمان ہی پیدا ہوتا تو پھر غیر مسلموں کے بچے اپنے ماں باپ کے تابع نہ ہوتے حالانکہ اس بارے میں روایات تو اتنی حد تک پہنچی ہیں کہ ان کے احکام قبل البلوغت وہی ہیں جو ان کے بڑوں کے ہیں لہذا ان کا قبرستان الگ ہے، ان کی نماز جنازہ نہیں ہے، کیا کسی بھی ایک روایت سے ثابت ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی یہودی بچے یا مشرک بچے کی نماز پڑھی ہو حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ کا بڑا اہتمام بلکہ التزام فرماتے، نیز مسلمان کی نماز جنازہ تو فرض ہے تو اس عہد پاک میں جو بچے بغیر جنازہ کئے دفن ہوئے اور آج تک ہو رہے ہیں؟ کیا سب مسلمان جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے تارک فرض ہوں گے؟ اسی طرح وہ بچے جب ماں باپ کے ساتھ گرفتار ہو جائے تو وہ غلام تصور کئے جاتے۔ غرض یہ بات انتہائی جلی ہے کہ عملی طور پر کسی بھی غیر مسلم کے بچے کے ساتھ مسلمانوں کے بچوں سا سلوک نہیں کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان پیدا نہیں ہوتے۔

فریق اول کے استدلال کا جواب:- ان حضرات کی دونوں دلیلوں کا جواب اور حدیث الباب کا مطلب یہ ہے جیسا کہ ابن العربیؒ نے فرمایا کہ ہر انسانی بچہ کفر اور شرک کے عیوب سے پاک اور صاف ستھرا پیدا ہوتا ہے بس وہ ایک خالی لوح کی طرح ہوتا ہے مگر دین اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے انسان فطری طور پر اللہ کی ربوبیت، توحید اور الوہیت کا قائل اور نجاستوں سے متنفر رہتا ہے اس لئے اگر اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہ ہوتا تو وہ صاف ستھرا موحّد ہی بنتا جیسا کہ پہلے مسلم الثبوت کا حوالہ گذر گیا ہے اور چونکہ یہ صلاحیت انتہائی تیز اور بالفعل مؤثر ہے اس لئے اسے ملت سے تعبیر فرمایا، جیسے ایک گاڑی بالکل زریعہ میٹر ہو مگر اس میں دو سو میل فی گھنٹہ رفتار والا میٹر فٹ کیا گیا ہو تو وہ اگرچہ ابھی تک روڈ پر چلی نہ ہو مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ گاڑی دو سو میل کی رفتار سے چلنے والی ہے، ہاں اگر اسے ضائع کر دیا جائے تو وہ الگ بات ہے اسی طرح اس خالی لوح اور سادہ لوح بچے کے دل و دماغ پر کچھ اور کندہ کیا جائے تو وہ قبول کر لے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات میں اسلام بالقوة کو قوت امکان کی وجہ سے اسلام بالفعل سے تعبیر کیا ہے۔

تدبر و تشکر

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھار ماہیت کے مقتضی سے تخلف بھی ممکن ہے یعنی بعض افراد ماہیت کے اقتضاء سے نکل بھی جاتے ہیں جیسے شہد کی مکھوں کا ایک نوعی مزاج ہے کہ وہ پھولوں پر بیٹھتی ہیں لیکن ایک دوکھیاں پیشاپ پر بھی بیٹھتی ہیں اسی طرح کھیر بعض کڑوا بھی ہوتا ہے چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کو قتل کیا تھا وہ ماہیت کے اس ضابطے سے مستثنی تھا یہ اللہ کی قدرت کا اظہار ہے تاکہ مادہ پرست اور دھری لوگ سمجھ جائیں کہ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر کوئی تصرف کرنے والا موجود ہے جو محض اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے۔

اعتراض:- یہاں یہ اشکال پیش آتا ہے کہ فطرت سے خواہ کوئی بھی معنی لئے جائیں لیکن مذکورہ بالا آیت میں تصریح ہے کہ: ”لا تبدل لخلق الله“ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے بھی بگڑ جاتے ہیں بلکہ ان کی غالب اکثریت اسلام سے دور بھاگتی ہے۔

جواب:- اس کا حل یہ ہے اور یہ حل ان لوگوں کی طرف سے زیادہ آسان اور بے غبار ہے جو فطرت بمعنی استعداد لیتے ہیں کہ وہ صلاحیت تبدیل نہیں ہوتی ہے بلکہ ماں باپ اور ماحول اس کو دبا لیتے ہیں، یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کو دوسری جانب موڑ لیتے ہیں جیسے کسی پودے کو انتہائی ٹھنڈے یا انتہائی گرم کمرے میں رکھ دیا جائے تو وہ بڑھ نہیں سکے گا اور جو شخص اس کو بجائے بلندی کے دائیں بائیں موڑے گا تو وہ اپنا راستہ تبدیل کر دے گا اسی طرح جیسے ایک ذہین بچے کو ہمل چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا آدمی نہیں بن سکتا حالانکہ ان تمام صورتوں میں اصل صلاحیت موجود ہوتی ہے مگر بے اثر ہو جاتی ہے آج بھی اگر سب کفار خواہ صغار ہوں یا کبار اگر تعصب کی عینک اتار دیں تو چند دنوں میں ساری دنیا میں ایک خدا اور دین اسلام کے ماننے والوں کے سوا کوئی بھی نہیں بچے گا۔

(۳) تیسری بات:- غیر مسلموں کے نابالغ بچوں کے بارے میں کوئی واضح حکم ثابت نہیں بلکہ مختلف موقعوں میں ایک دوسرے سے جداگانہ ارشادات وارد ہوئے ہیں، اس لئے بعض علماء نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے، ملا علی قاریؒ مرقات میں لکھتے ہیں کہ بعض نے ان کو ماں باپ کی وجہ سے جہنمی قرار دیا ہے۔

بعض نے کہا ہوں گے تو جنت میں مگر ”لامنعمین ولا معذبین“۔ بعض نے کہا کہ اللہ کے علم میں جو بڑا ہو کر ایمان لاتا اور اسی پر مرمّتا تو وہ جنت میں جائے گا اس کے برعکس اگر وہ کافر بن کر مرمّتا تو وہ دوزخ میں ہوگا۔ ”وقال ابن حجر هذا قبل ان ينزل فيهم شئ فلا ينافي ان الاصح انهم من اهل الجنة“۔ (حاشیہ مشکوٰۃ ص: ۲۱۱ از مرقاۃ ۵)

یعنی اخیراً حکم یہی ٹھہرا ہے کہ وہ جنت میں ہوں گے، امام نوویؒ شرح منہج میں لکھتے ہیں:
 ”الاصح انه من اهل الجنة والجواب عن حديث: الله اعلم بما كانوا عاملين انه ليس فيه تصريح بانهم في النار الخ“۔ (ص: ۳۳۷ ج: ۲)

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ عام اصول و روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے لہذا جو روایات ان کے دوزخی ہونے کی طرف مشیر ہیں یا تو ان میں تاویل کی جائے گی یا وہ دوسرے اصول سے از روئے اجتہاد مستحبط ہیں مگر ترجیح ان روایات لکھو ہے جو جنت میں جانے پر ناطق ہیں کہ اللہ عز و جل بغیر عمل کے کسی کو محض اپنے علم کی بناء پر نہیں پکڑتا، اور یہ کہ تکلیف بعد البلوغت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

باب ماجاء لا يَرُدُّ الْقَدْرَ اِلَّا الدَّعَاءُ

”عن سلمان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يَرُدُّ الْقَضَاءُ اِلَّا الدَّعَاءُ ولا يزيدني العمر اِلَّا البر“۔ (حسن غریب)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قضاء کو نہیں مائل سکتی مگر دعا اور عمر میں زیادتی نہیں کرتی مگر نیکی۔

تشریح:۔ اس حدیث سے استدلال کر کے بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ اجل میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے، جبکہ ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ازل میں معلوم تھا کہ فلاں شخص اگر دعائے مانگتا یا فلاں نیکی نہ کرتا تو اس کی عمر مثلاً چالیس سال ہوتی مگر بوجہ دعائیا نیکی کے ساٹھ ہوگی لہذا یہ کی بیشی اس دعا یا طاعت کی طرف منسوب کی گئی اور چونکہ تقدیر میں آگے پیچھے ہونے کا امکان نہیں ہے اس لئے اب جو بھی مرے گا وہ اپنے وقت

مقررہ ہی پر مے گا چنانچہ عقائد النصفیہ میں ہے: ”والمقتول میت باجلہ والموت قائم بالمیت مخلوق اللہ تعالیٰ والاجل واحد“۔ معتزلہ کو علامہ تفتازانی نے جواب دیا ہے:

”والجواب عن الاول (ای استدلال المعتزلة بان بعض الطاعات یزیدنی العمر) ان اللہ تعالیٰ کان یعلم انه لولم یفعل هذه الطاعات لکان عمره اربعین سنة لکنہ علم انه یفعلها ویكون عمره سبعین سنة فنسب هذه الزیادات الی تلك الطاعة بناءً علی علم الله تعالیٰ انه لولاها لما كانت تلك الزیادة“۔ (شرح عقائد ص: ۷۳)

جیسے نقد اور ادھار کی دو مختلف قیمتوں میں سے ایک ہی طے ہو جائے تو ثانی برائے نام رہتی ہے۔

تدبر

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

”عن انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُکثرُ ان یقول: یامقلبَ القلوبِ بَیتَ قلبی علی دینک افعلتُ یانبی اللہ! امنابک وبما جئت بہ فهل تخاف علینا؟ قال: نعم ان القلوب بین اصبعین من اصابع اللہ یقلبہا کیف شاء“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعا فرماتے: اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ پس میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر اور جو کچھ آپ لائے ہیں سب پر ایمان لائے ہیں تو کیا آپ ہمارے بارے میں خائف ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں کیونکہ سب دل اللہ کے اصابع میں سے دو اصبعین کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے، (یعنی کبھی طاعت کی طرف اور کبھی گناہ کی جانب)۔

تشریح:- چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اس لئے وہ اس قسم کی ادعیہ صرف امت اور خصوصاً صحابہ کرام کے لئے فرماتے ہیں اس لئے حضرت انسؓ نے

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

۱۔ رواہ ایضاً ابن ماجہ ص: ۲۷۲ ”باب دعاء رسول اللہ ﷺ“ ابواب الدعاء، مسند احمد ص: ۱۹۷ ج: ۵۔ حدیث: ۱۷۱۷۸، ایضاً روی بمنعہ الطبرانی فی الاوسط عن عائشةؓ، مجمع الزوائد ص: ۳۰۶ ج: ۷۔ حدیث: ۱۹۹۱۱۔

پوچھا کہ آپ کو ہمارے بارے میں بے راہ روی کا خطرہ و اندیشہ ہے؟ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں الخ، جواب کا مقصد یہ ہے کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اگر ایک آدمی کسی وقت میں ایک کیفیت پر کائن ہے اور کسی حالت سے وقتی طور پر گزیر رہا ہے تو وہ ہمیشہ اسی حالت پر قائم رہے گا، کیونکہ یہ دل تو اللہ کے دست قدرت میں ہیں وہ لمحہ سے کم آن میں ان کو تبدیل کر سکتا ہے اس لئے ہر وقت اللہ کا خوف دل میں رکھ کر بڑی عاجزی سے ہدایت پر استقامت کی دعائیں مانگنی چاہئے تاکہ اللہ کی توفیق ہر وقت شامل حال رہے۔ اصبعین کا اطلاق متشابہات میں سے ہے جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے تشریحات: ج ۲ ص ۳۰۷)

”باب ماجاء فی نزول الرب تبارک وتعالی الی السماء الدنیا کل لیلۃ، فقیل ابواب الوتر“

خلاصہ یہ ہے کہ مقدمین ایسی نصوص میں تزییہ مع التوفیض کے قائل ہیں جبکہ متاخرین تزییہ مع التاویل کے۔ قال ابن العربی فی العارضة: ”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتکلم بالحقیقة والمجاز“۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ افضل یہ ہے کہ متشابہات میں وہی منصوص الفاظ نقل کئے جائیں اور کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ نہ کیا جائے کہ اس سے ذہن جو ارجح کی طرف جاتا ہے اگرچہ عوام کے سامنے متشابہات بیان کرنے سے امام مالکؒ نے منع فرمایا اور امام بخاریؒ نے صحیح میں کتاب العلم کے آخر میں دو باب قائم کر کے اس پر زور دیا ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم کے مطابق بات کرنی چاہئے، اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

”ما انت بمحدث قوماً حدیثاً لا تبلغہ عقولہم الا کان لبعضہم فتنة“۔ (رواہ مسلم فی مقدمتہ ص ۹) مگر بوقت ناگزیر ضرورت اگر نوبت آ ہی جائے تو ان کے لئے تاویل کی ضرورت ہے جیسا کہ متاخرین نے کیا ہے کیونکہ یہ وقت روشن خیالی کا ہے لوگ ایمان کے بارے میں بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے ہیں جس سے علماء کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوا ہے۔

باب ماجاء ان اللہ کتب کتاباً لاهل الجنة والنار

”عن عبد اللہ بن عمرو قال خرج علينا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفي يده كتابان فقال: أتدرون ما هذان الكتابان؟ قلنا: لا يا رسول اللہ الا ان تُخبرنا فقال للذي في يده اليمينی: هذا كتاب من رب الغلّمين فيه اسماء اهل الجنة واسماء آبائهم وقبائلهم ثم أُجِیلَ علی اخرهم فلا یزاد فیہم ولا ینقص منهم ابدًا، ثم قال للذي في شماله هذا كتاب من رب الغلّمين فيه اسماء

اهل النار واسماء آبائهم وقبائلهم ثم أُجِملَ على آخرهم فلا يُزاد فيهم ولا يُنقص منهم ابداً فقال أصحابه فقيم العمل؟ يا رسول الله! إن كان امر قد فرغ منه فقال سَدِّدُوا وقارِبوْا فان صاحب الجنة يُخْتَمُ له بعمل اهل الجنة وإن عَمِلَ آتَى عَمَلٍ، وإن صاحب النار يُخْتَمُ له بعمل اهل النار وإن عَمِلَ آتَى عَمَلٍ ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده فَنَبَذَهُمَا ثم قال: فَرَعَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيقَ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقَ فِي السَّعِيرِ۔ (حسن صحيح غريب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف لائے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ (اور مشکوٰۃ میں تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی دونوں ہاتھوں) میں دو کتابیں تھیں پس فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تم لوگ جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسول! الایہ کہ آپ ہمیں آگاہ فرمائیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کے متعلق جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہاتھ میں تھی فرمایا کہ یہ رب العظیم کی جانب سے ایک کتاب ہے اس میں جنتیوں کے نام ہیں اور ان کے آباء و قبائل کے نام ہیں اور پھر آخر میں ٹوٹل (میزان) ذکر کیا گیا ہے پس نہ تو ان میں کبھی زیادتی ہوگی اور نہ ہی کبھی کمی ہوگی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا یہ (بھی) رب العظیم کی جانب سے ایک کتاب ہے اس میں دوزخیوں کے نام اور ان کے آباء اور قبیلوں کے نام ہیں پھر ان کے آخر میں مجموعہ عدد دکھا گیا ہے پس نہ تو کبھی ان میں زیادتی ہوگی اور نہ ہی کوئی کمی ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول! پھر عمل کس لئے کیا جائے؟ کہ جب صورت حال طے شدہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا استقامت پر رہو اور درمیانی راہ اختیار کرو کہ بلاشبہ جنتی کا خاتمہ جنت والوں کے عمل پر ہوگا خواہ وہ (پہلے) کوئی بھی عمل کرتا رہے اور بلاشبہ جہنمی کا خاتمہ دوزخ والوں کے عمل پر ہوتا ہے خواہ وہ کیسا ہی عمل کرے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرما کر وہ کتابیں (عالم بالا کے) حوالہ کر دیں پھر فرمایا تمہارے پروردگار بندوں سے فارغ ہو گیا ہے ایک فریق جنت میں ہوگا اور دوسرا جہنم میں رہے گا۔

لغات:- قوله ”أُجِملَ“ بصيغة مجهول میزان اور ٹوٹل کو کہتے ہیں جس میں کل عدد کا مجموعہ پیش کیا جاتا ہے۔ قوله ”سَدِّدُوا“ سدّ اذا فرط وتفریط کے درمیانی حالت یعنی اعتدال کو کہتے ہیں۔ قوله ”وقاربوا“ سداد کے قریب رہو یعنی اگر بالکل سیدھا چلنا اور راستے کے پتوں بچ سے گزرنا مشکل لگے تو کم از کم اس کے قریب تو رہو،

یا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرو جبکہ علامہ طبریؒ نے اس کو ”سا.دوا“ کی تاکید قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اعتقادی اعتدال یہ ہے کہ تقاض فی الخصوص سے بچے اور اعمال میں افراط و تفریط سے بچے۔

تشریح:- آپ علیہ السلام کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں ان کے بارے میں دو احتمال ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تمثیل فرما رہے ہوں کہ یوں سمجھو جیسے میرے ہاتھوں میں دو کتابیں ہیں چونکہ آپ علیہ السلام پر ان کتابوں کے بارے میں اور تفصیلات کے متعلق کشف تام حاصل تھا اس لئے اشارہ حسیہ صحیح ہوا جیسے ایک ماہر مصنف کتاب کے شروع میں کہتا ہے ”ہذا کتاب یا ہذہ رسالۃ“ وغیرہ بلکہ اس سے زیادہ ظاہر مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کا تعلق عالم مثال سے ہو جس کا مشاہدہ آپ علیہ السلام فرما رہے تھے اور صحابہ کرامؓ کو نظر نہیں آ رہی تھی عالم مثال کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں مستقل باب قائم کیا ہے فلیراجع۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ کتابیں حسی ہوں اور آج کے دور میں یہ کوئی ناقابل فہم بات نہیں کہ ایک عام کمپیوٹر میں بھی سارے انسانوں کے اعداد و شمار جمع ہو سکتے ہیں تو ان کتابوں کا کیا حال ہوگا، تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو وہ نام نہیں بتلائے کیونکہ پھر عالم تکوین کے بہت سے امور سے پردہ ہٹ جاتا حالانکہ یہ اللہ کی حکمت کے منافی ہے۔

اس حدیث شریف میں صحابہ کرامؓ کے سوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے متعلق تشریح ”باب ماجاء فی الشفاء والسعادة“ میں عنقریب گذری ہے۔

قولہ ”فنبذھما“ اگر یہ حسی کتابیں تھیں تو نبذ کے معنی یہاں پھینکنے کے نہیں بلکہ عالم بالا کے حوالے کرنا ہے جس کے لئے ہاتھوں کو کھولنا پڑتا ہے اور دیکھنے والے کو نبذ محسوس ہوتا ہے۔ اور اگر غیر محسوس تھیں تو مطلب ہاتھوں کو جھاڑنا ہے جو عموماً حتمی فیصلہ سناتے وقت خاص اشارہ ہوتا ہے۔

حدیث آخر:- ”عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ اذا اراد بعبد خیراً استعمله فقیل کیف يستعمله یا رسول اللہ؟ قال: یوقفہ لعمل صالح قبل الموت“۔ (صحیح)

باب ماجاء ان اللہ کتاباً الخ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ جب کسی بندے کی خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے (اچھا) کام لے لیتا ہے، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! کیسے کام لیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو موت سے پہلے نیک عمل کی توفیق دیتا ہے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے ”ثم یقبضہ علیہ“ ^۱ یعنی پھر اسے اسی عمل خیر کے دوران موت دے کر جنت میں داخل کر دیتا ہے۔

باب ماجاء لا عدوی ولا هامة ولا صفر

”عن ابن مسعود قال قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: لا یعدی شیئاً فقال اعرابی: یا رسول اللہ! البعیر اجرب الحشفة نُدْبُهُ فِیَجْرِبِ الْإِبِلَ کُلُّهَا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نعمن أجرب الأول؟ لا عدوی ولا صفر خلق اللہ کل نفس فکتب حیاتها ورزقها ومصائبها“۔ ^۲

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان (خطبے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کوئی شے (بیماری) کسی چیز کی طرف سرایت نہیں کرتی پس ایک اعرابی نے کہا اے اللہ کے رسول! جب ہم ایسے اونٹ کو باڑے میں داخل کرتے ہیں جس کے موضع پیشاپ میں خارش ہو تو وہ سب اونٹوں کو خارش بنادیتا ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے اونٹ کو کس نے خارش زدہ بنایا تھا؟ سرایت نہیں، صفر (کی نحوست) نہیں اللہ نے ہر نفس کو پیدا کیا ہے تو اس کی حیات و رزق اور مصیبتوں کو لکھا ہے۔

لغات:- قوله ”لا یعدی“ اعدا اور عدوئی سے ہے، بیماری کی سرایت اور دوسرے کو لگنے کو کہتے ہیں۔ قوله ”اجرب الحشفة“ جرب بروزن قمر خارش اور جھلی کے مرض کو کہتے ہیں، جبکہ حشفہ آلہ تناسل کے اگلے حصے کو کہتے ہیں جو ختنہ کے بعد کھلا رہتا ہے، یہاں مراد پورا عضو ہے کیونکہ خارش پھر پورے کو لگتی ہے اگرچہ حشفہ میں

۱۔ کذا فی مسند احمد ص: ۵۶۹ ج: ۳ حدیث: ۱۱۸۰۴۔

زیادہ ہوتی ہے۔ قولہ ”ندبہ“ یہ لفظ مختلف حروف کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے، مذکورہ لفظ ”دبن“ بفتح الدال وسکون الباء سے بمعنی باڑے کے آتا ہے اگرچہ اصل لغت میں یہ لفظ بکریوں کے باڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں بمعنی معطن ہے یعنی اونٹوں کا باڑا مراد ہے، پس ”ندبہ“ بصیغہ جمع متکلم ادبان سے ہے، ترجمہ وہی ہوگا جو اوپر لکھا ہے یعنی ہم اسے باڑے میں داخل کرتے ہیں تو وہ سب کو خارش بنا دیتا ہے لہذا ”فیحرب“ بضم الیاء باب افعال سے معروف کا صیغہ ہوگا اور ”ابل“ مفعول بہ ہے ”کلھا“ منصوب برائے تاکید ہے۔

دوسرا نسخہ:- ”بذنبہ“ ہے اس میں باء سمیت کے لئے ہے اور ”ذنب“ سے مراد دم یا پھر پھوڑے پھنسیاں ہیں یعنی ایک اونٹ پھنسی کی وجہ سے یا اپنی دم کی بناء پر خارش میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر باقی اونٹ بھی خارش کے مریض بن جاتے ہیں اس صورت میں ”فیحرب“ فعل لازمی اور ”الابل کلھا“ فاعل ہوگا۔

تشریح:- سائل کا سوال یہ ہے کہ آپ تعدی امراض کی نفی فرما رہے ہیں جبکہ مشاہدہ سے اس کا ثبوت معلوم ہوتا ہے، تو کیا یہ ایک سرسری خیال اور جائزہ ہے، یا پھر کیا مطلب ہے؟ اور جواب کا مقصد یہ ہے کہ باقی اونٹوں کی بیماری کو پہلے اونٹ کی ذمہ داری قرار دینا نہیں چاہئے ورنہ پھر پہلے کو کس نے بیمار بنایا؟ بلکہ یہ سب از خود بیمار ہو جاتے ہیں۔

”لاعدوی“ پر تفصیلی بحث پہلے گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۵ ص: ۴۶۷) ”باب ماجاء فی الطیرۃ“ (من ابواب السیر) اور اسی (جلد نمبر ۶: میں ”باب ماجاء فی الاکل مع الحزوم“) میں۔

قولہ ”ولاہامہ“ اس کے متعلق بحث گزری ہے۔ (دیکھئے ابواب الطب جلد ۶ میں ”باب ماجاء ان العین حق والغسل لھا تحت قولہ ولاشی فی الھام“) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربوں میں جو عقیدہ مشہور تھا کہ مقتول کی روح اُلو کی شکل میں قبرستان سے آکر وادیا کرتی ہے کہ میرا بدلہ لیا جائے تو یہ غلط اور من گھڑت ہے۔ اس بارے میں محشی نے بیان کیا ہے کہ عرب بومہ یعنی الو کو منخوس سمجھتے تھے یہ رات کو جس کے گھر کی چھت پر گرتا یا بیٹھتا تو وہ اس کو بُرا شگون اور موت کا اشارہ سمجھتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی بلکہ ابطال فرمایا۔

قولہ ”ولا صفر“ صفر کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک ماہ صفر اور دوم سانپ یا پھنسی۔ اگر مہینہ مراد ہو تو اس نفی کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ عرب ماہ صفر کو منخوس سمجھتے تھے جیسے آج کل بہت سے عوام کا عقیدہ ہے کہ اس میں شادی بیاہ کو منخوس سمجھتے ہیں، نئے گھر میں منتقل ہونا وغیرہ بُرا شگون ٹہراتے ہیں وغیرہ وغیرہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بد اعتقادی کی تردید فرمائی۔ بعض حضرات نے اس کی وجہ تسمیہ میں لکھا ہے کہ صفر کے معنی خالی کے

ہیں چونکہ اشہر الحرم کے بعد لوگ جنگی مہم دوبارہ شروع کرتے اس لئے مرد گھروں سے نکل کر سب گھران سے خالی ہو جاتے۔ واللہ اعلم

بعض کہتے ہیں کہ لوگ نسیا کرتے ہیں یعنی صفر کو محرم میں تبدیل کرتے جس کی نفی آگئی۔

پھر جس طرح صفر کے مہینہ کو منحوس سمجھنا بے بنیاد ہے بعینہ اسی طرح اس کے آخری بدھ کو خوشی اور سیر و تفریح کی تقریبات بھی بے بنیاد ہیں لوگوں نے جو یہ مشہور کیا ہے کہ آخری بدھ کو آپ علیہ السلام نے غسل صحت فرمایا تھا یہ درست نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آخری بدھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع سے رات کو جب تشریف لا کر گھر پہنچے تو سرد در اور بخار شروع ہوا۔ اور مسلسل تیرہ (۱۳) ایام بیماری میں گزرے تا آنکہ بارہ ربیع الاول پیر کے دن اختتام پر منگل کی رات وصال ہوا۔ (۱۲) واللہ وانا الیہ راجعون

چونکہ یہود نے اس دن (بدھ) کو خوشی منائی تھی اسی طرح ایران کے مجوس نے بھی جشن سامنایا تھا پھر وہ روایت ہندوستان آگئی اور سادہ لوح مسلمان نیکی کے نام پر بدی اور خوشی کے نام پر غم کے موقع پر خرافات میں جنس گئے لہذا اس کی حیثیت بھی باقی رسومات کی طرح ایک بے بنیاد روایت پڑی ہے اس سے بچنا چاہئے۔ بعض شارحین کہتے ہیں کہ صفر ایک دانہ پیٹ کے اندر تصور کیا جاتا تھا لوگ اسے عدوی گمان کرتے تھے یا ایک کیڑا یا سانپ تصور کیا جاتا جو ان کے بزم پیٹ کے اندر مفروضے کے تحت بھوک کے وقت کاٹا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں سے ممانعت فرمادی۔ (باب کی روایت صحیح ہے)

باب ماجاء فی الایمان بالقدر خیرہ وشرہ

”عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یؤمن عبد حتی یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیعطئہ وان ما اخطأہ لم یکن لیصیبہ۔“^۱

(غریب)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

باب ماجاء فی الایمان بالقدر خیرہ وشرہ

۱۔ وفی مسند احمد ص: ۳۷۸ ج: ۲ حدیث: ۶۶۶۳ لا یؤمن المرء حتی یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۸۹ ج: ۷ کتاب القدر.

فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ تقدیر اور اس کے خیر و شر پر ایمان نہیں لاتا اور یہاں تک کہ وہ یقین نہ کرے کہ جو کچھ اسے لاحق ہوا وہ چوکنے والا نہ تھا اور جو کچھ چوک گیا وہ اسے پہنچنے والا نہ تھا۔

تشریح:- یعنی ایمان کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ نعمت و راحت یا زحمت و مصیبت خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہو، انفسی ہو یا آفاقی جو چیز ان میں سے جس بندے کے لئے مقدر ہو تو وہ ضرور اس کا سامنا کرے گا اور اگر کوئی چیز مقدر نہیں تو کوئی امکان نہیں کہ اسے ممکن بنایا جائے چہ جائے کہ اسے حاصل کیا جائے۔

دوسری حدیث:- ”عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یؤمن عبد حتی یؤمن برباع یشہد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ بعثنی بالحق، ویؤمن بالموت ویؤمن بالبعث بعد الموت ویؤمن بالقدر“۔^۱

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک چار باتوں پر ایمان نہ لائے (۱) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس نے مجھے سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت پر ایمان لائے۔ (۳) موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لائے۔ (۴) اور تقدیر پر ایمان لائے۔

تشریح:- باب کی دونوں روایتوں میں ”لا یؤمن“ الخ کا ”لا“ نفی کمال کے لئے نہیں بلکہ نفی جنس اور نفی ذات کے لئے ہے یعنی جس آدمی کا یہ عقیدہ نہ ہو وہ سرے سے مؤمن اور مسلمان نہیں۔ قالہ القاری۔ ایمان بالموت سے مراد قیامت کا یقین اور تصدیق کرنا ہے۔

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ما کتب لها

”عن مطربن عکامس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا قضی اللہ لعبدان یموت بارض جعل له الیہا حاجة“۔^۱ (حسن غریب)

۲ رواہ ایضاً ابن ماجہ ص: ۹ ”باب القدر“ مقدمہ و مسلم فی کتاب الایمان۔

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ما کتب لها

۱ وفی مسند احمد عن مطرب بن عکامس قال قال رسول اللہ ﷺ اذا قضی اللہ مئة عبد بار من جعل له الیہا حاجة ص: ۲۹۹ ج: ۲ حدیث: ۲۱۴۷۷۔

حضرت مطرب بن عکامس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ کسی بندے کے بارے میں کسی جگہ موت کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کو وہاں جانے کی ضرورت درپیش فرماتا ہے۔

تشریح:۔ اس باب میں انہی الفاظ سے دوسری روایت بھی ہے جو ابو عروہؓ سے مروی ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جہاں موت مقدر ہو تو اس جگہ کی مٹی انسان کے خیر میں اس وقت شامل کر دی جاتی ہے جب وہ ابتدائی کوتھڑے کی حالت میں ہو پھر عند الموت وہ وہیں چلا جاتا ہے: قال اللہ: ”منہا خلقناکم وفيہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃ۔“ الخ تاہم اس آیت کا دوسرا مطلب بھی ہے کہ مراد نفس ارض اور جنس زمین ہو، اس بارے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کا واقعہ بھی مشہور ہے جو اسراہیلی روایات کا حصہ ہے۔

باب ماجاء لا تردُّ الرُّقى والدواء من قدر الله شيئاً

”عن ابن ابی عزمۃ عن ابیہ ان رجلاً اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: أَرَأیتَ رُقًی نستر قبیھا ودواء نندأوئ بہ وثقلۃ نتقیھا هل تردُّ من قدر اللہ شیئاً؟ قال: ہی من قدر اللہ۔“

ملاحظہ:۔ اس حدیث کا ترجمہ و مطلب اور ضروری تشریح ابواب الطب میں گذری ہے۔ (دیکھئے ماجاء فی الرقی والادویۃ) البتہ یہاں سائل ایک رجل کو قرار دیا ہے جبکہ وہاں ہے ”سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ الخ مگر روایات میں ایسا ہونا کوئی اضطراب نہیں کیونکہ راوی کبھی خود کو غائب بھی فرض کرتا ہے، نیز یہاں لفظ ابن کا اضافہ وہم راوی پر مبنی ہے اصل روایت میں ”عن ابی عزمۃ“ الخ ہے جیسا کہ وہاں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، اور یہ کہ اس حدیث کا مضمون بالا جماع صحیح ہے۔ قالہ ابن العربیؒ فی العارضۃ

باب ماجاء فی القدریة

”عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صنفان من امتي ليس لهما في الاسلام نصيب المرجئة والقدریة“۔ (حسن غریب) ^۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کی دو قسمیں (گروہ یا جماعتیں) ایسی ہیں کہ جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں وہ مرجیہ اور قدریہ ہیں۔

لغات:۔ قولہ ”صنفان“ صنف بکسر الصاد کا تثنیہ ہے، نوع اور قسم کو کہتے ہیں۔ قولہ ”مرجئة“ ارجاء سے ہے بمعنی تاخیر کے اور کبھی ہمزہ کو یا سے بھی تبدیل کیا جاتا ہے جیسے مرجیہ، یہ لوگ کس چیز کی تاخیر کے قائل ہیں؟ تو اس بارے میں متعدد اقوال ہیں، کسی نے کہا کہ یہ عمل کو ایمان سے الگ کرتے ہیں کہ نفس تصدیق کی صورت میں جتنے بھی گناہ کیوں نہ ہوں مگر اس سے عذاب مؤخر یعنی نفی ہوگا، مگر یہاں جو معنی مناسب ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو تقدیر کے آگے بالکل جماد کی مانند مجبور محض اور بے اختیار قرار دیا ہے لہذا وہ احکام باری تعالیٰ کی تاخیر کے قائل ہیں کہ بقول ان کے انسان کی نہ کوئی مرضی چلتی ہے اور نہ ہی اپنا اختیار چلتا ہے بس وہ تقدیر کے آگے بے بس ہے اس لئے ان لوگوں کا دوسرا نام جبریہ بھی مشہور ہوا ہے۔ قولہ ”القدریة“ یہ لوگ تقدیر میں زیادہ بحث کی وجہ سے گویا انکار کے قریب ہو گئے اگرچہ انہوں نے صریح انکار تو نہیں کیا ہے جسے التزام کفر قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے مگر اس کے قریب جانے کی وجہ سے مجازاً ان کو منکرین قدر کہا جاتا ہے، گویا لزوم انکار کو مبالغۃ التزام قرار دیا۔

تشریح:۔ اس حدیث پر محشی ترمذی نے تفصیل سے بحث فرمائی ہے اور مختلف اقوال وضع تضعیف اور مخدوش توثیق کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”ولاشك ان تحسين ت“ (ترمذی) لہ مقدم علی

باب ماجاء فی القدریة

۱۔ وعن ابی سعید قال قال رسول الله ﷺ: صنفان من امتي ليس لهما في الاسلام نصيب، المرجئة والقدریة، ایضاً روی مثله عن لجابر وعن واثلة بن الاسقع قال قال رسول الله ﷺ: صنفان من هذه الامة لاتنالهما شفاعتی، المرجئة والقدریة، راجع للروایات مجمع الزوائد ص: ۳۰۱ ج: ۷ کتاب القدر.

هذه الاشياء مع ما اشار اليه من شواهد عن ذكر من الصحابة انتهى “۔ غرض اس بارے میں علی بن نزار باپ بیٹا دونوں، اسی طرح سلام بن ابی عمرہ کے ضعف کے باوجود روایت درجہ حسن پر فائز ہے۔ کما قالہ الترمذی۔

بیان مذاہب :- انسان کہاں تک با اختیار ہے اور کہاں تک بے بس، اس بارے میں کافی اختلاف ہے، یہ اختلاف جیسے اہل قبلہ کے درمیان ہے اسی طرح اہل قبلہ کا دوسروں سے بھی ہے۔

(۱) ... دہریہ اور مادہ پرستوں کا زعم تو اس بارے میں واضح ہے کہ وہ کسی تقدیر یا خالق و مالک کے قائل نہیں ہیں، پھر ان میں بھی بہت سارے نظریات ہیں کوئی ڈارون وغیرہ کے پیروکار ہیں اور عالم کے وجود کی اپنے طور پر تشریح کرتے ہیں اور انسان کے ارتقائی عمل کے قائل ہیں۔ کوئی اجزائے دیمقرطسیہ کو بنیاد دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ راقم کا اس موضوع پر ایک مستقل کتابچہ بنام ”الصیحة الاولى“ ہے۔

(۲) ... مجوس کہتے ہیں کہ خالق و مالک دو ہیں: ایک خالق خیر جو بھلائی کا خالق ہے جو دوسرا خالق شر جو بُرائی کا، خالق خیر کو یزدان کہتے ہیں اور خالق شر کو ابھر من۔ بذل الحجو د میں اس کی تعبیر ذرا مختلف ہے: ”فان المحسوس قائلون بخالقین وهما النور والظلمة، فخالق الخير النور وخالق الشر الظلمة“۔ چنانچہ اسی وجہ سے ایرانی زمانہ قدیم سے آگ کی عبادت کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ نور ہے اور نفع رساں ہے، یعنی بقول ان کے۔

(۳) ... فرق اسلامیہ میں سے معتزلہ کہتے ہیں انسان اپنے تمام افعال کا خالق ہے، شرح عقائد میں ہے کہ ان کے اوائل انسان پر خالق کے بجائے موجد اور مخترع کا اطلاق کرتے تھے مگر جبائی اور اس کے اتباع کے بعد والوں نے سوچا کہ یہ سب الفاظ ہم معنی ہیں اس لئے انہوں نے صاف طور سے عبد یعنی انسان کو خالق سے تعبیر کیا۔

(۴) ... قدریہ جن کا نظریہ مختصر اوپر لکھا جا چکا ہے ان کے بارے میں دو رائے ہیں: ایک یہ کہ قدریہ معتزلہ کی قسم اور زبلی شاخ ہے۔ دوسری رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ یہ خوارج کی ایک جماعت و گروہ کا نام ہے۔ بہر حال ان کا زعم یہ ہے کہ انسانی افعال دو طرح کے ہیں: ایک اچھے اور دوم بُرے، پس اچھے اعمال کا خالق اللہ ہے اور فحیح کا بندہ خود ہے، تاہم ابوداؤد کی روایت میں ہے: ”القدریة محسوس هذه الامة“۔

تا ہم قدر یہ اوپر کی استثنائی صورت کے علاوہ باقی تمام مخلوقات خواہ وہ شرعی کیوں نہ ہو سب کا خالق اللہ کو مانتے ہیں، بذل الحمد میں ہے:

”والقدرية كذلك فانهم يقولون ان خالق الخير هو الله تعالى وخالق الشر... وجميع المخلوقات من الخير والشر والقبايح مخلوق لله سبحانه وتعالى لا شريك له غير“۔ (ص: ۲۱۰ ج: ۶ کتاب النہ)

(۵)... جبریہ جو جہمیہ کے نام سے مشہور ہیں انسان کو مجبور مانتے ہیں ان کا موقف اوپر لغات کے تحت مرحہ کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

(۶)... اہل السنۃ والجماعت یہ نہ تو انسان کو خالق مانتے ہیں اور نہ ہی مجبور اور جبراد کی طرح تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ حضرات افراط و تفریط کے درمیان درجہ اعتدال کے قائل ہیں کہ بندہ کا سب تو ہے مگر خالق نہیں ہے۔ دلائل:- جو لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں ان کے نظریات کی تشریح، ان کے استدلال اور پھر ان کے جوابات طویل سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اس لئے ان کو یہاں درج کرنا تطویلِ مُمل سے خالی نہیں کہ اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ جہاں تک باقی جماعات کا تعلق ہے تو ان کے آپس میں اختلاف کا دار و مدار دو طرح کے دلائل پر ہے: ایک نقلیہ اور دوم عقلیہ، نقلیہ میں دو قسم کی آیات ہیں، بعض میں افعال کی نسبت اللہ عز و جل کی جانب کی گئی ہے: جیسے ”یضل من یشاء ونہدی من یشاء“ ^۱ جبکہ بعض عبد کی طرف منسوب کی گئی ہیں: مثلاً ”اعملوا ما شئتم“ ^۲ پس ایک فریق نے اول کو حقیقت اور دوسری کو مجاز پر محمول کیا ہے یہ اہل السنۃ والجماعت ہیں، جبکہ معتزلہ و قدریہ نے اس کے برعکس موقف اپنایا ہے۔

یہ مسئلہ شرح عقائد میں تفصیل سے بیان ہوا ہے اس لئے جو حضرات تفصیل کے خواہشمند ہوں وہ وہیں دیکھ لیں، یہاں اختصار کے پیش نظر خلاصہ ادلہ پیش کیا جا رہا ہے۔

معتزلہ کی پہلی دلیل:- یہ ہے کہ اگر سب افعال اللہ عز و جل کی تخلیق ہیں تو پھر انسان مجبور ہو گیا کہ وہ اللہ کی تکوین و تخلیق کے آگے اپنا اختیار تو استعمال کر نہیں کر سکتا ہے، پھر تکلیف کا فائدہ نہ رہا اور ثواب و عقاب کا استحقاق ختم ہوا۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا استدلال جبریہ کے خلاف تو چل سکتا ہے مگر ہمارے خلاف

نہیں کہ ہم باوجود عدم خالقیت عبد کے اس کے اختیار کے قائل ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

دوسری دلیل:- وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ افعال عباد کا خالق ہو تو پھر وہ قائم وقاعد، آکل وشارب وغیرہ بھی ہوگا، علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ یہ تو بڑی جہالت کی بات انہوں نے کی ہے کیونکہ ان افعال سے وہی متصف ہوتا ہے جس کے ساتھ یہ صفات قائم ہوں نہ یہ کہ وہ خالق ہو ”اولا یرون ان اللہ تعالیٰ هو الخالق للسوداء والبیاض وسائر الصفات فی الاجسام ولا یتصف بذلك“ یعنی اگر آپ کی بات صحیح ہوتی تو پھر عبد کے افعال غیر اختیار یہ کے بارے میں کیا کہو گے کیا اللہ کو ان سے موصوف مانو گے؟ والعیاذ باللہ۔ تیسری دلیل:- ”وربما یتمسک بقولہ تعالیٰ: فتبارک اللہ احسن الخالقین،“

واذ تخلق من الطین کھیئة الطیر“^۱ والحواب ان الخلق ههنا بمعنی التقدير۔

یعنی اس قسم کی آیات میں خلق کی نسبت مجازی بمعنی تقدیر واندازے کے ہے۔

قدر یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کے بُرے افعال کا خالق مان لیا جائے تو ان قبائح کی نسبت اللہ کی جانب ہوگی، اور اس سے ملتا جلتا استدلال مجوس کا بھی ہے۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ کسی قبیح فعل کی نسبت کاسب کی طرف ہوتی ہے، خالق کی جانب نہیں کیونکہ خلق تو فیضان الوجود کا نام ہے جو بذات خود حسن ہی حسن ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ خلق اور کسب میں کیا فرق ہے؟ تو یہ آگے آ رہا ہے۔

جبر یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے کوئی چیز تقدیر میں لکھی ہو اور عبد اس کے خلاف پر قادر ہو جائے تو اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کا عاجز ہونا لازم آتا ہے نیز یہ اللہ کے علم ازلی کے بھی منافی ہے اور ارادے کے بھی خلاف ہے وغیرہ وغیرہ، بہت سارے استحالے لازم آئیں گے، چونکہ یہ سب تو الٰہی محال ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ عبد، اللہ کے حکم کے آگے اور تقدیر کے سامنے مجبور ہے۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو آپ کا موقف مشاہدے اور جس کے خلاف ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رعشہ کی حرکت اور پکڑنے کی حرکت میں فرق ہے اول غیر اختیاری ہے جبکہ دوم بدلہ ارادی و اختیاری ہے، ثانیاً پھر تو عبد کی تکلیف بمالایطاق ہوئی جس پر نہ ثواب ملتا ہے اور نہ گناہ۔ نیز یہ موقف لغوی استعمالات اور اصطلاحی محاورات کے بھی خلاف ہے کہ لوگ نماز وغیرہ کی نسبت عبد کی طرف کرتے ہیں اور اسے

حقیقی نسبت گردانتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ صریح نصوص کے بھی خلاف ہے۔

رہی یہ بات کہ عبد، اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تو یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے جبر لازم نہیں آتا کیونکہ اللہ نے اپنا ارادہ اور علم بندے کے ارادے کے ساتھ متعلق کیا ہے جب ازل میں اللہ نے دیکھا کہ فلاں فلاں کام بندہ فلاں فلاں وقت پر کرے گا تو اللہ کو واقعہ کے مطابق معلوم ہونا جبر کو مستلزم نہیں ہوا بلکہ اس سے تو انسانی ارادہ اور بھی پختہ ہوا: ”قلنا یعلمن ویریدان العبد یفعلہ او یتراکہ باختیارہ فلا اشکال“ الخ۔ (راجع للخصیل ان شئت شرح العقائد النسفیة)

اہل السنۃ والجماعۃ یا اشاعرہ و ماتریدیہ کے استدلالات درج ذیل ہیں۔

(۱).... پہلا استدلال:- یہ ہے کہ اگر بندہ کو خالق مانا جائے جیسا کہ معتزلہ و قدریہ مانتے ہیں تو پھر تو یہ عقیدہ مجوس سے بھی زیادہ جاہلانہ ہوگا کہ وہ دو خداؤں کے قائل ہیں اور اسلامین زیادہ کے معتقد ہوں گے۔

(۲).... دوسرا استدلال:- یہ ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کی تفصیل سے آگاہی لازمی ہے جبکہ مثلاً کراچی سے لاہور تک پیدل چلنے والے کو اپنے قدموں کی تعداد اور عضلات کی حرکات تک کا پتہ نہیں ہوتا پھر یہ کیسی خلقت ہوئی؟

(۳).... تیسرا استدلال:- اس بارے میں نصوص صاف بتا رہی ہیں کہ بندہ کے افعال کا خالق بھی خدائے ذوالجلال ہے: مثلاً ”واللہ خلقکم و ماتعملون“ کے بغیر ہا۔

اس کے برعکس اگر بندے کو مجبور اور بالکل بے اختیار مانا جائے تو تکلیف بمالایطاق لازم آتی ہے، اس لئے بیچ کا درجہ ماننا پڑے گا کہ عبد کا سب تو ہے مگر خالق نہیں یعنی جب وہ اپنا ارادہ کسی فعل سے متعلق کرتا ہے تو اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے فیضان وجود ہوتا ہے، اور چونکہ ایسے میں عبد اپنے آپ کو قادر سمجھتا ہے اور تکلیف کے لئے اتنی سی قدرت بھی کافی ہے اس لئے کوئی استحالہ خالقیت کا یا جبر کا لازم نہیں آتا، غرض تعلق ارادہ کسب ہے جبکہ وجود دینا خلق۔ خلق اور کسب کے درمیان مزید وجوہ فرق کے لئے شرح عقائد دیکھئے۔

حضرت تھانویؒ بواہر النوار میں فرماتے ہیں کہ افعال اختیار یہ میں انسان کا یہ اعتقاد کہ اگر چاہوں تو کر لوں گا اور نہ چاہوں تو نہیں ہوگا، ایسا اختیار ہے جو دلیل کا محتاج نہیں بلکہ بدیہی ہے اور یہی فعل کے صدور کی

علت قریبہ ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس اختیار کی صفت بھی اور اس صفت کا فعل کے ساتھ تعلق بھی دونوں مخلوق ہیں حق تعالیٰ کے، اس طرح سے کہ تخلیق حق کے بعد ان کا عدم وقوع، قدرتِ عبد سے خارج ہے اور یہ تخلیق علت بعیدہ ہے صدورِ افعال اختیاریہ کی، جس شخص نے افعال مذکورہ کی صرف علت قریبہ پر نظر کی وہ قدری ہو گیا اور جس نے صرف علت بعیدہ پر نظر کی وہ جبری ہو گیا اور جس نے دونوں پر نظر کی وہ کہہ کر کہ ”لاجب“ رای محضاً ولا قنلر ای محضاً ولكن الامرین بین“ سنی ہو گیا۔ (ص: ۹۲، ادارۃ اسلامیات لاہور)

ارادے کے متعلق مائتد یہ اور اشاعرہ کے درمیان بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ (راجع للخصیل کتب العقائد من شرح العقائد و شرح المواقف وغیرھا) شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ارادے کا سبب خیالات ہیں اور خیالات کے کم از کم پانچ اسباب ہیں۔ (راجع للخصیل حجتہ اللہ البالغہ، باب فی اسباب الخواطر الباعثۃ علی الاعمال)

اشکال:- اگر معتزلہ و قدریہ خالقیتِ عبد کے قائل ہیں تو پھر تو وہ مشرک ہوئے حالانکہ ان پر اسلاف نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا ہے ایسا کیوں ہوا؟

جواب:- اس کا جواب شرح عقائد میں دیا ہے کہ شرک یہ ہے کہ کسی کو اللہ کے ساتھ الوہیت بمعنی وجوب الوجود یا استحقاق العبادت میں شریک مانا جائے جبکہ معتزلہ وغیرہ اس کے قائل نہیں بلکہ وہ بندے کی خالقیت کو بھی اللہ کی خالقیت کی طرح نہیں مانتے ہیں کیونکہ وہ بندے کو اسباب و آلات کا محتاج تسلیم کرتے ہیں۔ (ص: ۶۱)

علیٰ ہذا حدیث الباب میں ”لیس لہما فی الاسلام نصیب“ تغلیظ پر محمول ہے، یہی جمہور اور محققین کا مذہب ہے۔

باب

”عن مُطَرِّف بن عبد اللہ بن الشَّحَير عن ابيه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مُثَّل ابن ادم والی جنبہ تسعة وتسعون منیة ان اخطأ ته المنايا وقع فی الہرم حتی یموت“۔^۱ (حسن غریب)

باب (بلا ترجمہ)

۱۔ ایضاً رواہ الترمذی فی القیامۃ باب: ۲۲۔

حضرت مطرف اپنے والد عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آدم زاد کو بنایا (یعنی پیدا کیا) جاتا ہے دریاں حالیکہ اس کے پہلو میں (ارد گرد) ننانوے مہلکات ہوتے ہیں اگر یہ سب چوک جائیں تو بالآخر وہ بڑھاپے میں پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ مر جاتا ہے۔

لغات:- قولہ ”مطرف“ بضم المیم وتشدید الراء المکسورة بصيغة اسم فاعل۔ قولہ ”الشخیر“ بکسر الشین وکسر الحاء المشددة وسکون الیاء، حضرت عبداللہ بن الشخیر عامری ”یَعُدُّ فِي الْبَصَرِ بْنِ وَفِدَالِي النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَنِي عَامِرٍ“۔ قولہ ”مُثَلِّ“ بضم المیم وکسر التاء بصيغة مجهول ای صُورَ وَخُلِقَ، ابن ادم اس کا نائب فاعل ہے۔ قولہ ”منية“ بفتح المیم، ہلاکت خیر مصیبت اور بلا کو کہتے ہیں جو موت کا سبب قوی ہو اس لئے اس کا اطلاق عین موت پر بھی کیا جاتا ہے۔ قولہ ”الهرم“ بروزن مُرشدید بڑھاپے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- ننانوے کا عدد تکثیر کے لئے ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی صورت میں موت سے بچ نہیں سکتا کیونکہ پیدا ہوتے ہی وہ امراض و آفات کی لپیٹ میں آ جاتا ہے خواہ وہ بچنے کی جتنی بھی تدابیر کرے مگر وہ بچ نہیں سکتا اس لئے عام لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی بیماریوں یا حادثوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں مگر بالفرض اور شاذ و نادر جو بچ جاتے ہیں تو انہی (۸۰) سو (۱۰۰) سال کے بعد وہ شدید بڑھاپے کی آغوش میں خود بخود خوائی و ناخوائی چلے جاتے ہیں اور یہی ان کا آخری مرحلہ ہوتا ہے اس کے بعد کوئی امکان بچنے کا نہیں رہتا کما ہوا الشاهد کسی نے خوب کہا ہے۔ ”لِنُتَوِ السُّمُوتِ“ دنیا میں آنا ہی جانے کا پیغام و پیش خیمہ بلکہ مستلزم للذہاب ہے۔

باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء

”عن سعد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سعادة ابن آدم رضاه بما قضى الله له ومن شقاوة ابن آدم تركه استخارة الله ومن شقاوة ابن آدم سخطه بما قضى الله له“۔^۱ (غریب)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: کہ آدمی کی نیک بختی میں سے ہے اس کا راضی ہونا اللہ کے فیصلہ پر جو اس کے حق میں کیا ہے اور آدمی کی بد بختی میں سے ہے اللہ سے خیر نہ مانگنا اور آدمی کی اس کے بارے میں اللہ کے فیصلہ پر ناراضگی، بد بختی میں سے ہے۔

تشریح:۔ حدیث میں دو امرین کا ذکر ہے: ایک اللہ کے فیصلہ پر راضی ہونا اور دوم راضی نہ ہونا ان کے درمیان بطور جملہ معترضہ طلب خیر چھوڑنے کو بھی بد بختی کی علامت قرار دیا ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ کوئی راضی ہونے کا مطلب یہ نہ لے کر بیٹھے کہ ہوگا تو ویسے بھی وہی جو میرے رب نے لکھا ہے پھر طلب و محنت کی کیا ضرورت ہے چونکہ سابقہ ابواب میں بارہا گذرا ہے کہ تقدیر کے ساتھ ساتھ عمل بھی لازمی ہے اس لئے ترک عمل کو بد بختی قرار دیا۔ رضاء بالقضاء میں ایک حکمت وفائدہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ راضی ہونے والا اپنی عبدیت کا بزبان قال و حال اقرار کرتا ہے جبکہ ناراض ہونے والا گویا شرکت کا دعویدار ہے کہ میرا حصہ مجھے کیوں نہیں دیا وغیرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ جب تقدیر پر راضی ہوگا تو اسے ہر حالت میں اطمینان قلبی اور سکون نصیب ہوگا تو وہ اپنی عبادت و جمعی کے ساتھ کر سکے گا۔

اعتراض:۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف رضاء بالقضاء واجب ہے جیسا کہ عقائد کی کتب میں ہے، دوسری طرف کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کفر مقضیٰ ہے جبکہ رضاء قضاء پر واجب ہے مقضیٰ پر نہیں۔

شرح عقائد میں ہے:

”لا يقال لو كان الكفر بقضاء الله تعالى لوجب الرضاء به لان الرضاء بالقضاء

واجب والالزام باطل، لان الرضاء بالكفر كفر، لانا نقول: الكفر مقضی لا قضاء

والرضاء انما يجب بالقضاء دون المقضی“۔ (ص: ۶۲)

تاہم اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی ملحوظ ہو کہ اگرچہ قضا اللہ کی صفت ہے اور کفر بندے کا وصف اور فعل ہے مگر رضاء بالکفر کی صورت میں اللہ کی صفت پر رضا تو مرا نہیں ہو سکتی اس لئے بعض محققین نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ رضاء بالکفر من حیث انہ کفر یعنی من حیث ذات الکفر، کفر ہے اور من حیث انہ مقضیٰ بہ کفر نہیں بلکہ رضا بالقضاء ہے۔ تدبر فائدہ دقیق و بالحفظ یلیق

باب

”نافع ان ابن عمر جاءه رجل فقال: ان فلاناً يقرأ عليك السلام فقال: انه بلغني انه قد احدث فان كان قد احدث فلا تقره مني السلام فاني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: يكون في هذه الامة اوفى امتي الشك منه حسف او مسخ او قذف في اهل القدر“۔
(حسن صحيح)

حضرت نافع نے بیان کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آ کر کہنے لگا کہ فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے، تو انہوں نے فرمایا (یعنی ابن عمرؓ نے) کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ اس نے دین میں بدعت نکالی ہے تو اگر واقعی اس نے کوئی نئی بات نکالی ہو تو میری طرف سے اس کو سلام نہ کہنا (یعنی جواب سلام مت پہنچاؤ کہ میں اس کا سلام نہیں لیتا) کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس امت میں یا فرمایا کہ میری امت میں (راوی کو شک ہے) دھنسا ہو گا یا چروں کا بگڑنا ہو گا یا سنگ باری ہو گی، یہ اہل قدر میں ہو گی۔

لغات:- قوله ”في هذه الامة اوفى امتي“ یہاں پر لفظ ”او“ شك من الراوی کے لئے ہے جیسا کہ اس کے بعد تصریح ہے شك کی، کہ آیا نبی علیہ السلام نے ”في هذه الامة“ فرمایا یا ”في امتي“۔ قوله ”حسف او مسخ او قذف“ اس مقام پر ”او“ میں دونوں احتمال ہیں: شك کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور تنویع کے لئے بھی۔ حسف زمین میں دھنسنے کو کہتے ہیں اور مسخ شکل بگڑنے کو جیسے بندر یا خنزیر وغیرہ کی شکل اختیار کرنا اور قذف پتھر برسنے کو کہتے ہیں۔ قوله ”في اهل القدر“ فی امتی سے بدل بعض باعادة الجار ہے۔

تشریح:- یہ آدمی جو تقدیر کے متعلق نئی باتیں کرتا تھا کوئی منکر تقدیر نہ تھا مگر چونکہ اپنی عقل سے بحث کرتا تھا جو ممنوع ہے اس لئے یہ بدعت کا مرتکب ہوا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بدعتی کو سلام کرنا جائز نہیں ہے اور چونکہ جواب دینا فرض ہے تو باوجود اس کے جب جواب نہ دینا چاہئے تو سلام کرنا بطریق اولیٰ نہ چاہئے کیونکہ ابتداء بالسلام سنت ہے واجب یا فرض نہیں ہے۔ (المسک الذکی)

باب (بلا ترجمہ)

۱۔ روی بمعناه ابو داؤد کذا فی مشکوٰۃ المصابیح ص: ۲۲ ”باب الايمان“ ايضاً رواه احمد بحواله مجمع الزوائد ص: ۲۹۶ ج: ۷۔

ابن قیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کے سلام کا جواب علی الاصح واجب ہے جبکہ مبتدع کا ممنوع ہے:

”و اختلف فی الرد علیہم (ای علی الیہود والنصارى) والصواب وجوبہ والفرق بینہم وبين اهل البدع انما أمورون بهجرهم“ (ای المبتدعة)۔

(مختصر زاد المعاد ص: ۱۰۹، فصل فی ہدیۃ علیہ الصلوٰۃ والسلام فی السلام علی اہل الکتاب)

سوال:- اس حدیث میں اہل قدر یعنی تقدیر میں بے جا بحث کرنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان پر حنف وغیرہ کا عذاب آئے گا جبکہ دوسری روایات سے ثابت ہے کہ آنحضور علیہ السلام کی امت پر اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا، پس یہ تو بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے؟

جواب:- اس کے متعدد جوابات ہیں: ایک یہ کہ ممنوع عام عذاب ہے جبکہ یہاں خاص فرقے کی بات کی گئی ہے۔

دوسرا جواب:- دوسرا جواب یہ ہے کہ جب تک امت مرحومہ کے لوگ بحالت اتباع شریعت رہیں گے تو وہ بحفاظت ہوں گے مگر جب وہ بگڑ جائیں گے تو پھر ان کے چہرے بھی بگڑ سکتے ہیں کہ باطن کا اثر ظاہر پر رونما ہوتا ہے۔

باب کی دوسری حدیث:- حضرت عبدالواحد بن سلیم فرماتے ہیں کہ میں مکہ آیا تو عطاء بن ابی رباح سے میری ملاقات ہوئی، میں نے ان سے کہا اے اباجمہ! اہل بصرہ تقدیر کے بارے میں بحث کرتے ہیں (یعنی عقلی انداز سے) تو حضرت عطاء نے فرمایا اے میرے بیٹے! کیا تم قرآن پڑھتے ہو (یعنی حافظ ہو یا مطلب تلاوت کرتے ہو؟) میں نے عرض کیا ”ہاں“ آپ نے فرمایا تو پھر ”زخرف“ پڑھو، کہتے ہیں میں نے ”حسم والکتاب المبین انا جعلناہ قرآنًا عربیًا لعلکم تعقلون وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم“ ۱؎ تک پڑھا، عطاء نے فرمایا تم جانتے ہو کہ ”ام الکتاب“ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ”اللہ ورسولہ اعلم“، انہوں نے فرمایا بے شک یہ ایک کتاب ہے جس کو اللہ نے آسمان کے پیدا کرنے سے پہلے اور زمین کے پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھا ہے، اس میں ہے: ”ان فرعون من اهل النار“ اور اس میں ہے: ”نبت یدایہی لہب وتب“ ۲؎ حضرت عطاء نے فرمایا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت ولید بن عبادہ سے میری

ملاقات ہوئی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے والد نے وفات کے وقت آپ کو کیا وصیت کی تھی؟ ولید نے کہا کہ انہوں نے مجھے بُرا کر فرمایا اے بیٹے! اللہ سے ڈرتے رہنا اور یقین جانو (حاشیہ کے نسخے کے مطابق) کہ تم اس وقت تک اللہ سے ڈرنے والا نہیں بنو گے جب تک اللہ پر ایمان نہ لائے اور ساری تقدیر پر، اس میں خیر و شر پر ایمان نہیں لاتا، پس اگر تم اس کے علاوہ دوسرے عقیدے پر مرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے، بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، پھر اس سے فرمایا: لکھو، قلم نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ تقدیر لکھو جو ہوا اور جو کچھ ہمیشہ یعنی قیامت تک ہونے والا ہے۔ (حدیث غریب)

تشریح:- اس حدیث میں جو آیت سورہ زخرف کی آئی ہے اس میں ”ام الکتاب“ سے مراد لوح محفوظ ہے اور آخر حدیث میں قلم کا ذکر آیا ہے، لہذا مطلب یہ ہوا کہ قلم نے جو کچھ لکھا ہے وہ لوح محفوظ پر منقش اور مکتوب ہے، تاہم لفظ ”ماکان وما هو کائن الی الابد“ سے مراد اگلی پچھلی سب کائنات یا سب معلومات و مقدمات وغیرہ نہیں کیونکہ ماکان بھی لامتناہی ہیں کہ اللہ کی صفات اور معلومات ازل میں بھی لامتناہی تھیں اور ماہو کائن الی الابد بھی غیر متناہی ہیں جبکہ لوح محفوظ متناہی ہے، اس لئے ماکان سے مراد آنحضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے پہلے کا زمانہ مراد ہے اور ماہو کائن سے اس کے بعد آنے والا زمانہ تا قیام قیامت، کیونکہ ابد بمعنی مدت طویلہ بھی آتا ہے جو یہاں مراد ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ماکان سے مراد قلم سے پہلے کی مخلوقات ہیں جیسے عرش و کرسی وغیرہ علیٰ هذا ”اول ما خلق الله القلم“^۱ سے مراد قبلیت اضافی ہوگی یعنی اس محسوس عالم سے قبل۔

چونکہ اس بارے میں بہت سی روایات میں اول کا لفظ وارد ہوا ہے اس لئے کسی چیز کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہی حتماً مقدم ہے۔

باب کی روایت سے قلم کی اولیت ثابت ہوتی ہے جبکہ مسلم^۵ کی روایت سے عرش اور پانی کی تقدیم

۱۔ رواہ رزین کذا فی جمع الفوائد ص: ۴۷۷ ج: ۲ ”کتاب بدء الخلق و عجائبہ“ حدیث: ۹۱۷۳، ایضاً رواہ ابویعلیٰ و رجالہ ثقات بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۷۹ ج: ۷ کتاب القدر۔

۵۔ رواہ البخاری ص: ۴۵۳ ج: ۱ کتاب بدء الخلق، ایضاً رواہ الترمذی فی کتاب التفسیر، جمع الفوائد ص: ۴۷۷ ج: ۲، صحیح مسلم ص: ۳۳۵ ج: ۲۔

ثابت ہوتی ہے تاہم پانی میں تو یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد خلاء ہے کیونکہ خلاء کو دیکھتے وقت پانی محسوس ہوتا ہے۔ بعض روایات سے آنحضور علیہ السلام کی روح کی اولیت معلوم ہوتی ہے۔^۶

ان روایات میں تطبیق اسی طرح ممکن ہے کہ اولیت سے مراد اضافی لی جائے چونکہ ہر چیز بالنسبۃ الی المتأخر اول و مقدم کہلاتی ہے اس لئے سب روایات بیک وقت باہم موافق ہیں کہ بعض سب سے پہلے ہیں اور بعض سموات والارض پر مقدم ہیں۔

ملحوظ:۔ ترمذی کے بعض نسخوں میں یہاں اس حدیث سے پہلے ایک اور حدیث کا اضافہ ہے جیسے متن عارضہ اور متن تحفہ دونوں پر موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے:

”عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سِتَّةٌ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَكَلَّ نَبِيٌّ بِحَبَابٍ، الزَّائِدِيُّ كِتَابُ اللَّهِ، وَالْمَكْذِبُ بِقَدْرِ اللَّهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبْرُوتِ يُعْزَّ بِذَلِكَ مِنَ اللَّهِ وَيَذَلُّ مِنْ أَعَزِّهِ اللَّهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللَّهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عَتَرَتِي مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي“۔^۷

تاہم مشکوٰۃ میں اس روایت کے بعد لکھا ہے: ”رواہ البیہقی فی المدخل وریزین فی کتابہ“۔ اس میں ترمذی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔

حدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ:۔ ”یقول سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقول: قدر الله المقادير قبل ان يخلق السموات والارضين بخمسين الف سنة“۔^۸ (حسن صحیح غریب)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے تقادیر کو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مقرر (مختص) فرمایا۔

۶ اور ریزین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے عمل کو بنایا گیا، عن ابن مسعود رفعہ اول ما خلق الله العقل الخ جمع الفوائد ص: ۴۷ ج: ۲۔

۷ رواہ ایضاً الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۲۸۸۳ وصححہ ابن حبان بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۷ حدیث: ۱۱۸۷۶۔ ۸ ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ص: ۳۵۸ ج: ۲ حدیث: ۶۵۴۳۔

لغات:- قولہ ”المقادیر“ مقدار کی جمع ہے، پیمانے کو بھی کہتے ہیں خواہ وہ کسی بھی چیز کی پیمائش کا ہو اور قدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔

تشریح:- پچاس ہزار سال کا عدد کثیر بلکہ لاتناہی کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور محدود وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے ہاں اگرچہ اس وقت شب و روز کا وجود نہ تھا کیونکہ یہ تو زمین کی سورج کے گرد محوری حرکت سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھی صرف اٹھارہ فرسخ یعنی تقریباً چوں میل کی بلندی تک ہیں، اس سے اوپر کوئی دن رات کا فرق نہیں مگر یقیناً ازل میں اور دنیا کے خاتمے کے بعد بھی کوئی نہ کوئی اندازہ تو ہوگا اگرچہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے مگر اللہ عز و جل کے لئے تو کوئی مشکل نہیں۔

متعدد روایات میں تطبیق:- یہاں بظاہر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بعض روایات سے مذکورہ عدد کے علاوہ بھی تقدیر کا لکھنا ثابت ہے مثلاً حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے جس مناظرے کا ذکر ترمذی میں گزرا ہے اس کے مسلم شریف والے طریق میں ہے: ”فَبِکُمْ وَجَدَتِ اللّٰهُ کَتَبَ التَّوْرَةَ قَبْلَ اَنْ اَخْلَقَ قَالِ مُوسٰی بَارِعِیْنِ عَامًا“۔ (مشکوٰۃ ص: ۱۹: ۹)

حل:- اس کا حل یہ ہے کہ اللہ عز و جل کو اگرچہ کسی چیز کے لکھنے کی ہرگز ضرورت نہیں مگر اللہ عز و جل کا ہر کام ضابطے کے مطابق ہوتا ہے، ایسے امور میں کیا کیا حکمتیں ہو سکتی ہیں ہماری عقل ان تک رسائی سے قاصر ہے، تاہم اپنی قدرت قاہرہ اور حکمت باہرہ کے اظہار کے لئے اور فرشتوں کو نظام چلانے میں سہولت دینے کے لئے تقدیر کا نظام مرتب فرمایا جیسے قیامت کے دن وزن اعمال میں لوگوں کے سامنے ان کے اچھے بُرے عمل میں تمیز کی خاطر اور یہ کہ اللہ عادل بادشاہ ہے اظہار کے لئے میزان قائم کر دی ہے، علیٰ ہذا کہا جائے گا کہ تقدیر ایک ازلی ہے، پھر آسمانوں اور زمینوں سے پہلے زمینوں اور آسمانوں و مافیہا کے احوال دوبارہ الگ سے لکھ دیئے ہیں، پھر جب بچہ ماں کے پیٹ میں سانس لینے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی سے متعلق تقدیر مرتب کی جاتی ہے اور ہر سال کے لئے جو فیصلے ہوتے ہیں وہ بھی تحریر کئے جاتے ہیں، اور انسان کی روزانہ کی کارروائی بھی لکھی جاتی ہے، گویا ایک کلی نظام کی تقدیر کے بعد مختلف فائلیں تیار کی جاتی ہیں جو خاص درعام کے زمرے میں آتی ہیں، جیسے جنس کے اندر انواع اور انواع کے ضمن میں افراد ہوتے ہیں۔ تدبر و تشکر

”عن ابی ہریرۃ قال جاء مشرکوا قریش الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یخاصمون

فی القدر فنزلت هذه الآية: "يوم يُسحبون فی النار علی وجوههم ذوقوا مس سقرانا کل شی خلقناه بقدر"۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ قریش کے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر تقدیر کے بارے میں بحث کرنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ترجمہ) جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں کے بل جہنم میں گھسیٹے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا کہ) (دوزخ کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو، ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا ہے۔ (قرآنیت نمبر: ۴۸، ۴۹)

تشریح:- اس آیت کریمہ میں "بقدر" سے یہی تقدیر مراد ہے جس کے لئے امام ترمذی نے اتنی ساری احادیث ذکر فرمائی ہیں، اگرچہ علامہ باجی مالکی نے اس تفسیر میں کچھ اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے مگر وہ قابل التفات نہیں لہذا کہا جائے گا کہ قرآن و سنت دونوں اثبات تقدیر پر صریح ہیں، اس لئے عقیدہ تقدیر ایمان کا حصہ ہے، تاہم جو لوگ اس میں بحث کرتے ہیں ان کو احتیاطاً کافر نہیں کہنا چاہئے جیسا کہ سابقہ اوراق میں گذرا ہے۔



ابواب الفتن

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

قوله ”الفتن“ فتنہ کی جمع ہے جس کے تقریباً درجن بھر معنی آتے ہیں، اصل لغت میں سونے، چاندی یا دیگر معدنیات کو جانچنے کے لئے آگ پر تپانے اور پگھلانے کو کہتے ہیں، دیگر معانی یہ ہیں: آزمائش، گمراہی، فساد و ہنگامہ، فریفتگی و گرویدگی، دیوانگی، جنگ و جدال، پریشانی و مصیبت اور عذاب وغیرہ۔ یہاں مراد وہ امور ہیں جن کی وجہ سے آدمی کے ایمان کا امتحان ہو جاتا ہے کیونکہ نامساعد حالات میں کھرے مؤمن اور کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، تاہم توسعاً اس کا اطلاق ہر ناپسندیدہ شے پر بھی ہوتا ہے، لہذا یہاں دونوں قسم کے واقعات اور آنے والے حالات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

باب ماجاء لايحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث

”عن ابی امامہ بن سہل بن حنیف ان عثمان بن عفان اشرف يوم الدار فقال: انشدكم بالله اتعلمون ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث، زنى بعد احصان او ارتداد بعد اسلام او قتل نفس بغير حق فقتل به؟ فوالله ما زني في جاهلية ولا في اسلام ولا ارتددت منذ بايعت رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا قتلت النفس التي حرم الله اقيم تفتلون“۔ (حسن) ۱

حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے گھر کے محاصرے والے دن اوپر سے جھانک کر فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں

ابواب الفتن

باب ماجاء لايحل دم امرئ مسلم الخ

۱۔ رواہ ایضاً نسائی، ابن ماجہ و حاکم بحوالہ سنن دارمی ص: ۲۲۵ ج: ۲، مستدرک احمد ص: ۹۹ ج: ۱ حدیث: ۳۳۹

و ۳۵۳ و ۳۷۰ و ۱۳۰۵

معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کا خون کرنا سوائے تین صورتوں کے جائز نہیں؟ (۱) احسان کے بعد زنا کرنا۔ (۲) اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہونا۔ (۳) یا ناجائز طریقے سے کسی کو قتل کرنا، جس کے بدلے میں اسے قتل (قصاص) کیا جائے گا، پس بخدا میں نے نہ تو جاہلیت میں کبھی زنا کیا ہے اور نہ ہی اسلام میں اور جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے تب سے میں کبھی مرتد بھی نہیں ہوا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا ہے جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہو، تو پھر تم لوگ مجھے کس بناء پر قتل کرنا چاہتے ہو؟؟؟

لغات:- قولہ ”اشرف“ شین، راء اور فاء میں بلندی کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی وہ گھر کے اوپر دریا یا دیوار سے جھانک کر بولے۔ قولہ ”یوم الدار“ گھر کے محاصرے کے دوران جس کا پس منظر تشریح میں آ رہا ہے۔ قولہ ”انشدکم“ ای اقسامکم، میں تمہیں قسم دیتا ہوں۔ قولہ ”اتعلمون“ ہمزہ استفہام برائے تقریر ہے یعنی قد تعلمون، تم تو جانتے ہی ہو۔ قولہ ”احصان“ حفاظت کی تدبیر اور مضبوط و مستحکم بنانے کو کہتے ہیں، اصطلاح میں بھینس کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے، آزاد یعنی خرپر، پاک دامن اور شادی شدہ پر، یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔ قولہ ”فبم تقتلون“ بفتح یاء النون کیونکہ بعض طرق میں دونوں کے ساتھ آیا ہے فبم تقتلون یعنی ”جبکہ امرء کی راء کی حرکت ہمیشہ مابعد حرف یعنی ہمزہ کی تابع رہتی ہے۔“

تشریح:- ابوامامہ بن سہل بن حنیف (بالتصغیر) صحابی ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ثابت نہیں۔

اس واقعے کا مختصر پس منظر جو ابن خلدون نے (جلد اول کے باب اٹھارہ) میں تفصیل سے لکھا ہے: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن (سودا) سبا یہودی امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بطمع مال و زر (بلکہ بیت فساد) ایمان ظاہر کر کے اہل بیت کی محبت کی آڑ میں لوگوں کو امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے خلاف اُکساتا، اور ان کے خلاف بہتان تراشتا، اس نے بصرہ، کوفہ اور بالآخر مصر میں ان خیالات کا بھرپور انداز اور شاطرانہ طریقے سے پرچار کیا، بہت سے لوگ اس کے خیالات کی جانب مائل ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف خیالات جنم لینے لگے، ان کے الزامات میں سے مثنیٰ میں چار رکعات نماز پڑھنا، مصاحف کو جلانا، اپنے امراء اور عاملوں سے نرمی کا برتاؤ کرنا وغیرہ شامل تھے مگر سب سے زیادہ پروپیگنڈہ اقرہ پروری کا کامیاب ہوا اور بصرہ و کوفہ اور مصر سے ایک ایک ہزار کا لشکر آ کر مدینہ منورہ کا گھیراؤ اور

خصوصاً حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر بیٹھا۔ حضرت علی اور محمد بن مسلمہ نے ان بلوایان مصر وغیرہ کو نشیب و فراز سمجھا کر واپس لوٹایا مگر راستہ میں مروان کا ایک جعلی خط ان کے ہاتھ لگا جس نے جلتی پرتیل کا کام کیا اور بلوایان مصر واپس مدینہ آ کر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ بنے۔

حضرت تھانویؒ نے المسک الزکی میں بحوالہ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ لکھا ہے کہ مروان حضرت عثمانؓ کی خدمت میں رہتے تھے، آپؓ کی مہر وغیرہ ان کے پاس رہتی تھی، اس نے حاکم مصر کو ایک خط لکھا اور اس پر حضرت عثمانؓ کی مہر لگادی، اور یہ خط غلام کو دے کر مصر روانہ کر دیا، وہ غلام راستہ میں گرفتار ہوا اور خط برآمد ہوا، چنانچہ تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ جب بلوایان مصر دوبارہ مدینہ کی طرف لوٹے تو محمد بن مسلمہ نے واپسی کا سبب پوچھا، فتنہ پردازوں نے وہ خط دکھایا (جو مروان نے جعلی طریقے سے از طرف امیر المؤمنین لکھا تھا) اس خط میں بعض لوگوں کے نام متعین کر کے لکھا تھا کہ ان کو قید اور سزا اور داڑھیاں مونڈنے کی سزا دی جائے اور بعض کو سولی دیئے کو لکھا تھا۔

جب خط کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے آیا تو انہوں نے قسم کھا کر اس سے لاعلمی کا اظہار کیا، محمد بن مسلمہ نے تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بے شک یہ کام مروان کا ہے، بہر حال اس واقعے پر بلوایان مصر مشتعل ہو کر واپس مدینہ آئے تھے اور ان کے ساتھ بلوایان بصرہ و کوفہ بھی آئے تھے۔ باب کی حدیث میں اسی محاصرہ ثانیہ کا بیان ہے، ان لوگوں کا مطالبہ حضرت عثمانؓ کی معزولی کا تھا اور دلیل یہ پیش کی کہ آپ کا غلام آپ کی مہر شدہ خط لے کر جائے اور آپ کو اس کا پتہ بھی نہیں اس لئے آپ خلافت کے حق دار نہیں، آپ معزول ہو جائیں، ان کو تو بہانہ درکار تھا۔

المسک الذکی میں ہے کہ جس روز حضرت سیدنا عثمانؓ شہید ہوئے ہیں اس روز آپ کا روزہ تھا اور اس دن کی رات میں آپ نے حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عثمان! تمہارا کیا حال ہے؟ آپ نے عرض کیا کہ آپ کی امت میری خون ریزی کے درپے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرے پاس آ کر روزہ افطار کرو گے یا دنیا میں؟ عرض کیا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر روزہ افطار کروں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم آج میرے پاس آ جاؤ گے، پھر آپؐ بیدار ہوئے اور فرمایا کہ آج میں شہید ہوں گا، چنانچہ اسی روز آپؐ شہید ہو گئے، جب آپؐ شہید ہو رہے تھے

تو آپؐ ثلاث فرما رہے تھے اور خون کا قطرہ اس آیت پر اُڑکا: ”فسبکفیکہم اللہ وهو السميع العليم“ ^۱ اور یہی آیت آپؐ کی زبان پر بھی تھی۔ (بحوالہ تاریخ الخلفاء للسیوطی ^۲ وحاشیہ ابن خلدون مترجم) کہتے ہیں کہ زمانہ جنگ عظیم میں یہ مصحف جسے امام کہتے ہیں لندن کے میوزیم میں پہنچ گیا ہے۔ واللہ اعلم

سوال:- حضرت عثمانؓ نے جو مرفوع حدیث بیان فرمائی ہے اس میں صرف تین آدمیوں کے قتل کا جواز معلوم ہوتا ہے جبکہ بعض دیگر روایات سے ان کے علاوہ بھی بعض لوگ مباح الدم قرار دیئے گئے ہیں مثلاً کوئی شخص حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع جائز ہے اگرچہ اس دفاع میں صائل یعنی حملہ آور کی جان چلی جائے، ہاں دفاع کم از کم حد تک ہونا چاہئے جس سے صرف جان بچانا ملحوظ ہو، اس کے علاوہ بھی بعض صورتیں جواز کی ہیں۔

جواب:- جن روایات سے اباحت قتل معلوم ہوتی ہے تو وہ یا ان صورتوں میں ہے جو تعزیر اور قتل سیارہ پر محمول ہیں یا تغلیظ ہیں یا مرتد کے حکم میں ہیں جیسے باغی، یا مدافعتاً ہیں نہ کہ تعمد قتل، اور یا ان میں لفظ قتال آیا ہے جس سے مراد لڑنا ہے نہ کہ مارنا۔ یہ مسئلہ پہلے گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۳۱۳ ج: ۵ ابواب الدیات ”باب ما جاء لا تحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث“)

باب ما جاء فی تحریم الدماء والاموال

عن سليمان بن عمرو بن الاحوص عن ابيه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: في حجة الوداع للناس ائى يوم هذا؟ قالوا: يوم الحج الاكبر، قال فان دماءكم واموالكم واعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا في بلدكم هذا الا لا يحنى جان الا على نفسه الا لا يحنى جان على ولده ولا مولود على والده الا وان الشيطان قد ايس ان يعبد في بلادكم هذه ابداً ولكن مستكون له طاعة فيما تحقرون من اعمالكم فسيرضى به“۔ (حسن صحيح)

حضرت سلیمان بن عمروؓ اپنے والد حضرت عمرو بن الاحوص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ لوگوں سے فرما رہے تھے: آج کو نسا دن ہے؟ لوگوں نے جواب دیا جج اکبر کا دن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تمہارا خون اور تمہارے اموال اور ناموس ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں (یعنی حرمت والے ہیں) جیسے تمہارے

آج کے دن کی حرمت آپ کے اس شہر میں، تم آگاہ رہو کہ کوئی مجرم نہیں کرتا مگر صرف اپنے اوپر، خبردار! کوئی آدمی جنایت نہیں کرتا اپنی اولاد پر اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ پر، آگاہ رہو کہ شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہارے ان شہروں میں پھر کبھی اس کی عبادت کی جائے گی البتہ اس کی فرمانبرداری آپ کے ان اعمال میں ہوگی جن کو تم معمولی سمجھتے ہوں گے بس وہ اسی پر راضی ہو جائے گا (کیونکہ یہی چھوٹے اعمال سیلاب کی شکل اختیار کر کے امت کو غرق کر دینے کا موجب بنیں گے کما ہوا المشاہد)۔

لغات :- قولہ ”حجة الوداع“ بروزن جنہ یعنی بفتح الحاء بھی جائز ہے جس کے معنی ایک حج کے آتے ہیں جیسے اس وزن کی خاصیت ہے جبکہ بکسر الحاء بھی جائز ہے اس کے معنی بھی ایک حج کے یا مطلق حج کے آتے ہیں۔ قولہ ”الوداع“ بفتح الواو رخصتی کے معنی میں ہے اس میں واؤ کا کسرہ بھی جائز ہے چونکہ یہ آپ علیہ السلام کا آخری حج تھا اس میں آپ نے جتنے خطبات ارشاد فرمائے تھے عموماً سب یا اکثر میں رخصتی کی طرف اشارہ تھا اور کہیں کہیں صریح الفاظ میں رخصت لے لی تھی۔ قولہ ”الحج الاکبر“ بعض نے عرفہ کے دن کو حج اکبر کہا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ عمرے کے مقابلے میں حج کو کہتے ہیں گویا عمرہ حج اصغر ہے اور حج، حج اکبر ہے، ادعوا میں جو یہ مشہور ہے کہ حج اکبر وہ ہے جو جمعہ کے دن آجائے تو یہ بلا اصل ہے۔ قولہ ”واعراضکم“ عرض بکسر العین کی جمع ہے موضع مدح والذم کو کہتے ہیں خواہ آدمی کی ذات سے متعلق ہو یا باپ دادا وغیرہ سے جس کو آبرو کہتے ہیں۔ قولہ ”حان“ اسم فاعل کا صیغہ ہے رام کی طرح، جنایت سے ہے جرم اور قصور کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ایس“ بفتح الهمزة وکسر الیاء آیساً وایسا مایوس ہونا یعنی شیطان ناامید ہوا ہے۔

تشریح :- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے موقع پر متعدد خطبات ثابت ہیں مگر غالباً اس حدیث کے خطبے کا تعلق یوم النحر یعنی دس تاریخ سے ہے جو جرات کے قریب آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا، ممکن ہے کہ کسی اور دن کا خطبہ ہو۔

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا جو آج تک ہمارے قبائلی نظام میں رائج ہے کہ مقتول والے قاتل کے کنبے سے جو بھی ملتا اور خصوصاً سرکردہ آدمی کو انتقام کا نشانہ بناتے تھے اگرچہ قتل اس کے بیٹے یا باپ نے کیا ہو آپ علیہ السلام نے اس سے ممانعت فرمادی کہ ایک آدمی (قاتل و مجرم) کے جرم میں دوسرے کو سزا نہیں دینی چاہئے ہاں اگر اس جرم میں وہ شریک ہو یا اس کی کوئی کوتاہی ہو تو شریعت کی بتائی ہوئی حدود کے اندر اسے سزا بھگتنا پڑے گی جیسے قاتل کے عاقلہ پر دیت کا مسئلہ ہے۔

پھر آپ علیہ السلام نے حرمت میں حج کے دن اور شہر حرام کے ساتھ جو تشبیہ دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سامعین کے ذہنوں میں ان کی حرمت مسلم اور راسخ ہو چکی تھی پہلے عارضہ کے حوالہ سے گزرا ہے کہ ایک آدمی مطاف میں اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ طواف میں شریک ہوتا مگر اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان جزیرۃ العرب میں دوبارہ شرک کے فروغ پانے سے مایوس ہو گیا ہے البتہ باقی گناہ ہوتے رہیں گے بایں طور کہ تم ان گناہوں کو معمولی سمجھ کر کرتے رہو گے اور شیطان اسی میں سے اپنا کام نکالے گا کیونکہ جب گناہ چھوٹے ہوں مگر جب کثرت سے ہوں گے تو وہ طوفانی شکل اختیار کریں گے کہ لاصغیرۃ مع الاستمرار اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہ بڑے گناہوں کے پیش خیمہ ہوتے ہیں پہلے معمولی سمجھ کر کر دو گے پھر اس کا خوف دلوں سے نکل کر تم ایک قدم آگے بڑھو گے پھر آہستہ آہستہ کبار دون الشریک میں منہمک ہو جاؤ گے جس کا آج مشاہدہ عام کیا جاسکتا ہے، اور یہی چیز شیطان کی خوشی کے لئے کافی ہے۔

اس کی قدرے تفصیلی بحث اسی جلد کے ابواب البر والصلۃ میں گزری ہے دیکھئے ”باب ماجاء فی التباغض“ وفیہ : ان الشیطان قد ایس ان یعبده المصلون ولكن فی التحریش بینہم۔

باب ماجاء لایحل لمسلم ان یروع مسلماً

عبداللہ بن السائب بن یزید عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یأخذ احدکم عصا اخیه لاعباً جاداً فمن اخذ عصا اخیه فلیردھا الیہ۔^۱ (حسن غریب)

حضرت یزید بن سعید بن ثمامہؒ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی بھی اپنے بھائی کی لاشی بطور مذاق یا سنجیدگی کے (بغیر اجازت کے) نہ لے پس اگر کسی نے اپنے بھائی کی چھڑی لی تو تو اسے (فوراً) واپس کر دے۔

لغات: - قولہ ”یروع“ باب تفعلیل سے معروف کا صیغہ ہے ڈرانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”لاعباً“ بصیغہ اسم فاعل لعب سے بمعنی مذاق (مزاح)۔ قولہ ”جاداً“ یہ بھی اسم فاعل کا صیغہ ہے جڈ بکسر الحکم وتشدید

باب ماجاء لایحل لمسلم ان یروع مسلماً

۱۔ رواہ ابیضا ابو داؤد فی الادب باب: ۸۵، مسند احمد ص: ۲۵۸، ج: ۵، حدیث: ۱۴۳۸۱، ۱۴۳۸۲۔

البدال مقابل مذاق کو کہتے ہیں یعنی سنجیدگی اور واقعیت سے کوئی کام کرنا، اس کا اسم فاعل محذ بھی آتا ہے۔ ابو داؤدؒ کی روایت میں ”لعباً ولا جاداً“ کے الفاظ ہیں لہذا کہا جائے گا کہ ترمذی کی روایت میں تقدیر ہے یعنی ”لعباً ولا جاداً“ پھر یہ دونوں لایاً خذ کے فاعل سے حالین ہیں متداخلہ یا مترادف دونوں قول ہیں۔ اگر عطف کو مقدر نہ مانا جائے تو پھر متداخلہ ہیں جبکہ ابو داؤد کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے حالین مترادفین ہوں گے، متداخلہ کا مطلب یہ ہے کہ جاداً کو ضمیر لا عباً سے حال بنایا جائے۔

تشریح:- ایک مطلب یہ ہے ”جاداً“ کا کہ کسی کی چیز بغیر بتلائے لے لے اگر چہ واپس کرنے کا ارادہ ہو مگر اپنا کام کر کے، یا مطلب یہ ہے کہ کسی کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کوئی چیز نہیں لینا چاہئے نہ بطور مذاق اور نہ اس نیت سے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں کہوں گا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا اور نہیں دیکھا تو ہضم کر لوں گا، اگر بالفرض ارادہ مذاق ہی کا ہو پھر بھی ایسا کرنا ممنوع ہے کہ کسی کی چیز لے کر مذاق میں اسے چھپا کر کہیں رکھ دیا اور وہ بے چارہ پریشان حال پھر رہا ہو چونکہ اس میں ایذائے مسلم ہے اس لئے یہ جائز نہیں اور اگر بقصد چوری کے ہو تو پھر تو حرام ہے، اور لاشی کا ذکر حکم کی تخصیص کے لئے نہیں بلکہ یہ واقعہ چونکہ بعض روایات کے مطابق سفر میں ایک ساتھی کے ساتھ مذاق میں لاشی ہی کے متعلق پیش آیا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمادی چونکہ علت ترویج یعنی پریشان اور خوف زدہ کرنا ہے اس لئے یہ حکم ہر شے کو شامل ہے، اور جب لوٹانے کی نیت کے باوجود منع ہے تو چوری کی نیت سے بطریق اولیٰ منع ہے۔

قابل غور ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی کو اتنی دیر کے لئے پریشان کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے تو مذاق سے زیادہ اور طویل مدت کے لئے لاشی سے بڑھ کر دوسری اشیاء میں کتنا گناہ ہو گا؟؟؟

باب ماجاء فی اشارة الرجل علی اخیه بالسلاح

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من اشار علی اخیه بحدیدۃ لعنہ الملائکۃ“^۱ (حسن صحیح)

۱۔ لا یأخذن احدکم متاع اخیه لاعباً جاداً وقال سلیمان لعباً ولا جاداً من ابی داؤد ص: ۳۳۵ ج: ۲ کتاب الادب.

باب ماجاء فی اشارة الرجل الی اخیه الخ

۲۔ رواہ مسلم ص: ۳۲۸ ج: ۲ ”کتاب البر والصلة“، ایضاً روی بمعناہ مسند احمد ص: ۵۰۳ ج: ۲ حدیث: ۷۴۲۷.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی پر لوہا تان لے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

تشریح:۔ لوہے سے اشارے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات میں کسی پر تلوار اٹھادی یا بندوق کا رخ اس کی طرف کیا اسی طرح دیگر کوئی ہتھیار یا دھار والا بوہا وغیرہ کوئی چیز جس سے چوٹ یا زخم لگنے کا اندیشہ ہو تو یہ ممنوع ہے اور آدمی اس سے فرشتوں کی لعنت کا مستحق بن جاتا ہے اور جب مذاق کا یہ حال ہے تو جب بارادہ ضرر ہو تو اس کا کیا حال ہوگا؟

پھر ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب اشارے سے مراد ڈرانا ہو: ”فہذا قد استحق اللعن بالاشارة فعاظنك بالاصابة“ اُلح۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ ایسے بے شمار واقعات پیش آئے ہیں کہ مذاق میں کسی پر بندوق خالی سمجھ کر چلائی اور گولی نکل کر لگ گئی، ہمارے قریب گاؤں ایک گاؤں میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، ایک لڑکے نے اپنی بہن کو اسی طرح قتل کیا تھا، یہ مذاق جائز نہیں اس لئے اس روایت کے بعض طرق میں یہ اضافہ ہے: ”وان كان احياه لاييه وامه“۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ تلاعبہ کی تمیم کے لئے فرمایا یعنی اگر چہ وہ اشارہ واقعی مذاق میں ہو کیونکہ اپنے سگے بھائی کو عموماً قتل نہیں کیا جاتا مگر جب اس کے ساتھ یہ مذاق منع ہے جس میں یقیناً پوری احتیاط ملحوظ ہوگی تو اجانب کے ساتھ تو بطریق اولیٰ ممنوع ہوا۔

باب النهی عن تعاطی السیف مسلولا

”عن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يتعاطى السيف مسلولا“۔^۱

(حسن غریب)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگی تلوار کے لینے دینے سے ممانعت فرمائی ہے۔

۲ کذا فی روایۃ مسلم حوالہ بالا۔

باب النهی عن تعاطی السیف مسلولا

۱ ایضاً رواہ ابو داؤد ص: ۳۵۶: ۱ ”باب فی النهی ان يتعاطى السيف مسلولا“ کتاب الجہاد مسند احمد ص: ۳۲۹

ج: ۳ حدیث: ۱۳۷۸۹، ۱۳۷۹۰۔

تشریح:- اگر کھلی ہوئی اور ننگی تلوار کسی کودے تو ممکن ہے کہ دوسرا آدمی تھامنے نہ پایا ہو اور دینے والا چھوڑ دے تو وہ گر کر پاؤں پر لگ جائے گی، اسی طرح دونوں کو یا ایک کو زخم لگ جائے گا، اس لئے آداب بتلائے، یہی آداب بندوق دینے کے بھی ہے کہ دیتے ہوئے اس کا رخ آسمان یا زمین کی جانب ہونی چاہئے کہیں خدا نخواستہ اگر گولی چل جائے تو کسی کو لگ نہ جائے بے احتیاطی سے بہت سے لوگ قلمہ اجل بنے ہیں۔

چاقو، چھری وغیرہ اشیاء میں بھی یہی ضابطہ ہے کہ چاقو وغیرہ یا تو بند کر کے دے دیا جائے یا زمین وغیرہ پر رکھ کر دوسرا اٹھالے، اسی طرح کسی کے اوپر چائے، پانی، شربت وغیرہ بھی نہیں دینا چاہئے ازاں جملہ یہ بھی ہے کہ کتاب وغیرہ اہم اشیاء کے اوپر پانی یا چائے وغیرہ مانع چیزیں ہرگز نہیں دینا چاہئے، ممکن ہے کہ ایک قطرہ بھی گر جائے پکڑے خراب ہو جائیں گے، اور اگر کوئی مصنف ہو تو اس کی محنت بھی ضائع ہو جائے گی کہ لکھا ہوا مضمون دوبارہ لکھنا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔

غرض تکلیف اور ضرر کے جملہ امور سے بچنا چاہئے، حضرت تھانویؒ ہشتی زیور میں لکھتے ہیں:

”چاقو یا قینچی یا سوئی یا کسی اور ایسی چیز سے مت کھیلو شاید غفلت سے کہیں لگ جائے، جہاں اور آدمی بھی بیٹھے ہوں وہاں بیٹھ کر مت تھوکو، ناک مت صاف کرو، اگر ضرورت ہو تو ایک کنارے پر جا کر فراغت کراؤ۔ جب کسی کے ہاتھ میں کوئی چیز دینا ہوتا ہے تو تھیکہ وہ دوسرا آدمی اس کو اچھی طرح سنبھال نہ لے اپنے ہاتھ سے مت چھوڑ، بعض دفعہ یوں ہی بیچ میں گر کر نقصان ہو جاتا ہے۔“ (حصہ ۱۰، بعض باتیں سلیقہ اور آرام کی)

باب من صلی الصبح فہو فی ذمة اللہ عزوجل

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من صلی الصبح فہو فی ذمة اللہ فلا ینبغیکم اللہ بشئ من ذمته“۔^۱ (حسن غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ کی ذمہ داری میں داخل ہو گیا، پس اللہ تمہارے درپے نہ ہو جائے اپنی ذمہ داری کے بارے

باب من صلی الصبح فہو فی ذمة اللہ عزوجل

۱۔ رواہ ایضاً مسلم فی کتاب المساجد، والترمذی فی الصلاة باب: ۵۱، سنن ابن ماجہ ۲۸۳ ”باب المسلمون فی ذمة اللہ عزوجل“ ابواب الفتن، مستدرک احمد ص: ۳۰۸ ج: ۴ حدیث: ۱۸۳۳۵۔

میں کسی طرح (یعنی پناہ توڑنے کے سبب)

تشریح:- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح مسلمان کو کلمہ توحید پڑھنے سے امان حاصل ہوتی ہے اسی طرح جزوی اعمال سے بھی خصوصی حفاظت ملتی ہے ازاں جملہ ایک صبح کی نماز ہے جس سے آدمی کو اللہ کی حفاظت و امان ملتی ہے پس جو شخص اس آدمی سے تعرض کرے گا خواہ اس کی جان و مال کے اعتبار سے ہو یا عزت و آبرو کے حوالے سے، تو اس سے قیامت کے دن انتقام لیا جائے گا، یہاں ایک خفیہ تشبیہ ہے وہ یہ کہ جس طرح ایک شخص کسی سردار کی پناہ حاصل کرتا ہے یا جیسے آج کل لوگ کسی ملک سے سیاسی پناہ لیتے ہیں تو وہ شخص اس سردار اور اس سیاسی پناہ دینے والے ملک کی حفاظت میں ہوتا ہے، وہ اس کے جان و مال وغیرہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں، پھر اگر کوئی دوسرا شخص اسے نقصان پہنچاتا ہے تو اس کی گرفت ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نمازی کو پناہ دیتا ہے، حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اس کو نقصان پہنچانے کی صورت میں اللہ ضرر پہنچانے والے کے درپے آزار ہو جاتا ہے لہذا تم اللہ کی امان اور عہد کو مت توڑو۔

تنبیہ:- بعض شارحین نے ”یتبعنکم“ کو مزید سے بناتے ہوئے تاء کو مشدود لکھا ہے مگر حضرت کنکوئیؒ نے الکوہ میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ مجرد سے ہے لہذا تاء کو ساکن پڑھا جائے گا اور تالیح ہونے کا مطلب مطالبہ کرنا ہے چنانچہ مسلمؒ کی روایت میں ”فلا یطلبنکم“ کے الفاظ ہیں۔ آیت کریمہ میں ہے: ”ثم لاتجدوا لکم علیناہ تبیعاً“۔^{۳۲}

باب فی لزوم الجماعة

”عن ابن عمر قال عطينا عمر بالحماية فقال: يا ايها الناس اني قمت فيكم كمقام رسول الله صلى الله عليه وسلم فينا فقال: اوصيكم باصحابي ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم نفسوا الكذب حتى يحلف الرجل ولا يستحلف ويشهد الشاهد ولا يستشهد الا لا يحلوا رجل بأمرأة الا كان ثالثهما الشيطان عليكم بالجماعة واياكم والفرقة فان الشيطان مع الواحد وهو من الاثنين ابعد، من اراد ان يحبو حة الجنة فليلزم الجماعة من سرته حسنة وساءته سيئة فذا لکم

۳۲ صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث: ۲۶۱، ایضاً مجمع.

۳۳ سورة بنی اسرائیل آیت: ۳۲.

المؤمن“۔^۱ (حسن صحیح غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے جابیہ مقام میں ہم کو خطبہ دیا، پس فرمایا اے لوگو! میں تمہارے درمیان اس طرح کھڑا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مابین جلوہ افروز ہوئے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں اپنے صحابہ کی اطاعت کی وصیت کرتا ہوں پھر ان کی جو ان سے ملے ہوئے ہوں اور پھر ان کی جو ان سے ملے ہوئے ہوں، پھر جموٹ عام ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک شخص قسم کھائے گا حالانکہ اس سے حلف اٹھانے کو نہیں کہا گیا ہوگا (یعنی قسم کے مطالبے کے بغیر قسمیں کھائے گا) اور گواہ (از خود) گواہی دے گا حالانکہ اس سے گواہی کا تقاضا نہیں کیا گیا ہوگا خبردار! کوئی آدمی ہرگز کسی عورت کے ساتھ تنہا نہیں رہتا مگر ان کا تیسرا ضرور شیطان ہوتا ہے تم جماعت کے ساتھ ہی رہو اور اختلاف سے خود کو دور رکھو کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دو سے دور ہوتا ہے، جو شخص جنت کے پتوں رہنا چاہے تو وہ جماعت ہی کے ساتھ رہے، جس شخص کو اس کی نیکی خوش کر دے اور برائی غم ناک کر دے تو وہ پکا مؤمن ہے۔

لغات: - قولہ ”بالحابة“ جابیہ شام میں دمشق کی ایک بستی کا نام ہے۔ قولہ ”باصحابی“ ای باطاعتہم والحراد الوالامر۔ قولہ ”یفشو“ ای بظہرو یتشتر یعنی پھیل جائے گا اور عام ہو جائے گا۔ قولہ ”یحلف ولا یتحلف و یشہد ولا یتشہد“ ہر دو جملوں میں اولین صیغہ معروف کے ہیں اور آخرین مجہول کے۔ قولہ ”بحبوحہ“ بضم الباء، درمیان کو کہتے ہیں، جنت کے درمیان سے مراد وسعت اور کشادگی ہے یعنی جو جنت میں اچھے اور کشادہ مقام کو پسند کرتا ہو۔

تشریح: - اس ارشاد پاک میں متعدد احکام بیان ہوئے ہیں تاہم امام ترمذی نے باب صرف ایک حکم یعنی لزوم الجماعت کے لئے باندھا ہے، لہذا یہاں پہلے ضمنی احکام کو پسند کیا جاتا ہے، پھر اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں:

(۱)... اس حدیث سے پہلا حکم یہ ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امراء اور ولایۃ مقرر فرمائے تھے ان کی اطاعت باقی صحابہ کرام پر لازمی تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب صحابہ کرام تھے تو جب ان

سے کیا گیا کہ ”اوصیکم بامصحابی“ تو لامحالہ مراد امراء ہیں، اسی طرح تابعین اور پھر تبع تابعین میں سے جو دلائے ہوئے ان کی اطاعت بھی لازمی ہوئی۔ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام مخاطب ہوں مگر یہ حکم ان کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ آئندہ امت کے لئے ایک ضابطہ بیان کرنا مراد ہو کہ میرے صحابہ کی پیروی کرو جو حکم ان سے نہ ملے تو پھر تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرو، اس مطلب کے مطابق ائمہ مجتہدین کی پیروی و اطاعت بھی اس حدیث کی مراد میں شامل ہوگی۔

(۲)... دوسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ تین زمانے مشہود لکھا بالتحیریت ہیں ان کے بعد جھوٹ اور فراڈ شائع ہو جائے گا، پھر حدیث جبرئیل کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ سچ عیب بن جائے گا اور جھوٹ خوبی، کیونکہ حدیث جبرئیل کے متعلق ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے یہی لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علامات قیامت کی بتلائی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قلب الامور والحقائق ہو جائے گا چنانچہ آج ایسا ہی ہوا ہے کہ جو آدمی سچ بولتا ہے لوگ اسے سادہ یعنی بے وقوف سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ ہوشیار وہ سمجھا جاتا ہے جو زیادہ مکار ہو اگر آپ اس کی مثال یا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں تو سیاسی لیڈروں کو دیکھ لیجئے، اس مسئلہ کے لئے آگے ابواب المغن میں مستقل ”باب ما جاء فی القرن الثالث“ آ رہا ہے۔

(۳)... تیسرا حکم یہ ہے کہ کسی غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت نشینی کی صورت میں شیطان ان کو گناہ پر اکساتا ہے بایں صورت کہ شہوت کو ابھارتا ہے اور حیاء کو اٹھاتا ہے اور جو موانع دیکر ہوتے ہیں ان کے بارے میں تشجیح کرتا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا بالآخر آدمی اندھا بن کر ہمت کرتا ہے اور خوف خداوندی کو پس پشت ڈالتا ہے اس لئے سد باب کے لئے فرمایا کہ بس ایسے مواقع میں جتلا ہونے سے پہلے ہی خود کو بچا لیا جائے یعنی خلوت سے بچے، اس لئے اللہ عز وجل نے ارشاد فرمایا ہے: ”ولا تقربوا الزنا“ کے قریب جانا اسباب زنا سے گزرتا ہے۔ (تذکرہ) یہ مسئلہ رضاع میں ”کراہیۃ الدخول علی المغنیات“ میں گزرا ہے۔ (تشریحات ص: ۴۶ ج: ۵)

(۴)... چوتھا حکم یہ ہے کہ مومن وہ ہے جس کو نیکی سے خوشی ہو اور بدی سے رنج اور ڈکھ ہو، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ کلام فصیح و بلیغ اور صحیح ہے کیونکہ جب ایمان ہوگا تو نیکی کی قدر ہوگی اور قابل قدر چیز کے حصول سے خوشی ہوتی ہے اور بدی و گناہ سے ڈر ہوگا کیونکہ اس کا انجام بُرا ہوتا ہے مگر ایمان نہ ہونے یا ناقص ہونے کی صورت میں اسے نیکی کا خاطر خواہ فائدہ اور گناہ کا نقصان ملحوظ خاطر نہ ہوگا، اس لئے کوئی فرق نہیں پڑے

گا چنانچہ آگے ترمذی میں آجائے گا کہ مؤمن اپنا گناہ ایسا دیکھتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے دامن میں گزر رہا ہو اور وہ اس پر گرنے والا ہو جبکہ منافق وغیرہ کے لئے گناہ کی حیثیت اتنی سی ہے جیسے کبھی ناک پر بیٹھ گئی اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اڑا دیا۔

(۵)... اس باب کا مقصودی مسئلہ لزوم الجماعت ہے، اگر کوئی جماعت سے الگ ہو جاتا ہے تو وہ شیطان کا اس طرح شکار ہو جاتا ہے جیسے ریوڑ سے علیحدہ بکری بھڑیا کا۔

جماعت سے مراد کون ہیں؟ اس باب میں امام ترمذی نے جماعت کے لزوم کے حوالے سے تین احادیث کی تخریج کی ہے جس سے لزوم الجماعت کی اہمیت تو معلوم ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ جماعت سے کن لوگوں کی جماعت مراد ہے؟؟؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنا آج کل خاصا مشکل ہے مگر جو اقوال قابل ذکر ہیں، وہ یہاں پیش کئے جا رہے ہیں:

(۱)... اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ مراد اجماع امت ہے، باب کی اگلی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جب امت اجابت کی غالب اکثریت بشرطیکہ وہ صلحاء پر مشتمل ہو یعنی صلحاء اس کے خلاف نہ ہوں کسی قول یا عمل پر متفق ہو تو اسے چھوڑ کر الگ راستہ اختیار کرنا جائز نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ ایسا اجماع خلاف شریعت نہیں ہو سکتا ہے۔

(۲)... دوسرا مطلب یہ ہے کہ مراد صحابہ کرام ہیں یعنی ان کا راستہ اختیار کیا جائے۔

(۳)... تیسرا قول یہ ہے کہ مراد ہر زمانے کے اہل علم و صلحاء ہیں اور قرآن میں ”وكونوا مع الصادقين“ کے رمز سے بھی اس کی تائید معلوم ہوتی ہے، عارضہ میں ہے کہ عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما، سائل نے کہا کہ وہ تو انتقال کر چکے ہیں آپ نے فرمایا فلاں و فلاں (یعنی صلحاء کے نام لئے) پھر سوال ہوا کہ وہ بھی زندہ نہیں رہے۔ ”فقال ابو حمزة السکری جماعة وهو محمد بن میمون وکان شیخاً صالحاً“ یعنی اب ابو حمزہ جماعت ہے اسی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مبارکؓ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور جس میں ارکان دین جمع ہوں گے بس وہی جماعت ہے اور یہ امام عادل ہے یا پھر عالم شخص ہے گو وہ تنہا ہو کیونکہ ”بدأ الاسلام غریباً“

وسیعود غریباً^۱ وجماعته العلم والعدالة“۔

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم“۔ (الآیۃ النساء نمبر: ۵۹) اسی پر زور دیا ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء ہیں کیونکہ حکام اس وقت مقتدی و قابل اطاعت ہیں جب وہ علماء کے فرائین کے تابع ہوں گے گویا عوام حکام کے تابع ہیں اور حکام علماء کے نتیجہ یہ نکلا کہ اصل طاعت علماء کی ہوگی۔

(۴) ... چوتھا قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مراد خلفاء و امراء ہیں چنانچہ ابن العربی عارضہ میں ”علیکم بالجماعة“ کے بعد لکھتے ہیں:

”یحتمل معنيين یعنی ان الامة أجمعت علی قول فلا یحوز لمن بعدہم ان یحدث قولاً آخر (یہ احتمال دہی ہے جو اوپر پہلے نمبر پر بیان ہوا) الثانی اذا اجتمعوا علی امام فلا تحل منازعته ولا خلعه وهذا یس علی العموم بل لو عقده بعضهم لحازولم یحل لاحد ان یعارض“۔

یعنی جب چند لوگ (قابل بھروسہ) کسی آدمی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے خلیفہ یا امام منتخب کر لیں تو باقی سب لوگ اس کی اطاعت کے پابند ہوں گے اس کے خلاف خروج یا حکم عدولی ان کے لئے جائز نہ ہوگی۔ یہ حکم اس وقت توانفاقی ہے جب امام حکم شرعی کے مطابق اور نیک و صالح شخص ہو لیکن اگر وہ فاسق یا جائر ہو تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا پھر بھی اس کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس کے خلاف خروج بھی ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ ”باب ما جاء فی بیعة النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ من ابواب السیر کے تحت گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۴۵۴ ج: ۵)

جمہور کے نزدیک پھر بھی خروج جائز نہیں یا کم از کم واجب نہیں، ہاں خلاف شرع حکم کی تعمیل نہیں کی جائے گی۔

آج کل یہ مشکل درپیش ہے کہ مسلمانوں کا کوئی ایک امام یعنی لیڈر متعین نہیں ہوتا، ہر ملک اور ہر پارٹی

۱ رواہ مسلم فی کتاب الایمان ”باب بیان ان الدین نصیحة“ ابو داؤد کتاب الادب ”باب فی النصیحة منن نسائی کتاب البیعة“ ”باب النصیحة للامام“ عن تمیم الداری، ورواہ البزار عن ابن عمر ورجالہ رجال الصحیح بحوالہ سنن دارمی ص: ۴۰۲ ج: ۲ حدیث: ۲۷۵۵، مسند احمد ص: ۶۵۷ ج: ۱ حدیث: ۳۷۷۵۔

کا الگ لیڈر ہوتا ہے ایسے میں کیا کرنا چاہئے؟ تو جہاں تک مختلف ممالک کا تعلق ہے اس کی تصویر تو آسان ہے کہ جو مسلمان جس ملک میں ہیں وہ اپنے اپنے ملک کے حکمرانوں کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہوں ہاں البتہ حتی الامکان کفار کے ممالک میں جانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (تشریحات ص: ۵۸ ج: ۳)

مگر ایک ہی ملک کے مختلف لیڈروں کا حکم بخاری شریف (ج: ۱ ص: ۴۹۱) کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے: ”فَوَابِيعَةُ الْاَوَّلِ فَاَلَاوَل“ یعنی جو پہلے فتنہ ہو اسی کی حکمرانی ہوگی اور تعمیل اسی کی بشرط ہوگی اگرچہ فاسق کے مباح احکام میں وہ لزوم نہ ہوگا جو عادل کے احکام میں ہوتا ہے، یہ مسئلہ بھی تفصیل سے گزرا ہے فلائعیدھا۔ (دیکھئے تشریحات ص ۵۲۱ ج ۵ ”باب ماجاء لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“ من ابواب الجہاد)

اگر طوائف الملوکی کا دور آجائے جیسے آج کل اس کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور ہر آدمی یا ہر گروپ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالے تو پھر کیا ہونا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے واللہ اعلم، کہ حتی الامکان جماعت کے ساتھ رہنے کی کوشش جاری رکھے مگر تمام راستے مسدود ہونے کی صورت میں پھر علیحدگی اختیار کر کے یکسو ہو جائے جیسا کہ بخاری شریف کی ایک طویل روایت میں ہے:

”قُلْتُ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا اِمَامٌ قَالَ فَاعْتَرِلْ تِلْكَ الْفِرْقَ كُلَّهَا وَلَوْ اَنْ تَعْصُ بِاصْلِ الشَّجَرَةِ حَتَّى يَبْرُكَ الْمَوْتُ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ“۔

(بخاری ص: ۵۰۹ ج: ۱، باب علامات النبوة فی الاسلام)

عزت اور تنہائی اختیار کرنے کے حکم کے لئے دیکھئے تشریحات ص ۴۲۱ ج ۳ ”باب ماجاء فی النصی عن التجمل“ مگر پھر بھی صحبت صالح تلاش کرتا رہے۔

باب کی دوسری حدیث:- ”عن ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان الله لا يجمع أمتي اوقال أمة محمد على ضلالة وبئذ الله على الجماعة ومن شذَّ شذَّ الى النار“۔^۵ (غریب من هذا الوجه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ میری امت کو یا فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ

ہے اور جو شخص تنہا رہا اس کو اکیلا ہی دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

لغات:۔ قولہ ”ومن شدّ شدّ الی النار“ پہلا معروف اور دوسرا مجہول کا صیغہ ہے جبکہ دال دونوں میں مشدّد ہے، شدّوز کے معنی الگ تھلگ ہونے کے ہیں۔ قولہ ”بداللہ“ متشابہات میں سے ہے، مراد نصرت و مدد ہے یعنی جماعت پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور شیطان ان سے دور رہتا ہے، تاہم ثانی یعنی شدّ لبعض طرق میں معروف بھی آیا ہے۔

تشریح:۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب من ہذا الوجه کہا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ضعیف ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ غریب بھی صحیح ہو سکتی ہے چنانچہ یہ روایت بھی صحیح ہے کہ ایک تو اس کے راوی ثقافت ہیں دوسرے اس کے کئی متابع و شواہد ہیں، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں: ”وان لم یکن لفظہ صحیحاً فان معناه صحیح جداً“۔

امت کی دو قسمیں ہیں: ایک امت اجابت، دوم امت دعوت، جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر کے ان پر ایمان لایا وہ امت اجابت کہلاتے ہیں جبکہ منکرین، امت دعوت میں شامل ہیں، اس حدیث میں امت اجابت کے متعلق فرمایا کہ وہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، تاہم قیامت کے قریب اگر چہ سب لوگ کفر پر مجتمع ہوں گے مگر وہ امت اجابت نہیں ہوں گے۔

اس حدیث سے اجماع کی معصومیت عن الطوائف بھی معلوم ہوئی مگر سب امت کی نہیں بلکہ اہل علم کی ورنہ فساق تو بہت سارے گناہوں اور گمراہی کے کاموں پر متفق ہو جاتے ہیں، مرقاۃ میں ہے:

”والمراد اجماع العلماء منهم ولا عبرة باجماع العوام وفي اضافة الامة الى

اسمہ الشریف اشارة الى ان هذه الامة هي التي امتاز بهذه انفضیلة من بین سائر

الامم“۔

اجماع کی اقسام اور ان کے الگ الگ احکام مطوّلات میں دیکھے جاسکتے ہیں، بہر حال اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جماعت کو ترک کرنے والا شخص قیامت کے روز اہل جنت کی جماعت سے الگ کر کے جہنم میں پھینکا جائے گا، یہ بھی ممکن ہے کہ جنتیوں سے علیحدہ کئے جانے کے ساتھ وہ جہنم میں بھی تنہا رکھا جائے جیسا کہ حدیث مبارک کے الفاظ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے، اس طرح مصیبت ڈبل ہو جائے گی دوزخی ہونا اور تنہائی کی زندگی بسر کرنا۔ والعیاذ باللہ، بنا بریں ہر آدمی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ امت کے سوا داء عظم کے

ساتھ ہی رہے، اہل حق کے عقائد، اقوال اور افعال پر استقامت کے ساتھ قائم و دائم رہے تاکہ اسی پر موت نصیب ہو۔

باب ماجاء فی نزول العذاب اذا لم یُغیر المنکر

”عن ابی بکر الصدیق انه قال: یا ایہا الناس انکم تقرءون هذه الآية: ”یا ایہا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا هتدیتم“^۱ وانی سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان الناس اذا رآوا الظالم فلم یأخذوا علی یدیه اوشک ان یعمہم اللہ بعقاب منه“۔ (حسن صحیح کذا جزم علیہ فی تفسیر سورة المائدہ)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو: ”اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا“۔ (مائدہ آیت نمبر ۱۰۵) (مگر اس کو ظاہری مطلب پر حمل کر کے خوش فہمی میں نہ پڑھو کیونکہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں (یعنی ظلم کرتا ہوا) اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی اسے ظلم سے نہ روکیں) قریب ہے کہ اللہ ان پر عام عذاب نازل فرمائیں۔

لغات: نقولہ ”اوشک“ بفتح الهمزة وسكون الواو وفتح الشین بمعنی قارب وَاَسْرَعَ یعنی قریب ہے اور ایسا بہت جلد ہوگا۔

تشریح:۔ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے بارے میں یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں لوگ اس آیت کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ نہ بیٹھیں، اس لئے مندرجہ بالا حدیث بیان فرمائی کہ جب لوگ بُرائی کو حسب استطاعت نہیں روکیں گے تو عام عذاب آئے گا۔

عارضہ میں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین کا بنیادی اصول اور مقصودِ اعظم ہے اسی کے لئے تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی ہے: ”و هو فرض علی الناس مثنی وفرادی بشرط القدرة علیہ والامن علی النفس والمال معہ“ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں جو عذاب کی بات کی گئی ہے اس میں عظیم فرقہ ہے

کیونکہ بعض گناہوں کی عقوبت جلد ملتی ہے، مگر سے نہ روکنا ان گناہوں میں سے ہے جس پر فوری سزا مرتب ہوتی ہے جو مال کی کمی، پھلوں کی قلت، جانوں کے ضیاع اور ذلت و ظلم کی صورت میں ہوتی ہے۔ (انہی مافی العارضۃ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج مسلمان ان تمام تباہیوں کا سامنا کر رہا ہے کوئی دن قتل و قتل کے بغیر نہیں گذرتا، بارشیں یا تو ہوتی نہیں یا پھر تباہی مچاتی ہیں، دریائے سندھ آج کل خشک پڑا ہوا ہے جو دنیا کے بڑے دریاؤں میں بیسیوں نمبر پر ہے، ظلم کا عالم یہ ہے کہ کوئی مظلوم نہ اپنی داستانِ ظلم تھانے میں جا کر پولیس کو سنا سکتا ہے کہ وہ خود پھنس جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑتے ہیں اور نہ ہی کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھا سکتا ہے کہ عدالتیں تو امیروں اور وزیروں جیسے لوگوں کے لئے ہیں، وکلاء کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں ایک ہزار کی وصولی کے لئے لاکھوں دینا نہ عقل میں آتا ہے اور نہ غریب کی رنج و قدرت میں ہے۔

اعترض:- اس طرح تو بظاہر اس حدیث اور اس آیت میں تعارض سا ہو گیا کہ آیت سے چھوٹ معلوم ہوتی ہے جبکہ حدیث سے لزوم معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہر صورت لازمی ہے ورنہ عذاب یقینی ہے۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے الگ الگ محال ہیں اس لئے کوئی تعارض نہیں، اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱)... اس آیت کا تعلق ابتدائے اسلام سے ہے جبکہ حدیث کا تعلق قوتِ اسلامی کے حصول کے زمانے سے ہے، گویا یہ منسوخ یا از قبیل منسأ ہے، منسا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی ایک حکم پر عمل ہو جب حالات اس کے مطابق ہوں اور کبھی دوسرے پر عمل ہو جب حالات سازگار نہ ہوں جیسے جہاد کی آیات اور صبر کی تلقین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الاتفاق میں اس طرح کی تطبیق دی ہے۔

(۲)... ”من ضل“ سے مراد ذمی لوگ ہیں یعنی جب مسلمان اپنے دین پر قائم ہوں تو ذمیوں کی لادینیت ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔

(۳)... ”من ضل“ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

(۴)... امام ترمذیؒ نے سورہ مائدہ کی تفسیر میں ایک حدیث کی تخریج کی ہے جس کے مطابق یہ اس زمانے سے متعلق ہے جب لوگ خواہشات میں منہمک ہو کر احکامِ شرع پر کان دھرنا چھوڑ دیں گے ایسے میں

امر بالمعروف کا اثر ختم ہو جائے گا اس لئے اس کا لزوم ختم ہو کر صرف اپنا فکر و عمل کافی ہوگا۔

ولفظہ: "عن ابی امیۃ الشعبانی قال أتیت ابانعلبة النخسنی فقلت له کیف تصنع فی هذه الآیة؟ قال آیة آیة؟ قلت قوله تعالیٰ یا ایها الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا هتدیتم" قال: أما واللہ لقد سألت عنها شیفاً سألت عنها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اتمروا بالمعروف وتناہوا عن المنکر حتی اذا رأیت شحاً مطاعاً و هو یُتَّبَعُ دُنْیَا مَوْتُهُ و اعجاب کل ذی رأی برأیه فعلیک بخاصة نفسک و دَعِ العوامَ فان مِن ورائکم اَیاماً الصبر فیہن مثل القبض علی الجمر للمعامل فیہن مثل اجر خمسين رجلاً یعملون مثل عملکم" الخ۔^۲ (ابواب التفسیر ص: ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰

لغات :- بقولہ ”بالمعروف“ امام راغب رحمہ اللہ المفردات القرآن میں لکھتے ہیں: ”والمعروف اسم لكل فعل يُعرف بالعقل او الشرع حسنه والمنكر ما ينكر بهما - قوله ”المنكر“ مفردات القرآن میں ہے: ”والمنكر كل فعل تَحَكَّم العقول الصحيحة بِقُبْحِهِ او توقف في استقباحه واستحسانه العقول فتَحَكَّم بِقُبْحِهِ الشرعية“ یعنی عقل سلیم جس چیز کو غور و خوض سے مستحسن قرار دے اور شریعت اس کا حکم کرے یا کم از کم اجازت دیدے تو وہ معرُوف ہے اور جو چیز ان دونوں کے نزدیک بالکل نئی اور قبیح ہو وہ منکر ہے یعنی عقل و نقل سے ناشناس۔ یہاں یہ نکتہ بھی قارئین کے فائدے کے لئے لکھا جاتا ہے کہ معروف معرفت سے ہے جو علم ہے انھیں ہے ”کما قال الراغب والعرفان ادراك الشيء بتفكر وتدبر وهو اخص من العلم وبضاده الإنكار ويقال: فلان يعرف الله ولا يقال يعلم الله... ويقال: الله يعلم ولا يقال يعرف بكذا“۔

تشریح :- عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے اسلام کی تین حالتیں ہیں: (۱) حالت بلاء و کرب و ذالک بملکۃ فی الاوّلٰی یعنی ایک حالت وہ تھی جس میں مصائب کی بھرمار تھی وہ کی دور ہے۔ (۲) پھر مدنی دور آیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر ہوئے۔ (۳) ثم ضعف ذالک الی الآن حتی صبار فی المعاصی والمظالم کما کان فی الجاهلیۃ الاولٰی الخ یعنی اس قدرت و طاقت میں پھر کمزوری آتی رہی تا آنکہ دور حاضر میں وہ سب یا کم از کم بہت کچھ ایسا ہی ہونے لگا جیسے زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔

قارئین یہ تو اس شخص نے اپنے زمانے کی بات کی ہے جو ۵۳۳ھ میں وفات پا چکے ہیں، آج ہمارا دور وہ زمانہ ہے جس میں قیامت کی آمد بہت ہی قریب ہے کہ علامات صغریٰ سب ظاہر ہو چکی ہیں صرف علامات کبریٰ کا آنا باقی ہے، ان منکرات میں سب سے خطرناک چیزیں تین ہیں اور یہی تین امریکہ و یورپ کے اصل اہداف ہیں (۱) موسیقی عام کرنا۔ (۲) بے پردگی و فحاشی کو فروغ دینا اور ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا بلکہ عزت افزائی کرنا جو اس کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ (۳) سود کو ضرورت بنانا، ان تینوں میں سے ایک پر بھی قابو پانا بظاہر ناممکن لگتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب ”عرف شذی میں فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے مگر اس کے اثر نہ ہونے کے یقین ہو جانے سے ترک جائز ہو جاتا ہے مگر ایسے میں بھی عزیمت یہ ہے کہ اس پر عمل

کیا جائے الایہ کہ اذیت یا مضرت کا اندیشہ ہو تو پھر چھوڑ دے۔ اس کے ساتھ باب سابق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔
بہر حال اس حدیث میں بطور قضیہ شرطیہ منفصلہ حقیقہ کے احوال الامرین پر حکم لگایا گیا ہے کہ یا تو
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرو گے یا پھر تم پر عذاب آئے گا نہ تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع ہوں گی اور نہ ہی
رفع ہوں گی بلکہ اگر ایک نہ ہوگی تو دوسری ہوگی۔ تدبر

دوسری حدیث:- عن حذیفۃ بن الیمان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: والذی
نفسی بیدہ لا تقوم الساعة حتی تقتلوا امامکم وتحتلوا باسیافکم ویرث دُنیاکم اشرارکم۔
(حسن) ۲

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی
قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم قتل کر لو گے اپنا امام اور یہ کہ تم آپس
میں تلواروں سے لڑو گے اور تمہاری دینا (حکومت وغیرہ) پر تمہارے بدترین لوگ قابض ہو جائیں گے۔
لغات:- قولہ ”تحتلوا“ اجتلدوا بالسیوف، اس وقت کہا جاتا ہے جب لوگ آپس میں پناہ کیل
رہے ہوں یا تلواروں سے لڑ رہے ہوں۔ قولہ ”اشرارکم“ شریر کی جمع ہے جو شر سے مشتق ہے، شر کے معنی فتنہ
وفساد اور بد اخلاقی و گناہ کے آتے ہیں، غنڈہ گردی کرنے والے کو بھی شریر کہتے ہیں، اشرار اور اشرار بھی جموع آتی
ہیں۔

تشریح:- اس حدیث کو بعض شارحین نے سابقہ حدیث کے ساتھ جوڑا ہے کہ دونوں کاماً خدا ایک ہی
ہے اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں علی ہذا امام سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں مگر حدیث
میں چونکہ دو امرین کا ذکر ہے قتل امام اور تسلط اشرار تو پہلا امر اُس زمانے میں آچکا تھا جبکہ اب دوسرے کی
آمد آمد ہے۔

مگر عام شارحین کہتے ہیں کہ امام سے مراد سلطان ہے اور یہ واقعہ حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد سے
قبل پیش آئے گا یہ تو جیہ اس لئے بہتر ہے تاکہ دونوں علامتیں قریب قریب ہو جائیں، تاہم اس صورت میں یہ
ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ قتل اور حضرت مہدی کی آمد کے درمیان کافی وقفہ ہوگا جس میں اشرار شرارتوں کی انتہاء

کریں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ اشرار کا تسلط مابعد نزول عیسیٰ علیہ السلام و وفاتہ مراد ہو یعنی لوگ اپنا سلطان قتل کریں گے، یہ ایک اہم نشانی ہے پھر زمانہ امن آجائے گا پھر جب وہ دور ختم ہو جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو جائے گی تو پھر جو حالت اس دنیا کی ہوگی تو اللہ بچائے، الامان والحفیظ، اس میں انسان نما جانور تخت و دولت پر قابض ہوں گے اور ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ واللہ اعلم، اس حدیث کو اہل حریمین کے ساتھ جوڑنا افضل ہے۔

بہر حال اس حدیث کو باب ہذا میں لانے کی دو وجہ ہیں: ایک یہ کہ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر معطل ہوگا تو انجام یہ نکلے گا کہ اشرار غالب آجائیں گے، یا مطلب یہ ہے کہ آمر و ن والناہون اچھے لوگ ہیں مگر جو لوگ آخری زمانے میں تخت و سلطنت کے مالک ہوں گے وہ اچھائی و بھلائی سے محروم ہوں گے کہ وہ تو گناہوں کو فروغ دینے والے ہوں گے نہ کہ منع کرنے والے۔

تیسری حدیث:- ”عن ام سلمة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انه ذکر الحیث الذبی یُخَسَفُ بہم فقالت ام سلمة: لَعَلَّ فیہم المکرہ؟ قال: انہم یُعَثُّونَ عَلٰی نِیَاتِہُمْ۔“ (حسن غریب) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کا ذکر فرمایا جس کو زمین میں دھنسا یا جائے گا پس ام سلمہ نے پوچھا شاید ان میں سے کوئی ایسا بھی ہو جسے زبردستی شامل کیا گیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو اپنی اپنی نیتوں کے مطابق (قبروں سے) اٹھایا جائے گا۔ لغات: بقولہ ”یُعَثُّونَ“ بعث کے معنی بھیجنے، نیند سے بیدار کرنے، پھیلانے، آزاد کرنے، آمادہ کرنے اور موت کے بعد زندہ کرنے وغیرہ کے آتے ہیں، یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔

تشریح:- یعنی ایسے لوگ جو شر پسندوں اور مفسدین کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کئے جاتے ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تخلف نہیں کر سکتے مثلاً نہ جانے کی صورت میں ان کو ناقابل برداشت تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو ایسے میں اگرچہ قیامت کے دن ان کی نیت معتبر ہوگی یعنی اگر وہ واقعی مجبور تھے اور کسی مسلمان یا مجاہد پر گولی چلانا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی بدوق کاذب عمر مسلمانوں کی طرف رکھتے بلکہ حتی الامکان ہوا میں گولیاں چلاتے رہے تو وہ نفس شرکت جبری پر مأخوذ نہ ہوں گے تاہم جہاں تک دنیوی عذاب کا تعلق ہے تو وہ سب کو شامل ہوگا ”قال اللہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الذِّینَ ظَلَمُوا مِنْکُمْ خَاصَّةً۔“ (الآیہ نمبر ۲۵، سورہ

انفال) یعنی جب مجرموں کی وجہ سے دنیا میں عذاب آتا ہے تو اس میں بچوں سمیت غیر مجرم بھی پلٹ دیئے جاتے ہیں مگر آخرت میں ہر ایک کا حساب کتاب الگ ہوگا۔

باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب

”عن طارق بن شهاب قال اول من قدم الخطبة قبل الصلوة مروان فقام رجل فقال لمرون خالفت السنة فقال يا فلان اترك ما هناك فقال ابو سعيد: اما هذا فقد قضى ما عليه سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من رأى منكم منكراً فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان“^۱ (حسن صحيح)

حضرت طارق بن شهاب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے نماز (عید) سے پہلے خطبہ دیا وہ مروان تھے چنانچہ ایک شخص نے اٹھ کر مروان سے کہا: تم نے سنت کی خلاف ورزی کی ہے تو مروان نے کہا اے فلان! وہ (سنت مطلوبہ) چھوڑ دی گئی ہے، پس ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا بلاشبہ اس شخص نے وہ حق ادا کر دیا جو اس کے ذمے تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر ڈالے (یعنی روکے) اور جو اس کی طاقت نہ رکھے وہ اپنی زبان سے روکے اور جو اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ اپنے دل سے (روکنے کا ارادہ رکھے کہ عند القدرت میں اسے روکوں گا اور یہ تب ہوگا جب فی الوقت اسے) بُرا مانے اور یہ درجہ کمزور ایمان کا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ حضرت مروان بالاتفاق تابعی ہیں بلکہ بعض نے تو ان کی صحابیت کا بھی دعویٰ کیا ہے اور امام بخاریؒ نے ان سے روایات بھی لی ہیں اس لئے ان کے اس جواب اور کلام میں یہ تاویل و توجیہ ضروری ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ اب لوگ عید کی نماز کے بعد خطبہ نہیں سنتے اور اس میں ہم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں جو واجب اور فرض ہے اس لئے اس کو مقدم کیا تاکہ لوگ سن لیں اور ہماری ذمہ داری پوری ہو جائے گویا یہ ایک اطاعت سے اعلیٰ کی طرف انتقال ہے بالکل ترک نہیں ہے، اگرچہ یہ حیلہ ان کے عمل کے جواز کے لئے کافی نہیں لیکن کلام کی توجیہ کے لئے کافی ہے، اور لوگوں کے نہ سننے کی وجہ سے اسکا بار عن الحق نہیں

باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید الخ

۱۔ الحدیث اخرجه ايضاً مسلم فى الايمان : ۷۸، نسائي ايمان باب : ۱۷، مسند احمد ص : ۳۹۷ ج : ۳ حدیث : ۱۰۷۶۶، ايضاً ص : ۴۴ ج : ۳ حدیث : ۱۱۰۶۸.

بلکہ بعض بنو امیہ اپنے خطبوں میں اہل بیت پر تنقید کرتے اس لئے لوگ اٹھ کر چلے جاتے۔

اس حدیث پر ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے شرح الخمسین (جامع العلوم والکلم فی شرح خمین حدیث من جوامع الکلم) میں تفصیل سے بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عدم قدرت کی صورت میں وجوب بالاتفاق ساقط ہو جاتا ہے تاہم پھر بھی جو شخص اس پر عمل کرے تو وہ عزیمت اور باعث فضیلت ہے کیونکہ معذورین اگرچہ ترک عمل سے گناہ گار تو نہیں ہوتے ہیں مگر ان کے مقابلے میں عاملین افضل ہوتے ہیں، اصحاب السبب کو ایک جماعت نے روکا اور دوسری نے وعظ میں تاثیر نہ سمجھ کر سکوت اختیار کیا مگر افضل واعظین تھے، عورتیں اگرچہ ماہواری کے ایام میں نماز پڑھنے سے معذور ہوتی ہیں مگر مردوں کے مقابلے میں ان کو بنا بریں ناقصات الدین قرار دیا گیا ہے، پھر عدم استطاعت سے مراد کیا ہے تو وہ لکھتے ہیں کہ جسے قتل کئے جانے یا کوڑے لگنے یا قید کئے جانے یا مال وغیرہ کا خطرہ لاحق ہو جیسے حکام کے متعلق کوئی منکر ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا جبکہ برا بھلا سننے کی پرواہ نہیں کرے گا ہاں البتہ حکام سے قتال نہیں کرے گا (یعنی کفر و اح سے کم درجے میں) البتہ اگر ہو سکے تو ان کے اقدامات غیر شرعیہ کو ہاتھ سے ختم کر دے جیسے شراب کے برتن توڑنا یا آلات موسیقی وغیرہ توڑنا۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ آج کل تو یہ کام یعنی توڑنے والا انفرادی طور پر تقریباً ناممکنات میں سے ہے ہاں کوئی جماعتی شکل میں کر سکے جیسے کوئی مضبوط سیاسی پارٹی کے کارکن ہوں تو وہ الگ بات ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ آج کل جمہوریت کا راج ہے اور اس میں فساق کی زیادہ چلتی ہے لہذا ہاتھ سے روکنے کی کوشش شاید کسی بھی جگہ زیادہ نقصان کا باعث بنے، زبان کا حکم بھی وہی ہے جو ہاتھ سے روکنے کا ہے یعنی اگر منکر پر اعتراض کی ہمت نہ ہو بوجہ خطرات کے تو یہ دوسرا درجہ بھی اس کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے، اس کے بعد قلبی نفرت کا درجہ رہتا ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے، آج کل اگرچہ بعض منکرات پر بعض مقامات میں تنقید تو ہو سکتی ہے مگر سب کے سب منکرات اور تمام مقامات میں روکنا یا ان پر ٹوکنا ناممکن ہے، کیونکہ عام منکرات اب مقامی نہ رہے بلکہ عالمی بن گئے ہیں۔

شرح الخمسین میں ہے:

”و کذا لک روی عن طائفة من الصحابة فی قوله تعالى: ”علیکم انفسکم

لا یضرکم من ضل اذا اعتدیتم“ قالوا لم یأت تأویلها، انما تأویلها فی

آخر الزمان“ الخ۔

بہر حال یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ نبی عن المنکر میں نرمی اور شفقت کا عنصر غالب ہونا چاہئے:

”وكان اصحاب ابن مسعود اذا مروا بقوم يرون منهم مايكرهون، يقولون: مهلاً رحمكم الله مهلاً رحمكم الله“۔

پھر جماعی یعنی متفقہ منکرات سے روکنا بقدر طاقت واجب ہے جبکہ اختلافی مسائل میں غلو سے بچنا چاہئے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے شرح الخمسین کی حدیث ص: ۳۴)

ہاں اگر وہ اختلاف ضعیف ہو جیسے ربا النکاح یا نکاح متعہ وغیرہ تو وہ بھی ان منکرات میں شمار ہوگا جس کی نکارت پر اتفاق ہے، شرح الخمسین میں اس کی مثالیں دینے کے بعد لکھا ہے کہ اگر ایک شخص لفظ واحد کے ساتھ تین طلاقیں دیدے اور کوئی قاضی بغیر نکاح زوج آخر کے رجوع کا حکم دیدے تو وہ فیصلہ نامنظور اور ایسا کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا۔

دل سے بُرا سمجھنے کا مطلب:۔ اس حدیث پاک میں منکر کو فقط دل سے نفرت کرنے اور بُرا سمجھنے کو اضعاف الایمان کہا ہے اور مسلم وغیرہ کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے: ”وفیه: ومن جاهلهم بقلبه فهو مؤمن وليس وراء ذلك من الايمان حبة خردل“۔

لیکن سوال یہ ہے کہ دل سے روکنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب ایک تمہید پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان کی مثال ایک کسوٹی کی سی ہے جب اس پر اچھائی وارد ہوتی ہے تو یہ اسے قبول کرتا ہے اور اس پر خوش و مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ بُرائی کو رد و نامنظور کرتا ہے، پیچھے گزرا ہے کہ منکر وہ ہے جو بنظر عقل و نقل بُرا ہو یا عقل کو اس میں توقف ہو اور شریعت اسے ناپسند قرار دیدے مثلاً بعض اشیاء ایسی ہیں جو طبعیت کو پسند ہوتی ہیں جبکہ بعض اشیاء کی قباحت معقول ہوتی ہے مگر بعض میں اخفاء ہوتا ہے ایسے میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ غیر مشروع چیز کو ناپسند کرے گویا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز طبعی اعتبار سے مرغوب ہو لیکن عقلاً و شرعاً ناپسندیدہ ہو یا عقل کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہو اور شریعت نے اسے ممنوع قرار دیا ہو مثال کے طور پر کسی نے موسیقی کے سُر کے ساتھ سُر ملی آواز میں گانا سنا یا کسی انتہائی خوب صورت لڑکی پر نظر پڑ گئی تو اگر چہ کالمین تو اس چیز کو طبعاً بھی بُرا سمجھتے ہیں مگر عوام یقیناً اس سے محظوظ ہوتے ہیں، ایسے میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے عواقب پر نظر ڈالے اور نفس پر پاؤں

رکھ کر اس آواز کو بند کر دے یا اس سے دور چلا جائے اور اپنی نگاہ پست کر دے گواس میں تکلف کرنا پڑے۔
 اس تمہید کے بعد سمجھنا چاہئے کہ مؤمن کو اچھے بُرے کی تمیز کرنا لازمی ہے، بُرائی بظاہر کتنی ہی اچھی لگے
 اور طبعیت کو کتنی ہی پسند ہو لیکن بنظر عقل و شرع اس کو بُرا جاننا ضروری ہے اس کے بعد اس سے خود بچنا چاہئے
 اور دوسروں کو بچانا چاہئے لیکن اگر وہ دوسروں کو نہیں بچا سکتا تو کم از کم خود تو بچے، اور اگر کوئی مجبوری ایسی ہے کہ وہ
 عملی طور پر خود بھی نہیں بچ سکتا مثلاً کسی کا پڑوسی اونچی آواز میں گانے سننے کا شوقین ہے اور اس کی آواز دوسرے
 گھروں تک بھی پہنچ جاتی ہے اور روکنے کی قدرت نہیں اور ہجرت کی استطاعت نہیں تو کم از کم اس عمل کو بُرا ماننا
 ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے، اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔
 شرح عقائد مع المتن میں ہے:

”ويحوز العقاب على الصغيرة والعفوعن الكبيرة اذالم تكن عن استحلال، والاستحلال
 كفولمافيه من التكذيب المنافي للتصديق“ الخ۔ (ص: ۸۷، مکتبہ علوم اسلامیہ پشاور)
 خلاصہ یہ ہوا کہ دل سے بُرا سمجھنا باعتبار عقل و نقل ہے نہ کہ طبعاً اور یہ کہ اسے ممنوع سمجھے، جائز و حلال نہ سمجھے۔

باب منہ

”عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَثَلُ الْقَائِمِ عَلَى حُدُودِ اللَّهِ
 وَالْمُحْدِثِينَ فِيهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهْمُوا عَلَى سَفِينَةٍ فِي الْبَحْرِ فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلَاهَا وَاصَابَ بَعْضُهُمْ
 أَسْفَلَهَا فَكَانَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا يُصْعِدُونَ فَيَسْتَقُونَ الْمَاءَ فَيَصُبُّونَ عَلَى الَّذِينَ فِي أَعْلَاهَا فَقَالَ الَّذِينَ
 فِي أَعْلَاهَا: لَأَنذَعُكُمْ تَصْعِدُونَ فَتُؤْذِنَانَا فَقَالَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا فَاثْنَانَا نَقْبُهُمَا فِي أَسْفَلِهَا فَتَسْتَقِي فَاثْنَانَا
 اخذوا على أيديهم فمنعوهم نحووا جميعاً وان تركوهم غرقوا جميعاً“۔^۱ (حسن صحيح)
 حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 ارشاد فرمایا کہ اللہ کی حدود کی پابندی کرنے والے اور ان میں کوتاہی کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی حالت کی
 مانند ہے جنہوں نے ایک سمندری کشتی میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کی پس بعض کو اس کا بالائی حصہ (منزل)

باب منہ

۱۔ روی بمعناه البخاری ص: ۳۳۹ ج: ۱ کتاب الشركة، وص: ۳۶۹ ج: ۱ کتاب الشهادات، مسند احمد ص: ۳۳۲

ج: ۵: حدیث: ۱۷۸۹۷ و ۱۷۹۰۳، ۱۷۹۳۳۔

ملا اور بعض کو بچلی منزل ملی، پس وہ لوگ جو بچلی منزل میں ہیں بالائی منزل پر چڑھ کر پانی لاتے ہیں تو وہ ان لوگوں پر جو اوپر کی منزل میں ہیں پر پانی گراتے ہیں تو اوپر والوں نے کہا کہ ہم آپ کو اوپر چڑھنے اور ہمیں اذیت دینے نہیں دیں گے تو اس کے تحتانی حصے والوں نے جواب دیا کہ پھر ہم اس کی بچلی منزل میں سوراخ کر دیتے ہیں اور وہیں سے پانی لیں گے، پس اگر انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور ان کو روکا تو سب بچ جائیں گے لیکن اگر انہوں نے ان کو چھوڑا تو سب کے سب ڈوب جائیں گے۔

لغات: - قوله "القائم علی حدود اللہ" حد کی جمع ہے، لغت و اصطلاح دونوں میں اس کے بہت سے معانی آتے ہیں مثلاً حد منطقی، حد حکمی اور حد عرفی، یہاں حد شرعی مراد ہے یعنی وہ احکام جن کو اللہ نے ادا فرموائے ہیں کے ذریعہ مقرر کیا ہے ان پر قائم کے معنی پابندی کرنے اور تحفظ کرنے کے ہیں۔ قوله "المدهن" اس کو مدھن بالالف بھی کہتے ہیں، دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں، یہ لفظ گویا دہن بمعنی تیل سے شستہ ہے، مدھنت حق پوشی اور چا پلوسی کو کہتے ہیں یعنی منکر کو دیکھ کر باوجود قدرت کے نہ روکنے والا، گویا اس نے باطل پر خاموشی اختیار کر کے اس پر جواز کا تیل لگا کر اس کو چمکیلا بنانے کی کوشش کی ہے۔ قوله "استهموا" یعنی قرعہ اندازی کے ذریعے اس میں بیٹھنے کی نشستیں اور منزلیں تقسیم کیں۔ قوله "تصعدون" "فتح الیاء صعود سے بمعنی چڑھنے کے ہے جبکہ اصعاد باب افعال سے ہموار زمین میں چلنے کو کہتے ہیں: نفی الایة الکریمہ "اذ تصعدون" الخ ۱۰ بضم التاء ہے، تدبر۔ قوله "فیستفون" استقی فلا تا کسی سے پانی یا سیرابی چاہنا۔ قوله "فیصّبون" علی کا صلہ میں آنے کی وجہ سے متعدی کا ترجمہ کیا ہے۔

تشریح: - اس حدیث مبارک میں ایک مثال کے ذریعہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ بُرائی کے مرتکب ہونے والوں کے ہاتھ نہیں پکڑتے اور ان کو اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل سے باز نہیں رکھتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ جانیں اور ان کا کام جانے کیونکہ جب ان پر عذاب آئے گا تو وہ سب کو تباہ کر کے رکھ دے گا جیسے مذکورہ بالا مثال میں اگر بالائی منزل والے تحتانی منزل والوں کو نقب اور سوراخ سے نہیں روکیں گے تو کشتی میں پانی داخل ہو جائے گا اور اس طرح اوپر نیچے جتنے سوار لوگ ہیں سب غرق آب ہو جائیں گے۔

غرض دین اسلام کی مثال ایک کشتی کی طرح ہے اس میں سب لوگ بیٹھے ہوتے ہیں مگر اس کی حفاظت

اس سے مشروط ہے کہ کشتی میں نقب و سوراخ نہ کیا جائے ورنہ سب غرق ہوں گے لہذا منکرات سے اہل اسلام کی زندگیوں کو خطرہ ہے عظمیٰ کا تقاضا ہے کہ اگر قدرت ہو تو انہیں روکا جائے۔

باب افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر

”عن ابی سعید الخدری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان من اعظم الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر“۔^۱ (حسن غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بڑا جہاد ہے۔

لغات:۔ قولہ ”من اعظم“ ایک روایت میں ”افضل“ کا لفظ ہے۔^۲ قولہ ”کلمۃ عدل“ ایک روایت^۳ میں لفظ ”کلمۃ حق“ آیا ہے لہذا عدل سے مراد حق ہے۔ قولہ ”جائر“ جور سے بمعنی ظلم کے ہے۔ تشریح:۔ ظالم بادشاہ کے سامنے حق گوئی کو افضل جہاد اس لئے قرار دیا کہ ایسا کرنے والا میدان جنگ کے مجاہد سے زیادہ بڑا اور دلیر ہوتا ہے کیونکہ مجاہد کے شہید ہونے اور نہ ہونے کے دونوں امکانات ہوتے ہیں جبکہ اس کا بچنا بظاہر مستبعد لگتا ہے، اور اگر اس کی بات پر عمل کرتا ہو سلطان جائر ظلم سے باز آجائے تو بھی اس کا بڑا فائدہ ہوگا جو مسلمانوں کو نقد ملے گا۔

باب سوال النبی ﷺ ثلاثاً فی امتہ

”عن عبد اللہ بن حبّاب بن الآرت عن ابیہ قال: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ فاطا لها فقالوا: یا رسول اللہ اصلیت صلوۃ لم تکن تُصلیہا قال آجل أنها صلوۃ رغبۃ ورہبۃ انی سئلۃ اللہ فیہا ثلاثاً فاعطانی اثنتین ومنعنی واحده سألتہ ان لا یہلک امتی بسنۃ فاعطانیہا وسألتہ ان لا یسلط علیہم عدواً من غیرہم فاعطانیہا وسألتہ ان لا یدیق بعضہم بأس

باب افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر

۱۔ رواہ ابن ماجہ ص: ۲۸۹ ابواب الفتن وفيه: افضل الجہاد کلمۃ عدل الخ مسند احمد ص: ۳۴۲ ج: ۶۔

۲۔ کذا فی رواۃ ابن ماجہ حوالہ بالا۔

۳۔ کذا فی رواۃ مسند احمد ص: ۳۳۳ ج: ۶ حدیث: ۲۱۶۵۳۔

بعض فَمَنْعَنِهَا“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز پڑھائی تو اسے طویل فرمایا پس صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسی نماز پڑھائی جو پہلے اس طرح آپ نہیں پڑھاتے؟ فرمایا جی ہاں یہ امید و بیم کی نماز تھی کہ میں نے اس میں اللہ سے تین چیزیں مانگی تھیں دو تو مجھ کو عطا کر دیں اور تیسری منع کر دی، میں نے اللہ سے سوال کیا کہ میری امت کو (عام) قحط (خشک سالی) سے ہلاک نہ فرما تو اللہ نے قبول فرمایا اور میں نے اس سے یہ بھی سوال کیا کہ مسلط نہ کیجئے ان پر ان کے علاوہ کوئی (بیرونی) دشمن تو اللہ نے اس کو بھی شرف قبولیت بخشا اور میں نے اللہ سے یہ بھی دعا مانگی کہ ان کو ایک دوسرے کے جھگڑے نہ چکھائے تو یہ منظور نہ ہوئی۔

مختصر تشریح:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے اس مرتبہ اتنی لمبی نماز پڑھائی جو آپ کی سابقہ عادت شریفہ سے مختلف لگتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ رغبت و رہبت یعنی امید ورجا اور خوف و اندیشہ کی نماز تھی، امید دعا کی قبولیت کی تھی اور خوف عدم قبولیت کا تھا مطلب یہ ہے کہ عام نمازوں میں دعاؤں کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا تھا جبکہ اس نماز میں اللہ عزوجل سے امت کے لئے تین دعائیں مانگیں جن میں دو تو قبول ہو گئیں مگر ایک قبول نہ ہوئی جس کی وجہ اگلی روایت میں آرہی ہے کہ ازل میں یہ مقرر و مقرر تھا کہ اس امت مرحومہ میں آپس کے جھگڑے اور مصائب ہوں گے، جس میں اللہ عزوجل کی کوئی حکمت ہوگی جو بظاہر اللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان میں باہمی جھگڑے نہ ہوتے تو پھر اسلام ہمیشہ غالب رہتا حالانکہ اللہ نے قیامت کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے جس سے وہ مؤخر نہیں ہوگی اور اس کی آمد ہر خیر کے فنا ہونے پر موقوف ہے لہذا آپس کے جھگڑوں اور منکرات کے فروغ سے خیر میں کمی آتی رہے گی یہاں تک کہ ایمان پر چلنا دشوار ہو جائے گا اور منکرات کا راج قائم ہوگا اس طرح ہر شخص ایمان سے بھاگے گا حتیٰ کہ جب ایک بھی مؤمن نہیں بچے گا تو ان انسان نما جانور صفت لوگوں پر قیامت قائم ہو جائے گی۔

دوسری حدیث:۔ ”قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الله زوى لى الارض

باب سوال النبي ﷺ ثلاثاً في امته

۱۔ ابضا روى ابن ماجه ص: ۲۸۳ ”باب مايكون من الفتن“ ابواب الفتن روى بمعناه احمد فى مسنده ص: ۶۱۳ ج: ۳

فرأيت مشارقها ومغاربها وان امتي سيلغ ملگها ما زوي لي منها وأعطيت الكنزين الاحمر والابيض
وانی سألت ربی لأمتی ان لا یهلكها بسنة عامة وان لا یسلط علیها عدو آمن سوی انفسهم فیستبیح
بیضتهم وان ربی قال: یا محمد! انی اذا قضیت قضاءً فانه لا یرد وانی أعطیتک لا میتک ان لا أهلكهم
بسنة عامة ولا أسلط علیهم عدو آمن سوی انفسهم فیستبیح بیضتهم ولو اجتمع علیهم من
باقطارها او قال: من بین اقطارها حتی یکون بعضهم یهلك بعضهم یسی بعضهم بعضاً۔^۲

(هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ
بے شک اللہ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا پس میں نے اس کے مشرقی و مغربی حصوں کو دیکھ لیا اور بلاشبہ
میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں تک پھیلے گی جو میرے لئے لپیٹ دیئے گئے تھے، اور یہ کہ مجھے دو خزانے
سرخ و سپید کے دیئے گئے اور یہ کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ وہ میری امت کو عام
قطعہ سال سے ہلاک نہ فرمائیں اور ان کے سوا کوئی (بیرونی) دشمن ان پر مسلط نہ کریں جو ان کی مرکزیت
(جماعت) کو تباہ کر دیں، اور بے شک میرے رب نے فرمایا اے محمد! میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو وہ رد نہیں کیا
جاسکتا تحقیق میں تجھے اطمینان دلاتا ہوں تیری امت کے حق میں کہ نہ تو میں ان کو عام قطعہ کے ذریعہ ہلاک کروں
گا اور نہ ہی ان پر ان کے علاوہ کوئی (بیرونی) ایسا دشمن مسلط کروں گا جو ان کی اجتماعیت کو منتشر کرے اگرچہ وہ
سب لوگ ان کے خلاف اکٹھے ہو جائیں جو زمین کے (چاروں طرف) کناروں پر رہتے ہیں یا فرمایا کہ اطراف
و کناروں کے اندر جو لوگ رہتے ہیں، تا آنکہ یہ لوگ خود ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے
کو قید کریں گے۔

لغات: - قولہ ”زوی“ زویت کے معنی سمیٹنے اور لپیٹنے کے ہیں بظاہر یہاں سکیز نامراد نہیں بلکہ دکھانا
مراد ہے، اس کی ایک صورت اگرچہ یہ ہو سکتی ہے کہ زمین کو سکیز دیا گیا ہو مگر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ
جو یہاں بظاہر مراد ہے کہ نظر میں حدت و قوت پیدا کر دی گئی یہاں تک کہ وہ پوری زمین یا مفتوحہ علاقوں تک پہنچ
گئی یا اس زمین کی شبیہ دکھادی گئی ہو جیسے آج کل کے آلات سے نظر آتی ہے، راقم نے ”شعاعی تصویر کی حقیقت

۲ ایضاً رواہ ابن ماجہ حوالہ بالا، رواہ مسلم فی الفتن حدیث: ۱۹، سنن ابی داؤد ص: ۲۳۳ ج: ۲ کتاب الفتن

اور شرعی حیثیت“ میں نظر کے اصول اور آپ علیہ السلام کی نظر کی قوت تحریر کی ہے، فن شاء الاطلاع فلیراجع۔
 قولہ ”مازوی لی منها“ اگر ”من“ کو تعین کے لئے مانا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ زمین میں سے جتنے حصے
 اور مالک مجھے دکھادیے گئے تھے ان سب پر میری امت کا قبضہ ہو جائے گا جیسے مشاہدہ ہے، اور اگر
 ”من“ کو تفصیل کے لئے لیا جائے تو پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ زمین کے جتنے حصے جو کہ پوری زمین پر مشتمل ہیں
 مجھے دکھائے گئے ان سب پر میری امت کی حکومت قائم ہوگی تو پھر یہ حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد اور حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا۔

قولہ ”الکنزین الاحمر والابيض“ دونوں کنزین سے بدلیں ہیں اس لئے منصوب پڑھے جائیں
 گے، یہ ذکر خاص بعد العام ہے کیونکہ جب مفتوحہ علاقوں پر قبضہ ہو گیا تو کنزین پر بھی ہو گیا مگر اہمیت کے پیش
 نظر اور اظہار معجزہ کے لئے ارشاد فرمایا کہ روم اور فارس اور ان کے خزانوں پر بھی ہمارا جھنڈا لہرائے گا، احمر سے
 مراد سونا ہے جو سرخ رنگ والے رومیوں کا سکھ تھا جبکہ ابیض سے مراد چاندی ہے جو فارسی النسل سفید رنگ کے
 حامل لوگوں کی کرنسی تھی۔ قولہ ”فیستبیح بیضتھم“ بیضہ سے لغوی معنی انڈا مراد نہیں بلکہ اجتماعیت ہے کیونکہ
 جب انڈا ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے اندر سب کچھ بے معنی سا ہو جاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم و ملت کی مرکزیت
 و اجتماعیت منتشر کر دی جاتی ہے تو اس کے بعد ان کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں، بعض حضرات نے بیضہ کو خود سے
 کنایہ بنایا ہے جو بمعنی عسکری طاقت کے ہے، جو حکومت کے لوازمات میں سے ہے تو جب فوجی طاقت نہیں رہتی
 تو حکومت بھی نہیں بچتی۔ قولہ ”اقطارھا“ قطر کی جمع ہے بمعنی طرف و کنارہ کے۔ قولہ ”اوقال“ و شک من
 الراوی کے اظہار کے لئے ہے۔

تشریح:- یہ حدیث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ اس میں جو پیش گوئی
 آج سے تقریباً چودہ سو بیس سال پہلے کی گئی وہ اس پورے عرصہ میں واقعہ کے عین مطابق رہی ہے کہ ہر دور میں
 کفار نے انفرادی و جماعتی اور بین الاقوامی سطح پر طرح طرح کی بارہا کوششیں کی ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں
 کا استباحہ کریں یعنی ان کو جڑ سے اکھاڑ دیں مگر تادم تحریر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اگر کسی محاذ پر ان
 کو اہل اسلام کے گناہوں کی وجہ سے کامیابی مل جاتی ہے تو کسی اور جگہ مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہتا ہے جب
 مسلمانوں میں صلاح اور وحدت تھی تب تو کفار ان کے سامنے ہیچ تھے مگر جب گناہوں کو فروغ ملا تب بھی حالت
 یہ ہے کہ افغانستان پر اس وقت بیالیس ملکوں کے فوجی جن کی تعداد ہزاروں میں ہے سابقہ اسلامی حکومت کے

خلاف مصروف عمل ہیں اور تقریباً نو سال سے ان کو کوئی کامیابی نہیں مل رہی ہے بلکہ الٹا نقصان غیر ملکی افواج کو اٹھانا پڑ رہا ہے اگر بالفرض وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہیں تو اللہ عز و جل اس کے بدلے مسلمانوں کو کہیں اور غلبہ عطا فرمادیں گے۔ وما ذالک علی اللہ بھیز

باب ماجاء فی الرجل یكون فی الفتنۃ

عن ام مالک البہزۃ قالت: ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ففتنۃ فقرّبہا قالت: قلت: یا رسول اللہ! من خیر الناس فیہا؟ قال: رجل فی ماشیتہ یؤدّی حقہا ویعبّد ربّہ ورجل اخذ برأس فرسہ یخیف العدو ویخوفونہ“۔^۱ (غریب من هذا الوجه)

حضرت ام مالک، ہنریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فتنے کا تذکرہ فرمایا اور اسے (ہمارے خیال میں) بہت قریب کر دیا، فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس میں لوگوں میں سے کون بہتر ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جو اپنے مویشی کے ساتھ (دور افتادہ جنگل میں) ہو وہ ان جانوروں میں سے حق (واجبی) ادا کرتا ہو اور اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہو اور وہ شخص (بھی بہتر ہے) جو اپنے گھوڑے کا سر (لگام) پکڑے ہوئے ہو کبھی وہ شخص دشمن کو ڈرائے اور کبھی دشمن اس کو ڈرائیں۔

لغات:- قولہ ”فقرّبہا“ باب تفعلیل سے ہتھ دید الراء ہے قریب لانے کو کہتے ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر ایسے بلیغانہ انداز سے فرمایا کہ سامعین کو وہ بہت قریب آنے والا محسوس ہوا جیسا کہ قوت واہمہ و خیالی کا تقاضا ہے۔ قولہ ”فی ماشیتہ“ اگرچہ اس کا اطلاق مطلق مویشیوں پر ہوتا ہے مگر بخاری شریف وغیرہ کی روایات میں غنم کی تصریح ہے لہذا یہاں بھی بھیڑ، بکریاں مراد ہیں کیونکہ ان کے پالنے میں مؤنت کم اور منفعت زیادہ ہے ان میں لباس بھی ہے اور طعام بھی اور آدی جہاں جانا چاہے اپنے ہمراہ لے جاسکتا ہے۔ قولہ ”یخیف العدو الخ“ یعنی وہ جہاد میں مصروف عمل رہے جو کبھی دشمن پر غالب رہتا ہے اور کبھی دشمن اس پر غالب آجاتا ہے، یا نفس سرحدات کی پہر اداری مراد ہے۔

تشریح:- اس فتنے سے کیا مراد ہے؟ تو اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ باہمی جھگڑے مراد ہوں۔ دوم یہ کہ منکرات کا ہنگامہ مراد ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں بیک وقت مراد ہوں کیونکہ جیسے جیسے عہد پاک سے دوری آتی رہتی ہے تو ان برکات میں کمی آتی رہتی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میمون اور بعد کے صلحاء کی وجہ سے تھیں حتیٰ کہ ان اثرات کی کمی کے تناسب سے باہمی لڑائیوں اور منکرات کی رفتار میں اضافہ آتا رہتا ہے جو بالآخر رات کی تاریکی کی طرح چھا جائیں گے یا ایسی صورت حال میں لوگوں کو چھوڑ کر اپنا دین بچانا اہم عمل ہوگا خواہ جنگل میں پناہ گزین بن کر یا محاذ جنگ میں مجاہد بن کر ہو، کیونکہ اس میں لوگوں کی ہمنشینِ ایمان کے لئے خطرناک ہوگی اور عزت نشینی و علیحدگی دین کی حفاظت کی واحد راہ ہوگی چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الایمان اور بدء الخلق میں اس کے لئے مستقل باب قائم کئے ہیں:

”باب من الدین الفرار من الفتن“ وفیه... یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم

یتبع بها شَعَفَ الجبال ومواضع القطر یفرُّ بدینہ من الفتن۔“ (ص: ۷۷ ج: ۱)

رہبانیت اور عزت نشینی میں فرق:- بظاہر یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے تنہائی کی ترغیب معلوم ہوتی ہے حالانکہ تنہائی جس کا دوسرا نام رہبانیت ہے نصوص کی رو سے مذموم معلوم ہوتی ہے قال اللہ تعالیٰ: ”ورهبانیۃ ابتدعوها ما کتبنا علیہم الا ابتغاء رضوان اللہ فمارعوها حق رعایتہا“۔ (الحدید آیت نمبر: ۲۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ رہبانیت مذموم ہے لیکن باب کی حدیث میں جس مقصد کی طرف اشارہ ہے اس تنہائی کو اختیار کرنے اور نصاریٰ کی رہبانیت میں فرق ہے۔ نصاریٰ نے جو رہبانیت اختیار کر لی تھی وہ مقصد اعلیٰ کو چھوڑ کر بلا کسی مجبوری کے اپنائی گئی تھی جو خلافِ فطرت اور خلافِ شریعت ہے، فطرت کے خلاف تو اس لئے ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے باقی جانداروں کی طرح انسان میں تاسل و تواجد کی نہ صرف صلاحیت و دیت فرمائی ہے بلکہ اس کے شدید جذبات بھی اس کے اندر رکھے ہیں تو نہ تو آدمی ان جذبات کو ہمیشہ کے لئے دبا سکتا ہے اور نہ ہی رہبانیت کی صورت میں نوعِ انسانی کی بقاء ہو سکتی ہے پس ایسی رہبانیت بالآخر پلٹ کر فساد معاشرے کا سبب بنتی ہے کیونکہ راہب پر جب قوتِ شہوانیہ کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ اندھا بن کر حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر وہی کرتا ہے جو نصاریٰ کے راہبوں نے راہبوں کے ساتھ کیا کہ گرجوں کی جھاڑیوں

میں جا بجا جائز و مولود بچے ملا کرتے تھے۔ اور خلاف شریعت اس لئے ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو لے کر لوگوں میں پھیلا نا اور خود بھی ان پر عمل کرنا اور دوسروں سے بھی ان پر عمل کرنا انسانی زندگی کا بنیادی مقصد ہے جو معاشرے میں رہ کر ہی ممکن ہے، نیز جس طرح دوسروں پر عمل کی محنت ضروری ہے تو اسی طرح شادی کر کے بچے جنونا بھی اس نیک سلسلے کی اہم کڑی ہے تاکہ ان کی صحیح پرورش کر کے دوسروں کے لئے راہنما بنایا جاسکے، یہ کام بھی معاشرتی و تمدنی زندگی میں ممکن ہے علاوہ ازیں نوعی منفعت شخصی فائدے پر مقدم ہے لہذا خود کو لوگوں سے دور رکھ کر صرف اپنی ہی خدمت میں لگا رہنا معیوب ہے۔

لیکن اگر یہ مقاصد فوت ہو جائیں اور معاشرہ اتنا بگڑ جائے کہ انسانیت کا نصب العین ہی تباہ ہو جائے اور صورت حال اس طرح بن جائے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے اس کے وجود سے کسی کو کوئی دینی فائدہ نہ ہو بلکہ الناس کے دین کو ضرر پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو ایسے میں اگر نوعی فائدہ یکسر ختم ہو اور انفرادی و شخصی فائدے کو بھی داؤ پر لگایا جائے تو یہ شرع شریف میں کوئی کمال یا محمود و ممدوح نہیں بلکہ اس حدیث کے مطابق لوگوں سے بقدر ضرورت علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے یعنی یا محدود وقت کے لئے جیسے آپ علیہ السلام کا غار حراء میں قیام کرنا تھا یا مستقل طور پر جیسے اصحاب کہف نے کیا تھا اور آیت کریمہ میں نصاریٰ کی رہبانیت کی جو مذمت کی گئی ہے تو اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے لئے حالات نامساعد نہ تھے بلکہ یہ لوگ نارل حالات میں اللہ کی رضا جنگوں اور رہبانیت میں تلاش کرتے تھے جو سراسر غلط فہمی تھی اور پھر جو طریقہ انہوں نے خود ایجاد کیا تھا اس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔

رہا یہ مسئلہ کہ عزالت نشینی فطرت اور حکمت الہی کے منافی ہے تو یہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض عبث لوگوں کو جنونا بائیں طور کہ ساری دنیا مہمل لوگوں سے بھر جائے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ فرض یہ کیا گیا ہے کہ معاشرہ اپنی برائی کے آخری کنارے کو چھو رہا ہو تو اس میں اگر بچے پیدا بھی ہوں تو وہ بھی ماحول کے رنگ میں رنگے جائیں گے اس لئے جہنم کا ایندھن بڑھانے کے بجائے بچوں کی پیداوار کے اقدامات سے دور رہنا ہی منشاء الہی کے مطابق ہونا چاہئے، اور جہاں تک جذبات کو قابو کرنے کا تعلق ہے تو یہ بھی کوئی ناقابل عمل مسئلہ نہیں ہے کیونکہ جو لوگ شادی کرنے پر قادر نہ ہوں ان کے لئے ریاضتیں اور روزے ہیں، بگڑے ہوئے معاشرے کی عورتوں سے شادی کی اگرچہ بظاہر مالی قدرت ممکن ہے مگر اخلاقی جواز ختم ہو جاتا ہے جس سے قدرتِ حکمی کی نفی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم و عملہ اتم۔ اس کی کچھ تفصیل ”باب النبی عن

التبتل“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۴۲۱ ج: ۴)

باب کی دوسری حدیث:- ”عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تكون الفتنة تستنظف العرب قتلاها فی النار اللسان فیها شد من السیف“۔^۳ (غریب)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ایک فتنہ ہوگا جو عربوں کو گھیر لے گا اس میں مارے جانے والے جہنم میں ہوں گے، زبان اس میں تلوار سے زیادہ خطرناک ہوگی۔

قولہ ”تستنظف“ بمعنی تستوعب گھیر لے گا، استنظاف کے معنی کسی چیز کو پورا لینے کو بھی کہتے ہیں اور صاف ستھری لینے کو بھی کہتے ہیں جو نظافت سے ہے علی ہذا مطلب یہ ہوگا کہ عربوں کو صاف کر دے گا یعنی اچھے بُرے کی تمیز کر دے گا۔ قولہ ”قتلاھا“ قتل جمع قتل کی بمعنی مقتول ہے۔ قولہ ”فی النار“ ای ستکون فی النار کیونکہ ان کا یہ عمل دخول نار کا موجب اور سبب ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہیں ہے۔

تشریح:- بعض محققین و شارحین کی رائے میں اس فتنے سے مراد جنگ صفین یعنی حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والی لڑائی ہے، مگر اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں اکثریت صحابہ کی تھی تو ”قتلاھا فی النار“ کا کیا مطلب ہے پھر اس کی توجیہات پیش کی گئی ہیں کہ یہ حکم زجر و تغلیظ پر محمول ہے یا مذکورہ حکم خاصۃً العمل کے قبیل سے ہے یا یہ حکم صرف ان کا ہے جو اس لڑائی میں مارا جائے بچ جانے والوں کا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن راجح قول یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی اشارہ نہیں کہ یہ صحابہ کرامؓ کے مابین کسی لڑائی کے بارے میں پیش گوئی ہے بلکہ یہ غیر متعین زمانے میں پیش آنے والی کسی لڑائی کا ذکر ہے جس میں مسلمان باہم لڑ پڑیں گے چونکہ ان کے قتل و قتل کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ نہیں ہوگا بلکہ مال و جاہ اور عصبیت و قومیت ہوگی اس لئے وہ مذموم مقصد میں مرنے کی وجہ سے دوزخی ہوں گے، تاہم حدیث میں خلود کا کوئی ذکر یا اشارہ نہیں ہے۔

بہر حال اگر یہ صحابہ کرامؓ کے مابین لڑائی پر محمول کی جائے تو پھر اس میں زبان کو تلوار سے زیادہ سخت

۳ ایضاً رواہ ابوداؤد ص: ۲۳۶ ج: ۲ ”باب فی کف اللسان“ کتاب الفتن والملاحم، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۵ ”باب

کف اللسان فی الفتنة“ ابواب الفتن، مسند احمد ص: ۴۲۸ ج: ۲، حلیث: ۶۹۴، جمع الفوائد ص: ۵۵۳ ج: ۲ کتاب الفتن۔

کہنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ دورانِ جنگ لڑائی کو ہوا دینا اور جنگ کو بھڑکانا جنگ کرنے سے زیادہ بُرا ہے اور بعد میں صحابہ کرامؓ پر لعن و طعن کرنا ایمان کا صفایا کر دینے کے مترادف ہے اس لئے شرح عقائد میں ہے:

”وَيَكْفُ عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ الْإِبْعِيرُ لِمَا وَرَدَ مِنَ الْإِحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ فِي مَنَاقِبِهِمْ
وَوُجُوبِ الْكَفِّ عَنِ الطَّعْنِ فِيهِمْ كَقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَلَوْ أَنَّ
أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أَحَدِ ذَهَبًا مَبْلُغٌ مُدًّا أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفُهُ.... إِلَى أَنْ قَالَ
وَمَا وَقَعَ بَيْنَهُمْ مِنَ الْمَنَازَعَاتِ وَالْمَحَارِبَاتِ فَلَهُ مُحَامِلٌ وَتَاوِيلَاتٌ فَسَبَّهُمْ
وَالطَّعْنُ فِيهِمْ إِنْ كَانَ مِمَّا يَخَالِفُ الْإِدْلَةَ الْقِطْعِيَّةَ فَكَفِّرْ كَقَذْفِ عَائِشَةَ
وَالْإِفْبَدَةِ وَفُسْقِ الْخ... (ص: ۱۱۶)

مُحْشٰی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا قول نقل کیا ہے: ”تِلْكَ دِمَاءُ طَهَّرَ اللَّهُ مِنْهَا أَيْدِيَنَا فَلَا تُنَوِّثُ
السُّنَنُا بِهَا“۔

غرض اہل سنت والجماعت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے مشاجرات و منازعات میں گفت و شنید جائز
نہیں۔

اور اگر یہ حدیث کسی اور لڑائی کی طرف مشیر ہو تو پھر کسی تاویل کی ضرورت نہیں اور اس میں زبان کی
تاثیر کو اثرِ شمشیر سے زیادہ سخت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے جنگ کو ہوا دینا مسلمانوں کے قتل عام کا موجب
بنے گا جبکہ تلوار سے آدمی زیادہ لوگوں کو قتل نہیں کر سکتا ہے۔

باب ماجاء فی رفع الامانة

”عن حذيفة قال ثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم حديثين قد رأيتهما احدهما
وانا انتظر الآخر، حدثنا الامانة نزلت في حذر قلوب الرجال ثم نزل القرآن فعلموا من القرآن
وعلموا من السنة“۔

ثم حدثنا عن رفع الامانة فقال: ينام الرجل النومة فتقبض الامانة من قلبه فيظلل اثرها مثل
الوكت، ثم ينام نومة فتقبض الامانة فيظلل اثرها مثل اثر المحل كحجر دحرجته على رجله
فنفطت فتراها متبرأ وليس فيه شيء ثم اخذ حصاة فدحرجها على رجله قال فيصبح الناس يتبايعون

لَا يَكَادُ أَحَدٌ يُوَدِّي الْأَمَانَةَ حَتَّى يَقَالَ إِنَّ فِي بَنِي فَلَانٍ رَجُلًا مَبْنُوءًا حَتَّى يَقَالَ لِلرَّجُلِ: مَا أَجَلُهُ وَأَظَرُّهُ
وَأَعْقِلُهُ وَمَا فِي قَلْبِهِ مَثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ، قَالَ وَلَقَدْ أَتَى عَلِيٌّ زَمَانَ وَمَا بِالْبَالِي أَتَيْكُمْ بَايَعْتُ
فِيهِ لَشْنٍ كَانَ مُسْلِمًا كَبُرْتُ دَنَّهُ عَلَيَّ دِينُهُ وَلَئِنْ كَانَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا لَكَبُرْتُ دَنَّهُ عَلَيَّ سَاعِيهِ فَمَا الْيَوْمُ
فَمَا كُنْتُ أَبَايَعُ مِنْكُمْ إِلَّا فَلَانًا وَفَلَانًا“۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے
دو حدیثیں بیان فرمائی ہیں: ان میں سے ایک تو میں نے دیکھ لی ہے (یعنی ایک کا مضمون آچکا ہے) اور دوسری
(کے مصداق) کا میں انتظار کر رہا ہوں (۱) آپ علیہ السلام نے ہم سے کہا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی تہ
میں نازل ہوئی، پھر قرآن نازل ہوا پس لوگوں نے قرآن میں سے سیکھا اور سنت میں سے سیکھا۔ (۲) پھر آپ
علیہ السلام نے ہم سے رفع امانت کے بارے میں بیان فرمایا (یہ وہ دوسری حدیث شروع ہوئی) پس آپ علیہ
السلام نے فرمایا کہ ایک آدمی سوئے گا تھوڑا سا تو امانت اس کے دل سے لے لی جائے گی تو اس (امانت کی جگہ
خیانت لے لی گی جس) کا اثر بلکے نشان (دھبے) کی مانند رہ جائے گا، وہ پھر دوسری بار سوئے گا تو امانت لے لی
جائے گی پس رہ جائے گا اس کا منفی اثر آبلہ کی طرح (یعنی ایسا ہی) جیسے تم اپنے پاؤں پر چنگاری لٹھکا دے تو اس
سے چھالا پڑ جائے، تم اس کو پھولا ہو ادیکھو گے حالانکہ اس میں کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ علیہ السلام نے ایک کنکری لی
اور اسے پاؤں (کی پشت) پر لٹھکایا آپ علیہ السلام نے فرمایا پھر (حالت یہ ہو جائے گی اور) لوگ ایسے
ہو جائیں گے کہ وہ خرید و فروخت کریں گے ایسا نہیں لگتا کہ کوئی ایک امانت ادا کرے گا یہاں تک کہ کہا جانے
لگے گا کہ فلاں قبیلے میں ایک امانت دار شخص ہے اور یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ ایک آدمی کے بابت کہا جائے گا
کہ: کس قدر پخت اور دلیر ہے، کس قدر ہوشیار ہے اور کس قدر عقلمند ہے، دراصل حالیکہ اس کے قلب میں رائی
کے دانے کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے شک میرے اوپر ایسا زمانہ
آچکا کہ اس کے اندر میں تم میں سے خرید و فروخت کی پرواہ نہیں کرتا، اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کا دین اسے میرے
پاس لوٹا دیتا اور اگر وہ یہودی یا نصرانی ہوتا تو اس کا ذمہ دار (ضامن) اس کو میرے پاس لوٹا دیتا، جبکہ آج میں تم

باب ماجاء فی رفع الامانة

۱۔ رواہ البخاری ص: ۱۰۴۹ ج: ۲ "باب اذا بقى فى حثالة من الناس" ابواب الفتن، ابضا رواه فى الرقاق باب: ۳۵،
صحیح مسلم ص: ۸۲ ج: ۱ کتاب الايمان حديث: ۲۳۰۰.

سے فلاں فلاں کے علاوہ کسی سے معاملہ نہیں کرتا ہوں۔

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت پر ائمہ کا اتفاق ہے۔

لغات:- قولہ ”حدیثیں“ یعنی امانت کے بارے میں ورنہ ان کی احادیث کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ قولہ ”الامانة“ اس امانت سے کیا مراد ہے؟ تو اس بارے میں بہت سارے اقوال ہیں: قابل ذکر تین ہیں: پہلا قول جو زیادہ مشہور ہے اور عام حواشی و شروح میں مستور ہے یہ ہے کہ مراد وہ قوت استعداد ہے جس کی بناء پر انسان بزبان حال بڑی ذمہ داری یعنی مکلف ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: ”إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ“ (الحزاب ۷۲) کیونکہ صلاحیت جب اپنی اصلیت پر قائم و دائم ہو تو وہ ایمان میں تبدیل ہو کر دونوں کجیاں متحد ہو جاتے ہیں۔

دوسرا قول:- یہ ہے کہ مرد ایمان ہے، ابن العربی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قولیں مالا ایک ہیں:

”الامانة هي معان تحصل في القلب فيأمن بها المرء من الردى في الآخرة

والدنيا واصلها الايمان ويليها الوفاء بالعهد“ الخ۔ (كذافي العارضه)

تیسرا قول:- تیسرے قول کے مطابق امانت سے مراد مقابل خیانت یعنی دیانت داری ہے۔

اسمستر شد عرض کرتا ہے کہ ان تینوں اقوال میں کوئی خاص فرق نہیں کیونکہ یہ تینوں بیک وقت انسانی خوبیوں کا حصہ ہیں جیسے حیاء ہے پھر جس طرح حیاء کے انتفاء سے اعمال صالحہ اور پھر ایمان کی نفی ہو جاتی ہے اسی طرح امانت بمعنی دیانت داری کا تقاضا بھی ایمان ہی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ”لادین لمن لا امانة له“۔^۲

قولہ ”جذّر“ بفتح الجیم وسكون الذال، بعض نے جیم کو مسور بھی جائز کہا ہے، کسی بھی چیز کی جڑ کو کہتے ہیں، عارضہ میں ہے: ”جذّر“ اصل کل شیء من خشب او حساب او نبات“۔ قولہ ”الوكت“ یہ لفظ بفتح الواو وسكون الكاف بروزن شمس ہے، معمولی اثر و نشان کو کہتے ہیں جیسے خال جس کا رنگ سابقہ رنگ سے مختلف

۲۔ وفی رواية احمد لا ايمان لمن لا امانة له، ولا دين لمن لا عهد له، ص: ۵۹۳ ج: ۳۔ حدیث: ۱۱۹۷۵، ایضاً ص: ۲۲۲

ہو۔ قولہ ”المحل“ یہ بھی شمس کے وزن پر ہے، ہاتھوں پر محنت طلب کام سے پاپاؤں پر بوٹ کے تنگ ہونے سے جو چھالے پڑتے ہیں جسے آبلہ بھی کہا جاتا ہے، بہر حال غرض یہ ہے کہ یہ دوسرا اثر پہلے اثر سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ آبلہ خال سے زیادہ نمایاں اور بڑا ہوتا ہے۔ قولہ ”دحر جتہ“ دحرج کے معنی لڑھکانا۔ قولہ ”فنفطت“ ضرب و صبح دونوں سے آتا ہے مگر بکسر الفاء بعد النون زیادہ رائج ہے نفطت القدر نطفاً اس وقت بولا جاتا ہے جب ہانڈی سے تیز بھاپ کی دھاریں نکلیں، یہاں مطلب پھول جانا ہے۔

قولہ ”مستبراً“ بصیغہ اسم فاعل بمعنی ابھرا ہوا چنانچہ منبر کو بھی اس لئے منبر کہتے ہیں کہ وہ بلند و نمایاں ہوتا ہے۔ قولہ ”ما اجلده و اضرفه و اعقله“ تینوں فعل تعجب کے صیغے ہیں جلد بضم اللام فی الماضي و جلد افتح اللام فی المصدر صابر، باہمت اور جرأت مند کو کہتے ہیں یعنی بہادر، جبکہ ظریف ہوشیار کو کہتے ہیں، ظرافتہ کے معنی ذہانت و تیزی طبع کے ہیں۔ قولہ ”ساعیہ“ ملک اور سردار کو کہتے ہیں جیسا کہ قبائلی نظام میں ہوتا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک بڑا ہوتا ہے سب قبیلے والے اس کی بات کے پابند ہوتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد اس پر مقرر مسلمان والی و گمراہ ہو۔

تشریح:- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خوبیاں جو انسان کا اصل سرمایہ ہیں ناپید ہونا شروع ہوئی ہیں جو کسی وقت میں اپنے عروج پر تھیں چنانچہ انہیں خوبیوں کی وجہ سے جن میں سے ایک امانت ہے انسان قرآن و سنت کو سمجھنے کے قابل ہوا اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہا کیونکہ اسلامی تعلیمات وہاں جذب ہوتی اور کارگر ثابت ہوتی ہیں جہاں ان کے لئے ماحول سازگار ہو جیسے بارش سے صرف ذرخیز زمین فائدہ اٹھاتی اور نفع پہنچاتی ہے اب حال یہ ہوا ہے کہ لوگ ان خوبیوں سے اور خصوصاً امانت داری سے دنیا داری کی طرف بڑھ رہے ہیں ان کا محظوظ نظر دنیا ہے خواہ اس کے لئے دھوکا دینا پڑے یا خیانت کرنا پڑے، ان کی نظروں میں دنیا ہی کی قدر ہے دین کی قدر کم ہونا شروع ہوئی ہے حتیٰ کہ حالت یہ ہو جائے گی کہ جو آدمی دنیاوی مال و متاع جمع کرنے میں ماہر ہو تو اندر سے خواہ انسانی خوبیوں سے کتنا ہی خالی کیوں نہ ہو لوگ اس کی تعریف کریں گے کہ وہ اتنا بڑا ہے، ہوشیار ہے اور عقلمند ہے جیسے آج کل کاروباری لوگوں اور سیاسی لیڈروں اور کارکنوں میں اس کا مشاہدہ عام کیا جاسکتا ہے قوم کے یہ ہیر واپنی مکاری کی وجہ سے ہی تو لیڈر بن گئے ہیں، ملک کا خزانہ لوٹ کر بیرون ملک منتقل کر دیتے ہیں مگر ان کے ووٹرز ان پر اپنی جان فدا کرتے ہیں کہ وہ اس چیز کو کمال و ہنر، دلیری اور عقلمندی سمجھتے ہیں، اس سے بڑا بگاڑ کیا ہو سکتا ہے؟

عام طور پر اعمال نسیان کی وجہ سے زائل ہو جاتے ہیں مگر ابن العربی فرماتے ہیں کہ جب اعمال بہت کمزور ہو جائیں تو وہ نیند سے بھی ختم و کمزور ہو جاتے ہیں چنانچہ زمانے کے مرور کے ساتھ لوگوں کی حالت یہ ہو جائے گی کہ جب آدمی سو کر اٹھے گا تو اس کے دل میں فرق آیا ہوگا پہلے مرحلہ میں یہ ہوگا کہ ایمان کا جتنا نور اٹھے گا تو اس کی جگہ ایک ظلمت و تاریکی پکڑ لے گی مگر اس کی مقدار کم ہوگی جبکہ دوسری بار سونے سے یعنی دوسرے مرحلے میں اس ظلمت کا اثر گہرا ہو جائے گا جیسے چھالہ کی نسبت ہے خال اور نقطہ سے، چنانچہ اس کا مشاہدہ آج کل یوں ہو سکتا ہے کہ بچے عام طور پر جھوٹ، دھوکے اور خیانت سے پاک ہوتے ہیں جبکہ جوانی میں ان کی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے اور بڑھاپے میں ان کی خباثتیں مکمل پکی ہو جاتی ہیں، اگر کسی کو شک ہو تو اس کا تجربہ کر لے کہ کسی بھی میدان اور فیلڈ کے لوگوں کو آزمائے خواہ دوکاندار ہو یا سرکاری ملازمین یا پھر سیاسی لیڈر شروع میں ان لوگوں کو حرام خوری میں جھجک محسوس ہوتی ہے مگر آگے جا کر اس کی قباحت دل سے نکل جاتی ہے اور رشوت ستانی، دھوکہ دہی اور خیانت ان کی طبیعت ثانیہ راسخہ بن جاتی ہے چنانچہ چھوٹا لیڈر چھوٹا فراڈ کرتا ہے اور بڑا، بڑا کرتا ہے۔ الا ماشاء اللہ وقلیل ماہم

وقت گزرنے کے ساتھ ایمانی و روحانی کیفیت اتنی تیزی سے زائل ہوگی جیسے پاؤں پر چنگاری یا کنکری لڑھک جائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۶ھ کے اوائل میں بعد شہادت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئی ہے مگر وہ اپنے وقت میں اس تبدیلی کے آثار دیکھ کر فرماتے ہیں کہ پہلے میں کسی سے معاملہ میں کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا خواہ وہ کوئی بھی ہوتا اگر مسلمان ہوتا تو اس کا ایمان میرا حق دلانے پر اس کو مجبور کرتا اور اگر ذمی ہوتا تو اس کا بڑا میرا حق بحفاظت مجھے دلاتا مگر اب وہ بھروسہ متزلزل ہو گیا، اور میں معاملات میں بڑی احتیاط کرتا ہوں۔

جب اس زمانے کی یہ حالت ان کو پسند نہ آئی حالانکہ وہاں دیانت داروں کی اکثریت تھی تو آج کی حالت کو کون قبیح بخش اور اسلام و انسانیت سے ہم آہنگ قرار دے سکتا ہے؟؟؟

غرض ان کے دور میں خائن لوگ خال خال پائے جاتے تھے مگر وہ اس پر بھی تشویش ظاہر فرما رہے ہیں اور مرفوع حدیث کی پیش گوئی ذکر فرما رہے ہیں کہ پھر امانت دار لوگ خال خال ملیں گے، یہ پیش گوئی بالکل صاف آئی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے۔

باب لَتَرْكِبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ

”عن ابی واعدالیشی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَمَّا خَرَجَ اِلَى حُنَيْنٍ مَرَّ بِشَجَرَةٍ لِّلْمَشْرَكِيْنَ یَقَالُ لَهَا ذَاتُ اَنْوَاطٍ یُعَلِّقُوْنَ عَلَیْهَا اَسْلِحَتَهُمْ قَالُوا: یَا رَسُولَ اللّٰهِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ کَمَا لَهُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ، هَذَا کَمَا قَالَ قَوْمُ مُوسَى: ”اجْعَلْ لَنَا اِلَٰهًا کَمَا لَهُمُ اِلَٰهَةٌ“ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهِ لَتَرْكِبُنَّ سُنَّةَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو اعدالیشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حنین کی جانب نکلے تو مشرکین کے ایک درخت سے گزرے اس پر پیکر ذات الانواط کہا جاتا تھا اور وہ لوگ اس پر اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے (پس یہ دیکھ کر) لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے بھی ایک ذات الانواط مقرر فرما دیجئے جیسا کہ ان لوگوں کے لئے ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سبحان اللہ“ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: کہ ہمارے لئے ایک معبود بنادیں جیسے ان (مشرکین) کے معبود ہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم لوگ ضرور ان لوگوں کے طریقوں کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے تھے۔

لغات:- قولہ ”حُنَیْن“ بروزن زبیر، مکہ و طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے: ”و یوم حنین“۔ قولہ ”ذات انواط“ ای ذات تعلیق، نوط کے معنی تعلیق اور لٹکانے کے ہیں چونکہ جاہلیت میں لوگ اس سے اپنے ہتھیار لٹکاتے اس لئے یہ ذات انواط سے معروف ہو گیا یعنی وہ درخت جس پر اسلحہ لٹکایا جاتا ہے، حاشیہ کوکب میں برولیہ درمنثور وغیرہ کے ہے کہ یہ درخت بیر کا تھا،^۲ الکوکب الدری میں ہے کہ خوشی اور تہوار کے موقع پر لوگ اس کے پاس جمع ہوتے، اسلحہ اس پر لٹکا کر اس پاس کھاتے پیتے اور کھیلتے رہتے۔ قولہ ”لتربکن“ ای لتبعن اس میں لام تاکید کے لئے ہے رکوب بمعنی چلنے کے ہے از قبیل ذکر ملزوم والمراد منه الملازم۔

باب لتربکن سنن من کان قبلکم

۱ رواہ احمد فی مسنده ص: ۲۸۶ ج: ۶ حدیث: ۲۱۳۹۳ وفیہ: انکم ترکبون سنن الذین من قبلکم۔

۲ منہاج حوالہ بالا میں بھی ہے کہ وہ بیر کا درخت تھا جس پر کفار اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے اور اس کے گرد اعتکاف کرتے تھے۔

تشریح:- یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ علیہ السلام فتح مکہ کے بعد طائف تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں جنین کے مقام پر یہ درخت دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے یہ عرض پیش کیا، بظاہر عرض کرنے والے وہ صحابہ کرامؓ تھے جو ابھی ابھی فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی جبکہ مدینہ منورہ سے صحابہ کرامؓ کی تعداد دس ہزار تھی، ابن خلدون وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ کل بارہ ہزار تھے چونکہ ایک ہفتہ میں تمام تصفیہ طلب امور کا صفایا نہیں ہو سکتا اس لئے یہ سوال نو مسلموں کی طرف سے اٹھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں کیونکہ ان کا مقصد شرک کرنے کی اجازت طلب کرنا تھا بلکہ ایک قومی روایت سمجھ کر اس کی اجازت چاہی تھی، تاہم اس قسم کی تہذیبیات چونکہ مفہمی الی الشریک یعنی شرک کی طرف لے جانے والی ہوتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمادیا کہ اس قسم کی خواہشات کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، مگر تمام انسانوں اور آنے والی پوری امت کے دلوں کو اس غصہ سے خالی رکھنے کی کوشش سو فیصد کہاں کامیاب ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے اس لئے فرمایا کہ تم لوگ گزرے ہوئے لوگوں کے راستوں پر ضرور چلو گے۔

بعض روایات جیسے صحیحین وغیرہماؒ میں اس پر یہ اضافہ ہے: ”شیر آبشیر و ذراعاً بذراع حتی لو دخلوا جحر ضب لذحلتموه“ یعنی تمہاری پیروی و اتباع کا عالم یہ ہوگا کہ تمہارے اور یہود و نصاریٰ کے درمیان ایک بالشت کا اور ایک ذراع کا فرق بھی نہیں رہے گا حتیٰ کہ اگر وہ لوگ گوہ کے بل و سوراخ میں داخل ہوں تو تم لوگ بھی اسی میں داخل ہوں گے اس سے بڑھ کر کمال اتباع کیا ہو سکتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ امت سابقہ ام کے نقش قدم پر چلے گی، اس کے تاجران کے تاجروں کی راہ لیں گے، اس کی عورتیں ان کی عورتوں کا طور و طریقہ اپنائیں گی اور اس کے علماء ان کے علماء اور اس کے حکمران ان کے حکمرانوں کے پیچھے ہوں گے، یہ پیش گوئی بھی جوں کی توں صحیح نکلی ہے جو آپ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔

ہاں البتہ اس میں کفر کی پیروی کی بات نہیں کی گئی ہے باقی تمام معاصی و نافرمانیاں مراد ہیں حتیٰ کہ ان

۱۔ صحیح بخاری ص: ۴۹۱ ج: ۱ ”باب ما ذکر عن بنی اسرائیل“ کتاب الانبیاء، ایضاً رواہ فی الاعتصام باب: ۱۴،

صحیح مسلم ص: ۳۳۹ ج: ۲ کتاب العلم و رواہ ابن ماجہ ابواب الفتن باب: ۱۷، مسند احمد ص: ۲۰۳ ج: ۳،

ص: ۳۱۲ ج: ۳ حدیث: ۱۰۲۶۳ و ۳۳۰ ج: ۳ و ۵۰۶ ج: ۳۔

لوگوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اور جب انبیاء نہ ہوتے تو ان کے خلفاء کو قتل کر دیتے اس امت میں بھی ایسا ہی ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ورثہ خلفاء و علماء کو نہیں بخشا گیا۔

اشکال:- اس روایت میں لڑکین کے لام تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ اتباع ناگزیر ہے جبکہ بہت سی روایات میں یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے ممانعت بھی آئی ہے تو امر لازم سے نبی تو تکلیف بمآلایطاق سی لگتی ہے۔

حل:- اس کا جواب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ اگرچہ امت کی غالب اکثریت تو پیروی کرے گی مگر اس کے ساتھ ایک طائفہ منصورہ کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے علیٰ ہذا اتباع کی پیش گوئی اکثریت کے حوالے سے ہے جبکہ نبی کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہئے اور یقیناً ہوگی بھی جو ان یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے گریزاں ہوگی: ”ففسی النهی عن ذالک (التشبه) تکثیر لہذہ الطائفة المنصورة وتبیتہا و زیادۃ ایمانہا“۔ (“إقتضاء الصراط المستقیم، مخالفة اصحاب الجحیم“ ص: ۴۴) یعنی نبی میں ترغیب ہے کہ طائفہ منصورہ کے ساتھ رہو چنانچہ آج عام مسلمانوں کے لباس اور اطوار کو دیکھیں گے تو حدیث باب کا مصداق نظر آئے گا مگر جب کسی مدرسہ میں جائیں گے تو آپ کو پاکیزہ ماحول ملے گا۔

باب ماجاء فی کلام السَّبَّاع

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: والذی نفسی بیدہ لا تقوم الساعة حتی تکلم السباع الانس وحتى یکلم الرجل عذبة سوطہ و شِرَاک نعلہ و تخبر فحیدہ بما حدث اهلہ بعدہ“۔^۱ (حسن صحیح غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ باتیں نہ کریں درندے انسان سے اور جب تک بات نہ کرے آدمی کے کوڑے کا بھندنا اس سے اور اس کے جوتے کا تسمہ اس سے بات نہ کرے اور اس کی ران خبر نہ دے اس کی جو اس کے گھروالوں نے اس کے (گھر سے نکلنے

کے) بعد کیا ہے۔

لغات: قولہ ”السباع“ بکسر السین، سُبْح بفتح السین وضم الباء کی جمع ہے درندے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”عذبة“ یہ اور ”شِر اک اور فُزْد“ تینوں سباع کی طرح مرفوع ہیں کہ سب فواعل ہیں علیٰ ہذا اُنس اور رَجُل دونوں مفعولیت کی بناء ہر منصوب ہیں، عذبة بفتح العین و سکون الذال بروزن رحمة، بعض نے ذال کا فتح و کسرہ بھی جائز کہا ہے، کسی چیز کے کنارے کو کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہے، اس کے معنی اس ڈوری کے بھی آتے ہیں جس کے ذریعہ ترازو اٹھائی جاتی ہے مگر وہ یہاں مراد نہیں۔ قولہ ”شِر اک“ بکسر الشین، تسمہ۔

تشریح:۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بول چال کا فن ترقی میں اپنے عروج پر پہنچ جائے گا حتیٰ کہ وہ اشیاء بھی ناطق و گویا ہو جائیں گی جن میں بظاہر بولنے کی صلاحیت نہیں ہے، آج کے دور میں ثابت ہو گیا کہ لوہا بھی بولتا ہے اور پلاسٹک بھی، اگر اس حدیث کا مطلب یہ لیا جائے کہ بطور خرق عادت ایسا ہوگا تو پھر تو کوئی اشکال نہیں کہ عالم میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں تو جس طرح ماضی کے صحیح واقعات و روایات سے غیر ناطق کا بولنا ثابت ہے جیسے گائے اور بچے کا گہوارے میں بولنا تو مستقبل میں بھی ایسا ہو سکتا ہے جیسے بھیڑیا کا چرواہے سے بات کرنا وغیرہ علیٰ ہذا پھر حدیث باب حقیقی کلام پر محمول ہوگی۔

لیکن اگر اسے ایک امر معتاد کے طور پر لیا جائے تو پھر معنی مجازی مراد ہونگے اور یوں کہا جائے گا کہ اس تعبیر میں کسی معنی دیگر کی طرف اشارہ ہے کہ مثلاً سائنسی ترقی اس حد تک پہنچ جائے گی کہ مذکورہ بالا چار اشیاء بھی بولنے لگیں گی تو اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ بولنے سے مراد صوتی حروف ہوں جیسے ہم موبائل فون وغیرہ پر سنتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد کوئی اشارہ و سگنل دینا ہو چنانچہ آج کل موبائل فون پتلون کی جیب میں ہوتی ہے اور اس سے تار کے ذریعہ منہ اور کانوں سے رابطہ رہتا ہے اور کسی بھی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گھر سے باتیں کرتے رہتے ہیں، مزید بریں آج کل ”ٹریلنگ ڈیوائس“ پر بھی کام و تحقیق جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چپس جسے عام طور پر ران میں فٹ کیا جائے گا جو صوتی و تصویری وغیرہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جاسوسی نظام کے لئے تیاری کے مراحل میں ہے۔

جہاں تک درندوں کی بات چیت کا تعلق ہے تو اگرچہ یہ موضوع بھی زیر غور ہے مگر اس میں کامیابی بظاہر مشکل ہے کیونکہ سائنس دانوں کے پیش نظر اس وقت یہ بات ہے کہ جانوروں کے خلیوں میں D.N.A

میں تبدیلی کر کے اس میں انسانی D.N.A شامل کر لیا جائے جیسا کہ وہ چوہے پر انسانی کان اگانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ بولنے بھی لگیں مگر یہ امر خاصا پیچیدہ ہے کیونکہ اس کے لئے نفس گویائی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو سمجھنا اور زبان کی ساخت کو تبدیل کرنا وغیرہ بہت مشکل مراحل کو طے کرنا پڑے گا مع ہذا یہ کام سائنس دان چوری چھپے کرتے ہیں کیونکہ علانیہ طور پر کرنے سے ان پر مذہبی طبقے کی طرف سے منصوبہ ترک کرنے کے لئے دباؤ بڑھتا ہے، البتہ انسانی جسم میں D.N.A کی تبدیلی سے نسبتاً زیادہ آسانی سے انسان جانوروں کی زبان سمجھنے کے قابل بن سکتا ہے، کیونکہ انسان باصلاحیت ہے جبکہ جانور بات سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، اس پیراگراف سے یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ کوڑے کا کنارہ اور جوتے کا تسمہ کس طرح بولے گا؟؟؟

اور اگر مراد مطلق دلالت لی جائے تو پھر تو مطلب بہت ہی آسان ہو جائے گا کیونکہ آج کل پالتو کتے جن کو خاص تربیت دی جاتی ہے وہ بھی بولتے ہیں۔ تدر

باب ماجاء فی انشقاق القمر

”عن ابن عمر قال انفلق القمر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اشفهوا“۔ (حسن صحيح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم گواہ رہو۔

لغات:۔ قولہ ”انفلق“ ای انشق یعنی چاند پھٹ گیا اور دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ قولہ ”القمر“ کسی سیارے کے گرد سیارچے کا گھومنا اس سیارے کا قمر یعنی چاند کہلاتا ہے، مختلف سیاروں کے متعدد مثلاً درجن اور ڈیڑھ درجن تک چاند دریافت ہوئے ہیں، زمین کا ایک ہی چاند ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔

تشریح:۔ جمہور کے نزدیک سورہ قمر کی پہلی آیت: ”اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ“ سے بھی یہی مذکور فی الحدیث کا واقعہ مراد ہے اگرچہ عند البعض اس سے قیامت کے قیام کے وقت انفلاق مراد ہے۔

زمانہ قدیم میں فلاسفہ نے یہ غلط نظریہ مشہور کر دیا تھا کہ چاند نچلے آسمان میں اسی طرح پیوست ہے جیسے چھت میں کوئی کیل ہوتی ہے نیز ان کے نزدیک افلاک میں خرق و التیام کی گنجائش نہیں ہے یعنی یہ ممکن نہیں کہ

آسمان پھٹ جائیں یا پھر جڑ جائیں، مگر آج کل کی تحقیق سے یہ بات سو فیصد یقین تک پہنچ گئی ہے کہ چاند ہمارے کرۂ ارض کے گرد گھومنے والا ایک چھوٹے سائز کا قمر ہے بلکہ آج تو انسان کی رسائی بھی چاند تک ممکن بن گئی ہے بلکہ غالباً واقع ہو چکی ہے اور اگر ہم امریکہ کا دعویٰ اس حوالے سے جھوٹا قرار دے جیسا کہ ایک رائے ماہرین کی یہی ہے تو آئندہ تو یہ ممکن ہے کہ انسان چاند پر چڑھ بیٹھے۔

بہر حال یہ واقعہ خلاف عادت ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور اسی چیز کا نام معجزہ ہے اور یہاں کفار کو یہی بتانا تھا چنانچہ جب قریش کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مطالبہ کیا کہ اگر آپ ساحر و جادوگر نہیں تو آپ چاند کو شق کر دیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بزم (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر گردانتے تھے) ان کا جادو آسمانوں میں تو چل نہیں سکتا تو ہمارے اس مطالبہ سے آپ لا جواب ہو جائیں گے، مگر حضور علیہ السلام تو نبی تھے جادوگر نہیں تھے اس لئے ان کا مطالبہ پورا فرما دیا اور ان کو دکھا بھی دیا کہ تم گواہ رہو، چنانچہ یہ دیکھ کر بعض لوگوں کا مسلمان ہونا ثابت ہے جیسا کہ تفسیر عثمانی میں ہے: ”ہجرت سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبنی میں تشریف فرما تھے کفار کا مجمع تھا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی.... وفیہ.... تاریخ فرشتہ وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے کہ ہندوستان میں مہاراجہ ”مالیبار“ کے اسلام کا سبب اسی واقعہ کو لکھتے ہیں۔

بہر حال یہ واقعہ غیر معمولی ضرور ہے کہ معجزہ ہے مگر ناممکن نہیں اور صحیح اخبار سے ثابت ہونے کی بناء پر اس کا ماننا ضروری ہے اور جہاں تک یہ کہنا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا والے دیکھتے تو یہ سوال ایسا ہی جاہلانہ ہے جیسا کہ فلاسفہ کا پہلا والا اعتراض اور نظریہ احمقانہ تھا، یہ نظام افقی سے ناواقفیت پر مبنی ہے، پھر یہ واقعات کو پیش آیا کیا ضروری ہے کہ ان لمحات میں لوگوں کی نگاہیں آسمان پر لگی ہوئی ہوں اور یہ بھی لازمی نہیں کہ ہر جگہ کا مطلع صاف ہو، مع ہذا مکہ سے باہر مسافروں کی ایک جماعت کا دیکھنا ثابت ہے کہ جب قریش نے یہ بہانہ بنایا کہ اگر یہ جادو نہیں تو ہمارے علاوہ دوسروں نے بھی دیکھا ہوگا چنانچہ معلوم کرنے پر اسی کا ثبوت ملا تھا، تاہم بعض کے اسلام لانے کی وجہ سے عام عذاب نہیں آیا یا چونکہ سب نے نہیں دیکھا تھا اس لئے بعض کے انکار ایمان پر عذاب نہیں آیا۔

باب ماجاء فی الخسف

”عن حذیفہ بن اسید قال اشرف علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غرفة ونحن نذاکر الساعة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تقوم الساعة حتی تروا عشرا یات، طلوع الشمس من مغربها، ویا جوج ماجوج، والدابة، وثلاث خسوف، خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرة العرب، ونا تخرج من قعر عدن تسوق الناس او تحضر الناس فقیبث معهم حیث باتوا وتقبل معهم حیث قالوا“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانے سے ہماری طرف جھانکا دراں حالیکہ ہم آپس میں قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ (۱) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (۲) اور یا جوج و ماجوج (کا برآمد ہونا) (۳) اور دابہ (کا خروج) اور تین خسوف (۴) ایک خسف مشرق میں (۵) اور ایک خسف مغرب میں (۶) اور ایک تیسرا جزیرۃ العرب میں (۷) اور ایسی آگ جو عدن کی گہرائی (والی جگہ) سے نکلے گی ہانکے گی لوگوں کو یا فرمایا کہ (اوللشک من الراوی) جمع کرے گی لوگوں کو تو جہاں لوگ رات گذاریں گے وہ بھی ان کے ساتھ وہیں رات گزارے گی اور وہیں قیلولہ کرے گی جہاں لوگ قیلولہ کریں گے۔

اس روایت میں سات علامات کا تذکرہ مکمل ہو چکا، دوسری سند میں دھواں مذکور ہے اور تیسری سند میں دخان کے ساتھ دجال کا ذکر ہے گویا یہ نو ہو گئیں جبکہ دسویں نشانی یا تو ہوا ہے جو لوگوں کو آڑا کر سمندر میں پھینک دے گی یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یعنی آسمان سے اترنا ہے جیسا کہ ابو موسیٰ محمد بن اسمٰعیل کی روایت میں ہے۔

لغات: - قولہ ”اشرف“ اشراف بلند جگہ سے نمودار ہونا اور جھانکنا، مسلم^۲ میں بجائے اشرف کے ”اطلَعَ عَلَینَا“ کے الفاظ ہیں۔ قولہ ”غرفة“، بضم الغین بلندی پر بنا ہوا کمرہ جسے فارسی میں بالا خانہ کہتے

باب ماجاء فی الخسف

۱۔ الحدیث اخرجه مسلم ص: ۳۹۳ ج: ۲ کتاب الفتن، سنن ابی داؤد کتاب الفتن والملاحم باب: ۱۲، سنن ابن ماجہ

ابواب الفتن باب: ۲۱، مستدرک احمد ص: ۵۷۴ ج: ۴ حدیث: ۱۵۷۱۱۔

۲۔ مسلم جوالہ بالا اس میں دونوں لفظ ہیں پہلی روایت میں اطلع کا لفظ ہے، دوسری روایت جو ابی سرحہ سے ہے اس میں فاشرف کا لفظ ہے۔

ہیں، قرآن کریم میں اہل جنت کے محلات کے لئے ”غرفات“ کے لفظ میں اسی بلندی کی طرف اشارہ ہے۔
 قولہ ”یاسجوج وماسجوج“ الف اور ہمزہ ساکنہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے الف کی قرأت اکثر ہے،
 دو قبیلوں کے نام ہیں اس کے لئے آگے مستقل باب آرہا ہے۔ قولہ ”خسوف“ اور ”خسف“، سکون السین
 دونوں مصدر ہیں، زمین میں دھنس جانے کو کہتے ہیں۔

قولہ ”بحزیرۃ العرب“ جزیرہ دراصل وہ قطعہ زمین کہلاتا ہے جو چاروں اطراف سے پانی میں
 گھرا ہوا ہو مگر عرفاً و مجازاً عرب کو بھی جزیرہ کہتے ہیں اگرچہ یہ جزیرہ نما ہے حقیقی جزیرہ نہیں ہے۔ قولہ ”مین
 قعر عدن“ قعر کے معنی جڑ اور گہرائی کے ہیں اور عدن یمن کا مشہور شہر اور علاقہ ہے، بعض نے یمن کا ایک جزیرہ
 قرار دیا ہے جو صومالیہ اور جنوبی مغربی یمن کے درمیان بحر ہند اور بحر احمر کے ملنے کی جگہ خلیج عدن کے نام سے
 بہت مشہور ہے جہاں سے تقریباً دنیا بھر کے سمندروں جہاز گزرتے ہیں۔ قولہ ”تقیل اور قالوا“ دونوں قیلولہ
 سے مشتق ہیں، دوپہر کی استراحت کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں سات علامات قیامت کا ذکر ہے ان میں سے اولین یعنی سورج کے مغرب
 سے طلوع ہونے اور یا جوج و ما جوج کے لئے اس باب کے بعد امام ترمذی نے بالترتیب دو باب قائم کئے
 ہیں، اس پر بحث وہیں ہوگی۔

تیسری نشانی دابہ کا خروج ہے، لغوی اعتبار سے تو زمین پر چلنے والے ہر جانور کو دابہ کہا جاتا ہے مگر عرف
 عام میں وہ چوپایا جو سواری یا مال برداری کے لئے استعمال ہوتا ہے دابہ کہلاتا ہے۔

اس حدیث میں مراد وہی دابہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے: ”واذا وقع القول علیہم
 اخرجناہم ذابۃ“ من الارض تکلمہم ان الناس کانوا ابائیتنا لا یوقنون“۔ (سورہ نمل آیت نمبر: ۸۲)

قیامت اس موجودہ نظام اور محسوس عالم کا سب سے بڑا سانحہ و حادثہ ہے تو جس طرح کوئی بڑا واقعہ پیش
 آتا ہے اس سے پہلے اس کی نشانیاں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں مثلاً جب طوفان آتا ہے تو اس سے بہت پہلے
 تیز ہوائیں اور بارش ہونا ایک عام سی بات ہے جس کی شدت کا دار و مدار طوفان کے صغرو کبر پر ہوتا ہے،
 لہذا قیامت سے پہلے علامات کا ظاہر ہونا لازمی بات ہے۔

پھر ان علامات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک قسم کی علامات صغریٰ ہیں اور دوسری قسم کی کبریٰ

ہیں، علاماتِ صغریٰ کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے، راقم نے ”راہ معرفت“ میں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا ہے جبکہ اس حدیث میں علاماتِ کبریٰ کا ذکر ہے جن کی تعداد کم از کم دس ہے، علاماتِ کبریٰ اس وقت رونما ہوں گی جب قیامت بہت زیادہ قریب ہو جائے گی جبکہ صغریٰ تو کافی پہلے سے وجود پذیر ہیں۔ پھر باب کی حدیث میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، بہر حال کبریٰ میں سے ایک خروجِ دابہ ہے جس کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”هذه الدابة تخرج في آخر الزمان عند فساد الناس وتركهم أوامر الله وتبديلهم الدين الحق يخرج الله لهم دابة من الارض...“

یعنی جب آخری زمانہ میں لوگ گمراہ جائیں گے اور احکامِ خداوندی کو چھوڑ جائیں گے اور دینِ حق کو تبدیل کر جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے لئے زمین میں سے ایک دابہ نکال دیں گے پھر اس بارے میں متعدد احادیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سب علامات لگاتار رونما ہوں گی: ”وايتها كانت قبل صاحبيتها فالأخرى على اثرها قريباً“۔

ابن کثیرؒ نے ابوداؤد طیالسی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا خاتم (انگوٹھی) ہوگا، عصا سے کافر کی ناک توڑے گا اور خاتم (کی مہر) سے مؤمن کا چہرہ روشن ہوگا یعنی چمکے گا یہاں تک کہ لوگ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر مؤمن و کافر کی تمیز کر سکیں گے تاہم ترمذی کے حاشیہ میں عصا و خاتم کا عمل و اثر اس کے برعکس بتلایا ہے۔ (کذا فی روایۃ احمد وابن ماجہ) اور اس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ مؤمن کے چہرہ پر ”مؤمن“ لکھا جائے گا اور کافر پر مہر لگانے سے کافر لکھے گا، پھر ظاہر یہ ہے کہ یہ دابہ کوہ صفا سے برآمد ہوگا، اس کی لمبائی ساٹھ گز کے برابر بتائی گئی ہے، یہ چوپایوں کی طرح چار ٹانگوں پر چلے گا بدن پر پشم یعنی اُدن ہوگی اور مختلف متعدد جانوروں کے نمونوں پر مشتمل ہوگا، کوئی آدمی اس کو پکڑ نہیں سکے گا اور نہ ہی کوئی اس سے بھاگنے میں کامیاب ہوگا۔

حدیث الباب میں تین خسوف کا ذکر ہے حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ نے الکوکب میں فرمایا ہے کہ

۱۔ سنن ابن ماجہ ص: ۲۹۵ ابواب الفتن باب دابة الارض قال تخرج الدابة ومعها خاتم سليمان بن داود وعصا موسى بن عمران عليهما السلام فتجلبوا وجه المؤمن بالعصا وتختم انف الكافر بالخاتم الخ، مسند احمد ص: ۲۷۵ ج: ۳ حدیث: ۹۹۸۸، ایضاً رواہ الترمذی فی کتاب التفسیر سورة: ۲۷۔

یہ تینوں ایک ہی نشانی ہیں علیٰ ہذا حدیث الباب میں راوی نے دس کا احاطہ نہیں کیا ہے۔

بعض شارحین حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ تینوں خسوف واقع ہو چکے ہیں، مگر ظاہر یہ ہے کہ ان کا واقع ہونا ابھی باقی ہے کیونکہ پیچھے عرض کیا جا چکا کہ اس حدیث میں علامات کبریٰ کا ذکر ہے اور یہ کہ علامات لگاتار اور قریب بقیامت رونما ہوں گی، حاشیہ کوکب پر ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے رسالے مسماۃ بہ "اشرط الساعۃ" میں میلان ظاہر کیا ہے کہ یہ تینوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوں گی۔

قولہ "ونار تخرج من قعر عدن" اٹخ ظاہر یہ ہے کہ یہ آخری نشانی ہے کیونکہ لوگوں کو محشر کی طرف یعنی شام کی جانب جہاں محشر ہوگا لے جانے سے مراد ان کو میدان محشر کی طرف ہانکنا ہے، جن روایات میں ہے کہ: "تخرج من الارض الحجاز" شہ تو دونوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ حجاز راستہ میں پڑتا ہے اس لئے تطبیق یوں ہوگی کہ یمن سے آنے والی آگ حجازی آگ سے آٹے گی، آج کل جزیرہ نماعرب تیل کی سیال دولت اور زیر زمین بلکہ زیر سمندر ذخائر سے لبالب ولبریز ہے ممکن ہے کہ اس میں مزید اضافہ ہونے کی وجہ سے یہ خطہ کسی وقت آگ پکڑ لے مگر اس آگ کا لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار کے مطابق چلنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلبۃ الارض کی طرح اللہ کی طرف سے کوئی زندہ نشانی یا کم از کم دنیاوی آگ سے مختلف شے ہے۔ واللہ اعلم

قولہ "وزاد فیہ الدخان" ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی دخان ہے جو سورۃ دخان میں مذکور ہے: "فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین، یغشی الناس هذا عذاب الیم"۔ (آیت نمبر: ۱۰، ۱۱) اگرچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے اس آیت کے متعلق یہ ہے کہ اس سے مراد وہ خیالی دھواں ہے جو بھوک کی وجہ سے ضعف بصارت کی بناء پر اور نضاء میں خشک سالی کی وجہ سے آلودگی کی بناء پر نظر آتا ہے جو قریش کے بایکاٹ کے دوران آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعاء کی بدولت قریش مکہ کو نضاء میں نظر آتا تھا غرض یہ دھواں گذرا ہے اب یہ آنے والا نہیں ہے۔

مگر باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علامات قیامت میں سے ہے جس کا آنا باقی ہے، بہت سے محققین نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور بہت سارے صحابہ کرامؓ نے بھی ان کی موافقت کی ہے جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں ہے، علاوہ ازیں اس میں کچھ قرآن

کا بھی سہارا لیا گیا ہے مثلاً آیت میں لفظ ”مبین“ سے ظاہر ایہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دخان کو ہر ایک دیکھے گا جبکہ پہلی تفسیر میں یہ صرف بھوکے کو بطور خیال نظر آتا، اسی طرح لفظ ”یغشی الناس“ سے بھی اس کا عام اور کثیف ہونا معلوم ہوتا ہے یہ صرف اہل مکہ کے لئے نہیں ہے نیز ”ہذا عذاب الیم“ سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

ترمذی کے محشی نے لمعات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ دھواں مشرق تا مغرب ہوگا یعنی بہت زیادہ ہوگا، چالیس دن تک رہے گا، مؤمن اس سے صرف اتنا سا متاثر ہوگا جیسے زکام میں ہوتا ہے یعنی چھینکیں آتی ہیں جبکہ کافراں خود رفتہ بن جائیں گے، بظاہر یہ دھواں ایٹمی جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آلودگی و تابکاری سے مختلف ہے کیونکہ ایٹمی اثرات سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

قولہ ”والعاشرة اماریح تطرحهم فی البحر و امانزل عیسیٰ بن مریم“ اس سے سابقہ روایت میں دجال کا بھی ذکر ہے جس کے لئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے لئے آگے مستقل الگ الگ ابواب آرہے ہیں۔ جہاں تک اس طوفانی ہوا کا ذکر ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینکے گی تو شارحین حدیث سے اس بارے میں تفصیل مروی نہیں ہے البتہ آگے ترمذی میں ”باب ماجاء فی نقتة الدجال“ کے تحت ایک طویل حدیث کے آخر میں اس ریح کا ذکر آیا ہے جو یا جوج و ما جوج کے بعد بچنے والے مسلمانوں کی جانوں کے قبض کا سبب بنے گی، اسی طرح مسلم جلد اول میں کتاب الایمان کے باب فی الریح التي فی قرب القیمة“ الخ اور جلد ثانی ص ۳۹۴ پر بھی یہ حدیث ہے: ”ثم یسعث اللہ ریحاً طیبة فتوفی کل من فی قلبه مثقال حبة من خردل من ایمان فیقی من لاخیر فیہ فیرجعون الی دین ابائهم“ جبکہ کتاب الایمان میں ہے کہ یہ ہوا ریشم سے زیادہ نرم ہوگی، ایک روایت میں ہے کہ یہ یمن سے آئے گی جبکہ دوسری میں شام کی تصریح ہے، امام نووی فرماتے ہیں:

”و یجاب عن ہذا ابو جہین احدہما یحتمل انہما ریحان شامیة و یمانیة و یحتمل ان

مبدأہما من أحد الاقلمین ثم تصل الآخر و تنتشر عنده و اللہ اعلم۔ (مسلم ص: ۵۷ ج: ۱)

ممکن ہے کہ حدیث الباب میں مذکورہ ہوا اس ریح طیبہ سے بھی مؤخر ہو جو کفار کو اڑا کر ادھر سے ادھر اور خشکی سے بحر و صحرا میں پٹک دے گی کما قال اللہ تعالیٰ: ”یوم یکون الناس کالفراش المبثوث و تكون الجبال کالعین المنفوش“۔^۱

حدیث آخر:- ”عن صفیة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا ینتہی الناس عن

غزوہ ہذا البیت حتی یغزو جیش حتی اذا كانوا ابالبيداء او ببیداء من الارض خُصِفَ بِأَوَّلِهِمْ وَاخِرِهِمْ
وَلَمْ يَنْجُ اَوْ سَطُّهُمْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَمَنْ كَرِهَ مِنْهُمْ قَالَ: يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ عَلَى مَافِي انْفُسِهِمْ“۔ (حسن
صحیح) کے

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگ
اس گھر (کعبہ) پر حملے سے نہیں رکیں گے یہاں تک کہ ایک لشکر حملہ آور ہوگا جب یہ لشکر بیداء مقام یا فرمایا کہ کسی
اونچے میدان تک پہنچ جائے گا تو اس کا اگلا حصہ اور پچھلا حصہ دیا جائے گا اور درمیانہ بھی نہیں بچے گا، میں نے
عرض کیا اے اللہ کے رسول! ان میں جو اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوگا؟ (یعنی اس کا کیا بنے گا؟) آپ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا اللہ ان کو اپنی اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا۔

لغات:۔ قولہ ”غزو“ حملہ کرنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”البيداء“ بَدْو سے بمعنی ظاہر ہونے کے، وہ
میدان جو کھلا اور اونچائی پر ہو، راوی کو شک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ بیداء فرمایا جو مسجد والحدیفہ کے
قریب مشہور و معروف مقام ہے یا مطلق بیداء فرمایا جو کہیں بھی ہو۔

تشریح:۔ جیسا کہ لغات کے عنوان میں عرض کیا گیا کہ غزوہ حملہ کرنے کو کہتے ہیں لہذا ”لا يستهسى
الناس عن غزوہ ہذا البیت“ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار و فجار کی طرف سے کعبہ شریفہ زادھا اللہ شرفاً و عزاً پر
متعدد حملے ہوں گے یا کم از کم منصوبے بنائے جائیں گے۔ مذکورہ بالا حدیث میں صرف ایک حملہ آور لشکر کا ذکر
ہے جو سب زمین میں دھنس جائے گا البتہ مسلم ^۵ کی روایت کے مطابق ایک سرکش کو بچا لیا جائے گا تا کہ وہ
واپس جا کر لوگوں کو اطلاع کر سکے، بعض روایات میں ہے کہ دو آدمی بچیں گے ان میں سے ایک اپنے حکمرانوں
کو اطلاع کرے گا اور دوسرا حضرت مہدی کو خوشخبری دے گا۔ پھر ظاہر یہ ہے کہ لشکر کعبہ کی طرف جاتے ہوئے
راستہ میں تابود ہو جائے گا، تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ کب رونما ہوگا مگر جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ
علامات گمبئی لگا تا رونما ہوں گی علیٰ ہذا اگر اس حنف کو کبریٰ میں شمار کیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ یہ حضرت
مہدی کے زمانہ میں ہوگا۔

آخری حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنف، مسخ اور تذف کا تذکرہ فرمایا تو ام

المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اس وقت بھی ہلاک ہوں گے جب ہمارے درمیان نیک لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نعم اذا ظهر الحبث“ ہاں جب گناہ عام ہو جائیں گے، حبث بفتح ح تیس فجور یا زنا کو کہتے ہیں اور اگر ہم بضم الحاء وسکون الباء ہو تو خباثت بھی گندگی اور شرارت کو کہتے ہیں یعنی جب بد باطنی کے ساتھ گندے کام عام ہوں تو پھر سب پر عذاب آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بُرے لوگوں کی معیت و دوستی بھی بد انجامی کا سبب ہے اس لئے حتی الامکان بُرائی کی جگہ اور بُرے لوگوں سے دور رہنا چاہئے۔

اس مسئلہ کی کچھ وضاحت ”باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر“ میں گزری ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها

”عن ابی ذر قال دخلت المسجد حين غابت الشمس والنبی صلی اللہ علیہ وسلم جالس فقال: یا ابا ذر! اتدري اين تذهب هذه؟ قال قلت: اللہ ورسوله اعلم قال: فانها تذهب لتستأذن فی السجود فليؤذن لها وکانها قد قبل اطلعی من حيث جئت فتطلع من مغربها، قال ثم قرأ: وذلک مستقر لها وقال ذالک قراءة عبد اللہ بن مسعود“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب سورج اوجھل ہو رہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ذر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی اللہ ورسوله اعلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک یہ جاتا ہے تاکہ سجدہ کرنے کی اجازت طلب کرے تو اسے اجازت مل جاتی ہے اور گویا اس کو حکم ملا کہ وہیں سے طلوع ہو جا جہاں سے تم آئے ہو، پس یہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا فرمایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: ”وذلک مستقر لها“ (اور یہ اس کا ٹھکانا ہے) اور حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا: یہ عبد اللہ بن مسعودؓ کی قراءت ہے۔

باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها

۱۔ ایضاً روی بمعناه مسند احمد ص: ۹۷ ج: ۶ وص: ۲۰۸ ج: ۶ حدیث: ۲۰۹۳۸ عن ابی ذر الغفاری، ورواه الترمذی فی کتاب التفسیر ایضاً۔

لغات:- قولہ ”وکانہا قلیل لہا“ علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی مستقبل کی چیز یقینی ہو تو اس کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرتے ہیں قرآن شریف میں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں جیسے: ”اتنی امر اللہ فلا تستعجلوه“۔ (نحل آیت نمبر ۱) چونکہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا طے شدہ امر ہے اس لئے ”قیل“ ماضی کا صیغہ ذکر کیا ہے جبکہ ”کانہا“ میں قرب کی طرف اشارہ ہے۔ قولہ ”مستقر لہا“ قرار سے ہے جائے سکون یعنی ٹھکانا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مستقر سے مراد یومیہ حرکت کا منتہی ہے جبکہ بعض حضرات نے سالانہ حرکت میں انقلاب صیغی وشتوی کو لیا ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ مراد اس سے نظام شمسی کا منتہی ہے کیونکہ یہ کہکشاں رواں دواں ہے، علاوہ ازیں بھی بہت سارے اقوال ہیں۔

تشریح:- دو اصولی اعتراضات اور ان کے اصولی جوابات:-

(۱)۔ زمین گول ہے:- پہلا اعتراض: یہ ہے کہ زمین گول ہے اور وہ اپنے محور کے گرد محوری حرکت کرتی ہے جبکہ سورج اپنی جگہ ساکن ہے پس اس محوری حرکت کے نتیجہ میں دن رات پیدا ہوتے ہیں بایں طور کہ اس گردش میں جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو اجمل رہتا ہے وہاں رات ہوتی ہے، علی ہذا نہ تو سورج چلتا ہے اور نہ ہی طلوع و غروب کسی مخصوص گھڑی میں منحصر ہیں بلکہ ہر آن بیک وقت سورج طالع بھی ہے اور غارب بھی، پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

جواب:- یہ جواب ایک اصول و تمہید پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے خطاب میں عام لوگوں کی فہم کی بہت زیادہ رعایت کی گئی ہے اس لئے عام بات متفہم الناس کے مطابق کی جاتی ہے اور یہ طرز کلام امثال، تذکیر بایام اللہ، صفات باری تعالیٰ اور کائناتی نظام سب میں اختیار کیا گیا ہے کیونکہ اگر بطور تحقیق الحقیقت بات کی جاتی تو بجز خاص الخاص لوگوں کے کوئی بھی اس کا مطلب نہ سمجھ پاتا مثلاً اگر طلوع کی نسبت بجائے سورج کے زمین کے افق یا زمین والوں کی طرف کی جاتی تو یقیناً یہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی۔

علی ہذا چونکہ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ سورج چلتا اور طلوع و غروب ہوتا ہے اس لئے یہ نسبت سورج ہی کی طرف مناسب ہے تاکہ جو اصل مطلوب ہے یعنی لوگوں کو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر لانا وہ پورا ہو سکے اس لئے ہر آدمی اپنی سمجھ کی بساط کے مطابق اللہ جل شانہ پر ایمان کا مکلف ہے جو تفصیلی ایمان سے قاصر ہے اس کے لئے مجمل بھی کافی ہے۔ اس اصولی تمہید کے بعد اصل اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مستقر سے مراد ٹھہرنے کی جگہ نہیں

جو حقیقی مستقر ہوتی ہے بلکہ اضافی ہے یعنی سورج جس افق پر ہوتا ہے اس سے بجانب مشرق رہنے والوں کے لئے وہی مستقر و مغرب ہے جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

”فالمراد بذلك ان كل قوم تغرب عليهم او تطلع فان ذلك استقرار لها بالاضافة

الينا وان كانت هي في حركتها الدائمة الغائبة عنا وهو استقرار في المشاهدة

عنا فعبّر عن زوال الحركة المشاهدة بالاستقرار بالاضافة الينا“ الخ۔

یعنی سورج جن لوگوں کے حس و مشاہدہ سے غائب ہو جاتا ہے ان کی نسبت وہی مغرب سورج کا مستقر ہے اگرچہ سورج اس وقت بھی جاری و ساری رہتا ہے، علیٰ ہذا سورج کے سجدہ سے مراد ہر وقت اللہ کے حکم سے چلنا ہے کہ جب طلوع و غروب ہر آن میں لازمی ہیں تو اجازت بھی آنفاً نا ضروری اور تعمیل بھی لازمی ہے جس کو سجدہ سے تعبیر کیا اور یہی مطلب عرش کے نیچے جانے کا ہے کیونکہ وہ ہر وقت عرش کے نیچے ہی ہوتا ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سورج ہر وقت اللہ کے حکم کے ماتحت چلتا ہے، اسی کے ملک و سلطنت میں رواں دواں ہوتا ہے اور اسی کے حکم کا ہر وقت منقاد ہوتا ہے اور جب اسے واپسی کا حکم ہوگا تو وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا بلکہ واپس پلٹ کر مغرب سے غروب ہوگا جو جمعہ کی رات ہوگی لوگوں پر بہت طویل ہوگی اور جب نصف النہار کے دائرے تک مثلاً بارہ گھنٹے واپس چلے گا تب اس کو معمول کے مطابق چلنے کا حکم ہوگا۔

سورج کے واپسی کے ساتھ ہی تو بہ کا دروازہ بند ہو جائے گا البتہ ایک قول کے مطابق اس کے بعد نئے گناہوں سے تو بہ قبول ہوگی مگر تو بہ کرنے والے کہاں ہوں گے؟ کہ لوگ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے پھر تو بہ کس چیز سے کریں؟

(۲) ... نیوٹن کا اصول:- نیوٹن ایک مشہور سائنس دان گذرے ہیں ان کے اصول دنیا میں آج

تقریباً اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کسی زمانے میں افلاطون وغیرہ کے مقبول عام تھے اگرچہ افلاطون والوں کے بہت سے اصول آج غلط ثابت ہوئے ہیں مثلاً فلک الافلاک کی گردش، ستاروں کا چھٹے آسمان میں ہونا، سورج کا چوتھے اور چاند کا نچلے آسمان میں ہونا وغیرہ وغیرہ مگر نیوٹن تا حال سائنس کی دنیا کے ہیر و شمار ہوتے ہیں، ان کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو حرکت دی جائے تو جب تک کوئی مانع حرکت پیش نہ آئے وہ حرکت دائمی ہوگی علیٰ ہذا چونکہ زمین سورج سے ایک دھماکے کے نتیجے میں علیحدہ ہو گئی تھی تو اس وقت جو رفتار اس کی محوری حرکت کی تھی وہ ابد الابد تک باقی رہے گی، علیٰ ہذا یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب دن رات زمین کی محوری گردش کا نتیجہ

ہیں اور یہ گردش دائمی ہے تو پھر سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے لئے زمین کی حرکت میں تبدیلی چاہئے۔

علم طبیعیات کے قوانین کا جائزہ:۔ دراصل یہ قانون ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اگر اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے تو اصل حقیقت باسانی منکشف ہو جائے گی، غلط فہمی یہ ہے کہ جب دو چیزوں کے درمیان تسلسل سے معیت دیکھی جائے تو وہاں لزوم کا یقین سا ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان تلازم ہے اور یہ نفسیات صرف آج کے انسان کی ہی نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے انسان اس بیماری کا شکار چلا آ رہا ہے مثلاً ہزاروں سال پہلے نام نہاد حکماء نے عالم کے قدیم ہونے کا نظریہ اس لئے پیش کیا تھا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے قیامت برپا ہوتی ہوئی نہیں دیکھی تھی، مشرکین عرب نے کسی مردے کو قبر سے اٹھتا ہوا میدان محشر کی جانب جاتا ہوا نہیں دیکھا تھا تو پہلے فریق نے کہا کہ عالم قدیم ہے کیونکہ اگر حادث ہوتا تو اب تک ختم ہو جانا چاہئے تھا جبکہ دوسرے نے حشرا جساد کا انکار کیا کیونکہ ان کے بزعم اگر قیامت کی بات سچ ہوتی تو اب تک آجانی چاہئے تھی۔

علیٰ ہذا القیاس لوگ جب بھی آگ کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ حرارت کا بھی تصور کرتے ہیں اور دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اسی پر باقی اشیاء کو قیاس کر لیا جائے مگر حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ اجسام طبعیہ کو دیکھتے ہوئے یہ غلط فہمی پیدا ہونا اگرچہ متبادر ہے لیکن یہ قاعدہ اس وقت درست ہوتا جب یہ تقاضے ان اجسام کے ذاتی ہوتے اور ان میں کسی طرح بیرونی قدرت کا عمل دخل نہ ہوتا، پس جن لوگوں نے ان مقتضیات کو اجسام طبعیہ کی ذوات تک محدود رکھا انہوں نے ان قواعد کو کلیات کی حیثیت دیدی اور کلیات بھی ایسی جن سے کسی طرح کبھی بھی تخلف و انفکاک نہ ہو سکے حالانکہ یہ ضروری ہے کہ ان مقتضیات میں کبھی کبھار انفکاک و تخلف بھی آئے۔

چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عادت شریفہ تو یہی ہے کہ جب اشیاء پیدا فرماتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ تاثیرات ضرور پیدا فرماتے ہیں مگر یہ لزوم عادی ہے یہ نہ تو تولیدی ہے جیسے معتزلہ کہتے ہیں اور نہ ہی اعدادی ہے جیسے حکماء کہتے ہیں جس کی وضاحت ”باب کرہیۃ البول فی المغتسل“ میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد: اول ص: ۱۳۸)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی صفت تدبیر سے اشیاء میں ایک ترتیب مقرر فرمائی ہے طعام میں بھوک

مارنے اور پانی میں پیاس بجھانے کی خصوصیت ضرور رکھی ہے جس سے لزوم کا تاثر ملتا ہے مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر ماہیت میں اس قاعدے سے کچھ استثناء بھی ہوتی ہے تاکہ لوگ اس تلازم کو مادہ اور جسم کی طبیعت کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ اللہ عز و جل کو اس کا خالق و مالک مانیں جس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جس آگ میں ڈالے گئے تھے تو وہ اس تاثیر سے خالی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کو قتل کر دیا تھا وہ ماہیت انسانی یعنی فطرت سے معر تھا، لاشی غیر جاندار چیز ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اثر دھابن کرسا حروں کی لاشیوں اور رسیوں کو ہڑپ کر گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے، بعض دفعہ آدمی بغیر اسباب ظاہریہ کے ہوا میں معلق ہوتا ہے جس کو ٹیلی پتھی کا اصول بھی تسلیم کرتا ہے جو برطانیہ و جاپان میں جاسوسی کے حوالے سے خاصا مقبول ہے۔

غرض اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسباب تو پیدا کئے ہیں مگر اپنا وجود منوانے کے لئے بعض دفعہ ان کی تاثیرات کو سلب کرتا ہے اور بعض دفعہ افراد کو ماہیت کے حکم و تقاضا سے الگ کرتا ہے، اس لئے شہد کی مکھیوں میں پھولوں کا رس چوسنے کا مزاج ڈالا مگر بعض پیشاپ پر بیٹھی ہیں، بعض کھیر اکڑا ہوتا ہے اسی طرح ہسپتال کے ڈاکٹر جمع ہو جاتے ہیں اور ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں مگر ان کے درمیان سے مریض کی جان پرواز کرتی ہے ان کا سارا نظام قفل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک روز ایسا آئے گا جب دنیا کے معاملات و حقائق الٹ جائیں گے کینے اشرف بن جائیں گے اور اشراف بے قدر کر دئے جائیں گے تو اللہ عز و جل اس نظام زمان کو پلٹ دے گا تاکہ لوگوں کے لئے درس عبرت ہو مگر اس وقت صرف بصارت ہوگی بصیرت نام کی کوئی چیز باقی نہ ہوگی، اگر طول کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس موضوع کو تھوڑا سا اور آجا کر کرتا مگر ”العاقل تکفیه الاشارة وللجاهل لاتکفی المنارة“۔

باب ماجاء فی خروج یاجوج وماجوج

”عن زینب بنت جحش قالت استیقظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نوم مُحَمَّرٌ وَجْهُهُ وَهُوَ يَقُولُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَرُدُّ دُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَيَلُّ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرِّ قَدَاقَتَرَبَ فَتَحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدَمٍ يَاجُوجُ وَمَاجُوجُ مِثْلَ هَذِهِ وَعَقْدَ عَشْرٍ أَقَالَتْ زَيْنَبُ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! افْتَهْلِكْ وَفِينَا

الصالحون؟ قال: نعم اذا اكثر العُجب^۱۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ام المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ تین بار اس کو دہرایا، ہلاکت آگئی عربوں کی ایک قریب آنے والے شر سے، آج یا جوج و ماجوج کی دیوار میں اتنی جگہ کھل گئی اور (اس کے ساتھ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس کا عقد بنالیا، حضرت زینبؓ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ہلاک ہوں گے جبکہ ہمارے سرمیان نیک لوگ بھی ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں جب گناہ عام ہو جائیں گے۔

لغات:۔ قولہ ”محمر“ بروزن مضطر یعنی تشدد ید الرءاء احملاً اشیء اس وقت کہتے ہیں جب وہ بتدریج سرخ ہو جائے۔ قولہ ”ردم“ بروزن شمس، سد سکندری مراد ہے یعنی وہ دیوار جس کو ذوالقرنین نے بنایا تھا۔ قولہ ”یا جوج و ماجوج“ یہ اللفین اور ہمزتین دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، دونوں عجمی نام ہیں، بعض نے عربی کہا ہے اگر ان کو عربی مانا جائے تو پھر یہ دونوں کس سے مشتق ہیں، اس میں اختلاف ہے کسی نے کہا کہ احيى النار سے مأخوذ ہے، اَحْيَا النَّارَ اَحْيَا اَوْ اَحْيَا اس وقت کہتے ہیں جب آگ بھڑک جائے، بعض نے کہا کہ اَحْيَا بمعنى اختلاط کے ہے، وفيه اقوال آخر قولہ ”وعقد عشراً“ دس کا عقد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کے ناخن کا سرا ابراہام کے جوڑ سے اندر کی جانب ملا کر حلقہ بنایا جائے۔

تشریح:۔ اس حدیث مبارک میں جس قرہی شر کا ذکر ہے اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ یا جوج و ماجوج کے علاوہ کسی دوسرے فتنے کی طرف اشارہ ہو جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی ناپاک جسارت مثلاً۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہی یا جوج و ماجوج کا فتنہ ہو اور عربوں کی تخصیص ان کے علو مقام کی وجہ سے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت عجمی دنیا سے اسلام کی بساط لپیٹ دی گئی ہوگی اور صرف عربوں بلکہ جزیرہ نما عرب تک باقی ہوگی جیسا کہ باقی روایات سے ثابت ہے کہ اسلام سب کر حجاز کی طرف ایسا ہی آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں، اور جنگلی بکری پہاڑ کی چوٹی میں پناہ لیتی ہے۔

اس روایت میں اور بخاری شریف کی روایت میں بظاہر تعارض سا معلوم ہوتا ہے جس میں ہے: ”دخل

علیہا یوماً فزعاً“^۱ مگر ان میں تطبیق آسان ہے کہ آپ علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے اور جلد ہی ان کے گھر میں تشریف لے گئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور گلاب کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔

اسی طرح اس روایت کا اس سے بھی تعارض نہیں ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسعین یعنی نوے کا عقد بنایا تھا^۲ کیونکہ اصل مقصد عدد بتانا نہیں تھا بلکہ حلقہ اور سراخ کا اندازہ بتانا تھا، عارضہ میں ہے: ”وفقهہ انہ لم یقصد بہ العدد فی عارض قولہ: ”انامۃ امیۃ“ وانما جاء لیبان صورة معينة خاصة“۔

اس باب میں تین باتیں قابل ذکر ہیں، ان ہر سہ مسائل پر مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے قصص القرآن میں بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش ہے۔ حدیث باب میں اگرچہ ذوالقرنین کا تذکرہ نہیں ہے مگر یہ تینوں مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس لئے کچھ عرض مناسب ہے۔

(۱) ذوالقرنین کے نام اور نسب میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ سکندر نام کی دو شخصیتیں گذری ہیں، بعض مفسرین ومؤرخین نے ان کو خلط ملط کر کے پیش کیا ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے اصل صورت حال اس طرح پیش کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا، دوسرا شخص اسکندر بن فیلیس (مقدونی) تھا لوگ اس دوسرے مقدونی کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے حالانکہ دونوں کے درمیان دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ حائل ہے، مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے گذرا ہے اور اس کا وزیر ارسطاطالیس (ارسطو) فلسفی تھا، یہ ایک بت پرست، مشرک، ظالم بادشاہ تھا، یہ شخص رومی و یونانی تھا جبکہ ذوالقرنین جن کا تذکرہ قرآن میں ہے، عربی سامی موحدا عادل بادشاہ تھا ان کا وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ امام بخاری کے طرز سے بھی اس کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال جعفر و چین کی جانب ہے اور نہ اہل مغرب میں سے تھا اور نہ ہی یمن والوں میں سے تھا بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان علاقہ کا باشندہ تھا بلکہ وہ سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے

۱ حوالہ بالا۔ ۲ کذا فی روایۃ البخاری ص: ۴۷۲ ج: ۱ کتاب الانبیاء عن ابی ہریرۃ ایضاً ۷۸ ج: ۲ ”باب الاشارة

فی الطلاق“ کتاب الطلاق، مستند احمد ص: ۱۳ ج: ۳ حدیث: ۸۲۹۶ وفیہ: وعقد وھیب تسعین۔

تھا جن کا نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے اس پر بہت زور لگایا ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں اکثر روایات تاریخی اعتبارات سے صحیح نہیں ہیں اس لئے ان کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا وہ بادشاہ ہے جو ۵۵۹ قبل از مسیح علیہ السلام گذرے ہیں جن کا نام خورس (سارس) ہے ان کو یہود خورس، یونانی سارس اہل فارس گورس اور عرب مؤرخین خسرو کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ شخص اس دور میں گذرے ہیں جب وسیع تر ایران دو حصوں میں منقسم تھا، شمالی مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) اور مغربی حصہ کو فارس کہا جاتا تھا، یہ شخص اپنی مقبولیت کی بناء پر ان دونوں حکومتوں، بابل اور نینوی کو باہم ملانے میں کامیاب ہوا، اسی نے بخت نصر کے جانشین نیل شازار کو شکست دی اور یہود کو دوبارہ بیت المقدس میں آباد کیا اور آسمانی مذہب کو پروان چڑھایا، اس کی دلیل مولانا نے یہ دی ہے کہ قرآن میں ذوالقرنین کا قصہ یہود کے سوال کے جواب میں بیان ہوا ہے لہذا اس کا مصداق ایسا شخص ہونا چاہئے جس سے یہود کے حالات و مفادات وابستہ ہوں اور وہ یہی خورس ہیں کیونکہ بخت نصر نے یروشلم (بیت المقدس) کو تاخت و تاراج کر کے یہود کو قتل و قیدی بنایا، ان میں سے ایک حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے، پھر جب بخت نصر مر گیا تو ذوالقرنین یعنی خورس بابل کو فتح کر کے یہود کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔

(۲).... دوسرا امر: ذوالقرنین کی دیوار سے متعلق ہے، بقول مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کے خورس (ذوالقرنین) کی مغربی فتوحات کے منتہی سے مراد بحر اسود ہے جبکہ مشرق سے مراد کرمان ہے کہ یہاں کی آبادی ہر طرح کی انسانی سہولیات درختوں اور چھتوں سے خالی تھی، تیسرا سفر بجانب شمال کر کے بحر کسپین سے آگے کوہ قاف کے پہاڑی سلسلوں کے ایک درے کے درمیان مضبوط دیوار قائم کر کے مشرقی ایشیائی ممالک چین اور منگول کے لوٹ مار کرنے والوں کا راستہ بند کر دیا چونکہ وہ پہاڑی سلسلے انتہائی دشوار گزار اور برف پوش ہیں اس لئے درے کے بند ہونے سے زمینی رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ چونکہ ایشیا اور یورپ کے درمیان حد فاصل کوہ قاف جسے ”کاؤ کاس“ کہتے ہیں کا پہاڑی سلسلہ ہے جس کی لمبائی شمالاً و جنوباً بارہ سو کلومیٹر ہے، یہ بحیرہ کسپین سے آزر بائجان، آرمینیا اور جارجیا کے مغرب میں اور مغربی روس تا بحر اسود پھیلا ہوا ہے، اور اس کے مشرق میں دوسرا سلسلہ ”اورال“ کا ہے

یہ انتہائی شمال یعنی قطب شمالی کے قریب سے شروع ہوتا ہے اور جنوب کی طرف بڑھتا ہوا ماسکو کے مشرق میں قازقستان کے انتہائی جنوب میں جا کر ختم ہو جاتا ہے اس کی لمبائی دو ہزار چار سو (۲۴۰۰) کلومیٹر ہے۔

دوسری طرف چین، افغانستان اور تاجکستان کے سنگم پر پامیر دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں کا مصدر منبع ہے اس سے کوہ ہمالیہ، قراقرم اور کوہ ہندو کش بھی نکلتے ہیں جن میں اول الذکر برما تک پہنچتا ہے، یہ بھی دو ہزار چار سو کلومیٹر لمبا ہے، جبکہ قراقرم پاکستان میں اور ہندو کش افغانستان میں جا نکلتے ہیں، اسی پامیر سے دو اور پہاڑی سلسلے نکلتے ہیں، یہ دونوں چین کے اندر ہیں، ایک بجانب مشرق جاتا ہے اس کو ”کولون“ کہتے ہیں، یہ تقریباً سولہ سو کلومیٹر لمبا ہے جبکہ اس کے ساتھ دوسرا بھی تقریباً سولہ سو کلومیٹر ہے، یہ پہلے شمال میں کرغیزستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر مشرق کی جانب مڑ جاتا ہے۔

اس کے برعکس ”اورال“ کے مشرق جو روس کا مغربی حصہ بنتا ہے سے بحر شمالی کے ساحلی علاقے یعنی شمالی مشرقی روس سائبیریا تک پورا علاقہ میدانی و صحرائی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ چین اور منگولیا سے پیدل سفر کرنے والوں کے لئے مشرق وسطیٰ تک رسائی کا آسان راستہ شمالی ایشیاء کی ساحلی پٹی اور ماسکو کے راستے پہاڑی دروں سے ہوتا ہوا بحر کاسپین تک ہی تھا بالفاظ دیگر چائنا اور منگولیا کے لوگ شمال میں ساحلی علاقے میں پہلے مغرب کی جانب جا کر پھر جنوب کی طرف مڑ کر دروں میں سے ہوتے ہوئے آرمینیا، آذربائیجان اور دیگر علاقوں کی طرف جا نکلتے اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کرتے، جس کی روک تھام کے لئے ذوالقرنین نے پانک بند کر دیا، اور اس قسم کی دیواریں اس زمانے میں تحفظ کا کامیاب ذریعہ تھا چنانچہ چینیوں نے بھی منگولیوں سے بچنے کے لئے دیوار بنائی تھی جو آج تک قائم ہے۔

(۳).... یا جوج و ما جوج کون ہیں؟ بقول مولانا حفیظ الرحمن صاحبؒ کے یہ دراصل اسی خطے کے دو قبیلے ہیں جس کا ذکر ابھی اوپر گذر گیا یعنی منگولیا تاتار اور چینی، ان کے دو بڑے قبیلے ہیں ایک کا نام ”موگ“ ہے اور دوسرے کا نام ”یوچی“ (یوایتی) ہے، موگ تقریباً چھ سو برس قبل از مسیح یونان میں میک اور میگاگ بنا اور عربی میں ”ما جوج“ ہوا جبکہ غالباً یہی یوایتی (یوچی) یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یا جوج کہلایا۔ (قصص القرآن ص: ۹۵ تا ۹۷ جلد: سوم و چہارم، دارالاشاعت)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ مولانا موصوف کی یہ تحقیق اپنی جگہ بہت وقیع سرمایہ ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ کے عین مطابق ہو مگر اس میں جو بڑی خامی رہ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں ان احادیث کی طرف کوئی

اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے جو صحیح ہے ٹھیک ہیں کہ یا جوج و ما جوج کے بارے میں بہت ساری من گھڑت روایات بھی پائی جاتی ہیں جن میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا مگر جہاں تک باب کی روایت ہے تو یہ صحیح ہے، شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ امام دارقطنیؒ نے اپنی اس کتاب ”العلل الواردة فی الاحادیث النبویہ“ میں جہاں امام بخاریؒ کی بہت سی احادیث پر اعتراضات کئے ہیں، باب کی حدیث ان میں شامل نہیں۔

بہر حال اگر مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کی تحقیق کو صحیح مانیں تو آج کے حالات کی روشنی میں یہ کہنا شاید بجا ہو کہ روس اور چین دونوں گرم پانیوں کی تلاش میں عرصہ سے مارے مارے پھر رہے ہیں، چین، پاکستان کی آوجھت کر رہا ہے تاکہ اس کو کراچی اور گوادریک رسائی حاصل ہو مگر دوسری طرف امریکہ نے پاکستان کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا ہے، مع ہذا بھارت امریکہ کے اشارے پر قراقرم پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے، ممکن ہے کل حالات ایسے بنیں کہ چین کے لئے یہ واحد راستہ بند ہو جائے اور وہ روس کے ساتھ مل کر شمالی روس کی ساحلی محفوظ پٹی کا راستہ استعمال کر کے اس پانک کو دوبارہ کھولیں جس کو ذوالقرنین نے بند کیا تھا، چونکہ چین، منگول اور روس نظریاتی اعتبار سے بھی ایک ہیں اور سیاسی اعتبار سے بھی امریکہ و یورپ کے حریف ہیں اس لئے مستقبل میں ان کا اتحاد اور گرم پانی تک رسائی کے لئے سد ذوالقرنین کو دوبارہ کھولنا مستبعد نہیں، یہ وہ زمانہ ہوگا جب مشرق وسطیٰ کی سیال دولت تیل میں دنیا والوں کے لئے بہت جاذبیت ہوگی ملکوں اور قوموں کی موت و حیات کا دار و مدار تیل پر ہوگا، اس لئے لڑنا اور مرنا ایک ضروری اقدام سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

سوال :- رہا یہ سوال کہ باب کی روایت کے مطابق یا جوج و ما جوج اس سد یعنی دیوار میں سُراخ کر چکے ہیں اور یہ بات تو سابق الذکر کیس منظر سے مطابقت نہیں رکھتی؟

جواب :- تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں خواب کا ذکر ہے اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بلا شک و شبہ اگر چہ وحی ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خواب عالم مثال میں دیکھا جاتا ہے اور عالم مثال میں اشیاء دنیا میں وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی مجسم ہو کر دکھائی دینے لگتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ خواب میں جو بات دیکھی جائے وہ اسی وقت عالم مشاہدہ میں واقع ہو چکی ہو یا جلد واقع ہو جائے بلکہ اس میں سالہا سال بھی لگ سکتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرے کا خواب ہے، علی ہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرب قیامت کے مناظر، اشراف و فتن عالم مثال میں دیکھتے تھے اور قیامت تک پورا منظر ان کے

سامنے تھا اس کا یہ مطلب لینا کہ جو کچھ انہوں نے بیان فرمایا، وہ فوراً اور بالفعل رونما ہو شاید صحیح نہ ہوگا، پس مطلب یہ ہوا کہ جب یا جوج و ماجوج اس دیوار کو گرانے کی کوشش کریں گے تو اس میں وہ اپنے آلات کے ذریعہ سوراخ کریں گے مگر ان کو کامیابی نہیں ملے گی، ایک دن وہ ان شاء اللہ کہیں گے خواہ عہد اہویا غیر ارادی طور سے پس وہ اس سوراخ کو بڑا کرنے میں کامیاب ہوں گے اور سب قفقاز، کوہ قاف اور دیگر پہاڑوں سے ہوتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں داخل ہوں گے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

مگر اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جس کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پُر اسرار مخلوق ہو جو اللہ نے اپنے حکم و حکمت سے ہماری نظروں سے اوجھل رکھی ہو اور جب حکم ہوگا تو وہ کوڈ پڑے گی، اس لئے قدیم شارحین حدیث نے اس مسئلہ پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے چنانچہ امام نوویؒ کی عادت خوب تشریح کرنا ہے مگر وہ اس مسئلہ پر خاموشی سے گزرے ہیں۔

ملفوظ:- اگر کسی کو پہلی تحقیق پسند ہو تو حدیث کی جو شرح راقم نے عالم مثال کے حوالے سے کی ہے اس کے لئے عالم مثال کی حقیقت سمجھنا لازمی ہے جو حجۃ اللہ البالغہ لشاہ ولی اللہؒ اور تحقیق الروایا لشاہ عبدالعزیزؒ کے دیکھنے اور سمجھنے پر موقوف ہے۔

روایات سے جو امر مترشح ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اولاً اہل مغرب کے ساتھ مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کی لڑائی ہوگی اور میدان جنگ مشرق وسطیٰ کا علاقہ ہوگا، شروع میں مسلمانوں کو برتری نصیب ہوگی پھر یہود جو کہ آج کل امریکہ و یورپ پر بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اپنے دجال کے ساتھ میدان میں کوڈ پڑیں گے پھر وہ حالات رونما ہوں گے جن کا تذکرہ ان شاء اللہ آگے ابواب میں آ رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل فرمائیں گے اور یہود کا خاتمہ فرمائیں گے ثانیاً اتنے میں یا جوج و ماجوج کا طوفان اُٹھ آئے گا، گویا پہلا سیلاب مغرب سے آئے گا اور دوسرا مشرق سے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب ماجاء فی صفة المارقة

”عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: يخرج فی آخر الزمان قوم احدثت الاسنان سفهاء الاحلام، يقرءون القرآن لا يجاوز تراقيهم يقولون من قول خير البرية يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية“۔^۱ (حسن صحيح)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آخری زمانہ میں ایک ایسی قوم نکلی گی جو کہ جواں سال ہوگی خفیف القتل ہوگی وہ لوگ قرآن پڑھیں گے وہ ان کی ہنسی کی ہڈی سے آگے نہیں بڑھے گا (یعنی گلے سے) وہ خیر البریہ کے مطابق بات کریں گے (یعنی آیات کو نقل کریں گے) نکلیں گے وہ دین سے ایسے جیسے تیر نشانہ سے گزرتا ہے (یعنی پار ہو جاتا ہے)۔

لغات:- قولہ ”احداث“ حَدَث بروزن قمر کی جمع ہے نئی اور تازہ کو کہتے ہیں مراد چھوٹی عمر ہے۔ قولہ ”الاسنان“ سن کی جمع ہے بمعنی عمر کے۔ قولہ ”سفهاء الاحلام“ حلم بکسر الحاء کی جمع ہے عقل کو کہتے ہیں اور سفہاء سفیہ کی جمع ہے جیسے فقہاء جمع فقیہ اور حکماء جمع حکیم کی ہے، سفہ خفت و ہلکا پن کو کہتے ہیں، سفیہ وہ آدمی ہوتا ہے جس کی عقل کم اور رائے ناقص ہو جو نفع نقصان کے مواقع نہ جانتا ہو چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر بچوں اور عورتوں کو سفہاء کہا گیا ہے قال اللہ تعالیٰ: ”ولا تاتوا السفهاء اموالکم التي جعل اللہ لکم قیاماً“۔^۲ قولہ ”تراقیہم“ ترقوتہ کی جمع ہے ہنسی کی ہڈی کو کہتے ہیں اور مجازاً حلق و گلے پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے۔ قولہ ”من قول خیر البریہ“ مراد اس سے قرآن پڑھنا ہے جیسے کہ مسلم کی متعدد روایات میں تصریح ہے۔ قولہ ”الرمیہ“ بمعنی مفعول یعنی مرمیہ، نشانہ کو کہتے ہیں یعنی جیسے تیر یا آج کل گولی نشانہ کو چیر بھاڑ کر نکلتی ہے اسی طرح یہ لوگ بھی دین سے یا اطاعت خلیفہ سے بنا بر اختلاف قولین نکلیں گے۔

تشریح:- چونکہ اسی باب میں آگے اس کی تفسیر خوارج سے کی گئی ہے جو حوراء کے رہنے والے تھے، یہ مقام کوفہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، یہ خوارج کا مرکز تھا اور مسلم کتاب الزکوٰۃ کے آخر میں

باب ماجاء فی صفة المارقة

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۴۷۲ ج: ۱ کتاب الانبیاء، ایضاً فی المناقب والمغازی والتوحید وغیرہ، ومسلم فی کتاب الزکوٰۃ، ابوداؤد کتاب السنۃ باب: ۲۸، سنن نسائی زکوٰۃ باب: ۷۹، ابن ماجہ مقدمہ باب: ۱۲، مؤطا مالک مس القرآن باب: ۱۰، مسند احمد ص: ۳۷۱ ج: ۳ حدیث: ۱۰۶۲۵۔ ۲۔ سورة النساء آیت: ۵۔

”باب اعطاء المؤلفۃ... ویان الخوارج“ کے میں بھی متعدد روایات بعض اشارۃ اور بعض صراحۃ اس پر ناطق ہیں کہ اس کا مصداق خوارج ہیں اس لئے آخر الزمان سے مراد اس خلافت کا آخری دور لیا جائے گا جو بطرز نبوت تھی، چنانچہ صحیح ابن حبان میں ہے: ”الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم تصیر ملکاً“۔ کے حافظ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء کے مقدمہ میں اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں: ”اخرجه اصحاب السنن وصححه ابن حبان وغيره“۔ (ص: ۸، قدیمی کتب خانہ) اور خوارج کا خروج ۲۸ میں ہوا ہے۔

خوارج نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی مصالحت پر اعتراض کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ جملہ کہا: ”ان الحكم الا الله“ جس کے متعلق مشہور ہے: ”كلمة حق واريدها الباطل“ اس کے ساتھ انہوں نے الگ ہو کر مستقل مذہب کی تاسیس کی اور مرتکب کبیرہ کو کافر کہنے لگے، بعد میں مزید غلو کرتے ہوئے بعض مرتکب صغیرہ کو بھی کافر ٹھہرانے لگے اس طرح ان کے میں فرقے بن گئے۔

جو حضرات ان کی تکفیر کرتے ہیں وہ: ”يمرقون من الدين“ میں دین سے مراد ایمان و اسلام لیتے ہیں، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ: ”اختلف العلماء قديماً (یعنی ان کی تکفیر میں)... والصحيح انهم كفار، لقوله صلى الله عليه وسلم: يمرقون من الدين“ الخ مگر جو حضرات ان کو کافر نہیں کہتے ہیں یعنی احتیاطاً جو کہ جمہور سلف کا مذہب ہے وہ یہاں دین سے مراد اطاعت لیتے ہیں یعنی یہ لوگ خلیفہ وقت کی طاعت سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر نشانہ میں داخل ہونے کے بعد فوراً نکل جاتا ہے، یہ تشبیہ ہے کہ یہ لوگ پہلے داخل ہوں گے مگر پھر جلد ہی نکل جائیں گے، اور قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے آگے تجاوز نہیں کرے گا یعنی دل میں داخل نہ ہوگا تا کہ اس کو سمجھیں یا اس پر عمل کریں یا اوپر کی طرف نہیں جائے گا یعنی قبولیت کے لئے نہیں جائے گا کہ مقبول کلمات و عبادات معبود کرتے ہیں قال اللہ تعالیٰ: ”اليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه“ ۱ خوارج بحیثیت جماعت آج موجود نہیں ہیں۔

باب ماجاء فی الاثرۃ

”عن أسید بن حضیر ان رجلاً من الانصار قال: یا رسول اللہ! استعملت فلاناً ولم تستعملنی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انکم سترون بعدی اثرۃ فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض“۔ (حسن صحیح)

حضرت اسید بن حضیر (دونوں مصر ہیں) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو عامل بنایا اور مجھے مقرر نہیں کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک عنقریب تم میرے بعد ترجیات دیکھو گے پس صبر کرتے رہنا یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر مجھ سے آلو!۔ لغات: استعملت، استعمال بمعنی عامل بنایا۔ قولہ ”اثرۃ“ مفتحات بمعنی ترجیح کے، ایثار سے ہے یعنی آنے والے اکثر امرا مستحقین کو ان کا حق نہیں دیں گے بلکہ مستحقین پر خود کو اور اپنے متعلقین کو ترجیح دیں گے۔

تشریح:۔ ان صحابی کو آپ علیہ السلام نے یہ جواب اس لئے دیا کہ وہ گھبرا گئے تھے کہ شاید آپ علیہ السلام نے دوسرے کو مجھ پر ترجیح دے کر مجھے ناپسند کیا، حاصل جواب یہ ہے کہ ایثار تو امور دنیا میں ہوتی ہے جبکہ عامل مقرر کرنا امور مسلمین میں سے ہے نیز ہم کسی خواہشمند یا مطالبہ کرنے والے کو نہیں بناتے ہیں مگر جب آپ کو اس پر بھی صبر نہیں تو بعد میں جب مشترکہ حقوق میں بہت سارے لوگوں کو یا انصار کو نظر انداز کیا جائے گا ان پر کیسے صبر ہوگا حالانکہ ترجیات کا علاج صبری ہی ہے لہذا جب بعد میں تم کو تمہارے حقوق نہیں ملیں گے تو صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے قیامت کے دن آلو، پھر وہاں آپ کے لئے آپ کا حق وصول کیا جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ اس صبر پر اتنا بڑا اجر مقرر ہے کہ آپ کوثر اور ساقی کوثر سے شرف ملاقات نصیب ہوتا ہے۔

حدیث آخر:۔ ”عن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: انکم سترون بعدی اثرۃ وامور اُتکرونها قالوا فما تأمرنا؟ قال: اُتوا الیہم حقہم واسألوا اللہ الذی لکم“۔ (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الاثرۃ

۱۔ اخرجه ایضاً البخاری ص: ۱۰۴۵ کتاب الفتن، ایضاً فی کتاب المساقاة باب: ۱۴، الخمس باب: ۱۹، الجزية باب: ۴ وصحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ حلیث: ۱۴۲، سنن نسائی ص: ۳۰۳ ج: ۲ کتاب ادب القضاء ”باب ترک استعمال من یحرم علی القضاء“۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپ میرے بعد تریجات دیکھیں گے اور ایسی چیزیں دیکھیں گے جو آپ کو نا آشنا لگیں گی، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں (یعنی ایسے میں ہم کیا کریں؟ ان سے لڑیں یا صبر کریں؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو ان کے حقوق ادا کرتے رہئے اور اپنے لئے اس چیز کی دعا مانگیں جو آپ کے لئے ہے۔

تشریح:- یعنی ولایت اور حکمرانوں کے خلاف کاروائی سے اجتناب کرتے رہو اور ان کی اطاعت میں لگے رہو اور اللہ سے سوال کرتے رہو کہ ان کی اصلاح فرمائے یا کوئی متبادل قیادت نصیب فرمائیں، یہ بھی ممکن ہے کہ: ”و اسالوا اللہ الذی لکم“ سے مراد صبر ہو یعنی اللہ سے صبر و استقامت مانگو۔

یہ مسئلہ پیچھے مکرر گزرا ہے کہ حکومت وقت سے باقاعدہ لڑائی اور جنگ سے اجتناب کرنا چاہئے خصوصاً جب کامیابی کا امکان کم ہو ہاں البتہ اگر خطرہ نہ ہو تو ان کے منکرات کو بزور زبان روکنا چاہئے پھر خطرے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ صرف اپنی حد تک ہو، دوسرا یہ کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہو، پہلی صورت جائز بلکہ عزیمت ہے جبکہ دوم جائز نہیں چنانچہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ شرح الخمسین میں لکھتے ہیں:

”ولیس ہومن باب قتالہم ولا من الخروج علیہم الذی ورد النہی عنہ ...

... و اما الخروج علیہم بالسيف فيحشى منه الفتن التي تؤدي الى سفك دماء

المسلمين، نعم ان عشى في الاقدام على الانكار على الملوك ان يؤذى اهلہ

او حيرانہ لم ينبغ له التعرض لهم حيثئذ لمافيہ من تعدی الاذی الى غيره“ الخ۔

(ص: ۳۹۲، دار ابن حزم حدیث نمبر: ۳۳)

ہاں البتہ اگر حکمرانوں کے منکرات ایسے ہیں جو رعایا پر لاگو کرنا چاہتے ہیں تو اس میں نہ ان کی اطاعت جائز ہے اور نہ ہی ان کو قبول کیا جاسکتا ہے، غرض لڑائی سے گریز کرتے ہوئے اپنا دامن بچانا لازمی ہے، خواہ اس کے لئے عہدہ چھوڑنا پڑے یا ہجرت کرنا پڑے۔ تاہم اگر حالات ایسے آجائیں کہ علماء متفقہ طور پر خروج کا فتویٰ جاری کریں جو بظاہر ناممکن لگتا ہے، تو اس وقت فتویٰ پر عمل کیا جانا چاہئے بشرطیکہ اسباب کی رو سے غلبہ کا قوی امکان ہو اور لڑائی کا مفید ثمرہ یقینی ہو مگر یہ شرائط آج کل ناممکن نظر آتی ہیں کہ اتنے اسباب جمع کرنا بعید از تصور ہے اور تقویٰ والی جنگ بھی آج نہیں ہو سکتی اور پھر جنگ کے بعد ثمرات و مفادات کی لڑائی بھی تقریباً یقینی ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب مَا أَخْبَرَ النَّبِيَّ ﷺ أَصْحَابَهُ

بما هو كائن الى يوم القيمة

[illegible]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہم کو عصر کی نماز دن میں (یعنی معمول سے پہلے جلدی) پڑھائی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے

کھڑے ہوئے اور قیامت تک آنے والی کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر ہمیں اس سے آگاہ فرمایا (یعنی موٹے موٹے تمام واقعات و حالات کے بارے میں بتلایا) یاد رکھا اس کو جس نے یاد کیا اور بھلا دیا اسے اُس نے جو بھولا پس آپ علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں (ایک فرمان) یہ تھا کہ بے شک دنیا ہری ہری میٹھی میٹھی ہے اور یقیناً اللہ نے تم کو اس کا جانشین بنایا ہے تاکہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو! اور اس ارشاد میں یہ بھی تھا کہ: خبردار لوگوں کا رعب کسی شخص کو حق بات کہنے سے ہرگز نہ روکنے پائے بشرطیکہ وہ اس کا حق ہونا جانتا ہو، راوی کہتا ہے کہ ابوسعید روئے اور فرمانے لگے بلاشبہ بخدا اہم نے بہت سی چیزیں دیکھ لیں مگر ہم بیت زدہ ہو گئے (یعنی ان منکرات کو روک نہ سکیں کہ ان کی پشت پر حکام تھے) اس خطبے میں یہ بات بھی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگاہ ہو! کہ قیامت کے روز ہر بے وفا کے لئے اس کی غداری کے بقدر ایک جھنڈا گاڑا جائے گا (یعنی بطور علامت کے) اور عام سربراہ کی غداری سے بڑا کسی کا غدر نہیں اس کا علم غدر اس کے سرین کے پاس نصب کیا جائے گا، اور ہم نے اس دن جو کچھ یاد کیا اس میں یہ بھی تھا: باخبر ہو کہ آدم کی اولاد مختلف طبقوں میں (تقسیم کر کے) پیدا کی گئی ہے ان میں بعض ایسے ہیں جو ایماندار پیدا کئے جاتے ہیں اور مؤمن رہتے ہیں اور بحالت ایمان مرتے ہیں، جبکہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کافر پیدا کر دیئے جاتے ہیں، کافر رہتے ہیں اور حالت کفر میں مرتے ہیں، اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو مؤمن پیدا کئے جاتے ہیں، ایماندار رہتے ہیں اور کافر بن کر مرتے ہیں جبکہ ان میں بعض ایسے ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، کافر رہتے ہیں (یعنی اسی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں) اور ایماندار بن کر مرتے ہیں۔

آگاہ ہو جاؤ! کہ ان میں بعض ایسے ہیں جن کو دیر سے غصہ آتا ہے اور جلد ہی غصہ سے لوٹ جاتے ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں جو جلدی غضبناک ہو جاتے ہیں اور جلدی واپس ہو جاتے ہیں پس ایک حالت دوسری کے بدلے میں برابر سرا بر ہو جاتی ہے، آگاہ ہو! بعض ایسے ہیں جو جلدی غصہ ہو جاتے ہیں اور دیر سے لوٹ جاتے ہیں (یعنی غصہ سے) آگاہ رہو! کہ ان میں سب سے اچھے وہ ہیں جو دیر سے غصہ ہو اور جلدی باز آجائیں اور ان میں بُرے وہ ہیں جو جلدی غصہ ہوں اور دیر سے باز آجائیں، باخبر رہو! کہ ان میں بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں بھی اچھے ہیں اور مطالبے میں بھی اچھے ہیں جبکہ بعض ان میں سے ادائیگی میں اچھے نہیں طلب میں اچھے ہیں، بعض ان میں سے دینے میں اچھے ہیں مانگنے میں اچھے نہیں ہیں پس ایک حالت دوسری کا بدلہ ہے، خبردار! بعض ان میں ایسے ہیں جو دینے میں بھی اچھے نہیں اور مانگنے میں بھی اچھے نہیں ہیں خبردار! ان میں

سب سے اچھے وہ ہیں جو دینے اور مانگنے دونوں میں اچھے ہوں، اور باخبر ہوں کہ ان میں بُرے وہ ہیں جو ادا کرنے میں بھی بُرے ہوں اور حق مانگنے میں بھی بُرے ہوں۔

خبردار! کہ غصہ آدمی کے دل میں ایک چنگاری (کی مانند) ہے کیا تم نے (دوران غصہ) اس کی آنکھوں کی سرخی اور گردن کی پھولی ہوئی رگیں نہیں دیکھیں پس جو شخص تھوڑا سا غصہ بھی محسوس کرے تو وہ زمین سے لگ جائے (مثلاً لٹ جائے) حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم سورج کی طرف دیکھنے لگے کہ اس کا کچھ حصہ باقی ہے؟ (یعنی سارا غروب ہوا یا کنارہ ابھی افق کے اوپر ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باخبر ہو کہ دنیا کے گزشتہ زمانے کے مقابلے میں اتنی ہی زندگی باقی ہے جتنا تمہارے آج کے دن کا باقی ماندہ حصہ ہے گزرنے والے حصے کے مقابلے میں۔

لغات مع تشریح:۔ قولہ ”ان الدنيا خضرة حلوة“ الخ خضرة بفتح الخاء وكسر الضاد جبکہ حلوة بضم الحاء وسكون اللام وفتح الواو ہے، اول کے معنی ہرے اور سبز کے ہیں جو دل کشی و جاذبیت سے کنایہ ہے کہ سرسبز منظر حسین لگتا ہے، اور حلوة سے مراد لذیذ ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا بظاہر بھی خوب صورت لگتی ہے اور نفس بھی اسے اچھا سمجھتا ہے، اب تم لوگ اس دنیا کے باسی اور حکمران بنادیئے گئے ہو مگر اس کی لذات میں انہماک سے بچو، اس کی محبت سے دور رہو، بس ضرورت کے تحت اسے حاصل کرو، غرض و مقصد سمجھ کر اس کے پیچھے مت لگو کہ اس میں آپ کا امتحان لیا جا رہا ہے، پھر آپ علیہ السلام نے خاص الخاص فتنے کا ذکر بطور خاص بعد العام کر کے فرمایا کہ عورتوں سے بچو یعنی ان پر دین قربان کرنے سے بچو، کہ اس سے مقصد اصلی فوت ہو جائے گا، تفسیر خازن میں ہے:

”لان الجمع بين لذات الدنيا والآخرة غير ممكن فمن اشتغل بتحصيل لذات

الدنيا فاته لذات الآخرة“ (جلد نمبر ۱ ص ۶۴) تحت آية ”اولئك الذين اشتروا الحياة

الدنيا بالآخرة“ من سورة البقرة

قولہ ”آلا تاتمنعون رجلاً هيبة الناس الخ“ یعنی حق بات کہنے کے لئے نقصان اٹھانا پڑے تو برداشت کر لیا کرو مگر لوگوں تک حق ضرور پہنچاؤ تاکہ قیامت کے دن کوئی لاعلمی کا عذر پیش نہ کر سکے تاہم اگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں خطرہ زیادہ ہو جس کی وضاحت پیچھے گزر چکی ہے تب آدمی معذور ہوگا، عارضۃ الاحوذی میں ہے:

”ان الخوف ان كان من اذابة قليلة لم يسقط عند ذلك فرض القول، فان كان ضرراً كثيراً تعين عليه ترك القول ولزمته خاصة نفسه۔“

قولہ ”ینصب لكل غادر الخ“ یہ جھنڈا اس کی نشاندہی اور اعلام کے لئے ہوگا تاکہ لوگ اس کو بحیثیت غدار دیکھیں اور یاد کریں اور چونکہ امام عام اور حکمران کی دھوکہ دہی و غداری بہت ہی شائع اور وسیع تر ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ حقوق و متعلقات کی زیادہ پامالی ہوتی ہے اس لئے اس کی تشہیر جُداً گانہ انداز سے ہوگی تاکہ شہرت کدائی کے ساتھ اس کی ذلت بھی ہو اور خُلُقِ سیئہ کے ساتھ اس کے خلق پوشیدہ کا بھی اظہار ہو۔

قولہ ”آلا ان بنی آدم خلقوا علی طبقات شتى الخ“ شتیت کی جمع ہے بمعنی مختلف کے جیسے مرضی جمع مریض، آپ علیہ السلام نے لوگوں کے مختلف درجات و طبقات بتائے اور بلاشبہ حقیقت بھی یہی ہے کہ سب لوگ برابر نہیں ہوتے، ہر دور میں دیکھا جاسکتا ہے کہ کوئی آدمی انتہائی خود غرض اور شریر ہوتا ہے جبکہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو خیر رسانی کے جذبے سے لبریز و سرشار ہوتے ہیں، شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر فلسفیانہ بحث فرمائی ہے، تفصیل تو وہاں دیکھی جاسکتی ہے، تاہم آسان لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سارے درخت یعنی نباتات مساوی نہیں اور نہ ہی تمام جاندار ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ ہر نوع کے افراد بھی یکساں نہیں ہوتے، ایسا ہی حال انسانوں کا بھی ہے، انسانیت کی سطح زمین بلکہ جانوروں سے شروع ہوتی ہے اور درجہ بدرجہ یہ سلسلہ عرش معلیٰ یعنی ملائکہ بالائیک پہنچتا ہے۔ (مد برو تشکر)

اس حدیث میں غصے کو انگارے سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ غصہ حرارت غریزہ کا اثر ہے جب آدمی خلاف طبع بات سنتا ہے یا خلاف مرضی کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس حرارت میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اس کا علاج پانی سے کیا جاتا ہے خواہ وہ پیئے یا وضوء کرے اور چونکہ کبھی غصہ تکبر کی وجہ سے بھی آتا ہے اس لئے زمین پر لیٹنے سے بھی وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ زمین میں تواضع و خاکساری ہے اور صحبت کا اثر تو ہوتا ہی ہے اس لئے ان ہر دو طریقوں سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، حُب دنیا اور غصہ کی مزید تفصیل درکار ہو تو راقم نے ”نقش قدم“ میں دی ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی اهل الشام

”عن معاوية بن قرة عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا فسد اهل الشام فلا خير فيكم لا تزال طائفة من امتي منصورين لا يضرهم من خذلهم حتى تقوم الساعة“۔^۱ (حسن صحيح)

حضرت معاویہ بن قرہ اپنے والد قرہ بن ایاس المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب شام کے لوگ بگڑ جائیں گے تو پھر تم میں بھی خیر نہیں بچے گی، میری امت کی ایک جماعت (ضرور) ہمیشہ منصور (مدد کی ہوئی) رہے گی وہ لوگ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو ان کی مدد کرنا چھوڑ دیں گے تا آنکہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

لغات:- قولہ ”منصورین“ جن کی من جانب اللہ نبی مدد کی جاتی رہے گی جس سے ان کے حوصلے بلند رہیں گے اور مکارہ و آزمائشوں پر صبر کرتے رہیں گے اس طرح ان کا کام جاری رہے گا اگرچہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔ قولہ ”من خذلهم“ جو ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے اور مدد کرنا بند کر دیں گے جیسا کہ موجودہ حالات میں مشاہدہ عام ہے۔

تشریح:- اس حدیث میں اہل شام کی منقبت کا ذکر ہے اور یہ کہ جب شام والے بگڑ جائیں تو پھر باقی لوگوں میں بھلائی کی موجودگی ختم ہو جائے گی، اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ شام مجاہدین کی ارض ہے اور مجاہدین کے فساد کے بعد دنیا میں خیر و بھلائی کا ناپید ہونا لازمی بات ہے، کسی نے کہا کہ شام مرکز حکومت ہے اور حکام کی خرابی رعیت کی تباہی ہے۔

مگر جو وجہ ابن خلدونؒ نے مقدمہ میں لکھی ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، یہ بنیادی طور پر جغرافیائی تاثیرات سے تعلق رکھتی ہے، یہاں اس کا انتہائی مختصر خلاصہ پیش ہے:

”علامہ عبدالرحمن بن خلدونؒ ہفت اقلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ چوتھی اقلیم تمام آباد علاقے میں سب سے زیادہ معتدل ہے اور اسے گھیرے ہوئے تیسری اور پانچویں اقلیمیں قریب بہ اعتدال ہیں... چونکہ

عراق و شام تمام دنیا میں وسط میں ہیں اس لئے یہ اعتدال میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں... اور ان معتدل اقلیم کے باشندے انتہائی کامل ہوتے ہیں... انبیاء کرام انہی لوگوں میں بھیجے جاتے ہیں جو نوع انسان میں اپنی پیدائش و اخلاق کے اعتبار سے انتہائی کامل ہوتے ہیں... انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو شریعت لے کر آئیں اسے یہ لوگ برضا و رغبت قبول کرتے ہیں۔ (تیسرا مقدمہ اقلیم معتدلہ وغیرہ معتدلہ بتقدیم و تاخیر)

غرض یہ لوگ فطرت کے بہت قریب ہیں اسی وجہ سے ان میں بکثرت انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے کہ ان کا حال گویا کچھ اس طرح ہے کما قال اللہ تعالیٰ: ”من شجرة مباركة زيتونة لا شرقية ولا غربية يكاد زيتها يضيئ ولو لم تمسسه نار، نور على نور“۔ (النور آیت نمبر: ۳۵) پس جب معتدل لوگ بے اعتدالی و بگاڑ کا شکار ہوں گے تو اندازہ لگائیں کہ باقی اقلیم کا حال کیا ہوگا؟ اگر آپ کا ذہن کسی اشکال کی طرف جائے تو اس کے جواب کے لئے حوالہ بالا مطالعہ کیجئے۔

ملاحظہ:- اس قسم کی احادیث میں قیامت تک کے الفاظ کا مطلب تا قیام قیامت نہیں لینا چاہئے بلکہ قیامت کا قرب لینا چاہئے یعنی وہ وقت جس کے بعد دوبارہ اصلاح نہ ہوگی بلکہ یہ ارضی کشتی ڈوب ہی جائے گی۔ رہا یہ مسئلہ کہ یہ طائفہ منصورہ جس کا یہاں ذکر آیا ہے کون ہے؟؟؟ اس سے کون لوگ مراد ہیں تو امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے ”قال علی بن المدینی: هم اصحاب الحديث“۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے اقوال ہیں: کسی نے کہا کہ مراد فقہاء ہیں، کسی نے مجاہدین کو اس کا مصداق بنایا ہے اور کسی نے صوفیاء کرام کو، مگر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اہل حق مراد ہیں خواہ وہ کسی بھی نام سے یاد کئے جائیں۔

باب لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض

”عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب

بعضکم رقاب بعض“۔^۱ (حسن صحیح)

باب لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض

۱۔ ایضاً رواہ البخاری ص: ۱۰۳۸ ج: ۲ ”باب قول النبی ﷺ لا ترجعوا بعدی الخ“ کتاب الفتن، ایضاً رواہ فی کتاب العلم باب: ۳۳، وفی الحج باب: ۱۳۳ وفی المغازی باب: ۷۷، وفی الاضاحی باب: ۵، ادب باب: ۹۵، حدود باب: ۹، صحیح مسلم کتاب الایمان، سنن نسائی تحریم باب: ۲۹، سنن ابن ماجہ باب: ۵، ابواب الفتن، سنن دارمی ص: ۹۵ ج: ۲، حدیث: ۱۹۲۱ عن جریر بن عبد اللہ، مسند احمد ص: ۳۸۱ ج: ۱، حدیث: ۲۰۳۷، ایضاً ص: ۶۶۳ ج: ۱، حدیث: ۳۸۰۵.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد کفار مت بننا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

تشریح:- ”لا ترجعوا“ بمعنی لاتصبروا کے ہے اور بعدی یعنی میری وفات کے بعد۔ کفار یعنی کالکفار یا ایک دوسرے کی تکفیر مت کرو کیونکہ اس سے تم ایک دوسرے سے قتال میں پڑ جاؤ گے، ”وقیل المراد کفران النعمة“۔ (کذافی حاشیۃ البخاری جلد اول ص: ۲۳۳) یضرب کو مجزوم پڑھنا بھی جائز ہے کہ جواب نہی ہے یا باء اول ثانی میں مدغم ہے، اور رفع بھی جائز ہے کہ جملہ محل صفت میں واقع ہے یا جملہ بدل عن الجملہ ہے۔ (کذافی العارضة) غرض یضرب یا حال وغیرہ بن کر ماقبل سے متعلق ہے یا جملہ متانفہ ہے۔

خلاصۃ المرام یہ ہے کہ میرے بعد تم لوگ ایمان و اسلام پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کفار کی مشابہت خصوصاً مقاتلہ سے بچتے رہو کہ اس سے دین بھی خراب ہوگا اور دنیا بھی۔

باب ماجاء انه تكون فتنة القاعد فيها خير من القائم

”عن بسر بن سعيدان سعد بن ابی وقاص قال عند فتنة عثمان بن عفان اشهد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: انها ستكون فتنة القاعد فيها خير من القائم والقائم خیر من الماشی، والماشی خیر من الساعی، قال افرأيت ان دخل علی بیتی وبسط يده إلی لیقتلنی؟ قال کُن کابن ادم“۔^۱ (حسن)

بسر بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کے فتنے کے وقت فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ بات یہ ہے کہ عنقریب ایک ایسا (ہولناک) فتنہ ہوگا کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا اور کھڑا شخص چلنے والے سے افضل ہوگا اور چلنے والا تیز رو سے بہتر ہوگا حضرت سعدؓ نے عرض کیا بتائیے (یعنی میری رہنمائی کیجئے) اگر کوئی شخص (فتنہ باز) میرے خلاف میرے گھر میں داخل ہو کر اپنا ہاتھ میری طرف

باب ماجاء فتنة القاعد فيها خير من القائم

۱۔ روی بمعناه البخاری ص: ۵۰۸ ج: ۱ کتاب المناقب، و ص: ۱۰۳۸ ج: ۲ کتاب الفتن، صحيح مسلم ص: ۳۸۹ ج: ۲ کتاب الفتن، سنن ابی داؤد ص: ۲۳۵ ج: ۲ ”باب النهی عن السعی فی الفتنة“ کتاب الفتن، سنن ابن ماجہ ص: ۳۸۵ ابواب الفتن باب: ۱۰۔

بڑھائے تاکہ مجھے قتل کر ڈالے (تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن آدم (ہائیل) کی طرح بن جاؤ۔

تشریح:- اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ شروفساد میں جس کا حصہ جتنا کم ہوگا وہ اس شخص کی بنسبت افضل ہوگا جو اس میں زیادہ سرگرم ہو کیونکہ ثواب و عقاب بقدر اعمال ہوتے ہیں علی ہذا ان سب لوگوں کو شریک تصور کیا جائے گا مگر قاعد کا حصہ قائم سے کم اور قائم کا ماضی سے کم اور ساعی سب سے زیادہ ہے۔
دوسرا مطلب جو کہ اظہر ہے، یہ ہے کہ فتنے سے جو شخص جتنا دور ہوگا وہ اتنا ہی محفوظ ہوگا پس قاعد تو اس لئے بہتر ہے کہ وہ بالکل لا تعلق ہے جبکہ قائم سے مراد تماشا دیکھنے والا ہے اور یہ بھی ایک گونہ شرکت ہے تو جس طرح گناہ کرنا جرم ہے اسی طرح گناہ کرنے والوں کا تماشا دیکھنا بھی حسب گناہ جرم و قبیح ہے جبکہ گناہ و فتنے کی طرف آہستہ و پیدل چلنے والا دوڑ کر شامل ہونے والے سے افضل ہے کہ دوڑنے والا زیادہ سرگرم ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فتنہ گھر کے اندر داخل ہو جائے تب بھی آدمی کو اپنا دفاع نہیں کرنا چاہئے بلکہ حضرت ہائیل کی طرح عزیمت پر عمل کرتا ہوا جام شہادت خاموشی سے نوش کر لینا چاہئے جبکہ بعض دیگر روایات^۱ اور فقہاء کی عبارات سے اپنے دفاع کا حق ثابت ہے، بظاہر یہ تعارض ہے۔

اس کا جواب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے الکوکب الدری میں یوں دیا ہے کہ اگر اپنے دفاع میں کسی بڑے فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر دفاع کرے اور اگر خطرہ ہو تو پھر دفاع کئے بغیر خوشی سے یا ناخوشی سے موت کو گلے لگا لے، لہذا دفاع کے جواز کی روایات عدم فتنے کی صورت پر محمول ہیں جبکہ باب کی روایت فتنے کے برپا ہونے کے اندیشے پر، مثلاً اگر آدمی سمجھتا ہے کہ اگر میں اپنے دفاع میں گولی چلاؤں تو حملہ آور میرے گھر کو بارود سے اڑا دیں گے جس سے میرے علاوہ اہل خانہ بھی نشانہ بن جائیں گے، یا مجھے قتل کر کے گھر والوں کو قیدی بنالیں گے اس طرح ان کی ایذا و آبروریزی کا سبب میں بن جاؤں گا تو پھر کوئی مزاحمت نہ کرے، غرض اہون البلیتین کو اختیار کر لینا چاہئے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب ماجاء ستكون فتنة كقطع الليل المظلم

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: بادروا بالاعمال فتناً كقطع الليل المظلم يُصبحُ الرجل مؤمناً ويُمسي كافراً، يُصبحُ مؤمناً ويُصبحُ كافراً، يُبيع احدهم دينه بعرض من الدنيا“۔^۱ (حسن صحيح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال (صالح) سرانجام دینے میں جلدی کرو ایسے فتنوں کی آمد سے پہلے پہلے جو تاریک رات کی مانند ہوں گے آدمی صبح مؤمن اٹھے گا اور شام کو کافر بنے گا اور شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کو کافر اٹھے گا، ان میں سے ایک اپنا دین دنیاوی مال و متاع کے عوض بیچے گا۔

لغات:۔ قولہ ”بادروا“ ای سارعو او سابقوا یعنی شیبانی و جلدی کرو۔ قولہ ”بالاعمال“ الف لام عہد کے لئے ہے، مراد اعمال صالحہ ہیں، ای بالاشتغال بالاعمال الصالحہ۔ قولہ ”كقطع“ بکسر القاف و فتح الطاء قطعہ کی جمع ہے کٹڑے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”المظلم“ بصیغۃ اسم فاعل، ظلمت اندھیرے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فتناً“ بفتح التاء فتنۃ کی جمع ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں فتنوں کی تشبیہ تاریک اور اندھیری رات کے ساتھ دی گئی ہے اور رات بھی ایسی جس میں جوق در جوق اندھیروں کا ہجوم ہو، ظاہر ہے ایسے میں بصارت کام نہیں کر سکتی ہے ایسا ہی ان فتنوں میں بصیرت قیل اور اندھی سی ہو جائے گی اور کچھ معلوم نہ ہوگا کہ حق کون سا ہے اور باطل کون سا؟ ایسے میں ذہنی انتشار اور پریشانیوں کی بھرمار ہوتی ہے اور اعمال کی طرف توجہ کم یا کم از کم دلجمعی ختم ہو جاتی ہے، مثلاً نماز باجماعت دشوار ہو جائے گی، حج کرنا مشکل بن جائے گا وغیرہ وغیرہ، لہذا ان حالات کے پیش آنے سے پہلے ہی عمل تیز کرو مثلاً ایک آدمی یہ سوچتا ہے کہ عمر کے اخیر میں حج کر لوں گا تو اول تو زندگی کی کوئی ضمانت نہیں، دوم حالات کا کیا بھروسہ شاید چند سال کے بعد حالات نامساعد بن جائے۔

پھر آپ علیہ السلام نے ان حالات کی ایک جھلک ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ ایک آدمی صبح کو مؤمن ہوگا مگر شام کو کافر بن جائے گا الخ اس ارشاد کا صحیح مطلب تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر جو کچھ ظاہری مطلب ہو سکتا ہے

باب ماجاء ستكون فتنة كقطع الليل المظلم

۱۔ ابصار رواہ مسلم ص: ۷۵ ج: ۱ ”باب العث علی المبادرة بالاعمال الخ“ کتاب الایمان و رواہ الترمذی فی الزهد باب: ۳۔

وہ امام ترمذیؒ نے اسی باب میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صبح وہ اپنے مسلمان بھائی کا خون اور آبرو اور مال محترم سمجھے گا مگر شام کو یہ چیزیں حلال سمجھنے لگے گا یعنی صبح کامل مؤمن ہوگا تو شام کو ایمان کا کمال اڑ جائے گا، یا مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں والا عمل شروع کر دے گا یا کافروں کی طرح طرز زندگی اپنالے گا۔

المستمر شد عرض کرتا ہے کہ روایت میں کافر کے لفظ کو معنی حقیقی واصلی پر محمول کرنے میں بھی کوئی زیادہ قباحہ نظر نہیں آتی کیونکہ دور حاضر میں ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے نظریات ایک ہی دن میں تبدیل ہو گئے، ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے سے پہلے (جوناٹن ایون کے واقعہ سے مشہور ہے) لوگوں کے ایمانی جذبات اچھے تھے مگر جیسے ہی امریکی صدر کا پاکستانی صدر پر وزیر مشرف کو دھمکی آمیز فون آیا تو پورے ملک کی پالیسی بھی تبدیل ہو گئی اور اکثریت کا رویہ بھی یکسر پلٹ گیا، اس سے اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ جب دجال کا فتنہ اور اس سے پہلے دوسرے فتنے آئیں گے تو یقیناً ایسی مثالیں دیکھنے کو ملیں گی۔ پھر اس کا مزید بیان کرتے ہوئے آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی اپنا ایمان معمولی دنیاوی متاع کے عوض بیچے گا۔

آج کل ایمان کی جو حالت ہے اور عام لوگوں کے دلوں میں اس کی جو قدر ہے اس کے تناظر میں اس جملے کو ظاہر پر محمول کرنا آسان لگتا ہے اور کسی قسم کی تاویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ آج معمولی فیشن کا مقام ایمان کے مقام سے اونچا سمجھا جاتا ہے، ایک بازاری عورت یا بازاری مرد کے سامنے کوئی ایسی حدیث بیان کرنا جو اس کی خواہش کے منافی ہو خواہ وہ فیشن سے متعلق ہو یا مال و نوکری سے کوئی مؤثر حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بہت سے لوگ تو حدیث کو ماننے نہیں اور قرآن میں مرضی کی تاویلات کرتے ہیں جس کے پیچھے دنیوی متاع کا لالچ ہوتا ہے، بے شمار لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے لئے آغا خانی بن گئے، لاتعداد قادیانی بن گئے اور بہت سے روشن خیال بن گئے یہاں تک کہ اہل علم میں بھی فتویٰ بیچنے والے پیدا ہو گئے گویا کسی نے پورا دین فروخت کیا اور کسی نے اس کے حصے بچہ دیئے ہیں مگر پھر بھی اللہ کا شکر ہے آج تک اہل حق علماء بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ اکابر علمائے دیوبند کو جزائے خیر عطا فرمائیں جن کی محنت کے ثمرات تا حال باقی ہیں جن کی بدولت ہم محفوظ و مستفید ہو رہے ہیں۔

حدیث آخر:۔ ”عن ام سلمة ان النبي صلى الله عليه وسلم: استيقظ ليلة فقال سبحان الله

ماذا انزل الليلة من الفتنة، ماذا انزل من الحزائن من يوقظ صواحب الحجرات يارب كاسية في

الدنيا عارية في الآخرة“۔ (حسن صحیح)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات (نیند سے) بیدار ہوئے تو فرمایا سبحان اللہ! کس قدر فتنے آج رات نازل کئے گئے اور کس قدر خزانے نازل کئے گئے ہیں کون ہے جو ان حجروں والیوں کو جگادے دنیا میں بہت سی آراستہ آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

لغات:- قوله ”ماذا أنزل“ الخ بصيغة مجهول اس میں ما استفہامیہ تعجب اور فحیم کے لئے ہے۔ قوله ”یارب“ منادی محذوف ہے تقدیر یہ یا سامعین! جبکہ رُبْ تکثیر کے لئے ہے۔ قوله ”كاسية“ کسی کیسی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے کاسیہ لباس پہنے ہوئی کو کہتے ہیں جو ”عاریتہ“ کے مقابل ہے، عاریتہ کے اعراب میں دو احتمال ہے، جر بھی جائز ہے کاسیہ کے تابع (صفت) ہونے کی وجہ سے، اور رفع بنا بر خبریت بھی صحیح ہے ای ہی عاریة فی الآخرة۔

تشریح:- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا بواسطہ ملائکہ بتایا گیا کہ مستقبل میں فتنوں اور خزانوں کا نزول ہونے والا ہے، فتنوں سے تو مراد ہلا دینے والے واقعات اور نئی ایجادات وغیرہ اوزان پر مرتب عذاب ہے جبکہ خزانوں سے مراد رحمتیں بھی ہو سکتی ہیں اور روم و فارس کے خزانے بھی ہو سکتے ہیں، چونکہ فتنوں کے پیش آنے کی صورت میں اتاب ت الی اللہ میں تیزی لانے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور تبلیغ و تعلیم اور دفع مضرت میں اپنے نفس و اہل خانہ اور قرب و جوار سے آغاز کرنا چاہئے اس لئے فرمایا کہ کون ہے؟ جو صواحب حجرات یعنی امہات المؤمنین کو جگادے، لہذا اس کلام کا رُخ امہات المؤمنین کی طرف نہیں ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”یارب کاسیة فی الدنیا عاریة فی الآخرة“ تو اگرچہ یہ حکم عام ہے مردوں کو بھی شامل ہے مگر عورتیں اس میں پیش پیش رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی تخصیص فرمائی کہ عورتوں کے مزاج میں ریاکاری، تفاخر اور نمائش کا تناسب مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، ایک روایت میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے ”نساء کاسیات عاریات مائلات مہیلات رؤسهن کاسنمة البخت“۔ اگر دونوں حدیثوں کا مورد ایک مانا جائے تو پھر کہا جائے گا کہ باب کی حدیث مختصر ہے، جیسا کہ اوپر لغات کے ضمن میں عرض کیا گیا کہ کاسیہ اور عاریہ متضاد الفاظ ہیں اس لئے یہاں کاسیہ کے جو بھی معنی مراد ہوں عاریتہ سے اس کے مخالف معنی مراد ہوں گے پس یا تو اس کا ظاہری مطلب مراد ہے، یا پھر مجازی معنی۔ اس لئے یہاں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں جو مندرجہ

ع رواہ البخاری ص: ۲۲ ج: ۱ کتاب العلم، ایضاً ص: ۱۰۷ ج: ۲ کتاب الفتن، ایضاً روی بمعناه المالک فی الموطا

ص: ۷۰۹ کتاب الجامع۔ ع رواہ مسلم ص: ۲۰۵ ج: ۲ کتاب اللباس، مسند احمد ص: ۳۷ ج: ۳ حدیث: ۸۴۵۱۔

ذیل ہیں۔

(۱)...کاسیتہ سے مراد کپڑوں میں ملبوٹ ہونا ہے مگر وہ کپڑے تستر کے مقصد سے خالی ہونے اور زینت کی خاطر زیب تن کرنے کی وجہ سے آخرت میں پردے کا کام نہ دیں گے، پھر محض زینت موٹے کپڑوں اور باریک دونوں سے مذموم ہے۔

(۲)...یا مراد لباس التقویٰ ہے مگر حقیقی تقویٰ نہ ہونے کی بناء پر وہ متقی آخرت میں عاری عن التقویٰ شمار ہوگا۔

(۳)...مال و دولت و دیگر نعمتوں سے مالا مال ہوں گی دنیا میں مگر ناشکری کی وجہ سے آخرت میں شکر کے ثمرات سے محروم ہوں گی۔

(۴)...بظاہر از دواج کے لباس میں مستور ہوں گی مگر اغیار کی یاری اور شوہر کے ساتھ مکاری و عیاری کی وجہ سے آخرت میں سب مکرو فریب اور زنا سے پردہ اٹھ جائے گا۔

پھر جس روایت میں مائعات ممیلات الخ کا اضافہ ہے اس کی تشریح میں ابن العربی نے عارضہ میں متعدد احتمالات ذکر کئے ہیں مثلاً چلنے میں دائیں بائیں جھکاؤ، یا چادر اور دوپٹہ کو چہرے سے ہٹانا، یا اپنی باتوں میں مٹھاس ظاہر کرنا وغیرہ جس سے دوسرے کے دل ان کی طرف مائل ہوں تاہم اپنے گھر میں شوہر کا دل جیتنے اور لٹھانے کے لئے یہ جائز ہے، عارضہ میں ہے: ”ومعناه ان المرأة اذا كانت في بيتها مع زوجها فليس شيء من هذا مذموماً على الإطلاق“ الخ۔

باب کی آخری حدیث:- ”عن علقمة بن وائل بن حجر عن ابيه قال: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجل يسأله فقال: أَرَأَيْتَ ان كان علينا أمراء يمنعونا حقنا ويسألونا حقهم؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اسمعوا واطيعوا فانما عليهم ما حُمِّلُوا وعليكم ما حُمِّلْتُمْ“۔ (حسن صحیح)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا دِراں حالیکہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر رہا تھا، پس اس شخص نے عرض کیا بتائے گا کہ اگر ہمارے اوپر ایسے اُمراء ہوں جو ہم سے تو ہمارا حق روکیں اور اپنا حق ہم سے مانگیں؟ (یعنی ایسے میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنا کرو اور فرمانبرداری کیا کرو بے شک ان پر وہ لازم ہے جو ان پر لازم ہے

گیا ہے (یعنی عدل و انصاف اور امن و امان وغیرہ کی ذمہ داری) اور تم پر وہ لازم ہے جو تم پر لا دیا گیا ہے (یعنی اطاعت و معاونت)۔

تشریح:- یہ مضمون پیچھے بارہا گذرا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ امر ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نافرمانی و بغاوت اور خروج کی اجازت دیدی جائے تو اس طرح ہمیشہ کے لئے طوائف الملوکی کا راج قائم رہے گا اور مسلمان چھوٹی چھوٹی ریاستوں بلکہ ٹولیوں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے اس لئے امام کی اطاعت کو والدین کی فرمانبرداری سے زیادہ مؤکد قرار دیا، اور بڑی حد تک ان کی زیادتیوں کو برداشت کرنے کی تلقین کی گئی، تاہم جس طرح مسلمان ماں باپ اور کافر ماں باپ کی تعمیل یکساں واجب نہیں اسی طرح عادل اور فاسق حکمرانوں میں بھی فرق ہے کہ عادل کی اطاعت موافق شریعت واجب ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے تو ان کے مباح احکام کو کبھی واجب التعمیل قرار دیا مگر فاسق حکمرانوں کی اطاعت کا حکم ماننا گواجب تو نہیں خاص کر جب وہ شریعت کے خلاف ہو مگر ان کے خلاف خروج بھی واجب نہیں بلکہ آج کل تو یہ کہنا چاہئے کہ جائز ہی نہیں کیونکہ آج بارود کا دور ہے اور خروج کی صورت میں نہ صرف مرد، حکومت کے ظلم کا شکار بن جاتے ہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی اس کی زد میں آتے ہیں جیسا کہ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۰ء کا تجربہ سب نے دیکھا کہ حکومت پاکستان کے ہاتھوں بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے یا غائب ہو گئے یا فروخت کئے گئے، بنا بریں جب تک کفر و ارجح نہ ہو تو صبر کا دامن تھامنا ہی عقلمندی ہے تاکہ یہ مقولہ صادق نہ آئے: ”کمن بناقصراً وهدم مصرأ“۔ مزید تفصیل پہلے گذری ہے اس سے بھی زیادہ درکار ہو تو ”المسائرہ اور المسامرہ“ وغیرہ دیکھیں۔

باب ماجاء فی الهرج

”عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم: ان من ورائکم ایاماً یرفع فیہا العلم

ویکثر فیہا الهرج قالوا: یا رسول اللہ اما الهرج؟ قال: القتل“۔^۱ (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الهرج

۱۔ ایضاً رواہ البخاری ص: ۸۹۲ ج: ۲ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۳۴۰ ج: ۲ ”باب رفع العلم وقبضہ الخ“ کتاب العلم، سنن ابن ماجہ ص: ۲۹۳ ”باب ذهاب القرآن والعلم“ ابواب الفتن، مسند احمد ص: ۶۴۳ ج: ۱ حدیث: ۳۶۸۷، ص: ۵۱۴ ج: ۲ حدیث: ۷۴۹۶۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے بعد ایسے دن ہوں گے جن میں علم اٹھالیا جائے گا اور ہرج (قتل یا فجور) بڑھ جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ”ہرج“ کیا ہے؟ فرمایا ”قتل“۔

لغات:۔ بقولہ ”الہرج“ اس کی تفسیر و مراد وہی ہے جو خود ہی حدیث میں آئی ہے یعنی باہمی قتل و قتال، تاہم بعض روایات میں ہرج کا اطلاق فتن و فجور پر بھی ہوا ہے جیسا کہ ترمذی ”باب ماجاء فی فتنۃ الدجال“ کی ایک لمبی حدیث کے ضمن میں آرہا ہے: ”ویسقی سائر الناس یتھارجون کما یتھارج الحمر فعلیہم تقوم الساعة“۔^۲ (ص: ۴۹) غرض لغت میں اضطراب کو کہتے ہیں، قتل اس کا کامل فرد ہے، حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے دونوں روایتوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ اگر بارہ ائمہ سے مراد قوت اسلام کا زمانہ لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہے کہ اسلام کی قوت و شوکت کی کمزوری کی صورت میں باہمی قتل و قتال عام ہو جائے گا: ”فعلى هذا التاويل يكون المراد بقوله "ثم يكون الهرج" یعنی القتل الناشئ عن الفتن وقوعاً ناشئاً ويستمر ويزداد وكذا كان“۔

اور اگر بارہ ائمہ سے مراد نفس اسلام کے پھیلے ہوئے زمانے پر منقسم دَوَر لیا جائے تو ”على هذا فالمراد بقوله "ثم يكون الهرج" ای الفتن المؤذنة بقیام الساعة من الخروج الدجال وما بعده“ انتہی ای کلام ابن حجر۔ (تاریخ الخلفاء ص: ۹، ص: ۱۰)

تشریح:۔ بعض نسخوں میں ترجمۃ الباب اس طرح ہے: ”باب الہرج والعبادۃ فی“ یہ حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا ہی فرمایا تھا ویسا ہی ہوا کہ علم گھٹ گیا اور قتل و غارت کا بازار خوب گرم ہے، علم کے رفع کی صورت تو یہ ہے کہ جب بھی کوئی عالم وفات پاتا ہے تو اس کے پیچھے رہ جانے والے خلاء پُر کرنے کے لئے کوئی نہیں ہوتا اس طرح مسلسل گراوٹ ہمارے مشاہدے میں ہے اور جب علم نہ رہے اور اس پر عمل نہ ہوگا تو لازمی بات ہے کہ جہل بڑھے گا اور زمانہ جاہلیت کا دَوَر دوبارہ شروع ہوگا کیونکہ جاہلیت زمانے کے کسی مخصوص وقفے کا نام نہیں بلکہ ذہنی و دماغی فطور کا نام ہے کہ جب وہ معیار قائم نہیں رہے گا جو دین اسلام نے قائم کر رکھا تھا تو کہا جائے گا کہ جاہلیت کا دور آگیا، اور انسانی سوچ پھر جاہلیت کی تاریکی میں ڈوب گئی۔

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ امت قتل و غارت گیری سے معصوم و مامون تھی مگر جب اس کے امام حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو فتنوں کا بند دروازہ کھول دیا گیا: ”وقد قال لهم عبدالله بن سلام: لا تسألوا سيف الفتنه المغمود عنكم“۔

ایسی صورت حال میں کہ جب اصلاح ممکن نہ ہو کیا کرنا چاہئے اس کو اگلی حدیث میں بیان کیا گیا ہے: ”العبادة في الهرج كهجرة الى“۔^۱ (حسن صحیح) ”فتنوں میں عبادت ایسی ہی ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا“۔ ابن العربیؒ اس تشبیہ کی وجہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ پہلے لوگ دین کی حفاظت کی خاطر ہجرت کر کے دار الکفر سے دار الایمان کی طرف جاتے تھے مگر جب فتنے ہوں (یعنی کوئی جگہ محفوظ نہ رہے) تو اس وقت تحفظ دین کی خاطر لوگوں سے الگ ہو کر عبادت کرنا متعین ہو جاتی ہے جو ہجرت کی ایک قسم ہے، سند میں ”ردہ“ بمعنی نسبہ ہے یعنی اس کو منسوب کیا۔

حدیث آخر:۔ ”عن ثوبان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا وضع السيف في امتي لم يرفع عنها الى يوم القيامة“۔^۲ (صحیح)

جب میری امت کے درمیان تلوار رکھ دی جائے گی (یعنی چلنے لگے گی) تو قیامت تک اٹھائی نہیں جائے گی۔

تشریح:۔ کیونکہ ہر گناہ کا یہ ضابطہ ہے کہ آدمی جب تک اس سے دور رہتا ہے تو اس کی شاعت، بُرائی اور ہولناکی و بدانجامی کا تصور ذہن پر غالب رہتا ہے مگر ایک دو دفعہ اس کے ارتکاب سے اس کا خوف ختم ہو جاتا ہے اور وہ عام معمولات زندگی کی طرح زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے علیٰ ہذا جب قتل کا اقدام کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اس علاقے یا قوم میں قتل فروغ پاتا ہے۔ والعیاذ باللہ

۱۔ ایضاً رواہ مسلم ص: ۳۰۶ ج: ۲ ابواب الفتن، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۷ ”باب الوقوف عند الشبهات“ ابواب الفتن، مسند احمد ص: ۶۶۰ ج: ۵ حدیث: ۱۹۷۸۷ ولفظہ: العمل في الهرج كهجرة الى.

۲۔ رواہ ایضاً ابو داؤد ص: ۲۳۳ ج: ۲ کتاب الفتن والملاحم، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۳ ابواب الفتن: واذا وضع السيف في امتي فلم يرفع عنهم الى يوم القيامة، مسند احمد ص: ۱۰۳ ج: ۵ حدیث: ۱۶۶۶۶ عن شداد بن اوس.

باب ماجاء فی اتخاذ السیف من خشب

”عن عُدیسة بنت أَهْبَانَ بن صیفی الغفاری قالت جاء علی بن مُطالب إلى أبی فدعاه الی الخروج معه فقال له ابی: ان خلیلی وابن عمک عهد الی اذا اختلف الناس ان اتَّخَذَ سِيفاً من خشب فقله اتَّخَذْتُهُ فَاِنْ شِئْتَ خَرَجْتُ به معک؟ قالت فَتَرَكَه“۔^۱ (حسن غریب)

حضرت عُدیسہ (بالقصر) فرماتی ہیں کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) میرے والد (یعنی اُہبان بن صیفی رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے اور ان کو اپنے ہمراہ نکلنے (یعنی جنگ کرنے) کی دعوت دی تو میرے والد نے ان سے کہا کہ میرے دوست اور آپ کے چچا زاد بھائی نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ جب لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگیں تو میں لکڑی کی تلوار بنا لوں، پس میں نے وہی بنائی ہے پس اگر آپ چاہیں تو اسی کو لیئے آپ کے ساتھ نکلوں؟ فرماتی ہیں کہ انہوں (حضرت علیؑ) نے ان کو (میرے والد کو) چھوڑ دیا۔

تشریح:- حضرت اُہبان (برزن نعمان) رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے لکڑی کی تلوار بنائی تھی جبکہ حدیث کا اصل مطلب یہ ہے کہ قتال سے اجتناب کیا جائے مگر کبھی کبھار ایسا جاتا ہے کہ راوی حدیث کے ظاہری مطلب کو بھی شامل مراد کر لیتا ہے جیسا کہ ابوداؤدؒ نے میں حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت ہے:

”انه لَمَّا حَضَرَہ الموتُ دَعَا ثِیَابَ جُدَدٍ فَلَبِسَہَا ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُولُ: ”المیتُ یُبْعَثُ فی ثِیَابِہ التّی یموت فیہا“۔

حالانکہ محققین کے نزدیک حدیث بالا میں ثیاب، عمل سے کنایہ ہے۔

غرض فتنے کے زمانہ میں اگرچہ ہتھیار رکھنا دفاع و تحفظ کی غرض سے جائز ہے مگر اس کے غلط استعمال کا احتمال بروقت رہتا ہے اس لئے عزیمت و بہتر یہ ہے کہ آدمی بالکل خالی ہاتھ رہے کہ مظلوم بننے میں کوئی حرج نہیں مگر ظالم بننا آخرت کی بربادی کا سبب ہے۔

باب ماجاء فی اتخاذ السیف من خشب

۱۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۸۳ ابواب الفتن، مسند احمد ص: ۶۳ ج: ۶ حدیث ۲۰۱۴۔

۲۔ ص: ۸۸ ج: ۲ ”باب ما یستحب من تطہیر ثیاب المیت عند الموت“ کتاب الجنائز۔

دوسری حدیث:- ”عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انه قال فی الفتنة کسروا فیہا قسبکم وقطعوا فیہا اوتارکم والزموا فیہا اجواف بیوتکم وکونوا کابن ادم“۔ (ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ فتنے میں اپنی کمانون کو توڑ دو اور اپنے تانت اس میں کاٹ دو اور گھروں کے اندرون کو لازم پکڑ دو اور ابن ادم (ہاتیل) کی طرح بن جاؤ۔

لغات:- قولہ ”فسی الفتنة“ ای فی ایامہا وزمنہا، یہ اگلے افعال کے لئے ظرف ہے۔ قولہ ”کسروا“ نکسیر سے ہے یعنی توڑ دو۔ قولہ ”قسبکم“ قسب بکسر القاف والسين وتشدید الیاء، قوس کی جمع ہے بمعنی کمان کے۔ قولہ ”وقطعوا“ یہ بھی تفعیل سے ہے، دونوں صیغہ مبالغے کے لئے ہیں یعنی ضرور توڑ دو اور ضرور کاٹو یا مطلب یہ ہے کہ ریزہ ریزہ کر دو۔ قولہ ”اوتارکم“ وتر کی جمع ہے، کمان کے تانت کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس اشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ فتنے سے گریزاں رہو بایں صورت کہ اپنے گھروں کے اندر رہی رہو کہ وہی نسبتاً سب سے محفوظ جگہ ہے، اور اگر کوئی شخص آپ پر ہاتھ اٹھائے تو تم بجائے دفاع و مزاحمت کے ہاتیل کی مانند عزیمت پر عمل پیرا رہو، کیونکہ مظلوم بننا آسان اور محفوظ ترین راستہ ہے، عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ بعض شامی لوگ یوم الحزہ میں ایک غار میں ابو سعید خدریؓ کے تعاقب میں گھس گئے اور ان سے کہا کہ نکلو تو ابو سعید خدریؓ اپنی تلوار ان کی طرف پھینکتے ہوئے نکلے پھر اس شخص نے ابو سعید خدریؓ سے پوچھا تم ابو سعید ہو؟ انہوں نے کہا ”ہاں“ تو وہ شخص ان کے قتل سے رُک گیا۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ آدمی کو دفاع کا حق ہے مگر عارضہ میں ہے کہ ایسے میں قضائے باری تعالیٰ پر صبر کرنا چاہئے۔

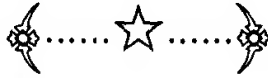
المستر شد عرض کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن فتنوں کی پیش گوئی فرمائی تھی وہ آج اسی رنگ میں سامنے آگئے اور اسلامی دنیا میں وقفے وقفے سے یا باری باری مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں، آج کل ہمارا ملک پاکستان شدید فتنوں کی لپیٹ میں ہے، حد یہ ہوگئی کہ ایک موبائل فون کے حصول کے لئے بھرے بازار

۳۔ روی بمعنہ ابو داؤد ص: ۲۳۵ ج: ۲ ”باب النهی عن الفتنة“ کتاب الفتن، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۵ ابواب الفتن،

مسند احمد ص: ۵۵۹ ج: ۵ حدیث: ۱۹۱۶۳، ص: ۵۷۰ ج: ۵ حدیث: ۱۹۲۳۱۔ حفیظ الرحمن الحنفی عفی عنہ

میں آدمی کو قتل کیا جاتا ہے اور کبھی کسی گھریا دوکان وغیرہ میں گھس کر حقیر چیز چھیننے میں بھی جان لینے سے گریز نہیں کیا جاتا، سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول یا قومیت و عصبيت کی خاطر قتل و قتل کو تو عبادت سمجھا جاتا ہے، بعض لوگ شوقیہ طور پر بھی گولیاں چلا کر بے گناہ کا خون کرتے ہیں۔

ایسے میں اپنا دفاع کیسے ممکن ہے نہ دشمن کا تعین ہو سکتا ہے جس سے بچا جائے اور نہ ہی وضاحت کرنے کا موقع ملتا ہے، اس لئے چاہئے کہ ہم ہر وقت توبہ تائب رہیں، عبادت میں سرگرم ہو جائیں اور موت کے لئے تیار رہیں تاکہ ناگہانی موت، گناہ میں نہ آئے سو فغنی اللہ وایاکم، وجعل الجنة مثنوی و مثنوا کم



بَيْتُكَ الْمَلْجَأُ

فِي
حِلِّ ابْنِ دَاوُدَ

تَأْلِيفُ

الْعَلَّامَةُ الْمُحَدِّثُ خَلِيلُ أَحْمَدَ السَّهَّارَنفُورِيِّ

(وُلِدَ سَنَةَ ١٢٦٩ هـ وَتَوَفَّى سَنَةَ ١٣٤٦ هـ)

مَعَ تَعْلِيقَاتٍ

الْعَلَّامَةُ الْمُحَدِّثُ الشَّيْخُ مُحَمَّدُ زَكْرِيَّا الْكَانْدَهْلُوي الْمَدِينِيُّ

الْمَجْلَدُ الْأَوَّلُ

الْمَحْتَوَى:

كِتَابُ الطَّهْرَةِ

الْأَهَادِيثُ : ١ - ١٤٨

قَدْ سَمِعْتُ كُنْزَ خَانَةَ

قَزَرْ مَرْبَاغ - كَرَجِي

الجزء الاول

تحفة الأحوزي

للإمام الحافظ محمد عبد الرحمن المباركفوري

المتوفى ١٣٥٣ هـ

بشرح

جامع الترمذي

ومعه

شفاء الغلل في شرح كتاب العلل
والشمائل المحدثية والنخائل المصطفوية
للإمام أبي عيسى الترمذي نفسه

حَقَّقَهَا وَضَعَ حَوَاشِيَهَا

علي محمد معوض ٥ عادل احمد عبد الموجود

تدري كتب خانة آراءم باغ - كراچی